1

غربت اور غلامی

خاتمہ کیسے ہو؟

ذیشان ہاشم

غربت اور غلامی خاتمہ کیسے ہو؟ ذیشان ہاشم

یہ کتاب بنیادی طور پر معاشیات، فلسفے اور بشریات کے علوم کا ایک ایسا امتزاج ہے جو انسانی صورتحال کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں معاونت کرتا ہے۔ یہ کتاب یقیناً کئی سماجی تشکیلات کی شکست کا سبب بنے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر قاضی عبدالرحمان عابد
بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

یہ کتاب پڑھ کر مجھے یوں لگا جو میری آرزو تھی وہ سب اسی میں ہے۔ انشاءاللہ یہ کتاب پاکستان کے معیشت و سیاست اور معاشرت کے طلباء میں خوب پذیرائی پائے گی اور پاکستانی دانشورانہ مکالمہ میں تاریخ ساز کردار ادا کرے گی۔

ڈاکٹر محمد ناصر
پاکستان انسٹیٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس

پاکستان کا فکری المیہ یہ ہے، یہاں نوع بہ نوع افکار ایک دوسرے میں الجھے ہوئے ہیں۔ پرانا بھی ٹھیک ہے، نیا بھی ٹھیک ہے۔ مذہب بھی صحیح ہے، سائنس بھی قبول ہے۔ یعنی clarity in thoughts نہیں ہے۔ ایسے حالات میں ذیشان خیالات، نظریات، افکار کی صفائی ستھرائی کا کام خوب کر رہا ہے۔ چنانچہ ذیشان کی زیر نظر کتاب پاکستان میں ایک زبردست علمی کردار ادا کرے گی، جس سے ہمارے ہاں کی فکری پس ماندگی، لاعلمی اور ادھوری علمی حالت کا خاتمہ ہوگا۔

ارشد محمود: مصنف، دانشور

ذیشان ہاشم انصاف اور آزادی کے دو زاویوں کو متوازن کرنے کی مسلسل جدوجہد میں ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ ذیشان ہاشم اپنی بے پناہ ذہانت، فکری توانائی، ذہنی دیانت داری اور قابل رشک احساس ذمہ داری سے کام لیتے ہوئے نہ صرف یہ کہ عالمی سطح پر علمی مکالمے میں تخلیقی کردار ادا کریں گے بلکہ انکسار سے پیش گوئی کرتا ہوں کہ ذیشان ہاشم کا قلم اردو زبان کے پڑھنے اور لکھنے والوں کے لیے امید کی کرن ثابت ہوگا۔

وجاہت مسعود: مصنف، دانشور، کالم نگار

ذیشان ہاشم نوجوان ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ وہ اس عمر میں کلاسکیل لبرل ازم کے فلسفے کے قائل ہیں۔ فاضل مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ ان فلسفیانہ افکار کی عام فہم پیرائے میں ترسیل پر ہی قدرت نہیں رکھتے بلکہ انہیں استدلال سے مزین کرنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ مند ہیں۔ اس کتاب میں جن افکار کو پیش کیا گیا ہے ان کی آج مسلم سماج کو شدید ضرورت ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر ساجد علی: سابق چیئرمین فلسفہ ڈیپارٹمنٹ، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

ذیشان ہاشم کا شمار ان احباب میں ہوتا ہے جن سے تعلق اور نسبت پر مجھے فخر ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ کتاب غیر سیاسی اور خشک موضوعات پر مشتمل ہوگی اور اسے پڑھنا دشوار ہو جائے گا مگر جب کتاب دیکھنا شروع کی تو غیر متوقع طور پر پہلی ہی نشست میں پوری پڑھ ڈالی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشکل ترین موضوعات کو سہل اور آسان فہم انداز اور سلیس زبان میں بیان کیا گیا ہے۔

محمد بلال غوری۔ دانشور، مصنف، کالم نگار

ذیشان ہاشم نئی نسل میں سے ان لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو شوق مطالعہ رکھتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ جذباتی انداز اختیار کرنے کی بجائے دلیل کی بنیاد پر اپنا مقدمہ پیش کرتے ہیں۔ میں خود ان کی تحریروں کا مداح ہوں اور بہت سے امور پر ان کی تحریروں سے راہنمائی بھی لیتا ہوں۔

سلمان عابد: مصنف، دانشور، کالم نگار

emel.com.pk

Price: Rs: 590

www.emel.com.pk

Ghurbat Aur Ghulami: Khatma Kaesy Ho?

Zeshaan Hashim

Emel Publications

اس کتاب کی اشاعت کے لئے ہمیں Friedrich-Naumann-Foundation Fur Die Freiheit کا تعاون حاصل رہا ہے جبکہ کتاب کے مندرجات کی ذمہ داری پالیسی ریسرچ انسٹیٹیوٹ آف مارکیٹ اکانومی (PRIME) کی ہے

غربت اور غلامی خاتمہ کیسے ہو؟

ایڈیشن: اوّل 2017

ناشر: ایمل پبلیکیشنز۔ اسلام آباد

مطبوعہ: انڈس ٹری پرائیویٹ لمیٹڈ، اسلام آباد www.industree.com.pk

ISBN: 978-969-9556-35-7

تقسیم کنندہ: ۱۲، سیکنڈ فلور، مجاہد پلازہ، بلیو ایریا، اسلام آباد۔

فون: 92-342-5548690، 92-51-2803096

اسلام آباد: سعید بک بینک، جناح سپر مارکیٹ، مسٹر بکس، سپر مارکیٹ

لاہور: ایمل بکس، اردو بازار، فون: 0323-4839655

قیمت: 680 روپے

غربت اور غلامی : خاتمہ کیسے ہو؟

ابو جان محمد ہاشم خواجہ اور

امی جان عائشہ ہاشم خواجہ

کے نام

فہرست مضامین

ذیشان ہاشم ......اردو کی نئی علمی امید

زیادہ عرصہ نہیں گزرا ۔ چند سال پہلے مجھے ڈاک میں ایک تحریر موصول ہوئی ۔ اردو زبان کسی قدر اکھڑی اکھڑی سی مگر خیالات صاف اور گہری سوجھ بوجھ کی جھلکیاں موجود تھیں۔ لکھنے والے نے معیشت کے کسی موضوع پر طبع آزمائی کی تھی۔ اردو زبان میں صحافت کرتے ہوئے یہ خوشگوار حیرت کم کم نصیب ہوتی ہے کہ کوئی نوجوان لکھنے والا معیشت پر قلم اٹھائے۔ ہمارے نوجوان عام طور سے سیاست یا مزاح وغیرہ کے موضوعات پر خامہ فرسائی سے لکھنے کا آغاز کرتے ہیں۔ اس تحریر کو الٹ پلٹ کر دیکھا ۔ لکھنے والے کا نام ذیشان ہاشم تھا۔ تحریر شائع کر دی گئی۔ خلاف توقع پڑھنے والوں سے بہت اچھا رد عمل ملا اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔

تعارف کے خدوخال کچھ واضح ہوئے تو معلوم ہوا کہ ذیشان ہاشم ایک خلیجی ملک میں مقیم ہیں۔ بیرون ملک معیشت کی تعلیم پائی ہے اور پھر ایک روز یہ بھی معلوم ہوا کہ شجاع آباد کے رہنے والے ہیں۔ رجحان طبع جدیدیت کی طرف مائل ہے ۔معیشت کے نئے رجحانات سے پوری طرح آشنا ہیں۔ امرتیو سین سے براہ راست تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ ملٹن فریڈمین کی تصانیف نوک زبان ہیں۔ فریڈرک ہائیک ، جوزف شمپٹر اور میکس ویبر جیسے صاحبان سے ایسا شغف ہے جیسا محمد حسن عسکری کو فراق گورکھپوری سے تھا۔ ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ معیشت کے ان دیوسائی نشانات سے تعلق خاطر کے باوجود ذیشان ہاشم کو جاوید غامدی صاحب کے مذہبی خیالات کے بارے میں بھی تجسس تھا۔ ایک بہت اچھی بات یہ دیکھنے میں آئی کہ نوجوان اور پرجوش ہونے کے باوجود ذیشان ہاشم جہاں اشتراکی ، فلسفے اور تاریخی تجربے کے بارے میں رائے دیتے تو اس میں ایسا اعتدال نظر آتا جو معاملات کی فہم سے جنم لیتا ہے۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں جنم لینے والے ان نوجوانوں سے بہت مختلف ہیں جن کی آنکھ اکیسویں صدی کے پار نہیں جاتی۔ پھر ایک روز یہ راز بھی کھلا کہ سوشلزم کی وادیوں میں پاکوبی کر چکے ہیں۔ محض کتابی معلومات نہیں ، عمل سے گزر کر اتفاق اور اختلاف کے خدوخال دریافت کئے ہیں۔

اردو میں علمی موضوعات پر تصنیف و تالیف کی روایت حیران کن ہے۔ اردو میں علمی نثر کا پودا سرسید احمد خان نے لگایا ۔ ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری نے اس کی بیاری کی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی ، غلام احمد پرویز اور مولانا وحید الدین خان جیسے قدر آور علما نے اردو زبان کو استدلالی نثر سے مالامال کیا۔ ہمارے زمانے تک آتے آتے سید علی عباس جلال پوری ، اکبر علی ایم اے ، جمال پانی پتی اور سید سبط حسن جیسے عبقری ہنرمندوں نے علمی مکالمہ ،سیاسی مؤقف اور معاشرتی مباحثے کو زندہ رکھا۔ سوچنا چاہیے کہ نصف صدی پہلے نشرواشاعت کے کیا وسائل دستیاب تھے۔ کتابوں کی تعداد اشاعت کیا تھی ۔ برقیاتی ابلاغ ،رسل و رسائی اور ابلاغ عامہ کی جو صورتیں آج دستیاب ہیں بیس برس پہلے ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس بیچ میں ایک ملال انگیز زاویہ یہ سامنے آیا کہ ماضی میں جو طبقہ اردو پڑھنے والوں کو جدید علوم سے روشناس کرتا تھا اس کی نئی نسل نے انگریزی کی راہ لی۔ اس پر کسی کی مذمت کرنا درست نہیں ۔ سادہ بات ہے کہ اگر عہد حاضر کا علمی مکالمہ انگریزی زبان میں

ہو رہا ہے تو ترقی یافتہ لغت میں بات کرنا کہیں زیادہ آسان ہے۔ اقبال نے اسی تناظر میں فارسی شاعری کا انتخاب کیا تھا۔ ترقی یافتہ زبان میں اظہار خیال سے آپ کا اپنا کام بھی کسی قدر آسان ہو جاتا ہے۔ آپ کو ایک کم ترقی یافتہ زبان میں خیالات کی ترجمانی کی دشواریوں سے نجات مل جاتی ہے اور پھر یہ کہ پڑھنے اور سننے والوں کا ایک وسیع حلقہ میسر آتا ہے۔ یہ تو طے ہو گیا کہ لکھنے والے کو زبان کے انتخاب کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اردو کو سمجھنے والے تیس کروڑ سے زیادہ لوگ ہیں ۔ نصف کے قریب ان میں سے ناخواندہ ہیں اور بہت بڑی تعداد میں اردو خواندہ افراد ایسے ہیں جو علمی موضوعات میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ اختلاف رائے کی ثقافت سے متعارف نہیں ہیں اور علمی تحقیق اور فکری جستجو کی بجائے پہلے سے قائم کردہ مفروضات اور تعصبات کا اثبات پڑھنا اور سننا چاہتے ہیں ۔ ایسے میں کوئی بہت ذمہ دار اور دور اندیش دانشور ہی ہو گا جو اس حقیقت کو مدنظر رکھے گا کہ انسانیت کے اتنے بڑے حصے کو علم کے نقشے سے منفک نہیں کیا جا سکتا۔

بہت کم عرصے میں ذیشان ہاشم نے اپنی لغت دریافت کی ہے۔ اپنے لہجے کو صیقل کیا ہے۔ موضوعات کا تنوع بڑھا ہے۔ ان کی علمی تگ و تاز کے تین اہم میدان ہیں ۔ معیشت ،فلسفہ سیاست اور معاشرت۔ وہ معیشت میں کھلی منڈی کی حمایت کرتے ہیں لیکن اسے پتھر کے بت کی طرح پوجتے نہیں ۔ ذیشان ہاشم منڈی کی معیشت سے وسیع تر انصاف کی نہر نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ انفرادی آزادیوں کے بہت بڑے علمبردار ہیں ۔ ان کی تحریروں کا ایک طالب علم ہونے کے ناتے میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ ذیشان ہاشم انصاف اور آزادی کے دو زاویوں کو متوازن کرنے کی مسلسل جدوجہد میں ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ ذیشان ہاشم اپنی بے پناہ ذہانت ، فکری توانائی ، ذہنی دیانت داری اور قابل رشک احساس ذمہ داری سے کام لیتے ہوئے نہ صرف یہ کہ عالمی سطح پر علمی مکالمے میں تخلیقی کردار ادا کریں گے بلکہ انکسار سے پیش گوئی کرتا ہوں کہ ذیشان ہاشم کا قلم اردو زبان کے پڑھنے اور لکھنے والوں کے لیے امید کی کرن ثابت ہو گا۔

وجاہت مسعود

تعارف

زوال آیا تو اتنا ہمہ گیر تھا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ سوشل سائنسز کے ارتقا سے بھی ہم محروم رہ گئے ۔ کتنی دلچسپ مگر افسوس ناک حقیقت ہے کہ مقدمہ ابن خلدون کے سوا ہمارے دامن میں کچھ بھی نہیں جبکہ فلسفہ تاریخ ، پولیٹیکل سائنس ، اکنامکس اور نفسیات مغرب میں الگ علوم کی شکل اختیار کر چکے ہیں ۔ یوں کے ان میں ہر روز نئے نظریات کا اضافہ ہو رہا ہے ۔ جس طرح انسانی زندگی انٹرنیٹ اور کلوننگ جیسی نئی ایجادات سے تبدیلی کا شکار ہو رہی ہے اسی تناسب سے سوشل سائنسز میں بھی تبدیلیاں آ رہی ہیں ۔

بد قسمتی صرف یہاں تک نہیں ، اس سے بہت آگے تک ہے ۔ علوم دوسروں کے پاس چلے گئے مگر بحث و تمحیص میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ۔ اردگرد پر غور کریں تو اس نتیجے تک پہنچیں گے کہ یہاں ہر دوسرا شخص مذہب کے علاوہ اکنامکس پر بھی اتھارٹی ہے ، علم سیاسیات پر بھی اور نفسیات پر بھی ۔ المیے کا تاریک ترین پہلو یہ ہے کہ یہ ساری بحث علم کے بغیر ہو رہی ہے ۔ غور کیجئے ، جن اصطلاحات کو ہم دن میں کئی بار "دانشورانہ" گفتگو کے دوران استعمال کرتے ہیں ، کیا ان کے حقیقی معانی سے واقف ہیں ؟ کیا ہمیں ایک لفظ کے لغوی معنی اور اصطلاحی معنی میں فرق معلوم ہے ؟ ہم تو آج تک "ربا" اور "سود" کا فرق نہیں جان سکے ۔ سود اور نفع کا فرق بھی نہیں معلوم کر سکے ۔ اس کے باوجود بزعم خود ہم "اسلامی معاشیات" کے سب سے بڑے مربی اور علم بردار ہیں ۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ پاکستانی سکالر محمد اکرم خان کی جس تحقیقی تصنیف "What is wrong with Islamic Economics" نے دنیا بھر کے تحقیقی مراکز میں ارتعاش پیدا کر رکھا ہے ، ہم اس سے آگاہ ہی نہیں ۔ محمد اکرم خان نے قرض (Loan) اور سرمایہ کاری (Investment) اور Financing کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے ۔

اس پس منظر میں ذیشان ہاشم کی یہ کتاب ہمارے لئے اتنی ہی اہم ثابت ہو گی جتنا کہ ایک بچے کے لئے نورانی قاعدہ ، جس کے بغیر وہ علم کے میدان میں آگے بڑھ ہی نہیں سکتا ۔ ہم ، دن رات لاحاصل بحث کرنے والوں کو پہلے تو ذیشان ہاشم بنیادی اصطلاحات کے حقیقی معنی سے روشناس کراتا ہے ۔ فرد ، سوسائٹی ، ریاست ، انفرادیت پسندی (Individualism) ، ویلیو سسٹم ، فری مارکیٹ ، پیداوار ، مطلق العنانیت (Authoritarianism) اور بے شمار دوسری اصطلاحات کے اصل مفہوم کو وہ مثالیں دے کر واضح کرتا ہے ۔ ہم سوشلزم ، کیپیٹلزم ، فری مارکیٹ ، مکسڈ اکانومی کے الفاظ بے محابا استعمال کرتے ہیں مگر کم ہی ان کے اصطلاحی مفہوم سے آشنا ہوتے ہیں ۔ ذیشان ہاشم کی کتاب پڑھ کر یہ سارے بنیادی الفاظ (Tools) درست معنی میں ذہن نشین ہوتے جاتے ہیں ۔

جدید انسان کی زندگی آسان بالکل نہیں – ستر سالہ سوویت یونین کے تجربے نے اور ماؤ کے چین نے انسان کی آنکھ کھول دی ہے – انسان کی فطرت میں مسابقت ہے ، یعنی مقابلے میں شریک ہو کر آگے بڑھنے کی کوشش کرنا – زندگی معیشت کے گرد گھومتی ہے – تعجب ہے کہ ہمیں تو یہ بتایا گیا تھا کہ غربت انسان کو کفر کے قریب لے جاتی ہے مگر ہمارے مذہبی رہنماؤں نے غربت کی شان میں وہ قصائد پڑھے کہ کار دنیا سے نفرت کو ثواب کا درجہ دے دیا گیا – اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی معیشت کے گرد گھومتی ہے – اب سوال اٹھتا ہے کہ معیشت آزاد ہو ، مادر پدر آزاد ہو یا ریاست کی زنجیروں میں بندھی ہوئی ہو ؟ ذیشان ہاشم نے اسی بنیادی سوال کا جواب دیا ہے – اس نے تاریخ کے ناقابل تردید حقائق سے ثابت کیا ہے کہ معیشت مادر پدر آزاد ہونی چاہئے نہ زنجیروں سے بندھی ہوئی – دو افراد دوڑنا چاہتے ہیں تو ایک کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تم اس رفتار سے زیادہ نہیں دوڑو گے – دوسری طرف انہیں کھائی میں گرنے کی آزادی دی جا سکتی ہے نہ ہی دوڑ کے دوران دوسروں کو روندنے کی – بس یہی وہ اصول ہے جس کے تحت فرد کی معاشی جدوجہد اور ریاستی کنٹرول کے درمیان توازن قائم رکھا جائے گا – Free will اور Incentives کی اہمیت کو سوویت تجربے نے کم کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی – ذیشان ہاشم بتاتا ہے کہ گورباچوف برطانیہ کی خوشحالی دیکھ کر حیران ہوا تو مارگریٹ تھیچر سے پوچھا کہ آپ کیسے جان لیتی ہیں کہ تمام شہریوں کو بہتر غذا میسر ہے ؟ تھیچر نے جواب دیا : " I don't know, Prices say it all" یہ ایک فقرہ کئی کتابوں پر بھاری ہے – اسی طرح وینزویلا کی مثال دے کر ذیشان نے جس طرح مضمرات کی طرف اشارہ کیا ہے ، گویا کوزے میں دریا کو بند کر دیا ہے –

ذیشان ہاشم کی یہ تخلیقی کاوش سنجیدہ حلقوں کے لئے ایک قیمتی اثاثے سے کم نہیں – اب دیگر اہل دانش پر لازم ہے کہ اس کام کو آگے بڑھائیں –

محمد اظہار الحق

اسلام آباد

دسمبر 2016.

پیش لفظ

انسان ایک دلچسپ مخلوق ہے ۔ پھر جتنا انسان خود دلچسپ ہے اتنا ہی اس کے اردگرد کی زندگی ؛ اس کا ماحول اور اس کی معاشرت ۔ اپنی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا ناقد بھی خود ہے ، معاشی زندگی میں انتہائی سنجیدہ ، چالاک اور ہوشیار بھی ....، اور ثقافتی زندگی میں اتنا نرم خو کہ ثقافت سے خود کو یوں ڈھانپ لیتا ہے کہ ہم آہنگ ہو جاتا ہے ۔ ممکن ہے ایک سیاسی جماعت کو ووٹ دے کر اپنے فیصلے پر پچھتائے مگر اگلی بار پھر اسی سیاسی جماعت کو ووٹ دیدے ۔ مگر ایسا کم ہی ممکن ہو پاتا ہے کہ کوئی شخص اس سے قرض لے کر کھا جائے اور وہ دوبارہ اسے قرض دیتا پھرے ۔ ..... تمام حقیقتوں میں سب بڑی حقیقت یہ ہے کہ ہم سب اپنی ذات کے خول میں بند ہیں اور اس کے دریچوں سے ہی اس دنیا کو دیکھتے ہیں ۔ جیسی نظر آتی ہے ، سمجھتے ہیں ایسی ہی ہے اور اسی تناظر میں اپنی زندگی کے فیصلے کرتے ہیں اور رویوں کو ترتیب دیتے ہیں ۔

انسان نے جب سے شعور کی آنکھ کھولی ہے ، اس کی پہلی سرگرمی اپنی خوراک لباس اور رہائش کی مادی جستجو تھی تو دوسری سرگرمی اپنے متعلق اور اپنے اردگرد کی دنیا سے متعلق "کون ،کیا، کیسے، کب اور کیوں"جیسے سوالات اٹھانا تھا ۔آج کا انسان لاکھوں سال کے ارتقاء کو اپنی جنیاتی ، علمی اور ثقافتی وراثت میں رکھتا ہے مگر مادی کامیابیوں کی جستجو اور متجسس ذہن کا سفر جاری ہے ۔مادی زندگی کی ان سرگرمیوں اور ان سوالات کے جوابات کی جستجو میں ہی دراصل انسانی شخصیت اور انسانی معاشرت سانس لیتی ہے ۔

زیر نظر کتاب فرد اور افراد سے متعلق ہے یعنی ہم سب سے متعلق ہے ۔ ہماری زندگی اور اس کی ضروریات و خواہشات سے متعلق ہے کہ ہم کون ہیں اور ہمارا ذاتی تشخص بطور انسان کیا ہے ؟ ہمارا معاشرہ کیسے وجود میں آیا اور اس کی سیاست و معیشت میں ہمارا کیا کردار ہے ؟ کیا ہمارا اس معاشرے اور اس کی سیاست و معیشت سے تعلق مبنی بر انصاف ہے یا ہم اس کے جبر کا شکار ہیں ؟متوازن زندگی کیا ہے ، متوازن سوسائٹی کسے کہتے ہیں اور یہ کیسے قائم ہو سکتی ہیں ؟ نیز ہم بہترین معیار زندگی کیسے حاصل کر سکتے ہیں ؟آخر یہ بہترین معیار زندگی ہے کیا ؟ آج مغربی اقوام دنیا میں سب سے ممتاز اور غالب ہیں اس کی وجوہات کیا ہیں اور وہ کیا بنیادی تصورات اور انسانی رویے ہیں جو ان کے سماج کی رگوں میں تازگی اور توانائی فراہم کر رہے ہیں اور ہم کیوں مسلسل اندھیروں کی نذر چلے آ رہے ہیں ؟ لبرل ازم کیا ہے اور اس میں اس کی لبرل معیشت یعنی نظام سرمایہ داری کا کیا کردار ہے ؟ آخر یہ نظام دو صدیوں سے طاقتور ، مستحکم اور ارتقاپسند کیوں ہے جبکہ اس کے مدمقابل کے دونوں نظام فاشزم اور سوشلزم کیوں وقت کے امتحان میں شکست کھا گئے باوجود یہ کہ انھوں نے شدید قسم کی آمریت بھی نافذ کی اور عوام سرجھکائے ظلم کی چکی میں پستے رہے ؟ دلچسپ بات یہ کہ یہ دونوں نظام ناکام ہوئے بھی تو اپنے داخلی تضادات کی وجہ سے جس میں سب سے مرکزی کردار معیشت نے ادا کیا- یہ سب اور ان سے متعلق تمام سوالات اس کتاب کا موضوع ہیں جنھیں فکری و عملی بنیادوں پر

سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مختصرا کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب فرد ، سوسائٹی ، ریاست ، معیشت اور ثقافت میں ہم آہنگی دریافت کرنے کی ایسی کوشش کا نام ہے جس میں تمام انسان سربلند ہوں ، اپنی زندگی کا وہ مقصد پا لیں جس کی انہیں آرزو ہے ..، اور مسرت سے ہمکنار ہوں ۔

کتاب جس اسلوب پر قائم ہے اس کے پہلے حصے میں فرد کی شخصی خصوصیات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے ، دوسرے حصے میں سوسائٹی کے بنیادی اور اہم پہلوؤں کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہوئے اس میں سیاست و ریاست کو بطور خاص موضوع بنایا گیاہے - تیسرے حصے میں مارکیٹ کی نظری بنیادوں ، اس میں قیمتوں کے نظام اور مقابلہ کی ثقافت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے -آخر میں قانون پر بات کی گئی ہے کہ کیسے سوسائٹی ، سیاست ، معیشت اور ثقافت کے بندوبست میں اس کا اہم کردار ہے اور سماجی انصاف کی کوئی ایسی صورت بھی ممکن ہے جس میں فرد کو بے بس کر کے اور اس پر آمریت نافذ کرکےان خاص مقاصد کو حاصل کیا جائے جو مراعات یافتہ طبقات کو مطلوب ہوں ؟

کتاب کو لکھنے کا مقصد اس کے علاوہ کوئی نہیں کہ اردو زبان میں موجود ،سماجی علوم کے ذخیرہ علم میں کچھ مفید اضافہ کیا جائے تاکہ مکالمہ کا سفر کامیابی سے آگے بڑھے – دوم فکر کی کلئیرٹی پیدا ہو – دیکھا یہ گیا کہ مارکیٹ اکنامکس پر جب تنقید کی جاتی ہے تو اس میں حقائق کے منافی ، مسخ شدہ معلومات اور نفرت انگیز پروپیگنڈہ کو بنیاد بنایا جاتاہے – اس تحریر کا مقصد ناقدین کے لئے بھی آسانی پیدا کرنا ہے کہ اگر وہ لبرل نظام و فکر پر تنقید کر رہے ہیں تو جان لیں کہ یہ اصل میں کیا ہے اور کن بنیادی تصورات پر قائم ہے تاکہ تعمیری تنقید کو سمت ملے – ساتھ ہی یہ کہ اردو قارئین یہ بھی سمجھ لیں کہ مغرب کی معاشی سیاسی اور سائنسی فتوحات ، ان کے عظیم الشان عقلی سفر کا نتیجہ ہیں جبکہ ہمیں سٹیٹس کو کی استبدادی قوتیں عقل کی کماحقہ تعظیم و اقتدا سے روکے ہوئے ہیں – اسی طرح جو لبرل ازم اور کیپٹل ازم کے معترف و ہمنوا ہیں وہ بھی مزید وضاحت سے سمجھ سکیں کہ انسان دوستی کی اقدار کس طرح ان کے اس پسندیدہ نظام کا خاصہ ہیں – تیسری اور سب سے اہم بات یہ کہ میری نظر میں انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ان امکانات کی تلاش میں ہے جس سے غربت اور غلامی (Lack of Freedom) کا خاتمہ ہو سکے – اس کتاب میں غلامی سے مراد آزادی کی عدم فراہمی ہے – جتنا ہم آزاد نہیں اتنا ہم غلام ہیں – ہماری زندگی ، سیاست ،معیشت اور سماج کے جن شعبہ جات میں ہماری آزادی کو تسلیم نہیں کیا جاتا اور اس پر قدغن لگائی جاتی ہے ان تمام میں ہماری حیثیت غلاموں کی طرح ہے – یہ کتاب غلامی کے تمام روایتی و جدید اقسام کے خلاف ایک بغاوت ہے اور یہ بات زیر بحث لاتی ہے کہ اس غلامی سے ہم کیسے نکل سکتے ہیں - یہ کتاب آزادی کے حصول میں پیش رفت کے رموز زیر بحث لاتی ہے اور خوشحالی کی سائنس سے متعارف کرواتی ہے – یہ کتاب ایک عاجزانہ پیشکش ہے -

اس کتاب کو لکھنے میں استاد محترم صلاح الدین شہبازی کی خاص مدد شامل رہی – انہوں نے پروف ریڈنگ میں باوجود ناسازی طبع کے خوب مدد کی اور اپنی شفقت بھری توصلہ افزائی سے اس کتاب کو لکھنے اور جلد سے جلد مکمل کرنے کی ترغیب دیتے رہے– میں تاعمر ان کا مشکور رہوں گا – ان کا میرے علمی و فکری سفر میں ویسا ہی کردار ہے جیسا مولوی میر حسن کا اقبال کی زندگی میں اہم کردار تھا – میں ان کی زندہ کتاب ہوں– میری زندگی میں ان کا کردار اس استاد کا سا ہے جو اپنے طالب علم کو تلاش علم کے تمام رموز سکھا کر اور اس کی روح کو تجسس سے لبریز کر کے علم کے میدان میں یہ کہہ کر چھوڑ دیتا ہے کہ جاؤ اپنا مقام خود تلاش کرو اور جب وہ طالب علم کوئی نیا کھوج لیتا ہے تو استاد مسکراتے ہوئے اور سینہ تان کر نہ صرف شاباش دیتا ہے بلکہ کھوجنے کے اس جاری عمل میں خود بھی شریک ہو جاتا ہے ......–پیارے دوست احمد علی کاظمی نے کچھ انگریزی مضامین کے تراجم میں بہت مدد کی – ان کی دوستی یقینا اعزاز بھی ہے اور فخر بھی – محترم علی سلمان کا خاص طور پر شکریہ کہ انہوں نے موقع دیا کہ PRIME کے پلیٹ فارم پر کچھ اچھا پیش کروں – امید ہے ان کا راقم پر یہ اعتماد قائم رہے گا –معیشت دان دوست ڈاکٹر محمد ناصر کا بھی ممنون ہوں کہ ان کی ترغیب و تلقین اس کتاب کو لکھنے میں کام آئی – اور آخر میں اپنے استاد گرامی جناب وجاہت مسعود کا بے حد شکرگزار ہوں کہ ان کی پرخلوص دوستی ، شفقت اور مدد کے بغیر یہ کام ممکن نہ ہو پاتا - اس کے علاوہ ان تمام دوستوں کا بھی شکریہ جنھوں نے توصلہ افزائی کی اور بار بار یاددہانی کراتے رہے کہ کتاب جلدی مکمل کی جائے – سوشل میڈیا کے دوست بھی یقینا اہم اثاثہ ہیں –

ذیشان ہاشم

(دبئی – یو اے ای)

دسمبر 2016

Zeeshan.hashim11@gmail.com

ہم سب منفرد ہیں

ہم چار بھائی ہیں اور ایک جان سے پیاری بہن ہے - ایک ہی گھر میں اور ایک ہی ماحول میں پلے بڑھے ہیں - جنیاتی وراثت اور تربیت کے ماحول میں اشتراک کے باوجود ہم میں ذہنی رجحان ، صلاحیت ، جذباتی رویوں ،اور پسند و ناپسند کے معاملہ میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے -آخر اس کی کیا وجہ ہے ؟ کیا یہ معاملہ صرف ہمارے گھر تک محدود ہے یا ہم سب کے گھروں میں بھی تنوع کی یہی صورتحال پائی جاتی ہے ؟ ہم سب اس پر اتفاق کریں گے کہ یہ تنوع تقریبا ہر گھر میں پایا جاتا ہے -

ہم میں سے ہر فرد لاثانی ہے ، کوئی بھی حقیقتا کسی کی کاربن کاپی نہیں - ہم میں سے ہر ایک کی ذہنی قابلیتیں و صلاحتیں منفرد ہیں - سوچنے و سمجھنے کا انداز جدا جدا ہے اور ہمارے جذباتی رویوں میں بھی یکسانیت نہیں پائی جاتی - موسیقی ، آرٹ ، علم و ادب سمیت ان گنت چیزوں میں یہ خوبصورت اختلاف موجود ہے - ایک ہی گھر میں ایک بچہ اگر سائنس میں دلچسپی رکھتا ہے تو اس کا دوسرا بھائی کھیلوں کا شیدائی ہے تو عین ممکن ہے کہ تیسرا بھائی ایک اچھا آرٹسٹ ہو - دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ یہ خصوصیت جامد بھی نہیں بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی اور ترقی آتی رہتی ہے -

انسانی فطرت سے یہی مراد ہے کہ ہم میں سے ہر ایک پیدائشی طور پر منفرد ہے ، اسی سبب سے ہم میں سے ہر ایک کو فرد کہا جاتا ہے - اگر ایک گھر میں دو بچوں میں سے کسی ایک کو خوراک میں بریانی پسند ہے اور دوسرے کو چکن کڑاہی تو یہ خامی نہیں بلکہ انفرادیت کا اظہار ہے - یہ فطری ہے - یہ پیدائشی خصوصیت ہے- نیچرل سائنس کے اساتذہ کہتے ہیں(1) کہ ارتقاء کا سبب دراصل یہی تنوع ہی ہے ، اور اسی بات کی سوشل سائنسز کے اساتذہ بھی اپنے اپنے شعبہ جات میں تصدیق کرتے ہیں - یونیورسٹی آفIllinoisکے استاد Jerry Hirsch اپنی تحقیقات کے نتائج میں لکھتے ہیں کہ انسانی رویوں کی سائنس (Behavioral Science) کی رو سے یہ لازم ہے کہ دو مختلف نسلوں کے دانشور ایک دوسرے سے اپنی آراء میں اختلاف کریں گے ، جس کے بہت سارے اسباب میں سے ایک اہم سبب انسان میں جنیاتی تفردات (inborn differences) بھی ہیں–(2)

فرد کی انفرادیت دو اسباب کی بنیاد پر ہے - ایک ہے اس کا حیاتیاتی وجود اور دوسرا ہےاس کا ذہن- ہم میں سے ہر ایک اپنا اپنا دل ، اپنا اپنا معدہ ، اپنا اپنا نظام دوران خون ، اعضاء کا نظام ، اعصابی نظام اور اپنا اپنا نظام تنفس رکھتا ہے – یہ اعضاء و نظام اپنی خصوصیات میں ہر ایک کے اپنے اور الگ ہونے کی بنا پر دوسرے سے مشترک نہیں ہو سکتے - میرا حیاتیاتی وجود مجھے ایک طرف اگر مکمل کر رہا ہے تو دوسری طرف مجھے دوسروں سے یکتا اور جدا کر رہا ہے - ہمارے حیاتیاتی وجود کی سائنس (بائیولوجی) کہتی ہے کہ تمام میملز میں جنیاتی طور پر اتنی انفرادیت

پائی جاتی ہے کہ اس فیملی کے کسی بھی جاندار کی حیاتیاتی خصوصیات کے اسباب کو قطعی طور پر بیان کرنا بہت مشکل ہے اس کی وجہ ہر فعل کے سبب میں کثیر جنیاتی خصوصیت (Multiple gene characteristic) کا پایا جاناہے (3) – یاد رہے کہ انسان تمام میملز میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ مخلوق ہے – (4)

دوسرا بڑا سبب میرا ذہن ہے جس میں ہے ہی انفرادیت - ہم ذہنی طور پر ایک دوسرے سے منفرد ہیں - عموما یہ دیکھا گیا ہے جسے سماجی نفسیات کی سائنس بھی ثابت کرتی ہے کہ ہمارے معاشروں میں تنوع کے بڑے اسباب جیسے خود پسندی (Self Interest) اور تعلیم کے علاوہ سب سے اہم ہمارا ذہن ہے – (5) ایک گروہ میں کسی ایک خاص موضوع کا سوال اگر اٹھایا جائے تو یہ ناممکن ہے کہ سو فیصد ہی اس سے اتفاق کریں اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ سو فیصد اس سے انکار کریں - اتفاق و اختلاف کا مادہ جہاں ایک طرف ہمارے ارتقاء میں مددگار ہے تو دوسری طرف آمریت کے لئے سب سے بڑا چلینج بھی یہی ہے - میں ہوں اور میں نہیں مانتا کی فطرت ہی دراصل آزادی پسندی کو بنیاد دیتی ہے - کسی طبعی وجود کو روٹی کے چند ٹکڑے کھلا کر اور اسے مکان و کپڑے کی ضمانت دے کر تو آپ مطمئن کر سکتے ہیں مگر ذہن کی وسعتیں تو بے کراں ہیں ، آزادی تو اس کا جوہر ہے ، اور تنہائی پسندی تو اس کی صفت ہے-

انسانی ذہنی خصوصیات میں بھی موازنہ ممکن نہیں - مثال کے طور پر ذہانت ایک فرد کی خوبی بھی ہے اور اس کی شخصی خصوصیت بھی - ہم جانتے ہیں کہ آئن سٹائن بھی ذہین تھا اور شیکسپیئر بھی - کیا یہ سوال ممکن ہے کہ ان دونوں میں سب سے زیادہ ذہین کون تھا ؟ جواب ناممکن ہے - شیکسپیئر کا تعلق زبان و ادب سے ہے جبکہ آئن سٹائن زبان سیکھنے کے معاملہ میں انتہائی سست تھا - اور ریاضی کے معاملہ میں تو بقول پروفیسر ولیم فلپس وہ کافی کمزور تھا - یہی معاملہ شیکسپیئر کے ساتھ ہے ، پیچیدہ نظریاتی و عملی سائنسز میں اس کا رجحان کمزور ہے - دونوں ذہانت میں مشترک ہونے کے باوجود رجحانات میں مختلف ہیں ، کیونکہ دونوں منفرد ہیں - رجحانات میں یکسانیت بھی دو افراد کے درمیان اپنے مظاہر میں مشترک نہیں ہو سکتی - آئن سٹائن اور نیوٹن کا اگر موازنہ کیا جائے تو دونوں کے درمیان سوچ و فکر اور ذہانت کے معیار میں کافی تفرد پایا جاتا ہے - اس کی وجہ بھی شخصیت میں انفرادیت ہے-

سقراط سچ کہتا ہے کہ اگر آپ اپنے اردگرد کی ہرچیز سے واقف ہیں مگر خود سے نہیں تو یہ مضحکہ خیز ہے – راقم اسے ایک مختلف زاویہ سے بیان کرنے کی جسارت کرتا ہے - اگر آپ نیچرل و سوشل سائنسز کی بدولت ہر چیز سے واقف ہیں مگر ایک فرد کی انفرادیت اور اس کے نفسیاتی مطالعہ سے بے خبر ہیں تو یقینا یہ مضحکہ خیز ہے - اگر آپ نہیں جانتے کہ اصل میں فرد کیا ہے ، اس کی انفرادیت کے کون کون سے مظاہر ہیں ، اس کے ان گنت رجحانات کی تشکیل کے کون کون سے اسباب و عوامل ممکن ہیں ، مختلف ترغیبات و محرکات کا اس پر کیا اثر

ہے ، وہ چاہتا کیا ہے اور کس چیز کی تلاش میں ہے ، تب تک نہ معیشت سمجھی جا سکتی ہے ، نہ معاشرت ، نہ سیاست ، اور نہ ہی تاریخ و مذاہب - انسانی نفسیات کا مطالعہ انسانی زندگی اور اس کی دنیا کو سمجھنے کے لئے ازحد ضروری ہے -

حقیقت یہی ہے کہ انسانی فطرت کوئی جامد شے نہیں اور نہ ہی یہ کسی متعین خصوصیات کا مجموعہ ہے جو تمام فراد میں ایک مخصوص حد اور مقدار کے اندر ایک مخصوص حالت میں پائی جاتی ہو۔ ہم میں سے ہر ایک کی فطرت منفرد ہے اس میں یکسانیت نہیں بلکہ اس میں تنوع ہے۔

یکساں اور جامد فطرت صرف بے جان مادی اجسام کا خاصہ ہے۔ انسان دوسری تمام مخلوقات سے فطرت کے باب میں منفرد ہے اس نوع انسانی کی تمام اکائیاں یعنی انسان اپنی اپنی فطرت میں جدا گانہ خصوصیات کی حامل ہیں۔یہی وجہ ہے کہ سائیکالوجی، علم کے دوسرے مضامین فزکس ، کیمسٹری ،اور بیالوجی کی طرح ترقی یافتہ شکل میں ابھی تک سامنے نہیں آسکی کیونکہ ایک فرد یا افراد کا ایک گروپ (sample) تمام انسانوں (population) کی مکمل اور پرفیکٹ نمائندگی (represent) کر ہی نہیں سکتا۔یوں کسی ایک فرد یا ایک گروپ کے مطالعہ کو ساری نوع انسانی پر جنرلائز (Generalize) نہیں کیا جاسکتا۔

مثال کے طور پر پانی کے باب میں ہم جانتے ہیں کہ یہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کی ایک مخصوص مقدار کا مرکب ہے اور جب پانی کو مختلف کیمیائی عناصر سے ملایا جائے گاتو اس کا ایک متعین کیمیائی تعامل ہے اور ایک مخصوص درجہ حرارت پر اس کی مخصوص خصوصیات ہیں ۔پانی کا ایک مالیکیول کرہ ارض پر پانی کے تمام مالیکیولز کی اپنی خصوصیات میں نمائندگی کرتا ہے چاہے وہ کہیں بھی پائے جاتے ہوں ۔ان سب کی فطرت میں یکسانیت ہے۔انسانوں کے معاملے میں ایسا نہیں۔ایک فرد کا رویہ اس کا ذاتی ہے ۔ہر فرد کی انفرادیت میں ہی اس کی شناخت ہے۔ یہ درست ہے کہ تمام انسانوں میں کچھ خصوصیات ایسی بھی ہیں جو مشترک ہیں اور ان مشترک خصوصیات کی بنیاد پر ہی ہم اس کتاب میں اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔
ہماری زندگی کے دو بڑے نجی مقاصد ہیں:

۱۔خوشی کا حصول

۲۔اپنی زندگی کی نشونما اور اس کی خوشحالی (well being)

اس کے علاوہ بطور ایک مذہبی انسان کے ایک خدا یا دیگر خداؤں کی خوشنودی بھی ہماری زندگی کا نجی مقصد ہوسکتا ہے۔

ذاتی خوشی کا حصول ایک بہت کٹھن کام ہے۔ اس کے لیے ایک متعین راستہ یا فارمولا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی ایسا پھل دنیا میں موجود ہے جو اگر کسی کو کھلایا جائے تو وہ خوشی سے مکمل ہو جائے گا۔ خوشی کے حصول میں فرد سے فرد متنوع ہے۔ ایک فرد کو اگر خوشی کسی

ایڈونچر سے مل رہی ہے تو ممکن ہے دوسرے فرد کو خوشی کسی اچھی فلم دیکھنے سے ملے۔تیسرے فرد کی خوشی تفریحی مقام کی سیر ہوسکتی ہے تو چوتھے فرد کے لیے خوشی اچھی کتابوں کے مطالعے یا مذہبی عبادات میں بھی ہوسکتی ہے ۔قصہ مختصر یہ کہ اس میں ورائٹی ہے ۔اور اس کا حصول محض آزادی میں پوشیدہ ہے ۔اس چیز کی آزادی کہ ہم جس چیز میں خوشی پائیں اسے pursueکر سکیں (Freedom to pursue happiness) ، بشرطیکہ دوسرے افراد کی آزادی بھی متاثر نہ ہو۔ خوشی ہر انسان کے ذاتی حق انتخاب میں ہےاور اس حق انتخاب کو عمل میں لانے کے لئے خوشی کے امکانات کی تلاش و تسخیر کی آزادی کی بھی اشد ضرورت ہے۔

ہماری زندگی اور معاشیات کا مقصد–

ہم کون ہیں ، کیا ہیں ، اس کائنات میں ہمارا کیا مقام ہے ، فطرت سے ہمارا کیا تعلق ہے اور ہماری زندگی کے کیا مقاصد ہیں ؟ کون کون سی مادی ضروریات اور مادی خواہشات ہیں ؟ زندگی کی ان بنیادی ضروریات و خواہشات اور مقاصد کی بہترین تکمیل کا کوئی ایک متعین ذریعہ ہے یا ان گنت راستے ہیں ؟ سوسائٹی اور ریاست کیا ہیں ، کیوں ہیں ، ہمارے ساتھ ان کا کیا رویہ ہے اور ہمیں ان کے ساتھ کیا رویہ رکھنا چاہئے ؟ یہ وہ چند سوالات ہیں جو ہم بطور انسان عموما سوچتے اور انہی کے مطابق اپنے رویوں کو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں –اسی طرح یہی وہ بنیادی سوال ہیں جو ہماری سوشل سائنسز کا بھی مرکزی موضوع ہیں –
اکنامکس بھی ان میں سے ایک ہے – اسے بھی فرد کو بطور پروڈیوسر اور کنزیومر سمجھنا ہوتا ہے کیونکہ بغیر فرد (Individual) کو سمجھے اس کے رویوں کو ایک کل میں (Macroeconomicsکی سطح پر) سمجھنا ناممکن ہے –

اکنامکس میں ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ وہ کون ساپیمانہ ، طریقہ یا معیار ہے جس کی بنیاد پر ہم سمجھ سکیں کہ ایک معیشت کیا واقعی بہتر حالت میں ہے اور مزید بہتری کی جانب گامزن ہے ؟ یا دوسرے الفاظ میں ، ترقی دراصل کسے کہتے ہیں جس کی تمام افراد اور ممالک جستجو کرتے ہیں اور اس مقام پر پہنچنے کے لئے اپنی تمام تر توانائیاں خرچ کی جاتی ہیں ؟

ان میں سے ایک معروف اصطلاح جی ڈی پی ہے – جی ڈی پی ایک ملک کی کل قومی پیداوار کا نام ہے – اسی طرح اکنامکس کے اصولوں کی رو سے کل قومی پیداوار سے مراد کل قومی آمدن بھی ہے (6)– یوں ایک ملک جتنا زیادہ پیدا کر رہا ہو گا اس سے مراد یہ ہے کہ اس ملک کے شہری اتنی زیادہ دولت کما رہے ہیں – معیشت کا یہ سب سے روایتی Indicator (اشاریہ) ہے - جب کل قومی پیداوار یعنی جی ڈی پی میں اضافہ ہو رہا ہوتا ہے تو معیشت دان خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور جب اس میں کمی آ رہی ہوتی ہے تو وہ نہ صرف فکر مند ہو جاتے ہیں بلکہ ایک ماہر طبیب کی طرح ان اسباب کی تلاش شروع کر دیتے ہیں جو ان کے خیال میں اس گراوٹ کی وجہ ہو سکتے ہیں –

یاد رہے کہ صرف جی ڈی پی پر ہی توجہ مرکوز رکھنے سے مراد یہ ہے کہ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی زندگی میں سب سے اہم دولت ہے جبکہ باقی چیزیں بہت بعد میں آتی ہیں – اسی بنیاد پر کچھ لوگوں کا یہ کہنا بھی ہے کہ صرف دولت ہی سب کچھ ہے – کچھ سمجھتے ہیں کہ اگر دولت ہے تو باقی آسائشیں اور راحتیں بھی حاصل کی جا سکتی ہیں -

یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے کہ اگر مادی ضروریات پوری نہ ہوں تو زندگی کا ابتدائی قاعدہ شروع کرنا بھی محال ہے – مادی ضروریات اگر پوری نہ ہوں تو زندگی کی بقا ناممکن ہے – کیا یہ اسی سبب سے نہیں کہ دنیا کے دس امیر ممالک میں زندگی کی اوسط شرح (Life Expectancy) غریب ملکوں کی نسبت پچیس سال زائد ہے – (7) اگر آپ کے پاس معقول آمدن ہو گی تب ہی آپ تعلیم صحت بہترین خوراک اور آرام دہ گھر پر خرچ کر سکیں گے ، اور کتب بینی ، شاعری و موسیقی جیسے مشاغل میں حصہ لے سکیں گے –

مگر محض دولت ناکافی ہے – صرف دولت سے زندگی کے تمام مقاصد کی تکمیل ممکن نہیں – صرف دولت سے خوشی کی منزل نہیں حاصل کی جا سکتی – ولیم ایسٹرلی ، نیو یارک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور دنیا میں ایک معروف نام ہے – انہوں نے 1960 سے 1990 کے درمیان کے اعدادوشمار لئے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ معاشی گروتھ یعنی ایک ملک میں کل دولت کے اضافہ کا وہاں کے شہریوں کے معیار زندگی میں اضافہ سے کوئی تعلق ہے یا نہیں ؟ معیار زندگی سے متعلق انہوں نے 81اشاریے (Indicators) لئے – انہوں نے یہ معلوم کیا کہ دولت میں اضافہ کا اثر کل اکاسی اشاریوں میں سے محض 32 پر ہے – یعنی ہمارے معیار زندگی پر اثر انداز ہونے والے کل اکاسی عوامل میں سے بتیس ایسے ہیں جن میں بہتری ہماری دولت میں اضافہ کے سبب ہے (8)– یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ صرف دولت کافی نہیں مگر یہ بھی ہے کہ بغیر دولت کے کچھ بھی نہیں –

مان لیا کہ دولت یا آمدن یا جی ڈی پی معیار زندگی کو جانچنے کا حتمی اور مکمل پیمانہ نہیں ، اب سوال یہ بھی ہے کہ کیا ہم کوئی اور بہترین متبادل بھی رکھتے ہیں ؟ اس سلسلے میں کچھ مزید متبادل بھی متعارف کروائے گئے ہیں جیسے :

- **دنیا میں خوشی کی رپورٹ (World Happiness Report)** : یہ اشاریہ بھوٹان میں ترتیب دیا گیا تھا اور اس کی رو سے ڈنمارک دنیا میں نمبر ون ہے – دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ صف اول کے دس خوش ترین ممالک میں وہی ممالک ہیں جو دولت کے اعتبار سے بھی ترقی یافتہ میں آتے ہیں – پاکستان اس رینکنگ میں 92نمبر پر آتا ہے – (9)

یقینا خوشی ایک بہترین معیار ہے – آپ اپنے طرز زندگی سے مطمئن ہوں گے تب ہی خوش ہوں گے – اگر مادی ضروریات پوری نہیں ہو رہی ہیں تو خوشی کاہے کی ؟ اگر غیر مادی آرزوں کی جستجو میں ناکامی ہے تو یقینا مایوسی کا ہی غلبہ ہو گا – مگر سوال یہ

ہے کہ فرد سے فرد خوشی کا معیار ، شدت ، اور کیفیت مختلف ہوتی ہے – ہم کیسے معلوم کر سکیں گے کہ کون خوش ہے اور کون خوش نہیں – فرض کیا پاکستان کے کیس میں ہم کیسے جان سکیں گے کہ بیس کروڑ عوام میں سے کون خوش ہے اور کون نہیں ، کون زیادہ خوش ہے اور کون کم ؟ اسی طرح کسی دوسرے ملک کے موازنہ میں ہم زیادہ خوش ہیں یا کم خوش ہیں ؟ یوں یہاں بھی وہی measurement (اعداد و شمار کے حصول اور تجزیہ) کا مسئلہ ہے جو بقول نوبل انعام یافتہ معیشت دان Angus Deaton معیشت کا سب سے بڑا مسئلہ ہے –

خوشی کو جانچنے کا معروف طریقہ سروے ہے – ہم لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ خوش ہیں یا نہیں ؟ اس طریقہ کار میں ایک بڑا مسئلہ ہے وہ ہے رپورٹنگ – ماہرین نفسیات کے مطابق لوگ اپنی خوشی کو رپورٹ کرنے میں ناکام رہتے ہیں – اگر وہ کہہ دیں کہ ہاں ہم خوش ہیں تو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ کتنا خوش ہیں ؟ اگر کم خوش ہیں تو کتنا کم خوش ہیں ؟ سائیکالوجی کی اصطلاح میں اس مشکل کو "adaptive preferences" کہتے ہیں (10)

ماہرین نفسیات کے مطابق ہم خوشی کے مراحل درجہ بدرجہ طے کرتے جاتے ہیں – مثال کے طور ایک فرد جو بے روزگار ہے اور اسے بھوک کے مسائل کا سامنا ہے ، جیسے ہی اسے نوکری ملے گی وہ ایک دم سے خوشی و مسرت سے لطف اندوز ہو گا – مگر جیسے ہی وہ ایک با روزگار شہری بن جائے گا اس کی خواہش ہو گی کہ وہ مزید ترقی کرے ، اب اس کی خوشی اس اگلی منزل کے حصول میں ہے – جتنا اگلی منزل تک پہنچنے میں زیادہ وقت لگے گا اتنا ہی خوشی کی شدت میں کمی آتی جائے گی – اس لئے سروے کے نظام پر ایک تنقید یہ کی جاتی ہے کہ جب کسی فرد سے اس کی خوشی کی کیفیت کے بارے میں پوچھا جاتا ہے ، اس وقت نہیں معلوم کہ وہ کسی نفسیاتی کیفیت میں ہوتا ہے – مثال کے طور پر ایک شخص جو دفتر سے تھکا ہارا گھر لوٹ رہا ہے جب اس سے پوچھا جائے گا کہ جناب کیا آپ خوش ہیں تو ممکن ہے وہ جواب دے : بکواس ہے یہ زندگی – اب اسی فرد سے جب وہ اتوار کے دن اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزار رہا ہو آپ پوچھیں کہ جناب کیا آپ خوش ہیں تو ممکن ہے اس کا جواب ہو جی ہاں ، بہت خوش ، میری فیملی میرے ساتھ ہے اور میں نے بھرپور نیند کے مزے لئے – (11)

میرے اپنے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے کہ آفس سے چھٹی کے دن میں فلمیں دیکھنا ، سونا ، اور گھر والوں سے گپ شپ کو ترجیح دیتا ہوں میرے لئے خوشی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے مگر میرے اکثر قریبی دوست چھٹی کے دن گھر سے باہر سیر و تفریح اور آوارہ گردی میں خوشی محسوس کرتے ہیں اور مجھے تنہائی پسند جیسے خطاب سے چڑاتے ہیں –

- ترقی کو ناپنے کا ایک اور ذریعہ "**Personal Well-being**" بھی ہے جسے برطانوی حکومت سالانہ بنیادوں پر شائع کرتی ہے –

- ہیومن ڈویلپمنٹ انڈکس بھی اس سلسلے میں ایک بہترین متبادل ہے مگر اس کی خوبیاں اور خامیاں بھی بہت ساری ہیں –

اب سوال یہ ہے کہ ان میں سب سے بہترین کون سا طریقہ ہے ؟

میرے خیال میں یہ سب طریقے یا اشارے اپنے مخصوص پہلؤوں کی محدود خبر دیتے ہیں – جی ڈی پی میں بہت سی خامیاں سہی مگر تمام درج بالا متبادلات میں سب سے بہتر macroenomic متبادل وہی ہے – مگر ٹھہرئے اس سارے معاملہ کو بجائے اس کے کہ ایک کل میں دیکھیں ، ایک دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں جسے مشہور فلسفی معیشت دان امرتیا سین ہمارے لئے پیش کرتے ہیں – وہ متبادل ہے capibility :انفرادی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے ترقی کو جانچنے کا اشاریہ – یاد رہے کہ امرتیا سین ہیومن ڈویلپمنٹ انڈکس کی تیاری میں پاکستانی معیشت دان ڈاکٹر محبوب الحق کے ساتھی تھے اور وہ خود ہیومن ڈویلپمنٹ انڈکس کو نامکمل اور ناکافی سمجھتے ہیں جس میں ان کے خیال میں بہت ساری خامیاں ہیں – (12)

سوال یہ ہے کہ سین کی مجوزہ Capibility کیا ہے ؟ سین لکھتے ہیں :

A capability is something that people have reason to value. (13)

اس سے مراد ویسا طرز زندگی ہے جیسا لوگ اپنے لئے پسند کرتے ہیں –جیسا اپنی سوچ و فہم ، معقولیت پسندی (Reasoning)، اور آزادی ارادہ و عمل سے وہ جینا چاہتے ہیں –

سین لکھتے ہیں :

انسانی صلاحیتوں و قابلیتوں کا شمار ناممکن ہے – لمبی مگر صحت مند زندگی کے مواقع ، سیاسی سماجی اور معاشی زندگی میں حصہ لینے کی آزادی ، اپنی آرزوؤں کی پرامن جستجو میں آزادی سمیت تمام امکانات کی تسخیر کی آزادی جسے فرد اپنی سوچ و فہم ، معقولیت پسندی (Reasoning)، اور آزادی ارادہ و عمل کی مدد سے جستجو کرنا چاہے (14) – ان صلاحیتوں و قابلیتوں میں سے کس صلاحیت و قابلیت کو اسے pursue کرنا چاہیئے یہ کسی سماجی ادارے کا کام نہیں بلکہ یہ صرف فرد کا شخصی انتخاب ہے – یہ اس کا حق ہے کہ اپنی زندگی کے جملہ فیصلے وہ خود کرے ، جسے حق انتخاب (Freedom of choice) کہتے ہیں - اب یہ خود فرد پر منحصر ہے کہ وہ طے کرے کہ وہ کس معیار ترقی کو اپنے لئے پسند کرتا ہے نہ کہ کوئی اور بیرونی و آمرانہ قوت اسے بتائے کہ کس معیار ترقی کی اسے جستجو کرنی چاہیئے – اس سلسلے میں سین مواقع کی مساوات اور مقابلہ کی ثقافت میں مواقع کی آزادی اور کم سے کم حکومتی مداخلت کو لازم قرار دیتے ہیں – ان کے خیال میں حکومت کا کام اس سارے معاملہ میں سہولت کار کا ہے جو ان تمام رکاوٹوں کو دور کرے جو مواقع کی مساوات اور مقابلہ کی ثقافت میں حائل ہیں – (15)

سین کہتے ہیں کہ معیشت دانوں کو بجائے جی ڈی پی یا کسی اور indicator کے زیادہ سے زیادہ شخصی آزادی یعنی فریڈم کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے – آمدن یعنی دولت بہترین زندگی کی یقینا ایک اہم ضرورت ہے مگر صرف یہی کافی نہیں – سونے کے پنجرے میں ترقی نہیں – اصل چیز آزادی ہے ، انتخاب ہے ، اور امکانات کی تسخیر کے مواقع ہیں –(16)

یہی سبب ہے کہ امرتیا سین کے ہاں ترقی کا مطلب بھی آزادی ہے – وہ آزادی کو ہی آزادی کی منزل کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں – ان کے الفاظ میں جہاں زیادہ فریڈم ہو گا وہاں زیادہ ترقی ہو گی اور جہاں کم فریڈم ہو گا وہاں کم ترقی ہو گی– یوں وہ مختلف معاشروں اور ممالک میں موازنہ کا معیار جی ڈی پی نہیں بلکہ آزادی قرار دیتے ہیں – سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک وہ ہے جہاں سب سے زیادہ فریڈم ہے ، مواقع کی مساوات اور مقابلہ کی ثقافت پائی جاتی ہے – اس سلسلے میں ان کی بہترین کتاب "ترقی بطور آزادی (Development as freedom) اس پورے موضوع کا مکمل تفصیل سے احاطہ کرتی ہے –(17)

اسی طرح خوشی کا بھی کوئی واحد ذریعہ ممکن نہیں۔ہم خوشی کے حصول میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں،اور دستیاب ذرائع کے پابند بھی ہیں ۔مثال کے طور پر ایک غریب افریقی یہ سمجھتا ہے کہ اگر تین وقت کی روٹی اور اچھا کپڑا اسے مل جائے تو یہی اس کی خوشی کے لیے بہت ہے۔جبکہ ایک امریکی اس سے بھی کئی گنا آگے کی آرزوئیں رکھتا ہے : مخصوص ماڈل کی گاڑی، اتنے بیڈ رومز کا گھر،فلاں جاب یا کاروبار وغیرہ۔

ہم جس دنیا میں جی رہے ہیں یہ اپنے عوامل و مظاہر میں انتہائی پیچیدہ ہے۔ ہمارے زندگی پر ان گنت عوامل و عناصر اثر انداز ہورہے ہیں۔ ان میں سے کچھ عناصر ہمارے لیے موافق ہیں جبکہ کچھ مخالف بھی ہیں۔ہمیں اپنی بقا کے اس سفر میں ایسے دانشمندانہ اور سنجیدہ فیصلے کرنے ہوتے ہیں جو ہماری زندگی کو متوازن رکھ سکیں۔ اپنی خودی میں توازن کی جدوجہد ہر فرد میں ذاتی ہے اور اس کا اپنا حق انتخاب اور قوت فیصلہ اس میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔خودی کے اندر توازن کی یہ کوشش بھی آزادی کے بغیر ممکن نہیں اور اس خود انتظامی میں بھی ہمارے بڑے مقاصد عام طور پر دو ہی ہوتے ہیں۔ ذاتی خوشی کاحصول اور اپنی زندگی کی بقاء اور اس کی بھر پور نشودنما۔

ہماری دوسری ضرورت یہ ہے کہ ہمیں اپنی زندگی کو ہر حال میں قائم رکھنا ہوتا ہے ایک بھر پور انداز سے ، اور وقت کے ساتھ ساتھ اسے نشونما دینی ہوتی ہے۔ ہماری یہ ضرورت اپنی اساس میں مادی ہے، اسے دولت کی ضرورت ہے جسے ہماری بنیادی ضروریات پر خرچ کیا جا سکے ۔اسے آسائشوں (comfort) کی ضرورت ہے کہ محنت سے تھکا ہارا وجود جو دولت کے حصول میں مصروف رہا ، سکون و راحت پائے۔یوں ان ضروریات و خواہشات کی بخوبی تکمیل میں اکنامکس (معیشت) کی اہمیت مرکزی ٹھہرتی ہے۔

صحت مند معاشی بندوبست وہ ہے جس میں تمام انسان نہ صرف اپنی مادی ضروریات وخواہشات کی تکمیل کر سکیں ، بلکہ اس میں ہماری ذاتی صلاحیتوں کا بھی بھر پور اظہار ہو ،ہم جو حاصل کرنا چاہیں اسے ایک جائز و آزاد طریقوں سے حاصل کر سکیں ،اس میں ہماری آزادی کی بقا ہو اور ہماری شخصیت کی نشودنما کے وسیع تر امکانات پائے جاتے ہوں۔

انفرادیت پسندی پر مبنی اسلوب مطالعہ

اگر ہم اپنا فوکس سماج کی بجائے فرد پر مرتکز کرتے ہیں تو بہترین نتائج کا حصول آسان ہے ۔ محض سماج کو براہ راست فوکس کرنے کا کوئی مطلب نہیں سوائے اس کے کہ آپ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں – تیر نشانے پر لگ گیا تو صحیح ورنہ ضائع ۔آئیے دو اہم مثالوں سے اسے سمجھتے ہیں–

1) ایک کمرہ جماعت میں تعلیم و تربیت کے دو اسلوب ہیں ۔ پہلا اسلوب پوری جماعت کو بطور ایک کل کے فوکس کرتا ہے ۔ دوسرا اسلوب ہر طالب علم کو ایک مکمل و منفرد اکائی سمجھتے ہوئے ہر ایک کے ذہنی رجحان کو اہمیت دیتا ہے ۔ پہلے رجحان میں ساری کی ساری توجہ پوری کلاس کو ایک ہی نفسیات سے سمجھنے اور طلباء کی تربیت کرنے کا نام ہے جبکہ دوسرے رجحان میں ایک استاد ہر طالب علم کے ذہنی رجحان کو پہچاننے ، ترقی دینے ، اور بہتر استعمال میں لانے کی جستجو میں ہوتا ہے ۔ نتیجہ کیا ممکن ہے اور کس اسلوب کے نتائج بہتر ہوں گے ؟ یقینا دوسرے اسلوب کے جس میں آزادی ہی میں ہے ، صلاحیتوں کی دریافت اور اس کی نشودنما ہے اور اسی میں ہی کامیابی ہے– ہر طالب علم مستقبل کا ایک روشن ستارہ ہے – (نوٹ : معیشت کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہی سبب ہے کہ ہم لبرل Macro Economicsکے بجائے Micro Economicsکو زیادہ اہمیت دیتے ہیں)

2) دوسری مثال انتہائی اہم ہے ۔ دیکھئے جرم کے اسباب میں علم سے دوری ، نفرت و فساد کی ترغیب دینے والا لٹریچر ، ذہنی بیماری ، الکوحل کا زیادہ استعمال ، ڈرگز کا استعمال ، جسم میں مخصوص نامیاتی اجزاء کی مقدار میں تبدیلی ، ذہنی و اعصابی نظام کی توڑ پھوڑ ، بہت زیادہ تنہائی پسندی ،انتقام ، غربت ، نسل پرستی سمیت ان گنت اسباب ہیں ۔ اب جرائم کو سمجھنے اور ان کی بنیاد پر سماجی بندوبست قائم کرنے کے دو اسلوب ہیں ۔ ایک ہے تمام مجرموں کو کسی ایک کل میں دیکھنا ، جیسے فرض کیا تمام پختون دہشت گرد ہیں ، بلوچ قوم ذہنی طور پر فرسودہ ہے ، یہود و ہنود و نصاری ہمارے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں ، سرمایہ دار لوٹ رہے ہیں ، تمام مسلمان دہشتگرد ہیں اور پنجابی منافق ہیں وغیرہ وغیرہ ۔ دوسرا اسلوب مجرم کو اس کی انفرادیت میں دیکھتا ہے ۔ اس میں ان اسباب کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ آخر وہ کون کون سے اسباب ہیں جو ایک مخصوص مجرم کو جرم کی ترغیب دے رہے ہیں ۔ کیا غربت و بے روزگاری کے سبب ایک شخص کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کر تشدد پسند بن گئی ہے ؟ کیا کسی معصوم طالب

علم کو جو لٹریچر پڑھایا گیا وہاں سے اس نے شدت پسندی کی ترغیب حاصل کی ؟ کیا ایک شخص ڈرگز کے زیادہ استعمال سے مجرم بنا ہے ؟ کیا کوئی بلوچ انتقامی جذبے کے تحت شدت پسند بنا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ان دو اسلوب کے نتائج حیران کن طور پر دلچسپ ہوتے ہیں - پہلے اسلوب میں آپ ایک پوری نسل یا مذہب یا جغرافیائی شناخت کو ہی مجرم بنا لیتے ہیں یوں فساد کو بڑھاوا بھی ملتا ہے اور آپ سچائی کی دریافت سے بھی محروم رہتے ہیں - جیسے راقم الحروف نے اوپر کی کچھ مثالوں سے واضح کیا جبکہ دوسرے اسلوب میں آپ کا رجحان جرم کے اسباب کی دریافت اور اس کے خاتمہ پر ہوتا ہے - آپ ظلم کی ہر قسم کے خلاف پالیسی بناتے ہیں تاکہ اس سے انتقام کی نفسیات کو فروغ نہ ملے - آپ غربت کے اسباب کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ غربت کا بوجھ انسان سے اس کی تخلیقی صلاحتیں نہ چھین لے - اس اسلوب میں امن ہے ، رواداری ہے ، خوشحالی ہے اور انسانیت ہے -

یہی سبب ہے کہ ایف اے ہائیک انفرادیت پسندی (Individualism) کی تعریف بھی یہی کرتا ہے۔کہ انفرادیت پسندی سے مراد یہ ہے کہ ہم سوسائٹی کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ایک فرد (individual) ، اس کی چوائسز (انتخابات) اور رویوں (Behavior) کو نہ سمجھ لیں۔اس کے نزدیک ہر فرد معاشرے کی متنوع اکائی ہے -معاشرے افراد سے بنتے ہیں اور معاشروں کا مطالعہ براہ راست افراد کے مطالعہ سے مشروط ہے۔

دیکھئے اگر ہم میں انفرادیت نہ ہوتی تو ہم سب ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے ، ایک ہی قسم کی فلمیں دیکھتے ، ایک ہی جیسے اشعار پر واہ واہ کرتے اور ایک ہی قسم کی کتابیں پڑھتے - ایک ہی مذہب سے ہوتے اور ایک ہی قسم کی بیماری سب کو ہوتی - ہم میں سے ہر من جملہ ایک الگ فرد ہے - یہی وہ صفت ہے جو ہمیں ہر قسم کی سیاسی مذہبی معاشی اور ثقافتی آمریت کے بالمقابل کھڑا کر دیتی ہے – ہمیں لبرل ازم اس لئے پسند ہے کہ اس میں انفرادیت پسندی ہے ، تنوع پسندی ہے ، اور ہمہ جہت صلاحیتوں ، قابلیتوں ، رجحانات ،اور ترغیبات کو امن پسندی سے جستجو کرنے کی ہر فرد کو آزادی ہے –

جب ہم انفرادیت پسندی کو سوشل سائنس میں لاگو کرتے ہیں تو اس سے کچھ مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں جنہیں حل کرنا آسان ہے اگر ان کی صحیح تفہیم بھی حاصل کر لی جائے - ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

1) آزادی ذمہ داری ہے ، انفرادیت پسندی فرد کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنے اعمال کے نتائج کا خود ذمہ دار بنے - جو شخص اس ذمہ داری کو اٹھانے سے قاصر رہتا ہے اس میں مایوسی اور اذیت پسندی پیدا ہو سکتی ہے - جیسے آپ کی جیب میں کرنسی نوٹ آپ کی قوت خرید تو بڑھا دیتے ہیں مگر کس چیز پر اور کتنا خرچ کرنا ہے یہ آپ کی ذاتی ذمہ داری ہے اگر ایک ہی دن میں

سب خرچ کر جائیں گے تو اس غلط منصوبہ بندی کے آپ خود ذمہ دار ہیں اسی طرح اگر ان پیسوں کو آپ صحیح منصوبہ بندی سے خرچ کریں گے تو اس کا بہترین پھل ہی آپ کھائیں گے - جس طرح ایک ووٹ آپ کو سیاسی آزادی دیتا ہے تو ساتھ میں صحیح انتخاب کی ذمہ داری بھی دیتا ہے اگر غلط نمائندے چنیں گے تو وہ آپ کی نمائندگی بھی غلط کریں گے – اس ذمہ داری کو صحیح طرح سے سرانجام دینے میں بہتر تعلیم آپ کی بہت مددگار ہے - تعلیم و تجربہ آپ میں حساسیت اور بہتر فیصلے کرنے کا شعور پیدا کرتے ہیں - دوسرے مذاہب یا مکاتب فکر سے واقفیت آپ میں برداشت اور رواداری پیدا کرتی ہے–

2) اگر ہر فرد کو اس کی انفرادیت میں دیکھا جائے تو نتائج کو جنرلائز کرنا مشکل ہو جاتا ہے جس کے سبب پالیسی سازی میں مشکل آ سکتی ہے - اس سلسلے میں جدید شماریات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا استعمال ہمارے لئے آسانی پیدا کر سکتا ہے-

جاری بحث کے تناظر میں ہمارے لیے چار مزید چیزیں بھی انتہائی ضروری ہیں۔

1۔ **زندگی کی بنیادی ضروریات جیسے روٹی کپڑا اور مکان وغیرہ**: اگر روٹی نہیں ہے یعنی بھوک کا راج ہو تو ہر فرد کو یہ ساری دنیا باطل اور جھوٹ لگتی ہے۔ اور خودی کا احساس کمزور تر ہوتا جاتا ہے۔ بھوک انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اس کا حل ترجیحی بنیادوں پر لازمی ہے۔ اگر جسم کے اوڑھنے کے لیے کپڑا نہیں تو آپ سماجی زندگی میں شامل نہیں ہوسکتے۔ اگر مکان نہیں تو موسم سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتے ۔

2۔ **صحت کو قائم رکھنا**۔ صحت جتنی خراب ہوگی اتنے مسائل پیدا ہوں گے۔ بہترین صحت بہترین طرز زندگی کے لیے لازم ہے۔

3۔ **ہماری دوسرے انسانوں کے ساتھ معاشرت**: ہم سوسائٹی قائم کرتے ہیں جس میں ہم اپنی ضروریات وخواہشات کی تکمیل کا سامان کرتے ہیں۔ شادی کرتے ہیں اور تفریحی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ قائم کئے بغیر ہم اپنی بقا کی جدوجہد میں شاید کامیاب نہ ہو سکیں کیونکہ یہ معاشرہ ہی ہے جس میں ہم ڈویژن آف لیبر کی مدد سے اپنی زندگی کو آسان بنا سکتے ہیں اور جس میں ہماری صلاحیتوں اور قابلیتوں کا موثر اظہار ہے –

4۔ **سیلف ڈسکوری (تلاش خودی)**: ہم خود کو پہنچاننے کو کوشش کرتے ہیں۔اپنے اندر توازن کو قائم رکھنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔اپنی صلاحیتوں و قابلیتوں سے خود کو متعارف کرواتے ہیں اور ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان صلاحیتوں وقابلیتوں کو اپنی ذاتی ترقی اور نشونما میں بہتر سے بہتر استعمال میں لائیں۔ہم فطرت کو سمجھتے ہیں اور یہ جاننے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ اس کا ہماری ذات سے کیا تعلق ہے۔ یہ ہم پر اور ہم اس پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔

انسانی زندگی محض کھانے پینے ، ایک مخصوص چھت کی پناہ میں رہنے اور لباس اوڑھنے کا نام نہیں۔ہمیں اپنی روح یعنی اپنی خودی کو مطمئن اور شادمان رکھنا ہے۔ کامیابی خودی کی دریافت میں ہے اور خودی کی دریافت انسان کو زیادہ انفرادیت پسند بنا دیتی ہے۔ انسان کو اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی تلاش و دریافت اور ان کے بہتراستعمال کی ان تھک جدوجہد کرنی ہوتی ہے ۔اور یہ جدوجہد آزادی سے ہی ممکن ہے۔

انفرادیت پسندی ہر فرد کا بنیادی حق ہے۔اپنی ذات کی جستجو میں رہنا سیلف ڈسکوری میں بنیادی چیز ہے۔اسی طرح کسی چیز کو سوچنا یا نہ سوچنا ،کسی خاص سرگرمی کو سرانجام دینا یا نہ دینا،کسی رائج اسلوب یا طریقہ کار کی پیروی کرنا یا نہ کرنا یہ سب فرد کا فریڈم ہے۔اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی مخصوص سانچے میں رہے اور ایک محدود فریم ورک میں سوچے ۔ہر فرد میں شعور کی دولت و صلاحیت موجود ہے اور اس کا استعمال فرد کا ذاتی استحقاق ہے۔

ہمارے زیادہ تر مسائل اوپر درج کردہ ان چار امور کی کمیابی کی وجہ سے ہیں اور یہ چاروں چیزیں ہی ایسی چیزیں ہیں جو ہمیں بہتر زندگی کے امکانات کی تلاش و تسخیر کی ترغیب دیتی ہیں – ہماری ساری زندگی ان چیلنجز کو بہتر رسپانس دینے میں گزر جاتی ہے ۔جیسے شادی،طلاق کے مسائل ،جرائم بیماری جنگ ہاؤسنگ کے مسائل،آلودگی،شہری مسائل،نسل پرستی،غربت ،آبادی کے مسائل وغیرہ وغیرہ ۔

خود نگہبانی اور آزادی ہم سفر ہیں

آزادی کا محض یہ مطلب نہیں کہ فرد کے پاس دونوں حقوق ہوں : مواقع اور انتخاب کا حق ... بلکہ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ وہ فرد جسے آزادی حاصل ہے وہ اپنے رویوں کے نتائج کی ذمہ داری بھی خود لے – شخصی آزادی اور شخصی ذمہ داری ساتھ ساتھ چلتی ہیں انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا –

(فریڈرک ہائیک)

انسان ایک آزاد وجود ہے اور اس سے وجود میں آنے والا معاشرہ اپنی اصل میں انسانوں کے درمیان رضاکارانہ اشتراک کی اساس پر قائم ہوتا ہے۔جبر معاشرہ کے فطری ارتقاء میں رکاوٹ بنتا ہے اور ہماری مروجہ اخلاق کی رو سے بھی جبر ایک ظلم ہے۔انسان اپنی اساس میں ایک ذمہ دار اور آزاد اخلاقی وجود ہے۔ معلوم انسانی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ تصورات اخلاقیات بھی جامد نہیں بلکہ انسانی تہذیب کے معاملہ میں عہد با عہد اور ایک فرد کے لئے اس کی عمر کے ساتھ ساتھ بدلتے اور ترقی و نشونما پاتے ہیں جس کی بنیادی وجہ فرد کے ذہن اور فہم (understanding) میں ترقی و نشودنما یعنی ارتقا ہے - اگر ایک فرد اپنی شعوری جدوجہد سے نہیں بدل رہا تب بھی وہ بدلتے سماج کا اثر ضرور لیتا ہے۔انسان کا یہ اخلاقی وجود اس کے تمام اعمال و افعال کی خود ذمہ داری لیتا ہے۔وہ ذمہ دار ہے اپنے خدا کے حضور (اگر مذہبی ہے)، اور اپنے خاندان ، دوستوں ساتھیوں (Fellowmen) اور معاشرے کے سامنے بھی وہ ایک طرح سے جوابدہ ہی ہے – جوابدہی کا یہ رشتہ رضاکارانہ ہے اور اس کا انحصار ثقافت کی دوستانہ اتباع میں ہے -

یہ انسان کا بنیادی حق ہے کہ اسے اپنے رویوں میں آزادی دی جائے اور ان کے اچھے برے نتائج کی ذمہ داری سونپی جائے۔سیلف رسپانسبلٹی اس کا بنیادی حق ہے۔اس کے اخلاقی وجود اور آزادی ارادہ و عمل(Free Will) کا بنیادی تقاضا بھی یہی ہے۔

اگر میں صحیح رویوں کا مظاہرہ کرتا ہوں تو اس کے انعام کا میں حقدار ہوں ،پورا معاشرہ نہیں الا یہ کہ میری مرضی شامل ہو - اسی طرح اپنے غلط رویوں کا ذمہ دار بھی میں ہوں -یقیناًسماج میرے رویوں پر اثر انداز ہوتا ہے مگر میری آزادی ارادہ و عمل ، معقولیت پسندی اور میرا تصور اخلاق میرا راہنما ہے جو میرے اچھے اور برے رویوں کی بنیادی وجہ بنتا ہے۔ ایک سماج یا کسی بھی بیرونی اتھارٹی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مجھ پر اخلاقیات اور قانون کی بنیاد پر کچھ غیر ضروری پابندیاں نافذکرے -ہر فرد منفرد اور خوددار و خود نگہبان (Self-Governing) ہے۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ ہم اخلاقیات کیسے develop کرتے ہیں –یہ سوال اس طرح سے بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ آیا ہم اپنی اخلاقیات کہاں سے اخذ کرتے ہیں؟ اس سلسلے میں مختلف مکاتب فکر کی مختلف آراء ہیں۔کچھ لوگ مذہب سے تصور اخلاقیات اخذ کرتے ہیں۔کچھ ثقافت سے اور کچھ اپنے آزاد ارادے سے ۔نیز اس میں تنوع ہے ۔ہر فرد کو آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی اخلاقیات کو جہاں سے بھی پسند کرے وہاں سے اخذ کر سکتا ہے ، بشرطیکہ اس کا یہ عمل دوسرے افراد کو جسمانی تکلیف اور ذہنی اذیت نہ دے اور ان کی آزادیوں میں حائل نہ ہو۔

کلاسیکل لبرل ازم پر ناقدین کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ یہ فرد کو اس کی زندگی پر مکمل اختیار اور اس کی ذمہ داری دیتا ہے۔جب کہ دور جدید کے صنعتی عہد سے پہلے ایسا ممکن نہ تھا۔ قبائلی معاشروں اور مطلق العنان (collectivist) معاشروں میں قبائلی سردارایا مخصوص استحقاق یافتہ افراد کا ایک گروہ یا کوئی اور مخصوص ادارہ ، اس کے حقوق و فرائض کا تعین کرتا تھا کہ اس کی کیا ذمہ داری ہے ، وہ کتنا آزاد و خود مختار ہے اور اس پر کون کون سی پابندیاں لاگو ہوتی ہیں۔اس کی ایک اہم مثال غلامی ہے جس میں ایک غلام اپنے آقا کی پسند و ناپسند کا پابند تھا –

میں آزاد ہوں اور خود نگہبانی و ذمہ داری (self-Responsibility)میری صفت ہے -آزادی کے بغیرذمہ داری نہیں،اور ذمہ داری کے بغیر آزادی نہیں۔ اگر میں صحیح کام کروں گا ،ذہانت ، سنجیدگی، محنت اور تمام صلاحیتوں و قابلیتوں کو استعمال کر کے ، تو اس کے انعام کا حقدار بھی میں ہوں اسی طرح اگر میں نقصان اٹھاتا ہوں اپنے آزاد ارادہ اور صلاحیتوں وقابلیتوں کے منفی استعمال سے ،تو اس کے غلط نتائج کا ذمہ دار بھی میں ہوں۔

جس طرح میرے اچھے عمل کا نتیجہ میرے لیے ہے۔اسی طرح میرے برے عمل کی ذمہ داری بھی دوسرے لوگوں یا معاشرہ پر نہیں ڈالی جاسکتی۔یاد رہے کہ تہذیب و تمدن کی عمارت غلامی و اطاعت کی ثقافت پر نہیں بلکہ شہریوں کی آزادی و خود نگہبانی کی اساس پر قائم ہوتی ہے –

خود نگہبانی کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں – میں ایک نوکری پیشہ آدمی ہوں اور اپنی تنخواہ ماہانہ باقاعدگی سے وصول کرتا ہوں - بجائے اس کے کہ اسے پورے ماہ کے لیے ذہانت اور سنجیدگی سے خرچ کروں،میں ساری رقم پہلے دس دن خرچ کر جاتا ہوں۔تو کیا اس صورت میں سماج یا حکومت ذمہ دار ہے کہ وہ مجھے باقی کے بیس دن پالے پوسے ؟جبکہ میں ایک خود کفیل فرد ہوں۔اسی طرح اگر میں اپنی تنخواہ کو ذہانت اور سنجیدگی سے خرچ کرتا ہوں۔اس میں سے کچھ بچا کر اپنے بڑھاپے کے لیے جمع کر لیتا ہوں،یا کسی کاروبار میں لگا دیتا ہوں تو کیا اس صورت میں

حاصل ہونے والے نفع یا انعام(reward) پر سماج یا حکومت کا حق ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ نہیں ،یہ ہم نے کمایا ہے۔یہ ہماری ذہانت و سنجیدگی کا انعام ہے –

جس طرح بیج زمین سے پھوٹتا اور نمو پاتاہے اسی طرح اخلاق بھی جماعتی و اقتصادی اکائیوں کی افراط سے سماج میں پنپتا اور ارتقاء پزیر ہوتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ فرد کے لیے اس کا اخلاقی تصور کسی لگے بندھے متعین سماجی اخلاقی اصولوں کی نقل نہیں بلکہ اس کا آزادی ارادہ و عمل ، اس کا شعور ، اس کی زندگی کے تقاضے اور آرزوئیں ،ان آرزؤں کی خوشگوار تکمیل کے اسباب و ذرائع اور ان کا موثر اظہار ہی راہنما ہیں۔کس نے کیا خوب کہا ہے کہ:

جب زندگی کے تقاضے اتباع سے پورے نہ ہوں تو انحراف ہی رواج پاتا ہے۔ (18)

یہ انسانی فطرت ہے کہ جب تصور اخلاق جامد ہو جاتا ہے اور وہ تصور اخلاق انسانی ضرورتوں و آرزوؤں کی موثر نمائندگی نہیں کرتا تو انسان اور تہذیبوں کا سفر رک نہیں جاتا بلکہ ان جامد تصورات اخلاق سے انحراف کر کے ہی انسانیت نئے امکانات کو تلاش و تسخیر کرتی ہے اور جدید تصور اخلاق وجود میں آتے ہیں –

سوال یہ ہے کہ ایک چیز جو بالحقیقت جامد نہیں ہو سکتی اور جو معلوم انسانی تاریخ کی رو سے ہر دم ارتقاء پزیر ہے۔اس چیز کو جبراً فرد پر نافذ کرنا کیا قرین انصاف ہے؟ تو جواب نہیں میں ہے۔سماج کا اپنا کوئی مخصوص غیر جامد اخلاقی ضابطہ جوہری طور پر ممکن ہی نہیں ، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ جسے ہم سماجی اخلاقی اصول کہہ رہے ہوتے ہیں وہ کسی بالادست طبقہ کے تصورات کی نمائندگی کرتا ہو ۔ایک آزاد معاشرے میں یہ افراد کے انفرادی ضابطے ہی ہوتے ہیں جو اجتماعی شکل میں جب ظاہر ہوتے ہیں تو سماجی ضابطوں کے طور پراپنی شناخت کرواتے ہیں ۔

اہم بات یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں اور خاص طور پر عہد حاضر میں بھی سماجی و انفرادی تصور اخلاق کے نمائندہ ادارے بھی بہت سارے ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ ایک فرد کس تصور اخلاق کی پیروی کرے تو ممکن جواب یہی ہے کہ جو بھی تصور اخلاق ایک فرد کو پسند آئے یہ اس کا بنیادی حق ہے کہ وہ اس کی پیروی کرے – یہ بھی اس کا حق ہے کہ وہ اپنا تصور اخلاق اپنے انفرادی شعور سے یا مختلف تصورات اخلاق میں سے اپنی ذہنی صلاحیت سے مختلف اجزاء کے انتخاب سے ہی ترتیب دے – اخلاقیات کے نام پر فرد پر ثقافتی آمریت نافذ نہیں کی جا سکتی –

ذیل میں کچھ تصور اخلاق بڑے نمائندہ اداروں کی مختصر لسٹ ہے ۔

۱۔ خاندان

۲۔ ریاست

۳۔انسانیت، اپنی عالمگیر شناخت و ادراک میں—

٤۔انسانوں کے مشترکہ گروہ : جیسے کمپنیز،گروپس ، انجمن ، یونینز یا ایسو سی ایشنز سکول کالج ہسپتال کھیل کے میدان وغیرہ۔

۵۔ مذہبی پاپائیت ، ملّائیت ،پنڈت ازم ، الحاد پسندی وغیرہ —

سوال یہ ہے کہ اگر اخلاق کا جبر ہی نافذ کرنا ہے تو ان میں سے کس کا اخلاقی ضابطہ حرف آخر مان کر نافذ کیا جائے گا؟ ان میں تو باہم ٹکراؤ لازم ہے۔کیونکہ ان کی بنیادیں اور ان پر مبنی تشریحات عموما ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں —

صرف ایک ہی صورت احسن ہے وہ یہ کہ فرد پر اعتماد کیا جائے ۔اس کا اخلاق ، سیلف ڈسکوری ، ضروریات وآرزؤں کی تکمیل کی ایک صورت اور ایک معقول ضابطہ ہے - یہ اس کا ذاتی اثاثہ ہیں ۔اسے اس کے اخلاقی ضابطوں میں آزاد چھوڑدیا جائے اور اسے اپنی ذمہ داری میں ہی رہنے دیا جائے ، بشرطیکہ اس کے ضابطے دوسرے افراد کی آزادی و خوشی کو نقصان نہ پہنچائیں کیونکہ امن تو تہذیب و تمدن کی بنیادی شرط ہے۔

عقل دوستی اور تجربیت پسندی میں انسانیت کا وقار ہے ۔

ہر فرد میں دلیل پسندی (Reasoning) کا جوہر پایا جاتا ہے ۔پتھروں کے عہد سے لیکر دور جدید تک نوع انسانی نے علم و تہذیب کے باب میں جو ترقی کی ہے وہ دلیل پسندی ہی کے سبب سے ہے۔ دلیل پسندی ہمارے سوال اٹھانے اور ان کے جواب تلاش کرنے کی منظم جستجو کا نام ہے ،جس میں ہم عقل و تجربہ کو اپنا راہنما بناتے ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ فرد ہر موقع پر دلیل پسندی (reasoning) سے رہنمائی نہیں لیتا ، وہ بعض اوقات unreasonable(غیر معقول) بھی ہوسکتا ہے۔اسی طرح تمام افراد اپنے انتخاب میں دلیل پسندی کی صلاحیت کو کم و بیش استعمال کرتے ہیں۔کچھ کم استعمال کرتے ہیں تو کچھ زیادہ - کچھ تو بالکل ہی کم - وہ محض دوسروں کی نقل کرتے ہیں۔اگر تمام افراد یکساں صلاحیتوں اور پرفیکٹ انداز میں دلیل پسندی کو استعمال میں لاتے تو سیاسی سماجی اور معاشی میدان میں تنازعات جنم نہ لیتے اور ہمیں ایک بہتر سیاسی سماجی و معاشی بندوبست قائم کرنے کی جستجو کے کٹھن مراحل سے نہ گزرنا پڑتا۔حکومت پر اپو زیشن کی نگرانی قائم نہ کرتے۔ مکالمہ کی ثقافت کے فروغ کی بات نہ کرتے کہ جو چیز فکری و عملی طور پر بہترین ہے نکھر کر سامنے آئے۔انصاف کے مقدمات پر سوال نہ اٹھائے جاتے۔مارکیٹ کی آزادی کی بات نہ کی جاتی ، سماج زیر بحث ہی نہ آتا یوں سب پرفیکٹ ہوتا ،ہر چیز مکمل اور شاندار ہوتی۔ایسا کچھ کسی یوٹوپیائی ریاست میں تو قابل عمل لگتا ہے مگر حقیقی دنیا میں ایسا ممکن نہیں ۔

سوال یہ ہے کہ انسان ہر بار ایسا کیوں نہیں کرتا کہ وہ دلیل پسندی کی راہنمائی میں اپنے ہر مقدمہ کو سوچے سمجھے اور اس کے مطابق عمل کرے ۔جواب یہ ہے کہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے سیلف انٹرسٹ کی مدد سے ہی اپنی دلیل پسندی کی صلاحیت کو کام میں لاتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے سیلف انٹرسٹ (شخصی مفادات) کی بھر پور تکمیل میں ہی اس کی دلیل پسندی اس کی مدد گار ہو ۔اس دوران وہ غلطی بھی کرتا ہے اور بہتر نتائج بھی حاصل کرلیتا ہے۔ وہ غلطی سے سبق سیکھتا ہے کہ آخر وہ جو چاہتا تھا حاصل کیوں نہیں کر پایا ، یوں اس کے بہتر حصول کے لئے وہ اپنی غلطی سے سبق سیکھ کر دوبارہ سے کچھ مزید بہتر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔جب وہ اس میں کامیاب ہوجاتا ہے تو دوسرے افراد بھی اپنے اپنے سیلف انٹرسٹ کی بہتر تکمیل میں اس کی نقل کرتے ہیں اس سے نہ صرف سوشل انٹرسٹ (سماجی مفادات : شخصی مفادات کا مجموعہ)حاصل ہوتا ہے بلکہ عقل و دلیل پسندی نئے نئے امکانات و رجحانات سے روشناس ہوتی اور ترقی پاتی ہے۔

ہم جب سڑک کراس کر رہے ہوتے ہیں اور ہمیں اگر کوئی بس ہماری طرف آتی نظر آئے تو ہم سڑک کراس کرنے سے خود کو باز رکھتے ہیں جب تک کہ بس گزر نہ جائے۔اسی میں ہی ہم اپنا بھلا سمجھتے ہیں اور اس کی ہدایت ہمیں اپنے عقل و فہم اور سمجھ سے مل رہی ہوتی ہے ۔

اسی طرح جب ہم کسی بیماری میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور ڈاکٹر ہمیں کوئی نسخہ تجویز کرتا ہے تو ہم اس پر اپنی رضامندی سے عمل کرتے ہیں۔اگر شفایاب ہوجائیں گے تو آئندہ کسی بیماری میں بھی اسی ڈاکٹر سے رجوع کریں گے اور دوستوں کو بھی اس ڈاکٹر سے رجوع کا مشورہ دیں گے۔ اگر فرض کیا کہ اس ڈاکٹر کی دوا سے صحت یاب نہیں ہوتے ،تو ہم ڈاکٹر بدل لیتے ہیں ہم ایک ہی دوا اور ایک ہی ڈاکٹر کے چکر میں خود کو بار بار ہلاک نہیں کرتے ۔

ان دونوں مثالوں میں ہماری دلیل پسندی (Reasoning) ، عقل و فہم (Rationality) اور تجربہ و مشاہدہ (learning) ہماری مدد گار ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی ساری کی ساری زندگی دراصل اس کے تجربہ و مشاہدہ سے سیکھنے ، عقل و فہم کی جستجو اور راست روی کی تلاش کا نام ہے – ہم میں اگر شعور کا مادہ نکال دیا جائے تو ہم اپنا انسانیت کا مقام کھو دیں گے ۔

اسی لئے لازم ہے کہ ایک فرد اور معاشرے کی سیاسی و سماجی تربیت میں عمل کی غلطی اور پھر اصلاح کی آزادی ضرور موجود ہو۔یہ مجموعی طور پر سوشل انٹرسٹ کی تکمیل کرتے ہیں ۔اس سے Trial & Error کی ثقافت میں بہتر امکانات کی تلاش و تسخیر کے راستے کھلتے ہیں ۔ اس سے معاشرے سیکھتے اور نشودنما پاتے ہیں۔ ویسے یہاں ایک دلچسپ بات بھی غور طلب ہے وہ یہ کہ جب ایک انسان اپنے سیلف انٹرسٹ کو pursue کرتے ہوئے ناکام ہو جاتا ہے تو اس ناکامی کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے ، مگر جب وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کامیابی کو وہ ضرور سوسائٹی سے شیئر (share) کرے –

مثال کے طور پر ایک کاروباری شخص یا کارجو (Entrepreneur) ہے جو بہت سارے کاروباری خطرات کا سامنا کرتے ہوئے اپنے کاروبار کا آغاز کرتا ہے – اگر وہ ناکام ہو جاتا ہے تو نہ صرف اپنی رقم سے جاتا ہے بلکہ جو قرض اس نے اٹھائے ہوتے ہیں انہیں بھی ادا کرنا ہوتا ہے اور ناکامی کی مایوسی و دلگرفتگی بھی اسے مزید کمزور در کمزور کرتی جاتی ہے – مگر جب وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو ریاست ٹیکس وصولی کی صورت میں اس کے سامنے آ موجود ہوتی ہے – ریاست سماجی ذمہ داریوں کے نام پر اس کی محنت کے انعام یعنی نفع سے حصہ مانگتی ہے – مطلب یہ کہ کامیابی کو پبلک سمجھا جاتا ہے اور ناکامی کو پرائیویٹ – سوال یہ ہے کہ کیا یہ اچھی بات ہے ؟

شخصی تصور اقدار کا نظام : آپ کی ، میری ، اور ہم سب کی اقدار

اگر لوگ کسی چیز کو ویلیو دیں گے تو اس کی ویلیو ہو گی ۔ اگر لوگ کسی چیز کو ویلیو نہیں دیں گے تو اس کی کوئی بھی ویلیو نہیں ہو گی ۔ کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس میں ویلیو خلقی طور پر (intrinsic) پائی جاتی ہو ۔

(John Enoch Powell)

ویلیو یا قدر کسی بھی شے یا خدمت کی اہمیت ،ضرورت ، وقعت اور افادیت کا نام ہے۔ مثال کے طور پر ہماری زندگی میں خوراک اور پانی کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے کیونکہ ہمیں اپنی زندگی کی بقا اور نشوونما کے لئے ان دونوں چیزوں کی اشد ضرورت ہے۔یہ دونوں ضروریات اپنی فراہمی میں سب سے اہم ،مقدم اور مفید ہیں۔خوراک کی بھوک مٹانے کی صلاحیت اور اس کی افادیت ،اسی طرح پانی کی پیاس بجھانے اور زندگی کو توانائی دینے کی اہمیت ان اشیاءکی یونیورسل ویلیوز ہیں۔

جب ہم معاشی زندگی میں آتے ہیں تو اشیاء کی ویلیوز بدل جاتی ہیں۔مثال کے طور پر وہ تمام اشیاء جو لا محدود ہیں اور وافر مقدار میں ہیں ان کی ویلیو تقریبا صفر ہے۔ اور جہاں ان کی قلت پائی جاتی ہےان کی ویلیو بھی اسی تناسب سے بہت زیادہ ہے۔جیسا کہ خلیج کے ممالک میں پینے کے صاف پانی کی قلت ہے اس لئے وہاں پانی کی ویلیو معاشی اعتبار سے بہت زیادہ ہے بہ نسبت پاکستان یا دیگر ملکوں کے جہاں پینے کا صاف پانی قدرتی طور پر وافر مقدار میں موجود ہے - اسی طرح ہیرا ہماری بنیادی ضروریات میں سے کوئی ایک بھی ضرورت پوری نہیں کرتا، نہ ہم اسے کھا سکتے ہیں اور نہ اوڑھ سکتے ہیں مگر چونکہ اس کی طلب بطور ایک خوبصورت و دلکش پتھر کے بہت ہی زیادہ ہےاور اسی حساب سے اس کی مقدار بھی انتہائی قلیل پائی جاتی ہے یوں بہت زیادہ طلب مگر کم سپلائی ہیرے کو انمول و قیمتی بنا دیتی ہے اور انسانی سماجی بندوبست میں اس کی ویلیو باقی اشیاء سے بڑھ جاتی ہے۔ان دونوں مثالوں سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ اشیاء و خدمات کی ویلیو یعنی قدر نافذ (Impose) نہیں کی جاتی بلکہ یہ ان کی طلب و رسد کے اعتبار سے خودبخود تمام انسانوں کے انتخاب (Choices) کی بنیاد پر وجود میں وجود میں آتی ہے –

پانی نایاب (scarce) ہے کیونکہ اسے بری طرح manage کیا جاتا ہے –

W.H. Auden نے کہا ہے کہ "ہزاروں لوگ محبت کے بغیر جی لیتے ہیں مگر پانی کے بغیر ایک شخص بھی نہیں جی سکتا"

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ پانی تمام انسانوں کا بنیادی حق ہے اس لئے اسے مفت میں دستیاب ہونا چاہئے جبکہ کچھ لوگ حکومتوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ کچھ مخصوص گروہوں (جیسے کسان : مترجم) تک پانی کی تقسیم کی سبسڈی دے – مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ ان تصورات یا پالیسیوں کے نتیجہ میں پانی ضائع ہو رہا ہے –

پانی نے سطح زمین کا دو تہائی گھیر رکھا ہے – پانی جب تک استعمال نہ ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں – سطح زمین کا یہ پانی محض سطح زمین پر گردش کر رہا ہے – MIT کے محققین کی پیش گوئی ہے کہ اس صدی کے نصف تک آدھے سے زیادہ انسان پانی کی کمی کا سامنا کر رہے ہوں گے – پانی کی کمی کا سامنا وہ علاقے کریں گے جہاں پانی کے دستیاب وسائل میں سے بہت زیادہ (unsustainable) مقدار میں پانی نکالا جا رہا ہے –

اس المیہ کا ایک سبب یہ ہے کہ جوں جوں انسانی آزادی میں اضافہ ہو رہا ہے اور ہم امیر ہو رہے ہیں ، ہم زیادہ پانی استعمال کرنے لگے ہیں – دوسرا سبب ماحولیاتی تبدیلیوں کا ہے جن کے سبب hydrologic cycles میں تیزی آئی ہے یوں نیم آبی جگہیں زیادہ آبی اور خشک جگہیں زیادہ خشک ہو رہی ہیں – دی ورلڈ ریسورس انسٹیٹیوٹ جو کہ ایک تھنک ٹینک ہے ،نے 167 ممالک کی درجہ بندی کی ہے جس میں یہ سامنے آیا ہے کہ ان 167 ممالک میں سے 33 ممالک دو ہزار چالیس تک پانی کا کمی کا شدید ترین شکار ہوں گے - جس کا بڑا سبب پانی کے نظام میں بدنظمی ہے – اب اہم سوال یہ ہے کہ پانی جیسے ریسورس (ذریعہ) کی بہترین تفویض (Allocation) کا نظام کیا ہونا چاہئے ؟

ہر فرد یومیہ چند لٹر پانی پیتا ہے مگر سینکڑوں لیٹر یہ پانی زراعت میں فصلوں کو اگانے ، اور ہزاروں لٹر پانی خوراک کو ہماری میز تک لانے میں خرچ ہوتا ہے – ستر فیصد پانی کا استعمال زراعت میں ہے جبکہ بقیہ تیس فیصد میں زیادہ تر حصہ صنعتوں کے کام میں آتا ہے –چونکہ زمیندار اور فیکٹریوں کے مالکان سیاسی طور پر اتنے بااثر ہیں کہ ایک قلیل مقدار میں رقم اس پانی پر ادا کرتے ہیں – کچھ محض روزمرہ امور کے لئے پانی کی سپلائی پر تو کچھ انفراسٹرکچر پر آنے والے اخراجات ادا کرتے ہیں کہ پانی کی ٹونٹی چلتی رہے – جبکہ ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو زمین کی تہہ سے پانی کو مفت میں نکال کر استعمال کر رہی ہے – بھارت میں زرعی استعمال میں آنے والے پانی کا دو تہائی اسی طرح سے نکالا اور استعمال میں لایا جاتا ہے – جب کوئی چیز مفت ہو یا انتہائی سستی ہو تو تو لوگ اسے فضول میں ضائع کرتے ہیں – چین میں پانی کا خرچ امیر ممالک میں اوسط پانی کے خرچ سے دس گنا زائد ہے –

اگر ہم پانی کا صحیح انتظام (مینجمنٹ) چاہتے ہیں تو ہمیں پانی کی مناسب قیمتوں کا نظام متعارف کروانا ہو گا اس سے ہم صارفین کو یہ وجہ فراہم کریں گے کہ آخر وہ پانی کو ضائع کیوں نہ کریں اور سرمایہ داروں (Investors) کو یہ ترغیب و تحریک کہ وہ پانی کی بہترین سپلائی کے لئے انفراسٹرکچر قائم کریں – اس کے لئے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے جو کہ محض دو ہزار دس سے دو ہزار تیس کے درمیان چھبیس

ٹریلین ڈالرز بنتی ہے – پانی کی قیمتوں کے نظام کو قائم کرنے سے پہلے اس کا تعین ضروری ہے کہ اس کی ملکیت کس کے پاس ہے ؟ اور کون دریاؤں ، زیر زمین ، اور دوسرے ذخائر سے پانی نکالنے کا حق رکھتا ہے ؟ آسٹریلیا نے ایک نیا نظام متعارف کروایا ہے جس میں پانی کو نکالنے کے حقوق شیئرز کی شکل میں مارکیٹ میں بیچے جا سکیں گے ۔

چنانچہ یہ لازم ہے کہ ایسا طریقہ ڈھونڈھا جائے کہ پانی کے بہترین استعمال کو ہر صورت میں ممکن بنایا جائے – یہ گنتی لازم ہے کہ کتنا پانی استعمال ہو رہا ہے اور کتنا پانی کا استعمال حقیقت میں کافی ہے۔

پانی کو نکالنے کے حقوق نہ صرف پانی کو استعمال کرنے کے ہمارے روزمرہ کے معمول کو بہتر بنائیں گے بلکہ اس سے ایسی ٹیکنالوجی کی تیاری و ترقی کی بھی حوصلہ افزائی ہو گی جیسے فیکٹریوں میں تیار کردہ گوشت (artificial meat) جس میں پانی کا انتہائی کم استعمال ہو ، اور سستی نمک ربائی کرنے کا طریقہ وغیرہ – اگر ہم پانی کے بطور ریسورس بہتر انتظام کے قابل نہ ہو سکے تو پھر مارک Twain کی پیش گوئی ہی درست ثابت ہو گی کہ "وہسکی کا مقصد اسے پینا ہے اور پانی کا مقصد اس پر لڑنا ہے "
(بشکریہ دی اکانومسٹ) (19)

انسانی سماج میں کسی بھی چیز کی ویلیو اس چیز کی ذاتی نہیں بلکہ انسانوں کے حوالے سے اس کی طلب میں ہے۔اور یہ ویلیو تمام انسانوں میں مقررہ بھی نہیں۔ایک شخص جو پانی سے سیر ہو اس کے لیے پانی کی ویلیو اب تقریبا زیرو ہے۔ اسی طرح ایک پیاسے کے لیے اس کی ویلیو دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر ہوگی۔ہیرے کی طلب خواتین میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔جبکہ مردوں میں پہناوے کے اعتبار سے اس کی ویلیو بہت کم ہے۔اسی طرح خواتین میں شوق اور رجحان کے اعتبار سے بھی ہیرے کی ویلیو مختلف پائی جاتی ہے اسے کچھ کم پسند کرتی ہیں کچھ بہت زیادہ اور کچھ تو بہت ہی زیادہ –

یہ جو ہم مارکیٹ کی قیمتوں کی بات کرتے ہیں یہ دراصل افراد کی ویلیو ججمنٹ (judgement) کی بلندشرح ہوتی ہے ،جس پر فروخت کنندہ خریدار کو چیز بیچنے پر راضی کر لیتاہے یا خریدار فروخت کنندہ کو راضی کر لیتا ہے ۔ ایک چیز کی مارکیٹ پرائس (قیمت) دراصل خریدار اور سیلر کے درمیان ایک ویلیو پر اتفاق یا کمپرومائز کا نام ہے ۔ ممکن ہے کہ میں کسی دکان میں جاؤں ،وہاں کوئی چیزدیکھ کر اس کی ویلیو دس یونٹ لگاوں مگر دکاندار اسے بارہ پیر بیچنا چاہتا ہے تو میں اسے نہیں خریدوں گا مگر چونکہ دکاندار اسے بارہ پر ہی بیچنا چاہتا ہے اور باقی خریداروں کی اکثریت بھی اسے بارہ پر خرید رہی ہے تو اس کی قیمت بارہ ہی ہوگی۔اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اشیاء و خدمات کی ویلیو کا تعلق فرد سے ہے اور یہ relevant ہے۔

Value concerns value for whom with its needs/wants of Individual

پیداواری عمل میں بھی ویلیو مستقل (Constant) نہیں، اس میں بھی ویلیو اپنے عناصر و عوامل (فیکٹرز) کی کنٹری بیوشن پر انحصار کرتی ہے کہ آیا کون سا فیکٹر کتنا contribute کر رہا ہے اور اس کا پیداواری عمل میں کتنا حصہ ہے - مثال کے طور پر ایک خدمت کا شعبہ لیتے ہیں جیسے وکالت : وکالت ایک معاشی سرگرمی ہے جس میں وکیل ایک مخصوص اجرت / معاوضہ / فیس کے بدلے اپنی قانونی خدمات فراہم کرتا ہے۔ خدمات فراہم کرنے کے اس عمل میں اس کی ذہنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی اہمیت مرکزی ہوتی ہے۔یوں اس خدمت کی پیداوار میں مرکزی کنٹری بیوشن اس وکیل کا ذاتی ہوا، وہی کنٹری بیوشن اس کی خدمات کی ویلیو بھی ہے،اور اسی ویلیو کے حساب سے وہ اپنے کسٹمر / کلائنٹ سے فیس کا مطالبہ کرتا ہے۔

ایک بڑا اور پیچیدہ پیداواری عمل جو کہ کسی بڑے پروڈکٹ جیسے کار بنانے کا ہے،جس میں ایک سے زیادہ فیکٹرز اپنا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں اسی لئے ان کی ویلیو پیمائش (calculation) بھی پیچیدہ ہے – وہ عوامل درج ذیل ہیں :

1۔ **سرمایہ اور Entrepreneurship**: اس میں سرمایہ دار کی محنت ،نفع و نقصان کا خطرہ (Risk) اور سرمایہ شامل ہے۔

2۔ ٹیکنالوجی ،یہ بھی سرمایہ دار کی ملکیت ہوتی ہے۔جسے وہ خریدتا ہے یا خود ایجاد کرتا ہے

3۔ محنت : لیبر کی بھی اقسام ہیں ۔ جیسے خام جسمانی محنت،ذہانت کی محنت، بہت زیادہ مہارت کی (skilled) لیبر۔ یوں ان کی پیداوار میں contribution بھی مختلف ہوتی ہے ، اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ویلیو بھی اور اسی حساب سے ان کی اجرت بھی -

- خام محنت میں مزدور صرف جسمانی محنت کرتا ہے۔
- ذہانت کی محنت میں مینیجرز اور کلرک حضرات ذہنی صلاحیتوں کے استعمال سے پیداواری عمل میں خدمات فراہم کر رہے ہوتے ہیں۔
- وقت، تجربہ اور مزید ٹریننگ سے محنت کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اور یہی پیداواری صلاحیت ہی پیداواری عمل میں بطور ایک فیکٹر کنٹری بیوٹ کر رہی ہوتی ہے۔

4 . زمین (land) : زمین ، وہ جگہ جہاں پیداواری سرگرمیاں سر انجام دی جاتی ہیں -

ان چاروں عناصر کی ویلیو پیداواری عمل میں ان کی کنٹری بیوشن طے کرتی ہے کہ آیا کون کتنا اور کس درجے کا کردار ادا کر رہا ہے ۔ان عناصر کی مختلف انڈسٹریز ، کمپنیوں اور ڈیپارٹمنٹس میں بھی ویلیو کی نسبت (composition) مختلف ہوتی ہے۔ایک ہی کمپنی کے مختلف

ڈیپارٹمنٹس (Departments) میں بھی مختلف ایمپلائز (Employees) کی contribution ویلیو کی تخلیق میں مختلف ہوسکتی ہے۔ویلیو جامد نہیں ہو سکتی اور اگر اسے جامد کر دیا جائے تو پورا پیداواری عمل جامد ہوجاتا ہے اور توڑ پھوڑ کا نشانہ بن جاتا ہے۔کیونکہ اس میں تخلیق کاری (productivity) اور ارتقاء پسندی ختم ہوجاتی ہے۔

معاشرے میں اخلاقی اقدار کا معاملہ

یہ معاملہ درحقیقت اخلاقیات کے معاملہ میں بھی ہے۔اخلاقی ویلیوز یا اقدار ہر فرد کی آزادی ارادہ و عمل ، شعور و فہم اور حسن انتخاب کا نام ہے۔ معاشرے کی اپنی ویلیوز مستقل و جامد ہوتی ہی نہیں،کیونکہ معاشرہ کوئی نامیاتی وجود تو ہے نہیں ، ، نامیاتی وجود تو انسان ہیں۔ جسے ہم سماجی اقدار کہتے ہیں وہ بعض اوقات معاشرے میں اکثریت کی اقدار ہوتی ہیں یا ہیبت مقتدرہ(سٹیٹس کو) کی نافذکردہ اخلاقیات ہوتی ہیں۔

جھوٹ کو برا کہنا، سچ کی حمایت کرنا ، انصاف کی خواہش کرنا، بہتان کو برا جاننا،اور ایمانداری کو فروغ دینا،یقینا یونیورسل اخلاقیات ہیں مگر ان کی وجہ بھی یہی ہے کہ معاشرے کے تمام افراد (معدودے چند) کی آزادی ارادہ و عمل ، سوچ و فہم اور حسن انتخاب انہیں مقدم و محترم سمجھتا ہے اور انسانی سماجی ارتقاء نے بھی انسان کو یہ سکھا دیا ہے کہ ان کے بغیر خود شخصی مفادات (سیلف انٹرسٹ) کا تحفظ بھی ممکن نہیں – مثال کے طور پر جھوٹ کو برا سمجھنے سے مراد یہ ہے کہ آپ خود کو بھی کسی جھوٹے شخص کے فریب سے محفوظ بنا رہے ہیں ۔یاد رہےکہ سچ صرف وہی نہیں جسے معاشرے کی اکثریت سچ کہے ، بلکہ سچائی کا تعلق بھی اپنے پوائنٹ آف ریفرنس ، مخاطب (Subject) ، اور وقت و مقام (Time & Place) سے مخصوص ہے۔

مطلب یہ کہ جنہیں ہم عموما یونیورسل ویلیوز کہہ رہے ہوتے ہیں وہ بھی دراصل معاشرے کے افراد کا اپنے اپنے شخصی مفادات کے تحفظ کے لئے کچھ بنیادی اخلاقیات پر رضاکارانہ اتفاق ہے – میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا اگر کوئی مجھے نہ پہنچائے – میں کاروبار میں بے ایمانی نہیں کروں گا اگر کوئی مجھ سے نہ کرے – یہ باہمی اتفاق رائے نسل در نسل صدیوں سے اور مسلسل انسانی تجربات کی بھٹی سے گزر کر ارتقاء پزیر ہوتے ہوتے ہم تک پہنچا ہے اور ہم سے اپنی مزید بہتر اور ارتقائی شکل میں ہم سے اگلے نسلوں کو منتقل ہو گا – یہ ہمارے شعور و لاشعور کا حصہ بن چکا ہے – ہر وہ فرد جو اس معاشرے میں جنم لیتا ہے وہ اپنے گھر سے لے کر سوسائٹی کے تمام شعبوں میں جب اخلاقیات کے ایک مخصوص تصور کو رائج دیکھتا ہے تو خود بھی اس کا حصہ بن جاتا ہے -

شخصی آزادی اور نظام اقدار

دلچسپ بات یہ ہے کہ کسی بھی شے یا خدمت کی ویلیو (قدر) کی پیمائش کی جاسکتی ہے۔پیمائشی صورت میں اسے یوٹیلیٹی (Utility) کہتے ہیں۔یہ ایک فرد میں وقت اور صورتحال کے اعتبار سے کم ہوتی اور بڑھتی رہتی ہے۔اسی طرح ایک ہی کیفیت اور ٹائم و مقام (Place) کے ریفرنس میں بھی یہ فرد سے فرد مختلف ہوتی ہے۔

اسی لئے شخصی آزادی ضروری ہے کہ ایک فرد آزاد ہو کہ وہ اپنی اخلاقی ،سیاسی اور معاشی زندگی میں مختلف اشیاء و خدمات کی ویلیو خودپیمائش کر سکے اسی میں ہی فرد کا حق انتخاب اور شخصی آزادی ہے – اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس صورت میں وہ فرد سماج کا باغی ہو جائے گا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے حسن انتخاب سے تمام موجود اخلاقی ضابطوں میں سے بہترین کا انتخاب کرے گا اور اپنے فہم و شعور سے ان میں اپنی ذات کے حوالے سے ویلیو شامل (addition) کرے گا-

جب فرد پر سیاسی،معاشی اور اخلاقی تصورات میں سے کسی ایک کی آمریت نافذ کر دی جاتی ہے اور یہ جبر کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اسے اقدار کی آمریت اور ویلیو کا آبجیکٹو ازم (Objectiveism) کہتے ہیں۔اس میں آپ کو ایک مفصل ومکمل ضابطہ دے دیا جاتا ہے ، اور آپ سے اس کی پابندی کروائی جاتی ہے۔جیسے مثال کے طور پر سوشلزم جو معاشی زندگی میں طے کرتا ہےکہ پیداواری عمل میں لیبر کی ویلیو کتنی طے شدہ ہے ، کسی بھی شے یا خدمت کی متعین قیمت کتنی ہونی چاہیے اور افرادی قوت کہاں ، کیسے اور کتنی استعمال میں لائی جائے۔سیاسی زندگی میں اسے فاشزم بھی کہتے ہیں جہاں سنٹرل گورنمنٹ لوگوں کے آزاد ارادوں کو کنٹرول اور ان کی سیاسی زندگی کی منصوبہ بندی (Planning) کرتی ہے۔جس کی رو سے شہری اس لیے ہوتے ہیں کہ ان پر حکومت کی جائے۔آمریت کی ہر شکل آبجیکٹو ضابطے کو راہنما بناتی ہے جب کہ آزادی فرد کا بنیادی حق ہے اور اس کی اقدار سبجیکٹو ہوتی ہیں –

اپنے ذاتی کاروبار زندگی کے نظام میں اخلاقیات طے کرنے کی آزادی
(ایک ایسے ماحول میں جہاں ہمارے مادی احوال ہم پر اپنا انتخاب مسلط کرتے ہیں)
اور
اپنی زندگی کو اپنے شعور کے مطابق ترتیب دینے کی ذمہ داری کی فضا میں ہی اخلاقی شعورپنپتا ہے اور
اخلاقی اقدار روزانہ کی بنیاد پر فرد کے آزاد فیصلوں سے وجود میں آتی ہیں۔

اپنے ضمیر کے سامنے (نہ کہ کسی برتر کے لیے)جوابدہی کا احساس ،
بے جبر فرض شناسی،
یہ ناگزیر فیصلہ کہ اپنی کون سی پسندیدہ اشیا کو دوسروں کے لیے قربان کرنا ہے

اور
اپنے فیصلوں کا بار اٹھانا کسی بھی نظام اخلاق کا جوہر ہیں-
(فریڈرک ہائیک)

نظام تجارت اور نظام اقدار

تجارت کی ممکن صورت بھی یہی ہےکہ ایک شے یا خدمت جب پیش کی جاتی ہے توخریدار اس کی قیمت یا ویلیو اپنی اپنی قوت فیصلہ (Perception) سے طے کرتے ہیں اور فروخت کنندہ تک اس کی متوقعہ ویلیو communicate کر دیتے ہیں۔جب تمام متوقعہ خریداروں یا کسی ایک خریدار کی طے شدہ ویلیو فروخت کنندہ (Sellers) کی متعین ویلیو کے برابرہوجاتی ہے تو وہ چیز یا خدمت اس کی قیمت (Price) کے بدلے خریدار کی پراپرٹی میں دے دی جاتی ہے۔ یاد رہے کہ ایک ٹرانزیکشن میں خریدار و فروخت کنندہ کے درمیان ایک مخصوص میڈیم آف ایکسچینج میں پراپرٹی کا تبادلہ ہو رہا ہوتا ہے – مثال کے طور پر میں ایک کرسی خریدنے جاتا ہوں ، اس کی ایک قیمت پر ہم دونوں (یعنی خریدار اور فروخت کنندہ) اتفاق کر لیتے ہیں – فروخت کنندہ یعنی دکاندار مجھے کرسی کی ملکیت دے دیتا ہے جبکہ میں اس کے بدلے اسے کرسی کے قیمت کے مطابق روپے دے دیتا ہوں - اس کرنسی میں نہ صرف پراپرٹی خریدنے کی سکت ہوتی ہے بلکہ اس کی قوت خرید بذات خود ایک پراپرٹی ہے – یاد رہے کہ کرنسی سسٹم دراصل بارٹر سسٹم (اشیاء سے اشیاء یا خدمات کا تبادلہ) کی ترقی یافتہ شکل ہے - اگر ایک خریدار یا زیادہ خریداروں اور فروخت کنندہ کے درمیان ویلیو کے اس فیصلے میں اختلاف (Discrepancy) پایا جائے تو ٹرانزیکشن نہیں ہوتی تاوقت یہ کہ ان میں باہم اتفاق قائم نہ ہو جائے -اس کو کارل میگر نے اس طرح بیان کیا ہے-

کسی بھی پروڈکٹ کی ویلیو اس کی لیبر پر انحصار نہیں کرتی جوپیداواری عمل کے دوران استعمال میں لائی گئ اور نہ ہی اس کا انحصار کسی بھی پیداوار پر آنے والی کل لاگت (یعنی سرمایہ) پر مخصر ہے۔بلکہ ویلیو دراصل خریدار و سیلر کی انفرادی طلب پر انحصار کرتی ہے۔ (20)

تنوع اور نظام اقدار

ہمارے معاشرے میں تنوع موجود ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا –اس تنوع کی ان گنت صورتیں اور رجحانات ہیں۔سوال یہ ہے کہ آخر یہ تنوع کیسے جنم لیتا ہے ؟اس کا جواب یہ ہے کہ ہر فرد یا مختلف افراد کے کسی گروپ ، ایسوسی ایشن ،کمیونٹی ، یا شناخت کی مذہب و معاشرت اور سیاست و معیشت کے باب میں ویلیو ججمنٹ مختلف ہوتی ہے۔ معاشرت کی رنگینی بھی اسی میں ہے -مارکیٹ میں ورائٹیز بھی اسی وجہ سے ہیں۔بین المذاہب اور ایک ہی مذہب میں ان گنت مسالک بھی اسی وجہ سے ہیں نیز ہماری زندگی کا ہر شعبہ متنوع ہے اور اس

تنوع کا جنم ویلیو ججمنٹ میں افراد کے درمیان اختلاف سے ہوتاہے۔ بہترین معاشرے سیاست و معیشت اور مذہب و معاشرت کے باب میں وہی ہیں جو نہ صرف اس تنوع کی قدر کرتے ہیں بلکہ اسے facilitate بھی کرتے ہیں تاکہ فرد و معاشرہ امن و خوشی سے پھلے پھولے اور ترقی پائے۔ یاد رہے کہ آزاد معاشرہ سب کا ہوتا ہے اس میں رہنے والے ہر فرد کی اسے نمائندگی کرنی چاہیئے — وہ معاشرے جو آزاد نہیں ہوتے ان پر بالادست طبقات کی ویلیو کے تعین (Judgement) میں اجارہ داری ہوتی ہے اور وہ ویلیوز کے اختلاف کو غداری ، کفر یا سرکشی سمجھتے ہیں ۔

کیپیٹلزم کی کامیابی کی وجہ : اس کا نظام اقدار

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کیپیٹلزم کے مقابلے میں کمیونزم اس لیے ناکام ہوا کہ کمیونزم کو قیادت نہ مل سکی ، جبکہ کیپیٹلزم کا سیاسی بندوبست مستحکم رہا — ان کے خیال میں کمیونزم کی ناکامی کی وجہ سٹالن جیسے کردار ہیں جبکہ کیپیٹلزم کی کامیابی کی وجہ مغربی معاشروں کی جمہوریت پسندی ہے۔ یہ درست استدلال نہیں ہے اس بات کا اگر تاریخی بنیادوں پر جائزہ لیں تو ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ معاشرے جنھوں نے فری مارکیٹ معیشت کو قبول کیا وہ وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ جمہوری ہوئے ہیں جبکہ وہ معاشرے جہاں کمیونسٹ یا سوشلسٹ معیشت لاگو ہوئی (جنکی تعداد 46 کے لگ بھگ تھی) ان کا انجام بالآخر بدترین آمریت اور تباہ کن سیاسی و معاشی بندوبست کے صورت میں سامنے آیا۔ اس کی کیا وجہ ہے ؟ یا دوسرے زاویے سے اگر دیکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ممالک جہاں فری مارکیٹ معیشت کا نظام پھلا پھولا، وہاں انسانی ترقی اور انسانی حقوق کے اشارے وقت کے ساتھ ساتھ بہتر ہوئے اور ہنوز ہو رہے ہیں ،جبکہ سوشلسٹ و کمیونسٹ معیشت کے سابقہ و موجودہ تمام ممالک میں سے ایک بھی انسانی ترقی و انسانی حقوق کے معاملہ میں قابل نظیر ملک یا معاشرہ نہیں بن سکا۔ اس کی کیا وجہ ہے ؟

محض سیاسی قیادت اس کی بنیادی وجہ نہیں ہو سکتی اس صورت میں یہ ایک نان اکیڈمک بات ہو گی ۔

ہر نظام کا ایک ویلیو سسٹم ہوتا ہے ،جس کے تحت وہ نظام چلتا ہے ۔نظام محض ایک مشین نہیں ہوتی جسے بنایا اور پھر چلانا شروع کردیا ، اب بس چوکیدار کی ضرورت ہے جو محض اس کی دیکھ بھال کرے ۔ ہر نظام اپنی مخصوص اقدار رکھتا ہے۔ وہ جہاں قائم ہوتا ہے وہاں ان مخصوص اقدار کو نشوونما ملتی ہے اور وہ ترقی پاتی ہیں بشرطیکہ کہ ان میں ترقی کے امکانات واقعی میں پائے جاتے ہوں وگرنہ وہ تباہ ہو جاتی ہیں — کسی بھی نظام کی کامیابی کی صورت یہ ہے کہ اس نظام کا مجوزہ ویلیو سسٹم فرد کے انفرادی نظام اقدار سے متصادم نہ ہو وگرنہ وہ قابل عمل نہیں رہتا ۔

اقدار معاشرے میں افراد کے رجحانات و ترغیبات (Incentive سسٹم) سے جڑی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ایسا نظام ہے جو ایک بھوک وبیماریوں میں مبتلا معاشرے میں قائم کیا جاتا ہے۔اگر وہ نظام محض پندو نصائح یا جذباتی و انقلابی تقریروں میں ہی کھویا رہتا ہے اور افراد میں خیرات و امداد یا لوٹ مار کے مال کے انتظار کی ترغیب پیدا کرتا ہے تو اس سے خوشحالی نہیں آئے گی اور نہ ہی اقدار بہتر ہوں گی۔بلکہ تمام افراد میں ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے جائز و ناجائز راستے ڈھونڈے جائیں گے اور ان میں انحراف ہی رواج پائے گا۔ بھوک اور ضعف میں اقدار کی بحث لاحاصل ہے –

دوسری طرف ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں ایسا نظام قائم کیا جاتا ہے جو غریب و امیر میں محنت و کامیابی اورپیداواری عمل میں نہ صرف شرکت کی ترغیب پیداکرتا بلکہ بھرپور انداز میں شریک کرتا ہے۔اس سے نہ صرف خوشحالی آتی بلکہ صحت مند اقدار کو بھی فروغ ملتا ہے ۔

میں تمام انسانوں کی طرح ، اپنی سوچ اور اپنے اعمال میں اپنے ذاتی نظام اقدار کی پیروی کرتا ہوں۔چاہے میری وہ معاشرتی و مذہبی زندگی ہو یا سیاسی و معاشی زندگی ۔ایک بہتر نظام وہ ہے جو میرے حق انتخاب کو facilitate کرے۔ اور اس میں ہر فرد کے حسن انتخاب کی پزیرائی ہو –

بنیادی قدر یہ نہیں کہ آپ دوسروں کے لیے ہر صورت میں اچھا کریں اگر وہ پسند کریں یا نہ کریں۔آپ جب دوسروں کے لیے اچھا کرنے لگیں گے بغیر ان کی رضامندی کے، تو اس صورت میں آپ اچھائی کے اپنے سسٹم کو دوسروں پر نافذ کر رہے ہوں گے۔اس صورت میں اس چیز کی کیا گارنٹی ہو گی کہ جسے آپ اچھا سمجھ رہے ہیں وہ حقیقتا اچھا ہے بھی یا نہیں ؟ جبر ہر صورت میں برا ہے چاہے جبر کرنے والے کی نیت میں اخلاص اور نیکی کا کتنا ہی جذبہ کیوں نہ ہو - بنیادی قدر یہ ہے کہ دوسروں کے لیے اس وقت اچھا کریں جب وہ آپ کو اپنے لئے اچھا کرنے کی اجازت یا حق بھی دیں اور پھر ویسے اچھا کریں جیسے خود کے لیے اچھا سمجھتے اور کرتے ہیں۔

اچھائی کو نافذ نہیں کرنا پڑتا۔ جبر اور اچھائی کا جذبہ باہم متضاد ہیں ۔فنڈامنٹل ویلیو دوسروں کے شخصی نظام اقدار کی عزت اور ان کی انفرادیت کے احترام میں ہے نہ کہ انہیں اپنے طے شدہ ذاتی نظام اقدار کے تحت مخصوص مقاصد کے لیے دوسروں کو manipulate کرنے میں ہے۔ ہر فرد کے ساتھ اس کی اپنی متعین کردہ ویلیوز اور حقوق کے مطابق برتاؤ کیا جائے۔

A person to be persuaded not worked not forced not bulldozed, not brainwashed.

(انسان کو دلیل سے قائل کیا جانا چاہیے،اس پر جبر و مہر کے ہتھیار نہ چلائے جائیں اور نہ ہی اس کے ذہن پر جھوٹ اور دھوکے بازی سے اثر انداز ہوا جائے)

اسی تناظر میں فلسفی Thoreau کیا ہی خوب کہتا ہے

خیر کے فساد سے بڑھ کر بری مہک کسی چیز کی نہیں ہوسکتی۔اگر مجھے علم ہوجائے کہ کوئی شخص جذبہ خیر سے میرے گھر کی جانب آرہا ہے۔تو میں اس سے بچنے کے لیے سرپٹ دوڑ لگا دوں۔(21)

فری مارکیٹ کی اخلاقیات

سوشلزم اپنے ویلیو سسٹم کی خامیوں و خرابیوں کے تحت ڈوبا تھا جبکہ فری مارکیٹ کیپٹلزم کے عروج و فتح کی وجہ بھی اس میں پنہاں (Inherited) ویلیو سسٹم ہے جو تمام افراد کے ذاتی نظام اقدار کو Facilitate کرتا اور ان کی معاشی آزادی کا تحفظ کرتا ہے۔

کیپٹلزم کی معیشت میں سب سے بڑی قدر پیداوار (پروڈکشن) ہے کیونکہ یہی وہ راستہ ہے جس سے معاشرے خوشحال ہوسکتے ہیں۔انسانوں کا معیار زندگی بہتر بنایا جاسکتا ہے اور اتنی بڑی آبادی تقریبا سات ارب سے زائد لوگوں کی خوراک اور بہتر طرز زندگی کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔

ہم موسیقی سے محبت کرتے ہیں -سر،راگ اور موسیقی کے آلات سے مرتب و مزین دھنیں ہمیں مسحور کرتی ہیں۔ کیا ہم نے کبھی سوچا کہ جس ڈھولک کی تھاپ سے موسیقی دلکش بنتی ہے۔اس ڈھولک کو کس نے بنایا ۔گٹار سے پھوٹنے والی دلکش دھنیں سنتے ہوئے ہم نے کبھی سوچا کہ اس گٹار کی کتنی اہمیت ہے اور ان لوگوں کی کتنی وقعت ہے جنھوں نے ان آلات کو بنایا ۔ بہترین آڈیو سسٹم جو ریکارڈنگ اور موسیقی کی نشرواشاعت میں اہم کردار ادا کرتا ہے اس کے ایک ایک آلے کی تیاری میں کتنی سرمایاکاری،لیبر ، رسک مینیجمنٹ اور معیشت کی خود انتظامی کا ایک مربوط نظام کارفرما رہا — جب ہم موسیقی سن رہے ہوتے ہیں تو یہ سوال کبھی ہم نے خود سے یا کسی دوسرے سے پوچھا ہے کہ ریکارڈنگ اور ناظرین کی پسند کے مطابق دیگر انتظامات کے یہ تمام کام کن لوگوں نے اور کس مہارت سے سرانجام دیئے ؟ پھر اس شاہ پارے کی ریکارڈنگ سے لے کر اس کی آڈیو کیسٹس ، پھر وہاں سے مارکیٹ اور مارکیٹ سے آپ تک اس کی رسائی کا ایک پیچیدہ نظام کیسے کام کرتا ہے ؟ یقینا ہم ان سوالات کے جوابات کی جستجو کی مشقت سے دوچار ہونا پسند نہیں کرتے بلکہ محض موسیقی سنتے ہیں اور اپنی روح کو خوشی و لذت سے ہمکنار کرتے ہیں۔

اسی طرح ایک قلم ہے ۔ہم لکھتے ہیں، علم کی ترسیل ہوتی ہے،خط و کتابت کے لطف اٹھائے جاتے ہیں۔آفس کے ریکارڈ اسی سے بنتے ہیں ۔تخیل کو زبان بھی قلم سے ملتی ہے اور وہ تخیل (ایک اعتبار سے) مادی شکل میں ڈھل کر اپنا اظہار یوں کر رہا ہوتا ہے کہ ہم عش عش کر

اٹھتے ہیں۔ کبھی ہم نے سوچا کہ قلم سے نکلتے وہ الفاظ جو انتہائی قیمتی ہیں ،ان الفاظ کو جنم دینے والا قلم ہم تک کیسے ، کن مراحل سے گزر کر اور کتنے ہی لوگوں کی محنتوں اور سرمایہ کاریوں کی بدولت ہم تک پہنچتا ہے ؟

موسیقی اور قلم سمیت ان گنت ایسی مثالیں اور مظاہر ہیں جو ہمارے اردگرد پائے جاتے ہیں۔جو معجزات کی ہی ایک شکل ہیں۔ جو انسانی تہذیب کا شاہکار ہیں۔ان کو ان کے پس منظر اور پیش منظر سے جو سپورٹ مل رہی ہوتی ہے۔اسے انسانی محنت ،سرمایہ ، کارجوئی (Entrepreneurship) ، رسک مینجمنٹ اور معاشی خود انتظامی کا ایک پیچیدہ سلسلہ مدد دے رہا ہوتا ہے۔یہی وہ پیداوار اور تقسیم محنت یعنی ڈویژن آف لیبر کا منظم سلسلہ ہے ہے جو کیپٹلزم کی سب سے بڑی قدر ہے، جس پر کیپیٹلزم فخر بھی کرتا ہے اور گزشتہ تین صدیوں سے سربلند ہے -

ایک نظر اینٹرٹیمنٹ (Entertainment) کے شعبہ پر بھی ڈال لیتے ہیں -اگر آپ تاریخ کا جائزہ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ صنعتی انقلاب سے پہلے شعراء ، ادباء ،مقربین حضرات وغیرہ بادشاہ وامراء کے دربار سے منسلک ہوتے تھے اور ان کی خوشنودی کے آرزومند رہتے تھے۔یہی ان کی وجہ شہرت تھی ، علم وادب کے فروغ کا ذریعہ بھی اور معاشی تنگ دستیوں سے نجات کا وسیلہ بھی یہی ہوتا تھا۔ دوسری طرف آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ انٹرٹیمنٹ کے میدان بھی محدوداور مقامی ہوتے تھے۔یہ صنعتی انقلاب کے بعد ممکن ہوپایاہے کہ انٹرٹیمنٹ کے ہیروز شاہی دربار کے بجائے عوامی مراکز کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔اس عوام کے حضور حاضر ہوئے ہیں جو انکے شوز (shows) اور تقریبات کے لیے ٹکٹ خرید سکتی ہے ، ٹی وی سکرین پر انہیں دیکھ سکتی ہے ، ان کی تحریریں پڑھ سکتی ہے یا ریکارڈنگز خرید سکتی ہے -یہ تاریخ میں پہلی بار ہو پایا ہے کہ ایک طرف تو انٹرٹیمنٹ انڈسٹری پھیلی ہے اور لوگوں کو دستیاب انٹرٹیمنٹ کے ذرائع میں وسعت آئی ہے تو دوسری طرف وہ امراء جو انٹرٹیمنٹ کے ہیروز کی سرپرستی کرتے تھے،وہ خود ان ہیروز کے فیشن و ثقافت کو نقل کرنے میں خوشی و فخر محسوس کرنے لگے ہیں۔یہ ہیروز چاہے وہ فلم و فیشن انڈسٹری کے ہوں یا کھیل کے میدان کے ، اب سپر ایلیٹ میں شمار ہوتے ہیں۔آج جو جتنا مشہور و مقبول ہے اتنا ہی زیادہ دولت مند ہے – اس شہرت اور مقبولیت کا ذریعہ کیا ہے ؟ عوامی پسند ، جو عوام پسند کریں - یہ سسٹم کی ان پر نوازشات ہیں جو انہوں نے کمایا ہے -کیپٹلزم سے متضاد کمیونسٹ معاشروں میں جیسا کہ سوویت یونین ، وہاں شعراء ادباء اور انٹرٹیمنٹ کے دوسرے ہیروز کی حالت کیسی تھی آپ تاریخ میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔کیا یہ سچ نہیں کہ وہ ہیروز جنھوں نے سوشلسٹ اقتدار کی مخالفت کی ، بدترین انجام سے دوچار ہوئے ؟

موسیقی اور انٹرٹیمنٹ بھی پیداوار(پروڈکشن) ہیں ،کیونکہ یہ انسانوں کی طلب و آرزو کو روحانی تسکین فراہم کرتی ہیں۔ان میں صارفین کے اعتبار سے پنہاں (Inhereted) ویلیو موجود ہے جو فرد سے فرد اور انٹرٹیمنٹ کے شعبہ در شعبہ مختلف ہے۔مثال کے طور پر لوگ فلموں سے زیادہ

لطف اندوز ہوتے ہیں بہ نسبت فائن آرٹس کے۔ پھر ان فلموں میں پسند و ناپسند کی بھی مختلف کیٹیگریز ہیں ۔ موسیقی میں بھی فرد سے فرد پسند و ناپسند کی مختلف ترجیحات پائی جاتی ہیں کوئی کلاسیکل پسند کرتا ہے تو کوئی بھنگڑا وغیرہ ۔ انٹرٹینمنٹ کی انڈسٹری مقامی و بین الاقوامی طور پر بہت وسیع ہے اور اس سے کروڑوں لوگوں کا روزگار وابستہ ہے۔

دور جدید کی جدتوں اور سائنس و ٹیکنالوجی کی ایجادات کا سب سے زیادہ فائدہ عام آدمی کو پہنچا ہے

مشہور نوبل انعام یافتہ معیشت دان ،ملٹن فریڈ مین لکھتے ہیں ۔
صنعتی ترقی اور مشینوں میں جدت ، دور جدید کی ان حیرت انگیزیوں کا بہت زیادہ فائدہ امراء کی نسبت عام شہریوں کو پہنچا ہے ۔ قدیم یونان میں امراء مشکل سے ہی دور جدید جیسی نکاسی آب کی سہولیات اپنے گھروں میں رکھتے تھے ۔ ان کے لئے گرم پانی کا انتظام گیزر کے بجائے دوڑتے خادم کرتے تھے ۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو ؟روم کے امراء ایسی محفلیں اپنے گھروں میں سجاتے تھے جن میں نمایاں موسیقار اور اداکار حصہ لیتے تھے ۔ ریڈی میڈ لباس اور سپر مارکیٹ کو اگر دیکھیں تو امراء کی زندگیوں میں ان چیزوں نے کم ہی اضافہ کیا ہے وہ پہلے ہی بہترین لباس پہنتے تھے اور ہر طرح کی آسائشوں سے لطف اندوز ہوتے تھے ۔ مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے عظیم کارناموں نے نے بنیادی طور پر سب سے زیادہ عام شہریوں کو فوائد پہنچائے ہیں ، یہ حیرت انگیز جدتیں تمام شہریوں کو بآسانی دستیاب ہیں جو پہلے صرف امراء اور طاقتوروں کی دسترس میں تھیں ۔ (22)

حقیقت یہی ہے کہ یہاں ہندوستان میں بھی دور جدید کی جدتوں اور سائنس و ٹیکنالوجی کی ایجادات کا سب سے زیادہ فائدہ عام آدمی کو پہنچا ہے ۔ لباس کو دیکھ لیجئے عام آدمی کے پاس ہر موسم کے کے لئے ایک ہی قسم کے ایک یا دو پہناوے ہوتے تھے ، جبکہ امراء ریشمی ملبوسات استعمال کرتے تھے ۔پنکھے کو دیکھ لیں ، امراء کے لئے خدام ہر وقت پنکھ ہلا رہے ہوتے تھے جبکہ عام آدمی موسموں کے رحم و کرم پر ہوتا تھا ۔ یہ چھوٹی سی چیز واشنگ مشین دیکھ لیں ، امراء کے گھر کی صفائی اور کپڑوں کی دھلائی خدام کرتے تھے جبکہ عام لوگ ندی کنارے بیٹھ کر ایک مشقت میں کپڑے بھی دھوتے تھے ، وہیں نہاتے تھے اور رفع حاجت کے بعد جسم کی صفائی کرتے تھے ۔ معیار زندگی کو دیکھ لیں عام شہریوں کی خوراک دال چاول یا گندم کی کوئی چیز ہوتی تھی جبکہ گوشت کم ہی دستیاب ہوتا تھا مگر امراء کے وسیع دسترخوانوں کے قصیدے ہماری اردو ادب کی کتابوں میں آسانی سے پڑھے جا سکتے ہیں ۔ سفر کی سہولیات دیکھ لیں ایک عام آدمی گدھے کی سواری یاپیدل سفر کرتا تھا جبکہ امراء کے پاس رتھ تھے ، ہاتھیوں اور گھوڑوں پر امراء کا جلوس سفر پر نکلا کرتا تھا جبکہ آج موٹر گاڑی سے لے کر جہاز ہر شخص کی دسترس میں ہے ۔پیغام رسانی کا طریقہ دیکھ لیں ، امراء کے پاس ایلچی یا قاصد ہوتے تھے جو ان کا پیغام مطلوبہ آدمی تک جلد سے جلد پہنچانے کے جتن کرتے تھے جبکہ عام شہری کو لمبی طویل مسافت پر انتہائی ضروری کام کے سلسلے میں دیگر ضروری کام چھوڑ کر اس مقصد کے لئے جانا پڑتا تھا ۔ نیز آج ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش میں جتنی تعداد مڈل کلاس کی ہے جو بہترین طرز زندگی سے لطف اندوز ہو رہی ہے پوری ہندوستانی تاریخ میں ایسی امارت اور خوشحالی کبھی نہیں رہی۔ دور جدید کی جدتوں اور سائنس و ٹیکنالوجی کی

ایجادات کا ایک عام فرد پر جتنا مثبت اثر پڑا ہے ایک طویل لسٹ ہے. جو بتاتی ہے کہ ہندوستان کی پوری تاریخ میں بھی ایسا بہترین عہد کبھی نہیں آیا۔

پیداوار کیپیٹلزم کی سب سے بڑی قدر ہے

معاشی، سیاسی اور سماجی ارتقاء میں ذرائع پیداوار کا کردار مرکزی ہے۔ ہمیں انسانی تاریخ کے ابتدائی ادوار سے ،جسے ہم شکاری عہد یا پتھر کا عہد (Stone age) کہتے ہیں، نجات اس وقت حاصل ہوئی جب ہم نے زراعت کو بطور معیشت قبول کر لیا ۔ اسی زرعی معیشت نے زرعی معاشرت کی آبیاری کی جس نے ثقافت کے تمام پہلوؤں کو بدل ڈالا ، سماج کا تصور اخلاق بدلا ، قبیلہ کی جگہ خاندان کو بطور سماجی اکائی کے حیثیت ملی ،اور بہت بڑی حد تک انسان بقا کی جدوجہد میں خود کفیل و کامیاب ہوا - اب اسے رزق کی تلاش نہ کرنی پڑتی تھی بلکہ اب وہ فطری قوتوں کی مدد سے خود رزق پیدا کرنے لگا ---

انجن کی ایجاد نے جہاں ایک طرف صنعتی انقلاب کو جنم دیا، وہیں اس کے پہلو بپہلو پرنٹنگ پریس کی ایجاد نے علم کی دنیا میں انقلاب کی بنیاد رکھی .... مشینی ذرائع پیداوار نے صنعتی عہد کو جنم دیا، اور یہ صنعتی عہد ہی ہے جو دور جدید کا حقیقی جوہر ہے۔

یہ تجزیاتی اسلوب مطالعہ بھی صنعتی عہد کی ضرورتوں کا حاصل ہے جس میں ہمارا زور منطق کے لاحاصل جھگڑوں کے بجائے مشاہدہ ، تجربہ ، اور نتیجہ خیز سائنس پر زیادہ ہے۔ ہمارے عہد میں فلسفہ سے زیادہ ریاضی و فزکس کا کردار ہے ، ہم انسانی نفسیات و سماجی حرکیات کو 'تخیل اور منطقی مباحثوں ' سے نہیں ، بلکہ انسانی کردار کے مختلف پہلوؤں کی تجرباتی اور شماریاتی تحقیق سے سمجھتے ہیں ۔ جدید تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ 'جدت پسندی' اور 'سائنسی اسلوب مطالعہ' وہاں پیدا ہوا ہے جہاں صنعتی تمدن موجود ہے ۔ صنعتی ترقی سے جہاں شہریوں کا معیار زندگی بہتر ہوتا ہے، وہیں بہتر مستقبل کے امکانات کی راہیں زیادہ سے زیادہ وسیع ہوتی جاتی ہیں۔

معیشت تین اجزاء کا مجموعہ ہوتی ھے :

I. **پیداوار**
II. **پیداوار کی تقسیم**
III. **معیار زندگی یعنی پیداوار کی Consumption۔**

اس کا اہم ترین اور مقدم حصہ پیداوار ہے جبکہ باقی دو شعبوں کا عمل شروع ہی اس وقت ہوتا ہے جب پیداوار موجود ہو - اگر پیداوار ہو گی تب ہی اس کی تقسیم (منصفانہ یا غیر منصفانہ) ہو پائے گی اور وہ خرچ بھی تب ہو پائے گی۔ بغیر پیداوار کے نہ تقسیم پیداوار (دولت) کا سوال پیدا ہوتا ھے اور نہ اس پیداوار کو خرچ کرنے کا۔

حقیقت میں ایک سماج کی کل پیداوار ہی اس سماج کی آمدن ہوتی ہے –(23) -آج کی اس منفرد دنیا میں آج وہی معاشرے ترقی یافتہ ہیں جن کی پیداوار ترقی یافتہ ٹیکنالوجی پر انحصار کرتی ہے اور حجم میں بہت زیادہ ہے۔ دور جدید کی سب سے بڑی قدر بھی پیداوار ہے۔ ہر وہ عمل اچھا ہے جس سے پیداوار میں اضافہ ہو ، ایسا اضافہ جو لوگوں کی ضروریات پوری کرنے اور انہیں راحت پہنچانے میں معاون ہو۔ جس کی لوگوں کو طلب ہو -

اب سوال یہ ہے کہ ایک معاشرہ اپنی پیداوار میں کیسے اضافہ کرے کہ نہ صرف اس سماج کی ضروریات پوری ہو ں بلکہ وہ اردگرد کے دوسرے معاشروں کے لیے بھی بہتری کا سامان کر سکے ؟ دیکھئے، بے شک ہم آج اس وقت تیسرے صنعتی انقلاب سے گزر کر چوتھے صنعتی انقلاب میں داخل ہو رہے ہیں اور ہمارے پاس اعلیٰ درجے کی جدید ترین مشینیری ہے جس نے پیداوار کے عمل کو انتہائی تیز رفتار اور کوالٹی میں شاندار بنا رکھا ہے مگر باوجود ان سب بلندیوں کے ، اس ضمن میں جو ہمیشہ یاد اور مدنظر رکھنے کے لائق بنیادی نکتہ ہے وہ یہ کہ معاشی عمل کا کلی انحصار ایک سماج کی معیشت میں سرگرم تمام انسانوں کے معاشی فیصلوں اور معاشی سرگرمیوں پر ہوتا ہے۔ پیداوار میں اضافہ یا معاشی ترقی کا حقیقی سفر اس وقت شروع ہوتا ہے جب تمام افراد میں محنت ، مثبت معاشی فیصلوں اور سرگرمیوں کی تحریک پیدا کی ہو - یاد رہے کہ ہم انسان اپنی ہر سرگرمی کو سرانجام دینے سے پہلے یہ ضرور سوچتے ہیں کہ اس عمل سے ہمیں فائدہ ہو گا یا نقصان؟ سڑک پار کرتے ہوئے سوائے پاگلوں کے ہر شخص دائیں بائیں اس لئے دیکھتا ہے کہ کہیں سڑک پار کرتے ہوئے کوئی گاڑی اسے کچل نہ دے۔ حقیقت یہ ہے کہ شخصی مفادات (سیلف انٹرسٹ) کی جستجو تمام انسانوں کی فطرت کا لازمی جزو ہے۔ ایک سماج اس میں بسنے والے تمام افراد کا مجموعہ ہے اور اگر تمام افراد اپنے اپنے معاشی مفادات کی جستجو کریں گے تو یقیناً اس کے نتیجہ میں پورے سماج کو فائدہ ہو گا جسے سوشل انٹرسٹ کہتے ہیں ۔ ہر فرد اپنا بہترین ذمہ دار خود ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور طاقت (ریاست، معاشرہ ، خاندان) اس دنیا میں اس کی بہتر ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی –

معاشی عمل میں تیز رفتاری اور ترقی اس وقت آتی ہے جب تمام افراد کو اپنے اپنے شخصی مفادات (سیلف انٹرسٹ) کو pursue کرنے کی آزادی اور فراواں مواقع حاصل ہوں اور وہ معاشی میدان میں اور مقابلہ کی ثقافت میں اپنی اپنی contribution پیش کرنے میں پرجوش ہوں۔ فائدے کا حصول مزید فائدے پر اکساتا ہے اور نقصان سے عمل میں سستی اور جذبوں میں مایوسی آتی ہے۔ اگر پاکستان تیز رفتار اور مستقل ترقی چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ تمام شہریوں کو معاشی عمل میں شامل کیا جائے اور آزادی و مقابلہ کی ثقافت کو

فروغ دیا جائے۔ معاشی عمل میں تمام افراد کی شمولیت اور شخصی مفادات کے بنیادی محرک کے بغیر معاشی ترقی کا خواب کبھی عملی تعبیر نہیں پا سکے گا چاہے ہم جتنے بھی بڑے پروجیکٹ لگا لیں یا قرضے لیتے پھریں۔

پیداوار میں اضافہ کے لئے ضروری ہے کہ ہم مقابلہ کی ثقافت کو فروغ دیں اس میں تمام انسانوں کی شرکت کو یقینی بناتے ہوئے بہتر نتائج، پیداواری صلاحیت، ذہانت اور دریافت و ایجاد کے منصفانہ انعام یعنی نفع کو یقینی بنائیں۔ یقیناً محنتی اور باصلاحیت معاشرے وہ ہوتے ہیں جہاں اجارہ داری ناممکن بنا دی جائے ، بھیک مانگنے کے عمل (چاہے یہ بھیک افراد سے لی جائے یا ریاست و حکومت سے ویلفیئر کی شکل میں) کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے اور تخلیق و دریافت (پیداوار) کو سب سے بڑی قدر سمجھا جائے۔ ہمارا اصل انعام ہماری اپنی محنت ہے اور اگر کوئی مجھ سے زیادہ محنت کرتا ہے اور محنت کا زیادہ انعام حاصل کر رہا ہے تو ایسی ثقافت میں مجھے اس سے نفرت نہیں بلکہ آگے بڑھنے اور خود کو بہتر کرنے کی ترغیب و تحریک اور سمجھ بوجھ حاصل کرنی چاہیے۔

آج دنیا کی ترقی یافتہ معیشتیں وہ ہیں جو پیداواری صلاحیت اورپیداواری عمل میں سب سے آگے ہیں ۔ مثال کے طور پر امریکہ سالانہ ساڑھے سترہ ہزار ارب ڈالر کی اشیا اور خدمات پیدا کرتا ہے، چین جاپان اور جرمنی بالترتیب ساڑھے دس ہزار ارب ڈالر ، ساڑھے چار ہزار ارب ڈالر اور چار ہزار ارب ڈالر کی اشیاء و خدمات پیدا کرتے ہیں اسی لئے امریکہ دنیا کی نمبر ایک ، چین دوسری ، جاپان تیسری اور جرمنی چوتھی بڑی معیشت ہے ۔ اس کے برعکس میں ملاوی ، برونڈی ، سینٹرل افریقن ریپبلک ، گیمبیا ، اور نائجیریا وغیرہ دنیا میں سب سے کم اشیاء و خدمات پیدا کرتے ہیں اس لیے ان کا ترقی یافتہ ممالک کی درجہ بندی میں سب سے کمتر مقام ہے۔ یاد رہے کہ جتنی زیادہ فی کس پیداوار ہو گی اتنا ہی اس معیشت میں فی کس معیار زندگی بلند تر ہو گا۔

اس سلسلے میں ہم چین کی مثال لیتے ہیں ، چین میں 1979ء سے پہلے سوشلسٹ معیشت تھی ، جس کا زور آزاد پیداواری قوتوں کی حوصلہ افزائی اور انہیں فروغ دینے کے بجائے پیداوار کی مصنوعی اور نظریاتی تقسیم پر تھا۔ جس کا نتیجہ ہر سال کے قحط تھے جن میں صرف ایک بڑے قحط 1958-61 ء میں ساڑھے تین کروڑ اموات ہوئیں۔(24) 1979ء میں چین مارکیٹ معیشت کی طرف منتقل ہوا اور اس وقت سے آہستہ آہستہ اپنی مارکیٹ کو زیادہ سے زیادہ آزاد اور خود مختار کرتا آ رہا ہے۔ اس دوران چین نے اپنی معیشت کا رجحان زیادہ سے زیادہ پیداوار کی طرف مرتکز رکھا ،جس کے نتیجے میں پینتیس برس میں چین نے دس فیصد سالانہ سے ترقی کرتے ہوئے اپنی معیشت میں بتیس گنا اضافہ کرکے اسے دنیا کی دوسری بڑی معیشت بنا دیا ہے (25)۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان پینتیس برسوں میں چین کے کسی ایک صوبہ میں بھی قحط نہیں آیا اور لوگوں کے معیار زندگی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے ۔ آج چین کا ساری دنیا میں نمایاں مقام اسکی مارکیٹ معیشت کی وجہ سے ہے ، جس کی پیداواری صلاحیت نے چین کو سیاست اور ثقافت میں بھی نمایاں مقام دیا ہے۔

بالکل یہی داستان مشرقی ایشیا کی ہے ، جاپان ، جنوبی کوریا ، سنگاپور ، تائیوان وغیرہ نے صنعتی میدان میں پیداواری قوتوں کی مدد سے ہی معاشی ترقی کر کے اقوام عالم میں ایک باعزت اور قائدانہ کردار حاصل کیا ہے ، ہمارے پڑوس میں بھارت بھی پیداواری قوتوں میں مسلسل اضافہ کے سبب تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے۔ ستر کی دہائی میں پاکستان کی معاشی ترقی کو جب ایشیا کے لئے ایک بہترین مثال سمجھا جاتا تھا ، اس وقت ہماری معیشت بھی قرض، عالمی امداد اور تارکین وطن کے بھیجے جانے والے پیسوں (Remmitences) کی بجائے صنعتی پیداوار ہی پر انحصار کرتی تھی۔ پاکستان چین پر اپنا معاشی انحصار روز بروز بڑھا رہا ہے ، ہم 1951ء سے 2011ء تک 68 بلین ڈالر کی امداد لے چکے ہیں ۔ ہم اپنے بجٹ کا ایک بڑا حصہ قرضوں کی ادائیگی پر خرچ کر رہے ہیں ، اور سالانہ تارکین وطن پاکستانی پندرہ ارب ڈالر سے زائد پاکستان میں بھیج رہے ہیں ۔ اس کے باوجود ہم ایک اوسط سے بھی کمتر درجہ کی معیشت ہیں ،آخر کیوں ؟ ہمیں اس سوال پر ضرور غور کرنا چاہئے کہ آیا ہم ایک ضرورت مند معیشت اور بے بس قوم کی طرح جینا چاہتے ہیں یا ہم دوسری اقوام بشمول چین کی طرح اپنا مقام آپ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ترقی یافتہ اقوام کی تاریخ سے یقینا ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ۔

اہل مغرب کی معیشت میں آئیڈیاز اور تخلیقی مہارت کو اہم ترین قدر کا درجہ حاصل ہے بہ نسبت خام سرمایہ اور خام محنت کے۔

پہلا صنعتی انقلاب اٹھارھویں صدی کے آخر میں برپا ہوا تھا ، جب ہم نے پانی اور بھاپ کی توانائی سے انجن چلانا سیکھا۔ دوسرا صنعتی انقلاب الیکٹرک پاور اور اس سے چلنے والی بڑی بڑی مشینوں کی بدولت منظر عام پر آیا۔ اس کا دورانیہ انیسویں صدی کی آخری آخری تہائی سے بیسویں صدی کی ابتداء تک بتایا جاتا ہے۔تیسرے صنعتی انقلاب کو جنم بیسویں صدی میں الیکٹرونکس اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سے ملا۔اور چوتھا صنعتی انقلاب جس کی دستک ہم سن رہے ہیں ، ۔ بائیولوجی ،فزکس ، ڈیجیٹل ٹیکنالوجی اور دوسری جدید سائنسز میں جدت پسندی Innovation ( ) کی بدولت ہے۔ٹیکنالوجی کے بدلنے سے معیشت بدل ہی ہے۔ٹیکنالوجی کیپیٹل انوسٹمنٹ کی ہی ایک شکل ہے ، یہ بھی سرمایہ ہے ، جس کا ارتقاء خالص معاشی اور علمی بنیادوں پر ہوا ہے۔آج انفارمیشن ٹیکنالوجی میں جتنی جدت آرہی ہے، اس کی اکثریت گوگل ،یاہو،مائیکروسافٹ ،فیس بک اور ٹویٹر جیسی بڑی پرائیویٹ کمپنیوں کی بدولت ہے۔ٹیکنالوجی میں تبدیلی وترقی نئے آئیڈیاز کی جستجو اور ان کے کامیاب عملی نتائج میں ہے۔

جتنا ایک معیشت صنعتی طور پر پختہ (mature) ہوتی جاتی ہے ،اتنا وہ خام کیپیٹل و لیبر سے نکل کر آئیڈیاز اور ٹیکنالوجی کی اقدار پر منتقل ہوتی جاتی ہے۔ آج مغرب کو سرمائے کی اتنی ضرورت نہیں جتنا غریب و پسماندہ ممالک کی معیشت کو اس کی اشد ضرورت ہے۔ مغرب کی لیبر یقریباً ساری استعمال میں ہے جب کہ غریب ممالک کی لیبر تو سرپلس میں ہے یعنی لیبر اپنی آبادی میں زیادہ ہے مگر روزگار کے مواقع

بہت محدود ہیں۔ مغرب کو آئیڈیاز کی ضرورت ہے جس سے مارکیٹ کو boost ملے۔ نئی ٹیکنالوجی نیا پروڈکٹ لائے تاکہ معیشت کا پہیہ چلتا رہے ۔

مثال کے طور پر مائیکروسافٹ کے بانی بل گیٹس دنیا کے صف اول کے سرمایہ داروں میں سے ایک ہیں۔ان کی کمپنی مائیکروسافٹ کا جنم ، اس میں ترقی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں اس کی بے نظیر کامیابیوں کی وجہ بل گیٹس کی محنت و سرمائے سے زیادہ اس کے آئیڈیا کا مرکزی کردار ہے ۔ لیبر و سرمایہ نے اس کی ترقی میں محض ایک معاون و مددگار کا کردار ادا کیا ہے ۔بل گیٹس نے اپنے سیلف انٹرسٹ (شخصی مفادات) کو Pursue کیا جس نے اپنے نتائج میں سوشل انٹرسٹ (سماجی مفادات) کو جنم دیا۔بل گیٹس انفارمیشن ٹیکنالوجی کا باوا آدم ہے ۔

چوتھے صنعتی انقلاب کی دستک: اقدار بدل رہی ہیں -

ٹیکنالوجی اور معیشت ہم دم اور ہم قدم ہیں -دونوں ایک دوسرے کی معاون اور مددگار ہیں۔ ہم عموما دیکھتے ہیں کہ جب معیشت عروج پر ہوتی ہے تو ٹیکنالوجیکل ترقی بھی عروج پر ہوتی ہے اور جب معیشت کی رفتار دھیمی پڑتی ہے تو سائنس و ٹیکنالوجی میں نئے امکانات کے کھوج کی رفتار بھی سست پڑ جاتی ہے۔ ہم نے یہ سب گزشتہ مالیاتی بحران 2008 سے پہلے اور بعد میں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اسی طرح سائنس و ٹیکنالوجی اور علوم و فنون کی دوڑ میں بھی وہی ممالک آگے ہیں جو معاشی ترقی کی دوڑ میں آگے ہیں-(26)

قرائن بتاتے ہیں کہ ہم اس وقت ایک نئے ٹیکنالوجی کے انقلاب کے دہانے پر کھڑے ہیں جس نے ہمارے معیار زندگی، تصور خودی، ثقافت، معیشت اور سیاست سمیت زندگی کے ہر پہلو کو بدل دینا ہے-معیشت کی زبان میں ہم چوتھے صنعتی انقلاب میں داخل ہونے کو ہیں-

پہلا صنعتی انقلاب اٹھارویں صدی کے آخر میں اس وقت برپا ہوا جب ہم نے پانی اور بھاپ کی توانائی سے مشینوں کو چلانا سیکھا- (27) اس وقت ہماری پیداواری قوت انتہائی کم تھی- جب ہم نے بجلی (الیکٹرک پاور) پیدا کر لی تب ہم بڑی بڑی مشینوں سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے قابل ہوئے یوں ہماری معیشت میں یک لخت بہت زیادہ اضافہ ہوا- اسے دوسرا صنعتی انقلاب کہتے ہیں جس کا دورانیہ مؤرخین کے نزدیک انیسویں صدی کی آخری تہائی سے بیسویں صدی کی ابتداء تک ہے-(28) تیسرے صنعتی انقلاب نے الیکٹرونکس اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی مدد سے بیسویں صدی کی ابتداء میں جنم لیا جس سے جہاں معیشت زیادہ سے زیادہ گلوبلائزڈ ہوئی وہیں پیداوار میں بھی مزید اضافہ

ہوا جس نے تمام ممالک بالخصوص ترقی یافتہ ممالک میں معیار زندگی کو بدل دیا- (29) چوتھا صنعتی انقلاب جس کا ہم جلد سامنا کرنے والے ہیں وہ بائیولوجیکل، فزیکل اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے ملاپ سے نئی کارآمد صنعتی ٹیکنالوجی کی شکل میں سامنے آ رہا ہے-(30)

وجود میں آنے والی نئی ٹیکنالوجی پیداوار کے تمام روایتی طریقوں کو بدل رہی ہے- اس کا جنم پہلے والے صنعتی انقلابوں کی طرح اپنی بنیاد میں نہ خام سرمایہ پر ہے اور نہ ہی خام محنت پر، بلکہ اس کا جنم اپنی اساس میں علم یعنی آئیڈیاز بالخصوص سائنس و ٹیکنالوجی اور کنزیومر ازم پر ہے جس میں سرمایہ و محنت نے ایک ناگزیر مددگار کا کردار ادا کیا ہے- یہی سبب ہے کہ آنے والے عہد میں وہ ممالک جن کی معیشت سرمایہ و لیبر (capital & labor intensive) سے ترقی پا کر علم و تخلیق (Economy of Information) پر منتقل ہو چکی ہے وہ اس کا زیادہ فائدہ اٹھائیں گے اور ترقی پزیر ممالک پھر پیچھے رہ جائیں گے جو ہنوز تخلیقی سرمایہ اور تخلیقی محنت سے مجموعی طور پر محروم ہیں-

سوال یہ ہے کہ وہ کون کون سے علوم ہیں جو اس صنعتی انقلاب کو جنم دے رہے ہیں ؟ وہ علوم ہیں : آرٹیفیشل انٹیلیجنس (مصنوعی مشینی ذہانت)، روبوٹ، انٹرنیٹ، خودکار گاڑیاں، 3D پرنٹنگ، بائیو ٹیکنالوجی، نینو ٹیکنالوجی، میٹیریل فزکس، توانائی کی سائنسز، کوانٹم مکینکس اور کوانٹم کمپیوٹرز وغیرہ- اگر ہم پاکستانی یہ جاننے میں متجسس ہیں کہ ہم اس صنعتی انقلاب کے بعد کہاں کھڑے ہوں گے تو ہمیں اول خود سے یہ سوال کرنا چاہیئے کہ آخر ان علوم میں ہم کہاں کھڑے ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ ہم ہنوز اپنی ذہانت، ثقافت، معیشت اور سیاست میں پسماندہ ہیں- خطرہ یہی ہے کہ ہم نے پچاس سال بعد بھی عالمی نظام کو گالیاں دینی ہیں جس نے بقول ہمارے، ہمیں محروم رکھا ہوا ہے ورنہ تو ہم سائنس و ٹیکنالوجی کے "آغا وقار" ہیں-

اس سے ہمارے جیسے ملک کے لئے جہاں لیبر فورس کی بہتات ہے، سب سے بڑا نقصان یہ بھی ہو گا کہ چونکہ مزدور کا کام اب مشینیں کریں گی یہاں تک کہ کلرکی بھی کوانٹم کمپیوٹنگ کی ٹیکنالوجی سے کمپیوٹر کر سکیں گے تو ہماری اکثریتی آبادی کو روزگار کا بدستور چیلنج رہے گا- تخلیقی ذہن کی مانگ ہو گی اور خام محنت کا کوئی وقار نہ ہو گا- سوال یہ ہے کہ کیا ہماری حکومتیں اس کے لئے تیار ہیں اور تعلیم و صحت کے لئے انقلابی اقدامات کئے جا رہے ہیں تو جواب نہیں میں ہے- ہم اپنی آنے والی نسل کو محروم چھوڑ جائیں گے جو ہماری طرح آوارہ بدزبان اور تنگ ذہن ہو گی- یہ ناکام ریاست کی وہ فصل ہے جو ہمارے بعد آنے والوں نے کاٹنی ہے- یاد رکھئے ایک طرف وہ ذہنی فرسٹریشن میں اپنے عہد کو گالی دیں گے تو دوسری طرف وہ ہمیں اپنے آباؤ اجداد کو گالیاں دیں گے جو بصیرت و بصارت سے محروم تھے- اس چوتھے صنعتی انقلاب کی مزید جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں-

- گلوبلائزیشن میں مزید جدت آئے گی، ٹرانسپورٹ اور کمیونیکشن کی لاگت میں مجموعی طور پر کمی آئے گی، عالمی تجارت میں رکاوٹیں کمزور پڑ جائیں گی، لاجسٹکس اور "گلوبل سپلائی چین" سستی اور آسان ہو جائے گی-

- حیران کن سیاسی تبدیلیاں وقوع پزیر ہوں گی جسے تاریخ کے وہ طالب علم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے ورلڈ وار سے پہلے اور بعد کی دنیا کو تفصیل سے پڑھا ہے۔ اس وقت دنیا کے چالیس فیصد لوگ سوشل میڈیا استعمال کر رہے ہیں جس سے حکومتی پالیسیوں پر عوامی ثرورسوخ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سے ہمیں ایک دوسرے کے نقطہ نظر اور کلچر کو سمجھنے کا موقع مل رہا ہے۔ یوں ماہرین کے بقول انٹرنیٹ کی ٹیکنالوجی میں مزید اضافہ اور بہتری سے تمام ممالک میں جہاں ٹھوس جمہوری اقدار فروغ پائیں گی، وہیں اس کا بھی زیادہ امکان ہے کہ ریاستی ادارے ٹیکنالوجی کے استعمال سے شہریوں کی آزادی پر زیادہ سے زیادہ اثر انداز ہوں گے، جیسے سیکورٹی کے نام پر شہریوں کی ذاتی زندگی کی نگرانی۔ انسانی آزادیوں، مساوات، اور انصاف کے جہاں ان گنت زاویے ترقی پائیں گے وہیں ان میں نئے مسائل بھی جنم لیں گے اور عوام کی ریاست سے آرزوؤں میں تبدیلی آئے گی۔

- ماہرین کا کہنا ہے کہ اس سے نہ صرف ہماری روزمرہ کی سرگرمیاں بدل جائیں گی بلکہ اس سے ہمارے یہ تصورات بھی بدل جائیں گے کہ ہم کون ہیں؟ ہماری شناخت، نجی زندگی، تصور ملکیت، ہمارے خرچ، محنت اور فرصت کے اوقات، ہماری مہارتیں، روزگار، شہری زندگی، حلقہ احباب، خاندانی تعلقات اور اقدار سمیت ہر چیز بدل جائے گی جس کا مشاہدہ ہم نے ہر گزرتے صنعتی انقلاب کے دوران کیا۔ مطلب یہ کہ اقدار وقت اور مادی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بدلتی جائیں گی ، کیونکہ ان میں جمود نہیں — اگر ہم نے ان کو جامد رکھا اور جامد ، دور از کار و فرسودہ اقدار کو فرد پر مسلط رکھا .... تو ہمارا انجام بھیانک ہو گا ۔

سیلف انٹرسٹ سے سوشل انٹرسٹ تک کا سفر

کیا یہ خطرناک نتائج ہمیں عمیق اور متفکرانہ انداز میں سوچنے پر مجبور نہیں کرتے کہ اگر کسان فصل اگانا بند کر دیں تو ہمارا کیا ہوگا؟ اگر انجینیر بننا ختم ہوگئے توتعمیرات کے کام کیسے چلیں گے؟ بجلی کے بڑے بڑے گرڈ سٹیشن اور وہاں سے بجلی کی ترسیل کا نظام کیسے چلے گا؟اگر کان کنوں نے اپنا پیشہ چھوڑ دیاتو اس کا انجام کیا ہوگا؟ہم ایسا کیوں نہیں سوچتے ؟اگر سوچتے ہیں تو ہمارے خیال میں ایسا کیوں کر ممکن ہے کہ کسان فصل اگانا بند نہیں کریں گے،کان کن اپنے پیشے سے جڑے رہیں گے،انجینیر بنتے رہیں گےاور انجینیرنگ کا کام جاری رہے گا۔ یا دوسرے بہتر الفاظ میں اگر ہم یہ سوچیں ایسا کیونکر ممکن ہو پا رہا ہےکہ کسان زراعت کی سرگرمیوں میں ہنوز مصروف ہیں۔ نئے ڈاکٹر بن رہے ہیں اور بیماریوں کے علاج میں تندہی سے ہماری خدمت کر رہے ہیں۔انجینیر ،کان کن سمیت ان گنت شعبے ایسے ہیں جو اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔سوال یہ ہے کہ آخر وہ کون سی قوت ہے جو ان کو ان سرگرمیوں پر قائم رکھے ہوئے ہے اور ہمارے سماج کی ضروریات وخواہشات کو پورا کر رہی ہے یا اس میں معاون ہے ؟ چونکہ بظاہر ہمیں ان گرمجوش معاشی مشغولیتوں میں کوئی بیرونی قوت نظر نہیں آتی ، اس لئے ان کاموں کی تہہ میں کارفرما جو اندرونی قوت محرکہ ہے اس قوت کو سمجھنے کی ضرورت ہے ۔

سوال کو ایک دوسرے زاویے سے سوچتے ہیں فرض کیا کہ آپ ایک دکاندار ہیں۔ وقت پر اپنی دکان کھولتے اور وقت پر بند کرتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ آپ صرف دکانداری ہی کیوں کر رہے ہیں؟ آخر وہ کون سی قوت ہے جو آپ میں یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ صبح وقت پر اٹھیں ، دکان کھولیں اور روزانہ باقاعدگی سے یہ کام کئے جائیں ؟ اس سوال کاجواب ہے سیلف انٹرسٹ (شخصی مفاد) کی قوت محرکہ یعنی آپ کو اس دکانداری سے نفع مل رہا ہے ۔ کسان سے لے کر انجینیر،ڈاکٹر ،کان کن ، معلم ، کاریگر اور دکاندار سمیت ہر فرد اپنے اپنے سیلف انٹرسٹ سے جڑا ہوا ہے اور اسی کے تحت اپنی معاشی سرگرمیاں ادا کر رہا ہے۔یہ ہم سب کا سیلف انٹرسٹ ہی ہے جو باہم مل کر سوشل انٹرسٹ (سماجی مفادات) بناتا ہے۔

سیلف انٹرسٹ سے مراد ہر فرد کا ذاتی انٹرسٹ (مفاد)ہے۔وہ مفاد جو اس کی ضروریات و خواہشات کی جائز تکمیل کا نام ہے۔اور ان مفادات کے حصول کا ذریعہ ہماری منفرد صلاحیت و قابلیت (ہمارا Comparative advantage)ہے۔کسان اپنے روزگار سے اس لیے جڑا ہوا ہے کہ وہ تمام دستیاب شعبوں میں صرف یہی سب سے بہتر کرسکتا ہے اسی لئے اس نے اسی کا ہی انتخاب کیا ہے ۔ وہ ڈاکٹری یا انجینیرنگ کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اسی طرح جب اس کا بیٹا ڈاکٹری یا انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرے گا تو وہ ڈاکٹر یا انجینئر بن کر اپنے سیلف انٹرسٹ کو pursue کرنے کے قابل ہو گا ، ہاں اگر اسے محسوس ہوا کہ باوجود ڈاکٹری کی تعلیم وتربیت کے وہ کوئی کاروبار بہتر طریقہ سے کر سکتا ہے جس میں اس کی ضروریات و خواہشات کی بہتر تکمیل ہو اور اس میں اس کی خوشی و مسرت بھی زیادہ ہو تو وہ کاروبار کی طرف ہی رجوع

کرے گا۔ہم سب اپنی معاشی سرگرمیوں میں سیلف انٹرسٹ کو Pursue کرتے ہیں جو اپنی کل میں سوشل انٹرسٹ بن کر پورے معاشی نظام کو بغیر کسی سپروائزر یا اتھارٹی یا ڈیزائنر یا منصوبہ ساز (Planner) کے بہتر انداز سے چلاتا ہے –

سوشل انٹرسٹ اور سیلف انٹرسٹ سے متعلق تین نظام پائے جاتے ہیں -

ہماری معاشی سرگرمیوں سے متعلق تین نظام پائے جاتے ہیں۔

1۔ماضی کے رسم و رواج یا مذہب کے مطابق معاشی سرگرمیوں کی مستقل منصوبہ بندی (Planning) کر دی جائے۔ جیسا کہ بھارت کا ذات پات کا نظام (Hindu cast system) جو لوگوں کو انکی ذاتوں میں تقسیم کر کے انہیں مخصوص ذمہ داری سونپ دیتا ہے۔ اس نظام میں مختلف ذاتوں کے افراد اپنے سیلف انٹرسٹ (شخصی مفادات) کو Pursue نہیں کرسکتے بلکہ جو ذمہ داری انہیں مسقل منصوبہ بندی اور متعین سماجی خدمات (سوشل انٹرسٹ) کی صورت میں دی جاتی ہے وہ مجبورا اس کی پابندی کرتے ہیں ورنہ سزا ان کا مقدر ہوتی ہے۔

بھارت کے قدیم ہندو لٹریچر کے مطابق ذاتوں کا یہ نظام سماج کی بقاء کے لئے لازم ہے کیونکہ اس لٹریچر کے مطابق بغیر کسی باقاعدہ و مستقل منصوبہ بندی اور پیشوں کے جبر کے ، معاشی تنظیم قائم نہیں کی جا سکتی۔(31) یہی Planned ، یہی مستقل منصوبہ بندی اور انہی متعین و مسلط سماجی خدمات (سوشل انٹرسٹ)اورپیدائشی و طبقاتی ذمہ داریوں کی جھوٹی دلیل اور ظالمانہ ڈھکوسلا عہد غلامی میں بھی چلایا جاتا تھا ، جب کہا جاتا تھا کہ اگر غلام (مجبور لیبر) نہیں ہونگے تو معاشی نظام کیسے چلے گا۔

2۔ہمہ گیرآمریت کا نظام (Authoritarianism): اس میں ریاست طے کرتی ہے کہ کس سے کیا اور کیسے کام لیا جائے –کتنے انسان کسان بنیں ،کتنے انجینئر ،کتنے ڈاکٹر اور کتنے دکاندار وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب منصوبہ بندی ریاست کیسے کر لیتی ہے جبکہ ریاست کے پاس مستقبل کی پیش گوئی کا کوئی خدائی اختیار یا طاقت بھی نہیں ہوتی؟ جواب یہ ہے کہ ریاست اپنے تمام کام انتظامی طور پر بیوروکریسی سے کرواتی ہے اور سیاسی طور پر سیاست دانوں سے۔ فرعون کے اہرام مصر سے لے کر فاشسٹ ریاستوں (ہٹلر اور مسولینی کی ریاستیں) اور کیمونسٹ و سوشلسٹ ریاستوں میں یہی ریاستی آمریت کا نظام پایا جاتا تھا جس میں ریاست انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو سختی سے پلان (plan) اور کنٹرول کرتی تھی ۔اس نظام میں بھی ہر فرد کو اپنے سیلف انٹرسٹ کو مرکزی حکومت کے حضور سرنڈر کرنا پڑتا ہےاور مفروضہ سوشل انٹرسٹ کو شہریوں کے سیلف انٹرسٹ پر نافذ کیا جاتا ہے۔

3- سیلف انٹرسٹ پر قائم مارکیٹ کانظام : یہ درج بالا دونوں نظاموں کے برعکس ہے - اس میں فرد کوآزادی حاصل ہوتی ہے کہ جو بھی پیشہ اپنے لیے پسند کرے اسے Pursue کرسکے -جو خریدنا چاہتا ہے خریدے-جو بیچ سکتا ہے بیچے اور جیسے چاہے اپنی معاشی منصوبہ بندی کر سکتا ہے-اس میں فرد کو معاشی میدان میں خود مختاری حاصل ہوتی ہے-

اکنامکس کو جنم بھی ایک مارکیٹ میں تمام افراد کے سیلف انٹرسٹ کی جستجو کے عمل سے ملتا ہے ، جب ہم دیکھتے ہیں کہ تمام افراد اپنے آزاد معاشی فیصلوں میں اپنے سیلف انٹرسٹ کو کن بنیادوں پرPursue کرتے ہیں اور پھر ہم ایک کل میں ان انفرادی معاشی فیصلوں کو جنرلائز کرنے کی کوشش کرتے ہیں (Macroeconomics) –

مارکیٹ کی قوت ، بھارت میں قدیم ذات پات کے قانون کو بدل رہی ہے -

اس سال بھارت میں لبرل معاشی اصلاحات کی سالگرہ منائی گئی، جن کے سبب اس ملک نے بہت ساری سوشلسٹ معاشی پالیسیوں سے پیچھا چھڑایا اور ڈریکولا ٹائپ لائسنس راج کا خاتمہ ہوا - معشیت کی لبرلائزیشن نے ان 25 سالوں میں بھارت میں بہت سارے لوگوں کی زندگی بدل دی ہے -تاہم اب بھی بہت کچھ ہے جسے بدلنا لازم ہے - صرف 1991 سے 2014 کے درمیانی عرصے میں مڈل کلاس کی تعداد 30 ملین سے بڑھ کر 300 ملین ہو چکی ہے-

اس لئے یہ بہترین موقعہ ہے کہ ان لوگوں کی کہانی لکھی جائے جنہیں ان اصلاحات کا غیر متوقع فائدہ ہوا : دلت کروڑ پتیوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوا ہے - ان حالیہ برسوں میں لاکھوں اچھوت یا دلت جنہیں بھارتی ذات پات کے نظام میں کمتر مقام حاصل ہے، غربت سے نکل کر اپنے کاروبار کے امیر مالک بنے ہیں - ان میں سے کچھ تو کروڑپتی ہیں –

اس سب کچھ کا سبب مارکیٹ اصلاحات سے پیدا ہونے والے عظیم معاشی مواقع ہیں –

یہ تیزی سے ابھرتے ہوئے دلت ہمیں مارکیٹ کی طاقت کی نہایت اہم مثال فراہم کرتے ہیں-مارکیٹ نہ صرف ان کی معاشی بلکہ سماجی امتیازات کے خلاف جنگ میں انہیں بھرپور اندازہ میں مورچہ بند مدد فراہم کی ہے –

بھارت کا ذات پات کا نظام ایک قدیم اور پیچیدہ سماجی نظام ہے. جو سوسائٹی کو تقسیم محنت (ڈویژن آف لیبر) کے جامد تصور کے تحت طبقات میں تقسیم کرتا ہے- دلت اس سماجی نظام میں سب سے کمتر درجے کا طبقہ ہے جس پر چار طبقات نسلی بنیادوں پر حاوی ہیں:

1-پنڈت، مذہبی طبقہ

2- جنگجوؤں کا طبقہ

3- تاجروں کا طبقہ

4- دستکار وں کا طبقہ

روایتی طور پر ان دلتوں سے وہ سارے گندے (Dirty) کام لئے جاتے ہیں جو باقی چار طبقات کرنا پسند نہیں کرتے - جیسا کہ گھر کے فرش اور ٹوائلٹ کی صفائی، کوڑاکرکٹ کو اکٹھا کرنا اور ٹھکانے لگانا وغیرہ- انہیں اچھوت اس لئے بھی کہا جاتا ہے کہ دوسرے طبقات کے لوگ انہیں چھونے سے پرہیز کرتے ہیں یعنی ان سے رابطہ میں رہنا پسند نہیں کرتے-

جیسا کہ کسی کی ذات و پیشہ کو اس کی پیدائش سے ہی متعین کر دینا اور اس کے لئے ناممکن بنا دینا کہ وہ اس مخصوص پیشے سے باہر ساری زندگی نہیں نکل سکتا، کا دراصل مطلب ہی یہی ہے کہ کم آمدن کے کمتر روزگار سے جڑے خاندان میں پیدا ہونا آپ کو ساری زندگی اسی رتبہ کے پھندے میں ہی قید رکھنا ہے -آپ شادی بھی صرف اپنی ذات کے لوگوں سے کر سکتے ہیں- پھر آپ کے پیدا ہونے والے بچے بھی اسی اچھوت شناخت کے ساتھ انھی مسائل سے گزریں گے جن سے آپ گزرے - اس طرح یہ نظام آپ کو باقاعدہ طور پر نسل در نسل امتیازات کی قید میں رکھتا ہے-

اس لئے حیران نہیں ہونا چاہئے کہ دلت ۱۹۹۱ء سے پہلے غربت کے پھندے میں قید اس ملک کی شماریات میں سب سے بدترین حالت کے غریب تھے - انہیں غریبوں کے غریب (poorest of the poor) کہا جاتا تھا جو کہ سماجی و معاشی رتبوں کا واضح اظہار ہے - کئی دہائیوں میں بہت سارے حکومتی عملی منصوبوں سے یہ کوشش کی گئی کہ انہیں اس غربت سے نکالا جائے- بہت سارے سیاستدان اس مقصد کے حصول کے لئے بطور چیمپئن ابھر کر سامنے آئے-
مگر ان حکومتی اقدامات سے کچھ لوگوں کو تو فائدہ ہوا مگر یہ حکومتی منصوبے مسائل کے حل میں اکسیراعظم ثابت نہ ہو سکے- جب تک کہ معیشت حکومت کے قبضہ میں رہی اور ہر معاشی مرحلہ پر بہت زیادہ لائسنگ کی ضرورتیں رائج رہیں، جب تک ریاست خود ہی سارے پیداواری فیصلے کرتی رہی اور لائسنس صرف من پسند طبقہ اشرافیہ کے چند مخصوص افراد کو ہی عطا کئے جاتے رہے - اس حکومتی کنٹرول کا نتیجہ تھا کہ کارجوئی (Entrepreneurship) اور ذاتی کاروبار کے مواقع انتہائی محدود تھے. اور حکومتی منصوبے صرف یہ کرتے رہے کہ وہ مخصوص عدد میں رقم کو ان دلتوں میں تقسیم کر کے امید کرتے رہے کہ اب دلت مرکزی دھارے میں آجائیں گے-
مگر اب ۱۹۹۱ء کی لبرل اصلاحات کے بعد دلتوں میں کارجوئی اور اپنی مدد آپ کا نیا رجحان دیکھنے میں آیا ہے.اگر آپ دلتوں کی "دلت چیمبر آف کامرس" کا وزٹ کریں تو ایسے سلوگن پڑھنے کو ملیں گے "ذات پات کے نظام کے خلاف سرمایہ کی مدد سے جنگ" اور "روزگار دینے والے بنئے، نہ کہ روزگار کے متلاشی"- اسی طرح اگر ان کے ترجمانوں سے ملاقات کی جائے تو وہ ایڈم سمتھ کے تصور "نا دیدہ ہاتھ (Invisible Hand)" کو بار بار اپنی باتوں میں پسندیگی سے نقل کرتے ہیں –

یاد رہے کہ یہ "دلت چیمبر آف کامرس" رضاکارانہ بنیادوں پر 2003 میں قائم کی گئی تھی جس کا مقصد دلت کارجوؤں (Entrepreneurs) کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنا ہے - اس وقت ان کی تعداد 5000 ہے جن کا کل سیل ریوینو (Sale Revenue) نصف بلین ڈالر سے بھی زائد ہے ، جبکہ پورے بھارت میں تمام کارجوؤں کی تعداد اس سے کئی گنا زائد ہے-

آخر اس کامیابی کا سبب کیا ہے؟ اس پر درجنوں کامیاب لائف سٹوریز کے مطالعہ سے جو تجرباتی تحقیقات کی گئی ہیں ، وہ ایک مشترک دھاگے کا انکشاف کرتی ہیں : مارکیٹ میں پیداواری عمل کو آزاد کرنا جس سے مارکیٹ کی قوتوں کی بدولت نئے کاروباری مواقع پیدا ہوئے ہیں جو پہلے نہیں پائے جاتے تھے- عام سے وسائل اور قلیل و ناکارہ سرمایہ سے شروع کرنے والے یہ دلت بزنس مین آج بڑی بڑی کمپنیوں کے مالک ہیں جو دلچسپ بات یہ ہے کہ طبقہ امراء کے لوگوں بھی روزگار فراہم کر رہی ہیں –

اب ہم اس دلچسپ سوال پر غور کرتے ہیں کہ ایسا کیسے ممکن ہو پاتاہے کہ مارکیٹ سماجی امتیازات کے خلاف جنگ کرتی ہے؟ مارکیٹ ....، حکومتی منصوبہ بندیوں سے جو ظاہر بھی ہوتی ہیں، مختلف طرح سے کام کرتی ہے – جیسا کہ ریاست اگر تفریق و تعصب کو ناپسندیدہ سمجھتی ہے تو وہ اسے غیر قانونی قرار دے کر ذات پات کی شناخت کو غیر قانونی و ممنوع قرار دیتی ہے- دیکھا یہ گیا ہے ذات پات کی قانونی ممانعت اتنی ثمر آور نہیں - جبکہ مارکیٹ ، خاموشی سے اور غیر محسوس مگر انتہائی موثر طریقوں سے کام کرتی ہے کہ ذاتوں کی شناخت (یعنی ذات پات کے ظالمانہ نظام کو) کو اپنے مارکیٹ نظام کے نظام کے ذریعے غیر متعلقہ (Irrelevant) بنا کر رکھ دیتی ہے کہ سابقہ تفریق و تعصب مٹتے نظر آتے ہیں –

مقابلہ کی ثقافت میں معنی خیز اور متعلقہ (Relevant) متبادل سامنے آتے ہیں جو ان تمام لوگوں کے لئے جو مارکیٹ کا حصہ بنتے ہیں ، اگر امتیازی رویہ رکھیں تو مواقع کے حصول پر آنے والے اخراجات (Opportunity Cost) بڑھ جاتے ہیں - مثال کے طور ایک کاروباری آدمی کا معاشی فائدہ اس میں ہے کہ وہ ان لوگوں کو روزگار پر رکھے یا ان لوگوں سے کنٹریکٹ (Contract) کرے جن سے اسے فائدہ ہو ، بغیر اس چیز کو دیکھے کہ ان لوگوں کی بطور ذات شناخت کیا ہے - اگر وہ اس چیز کو نہیں دیکھے گا تو اس کا مارکیٹ میں مدمقابل اس سے اس کا نفع (ان لوگوں سے معاہدے کر کے جنہیں اس نے نسلی امتیازات کے سسب ریجیکٹ کیا تھا) چھین لے گا جو وہ دراصل کما سکتا تھا – جتنی مارکیٹ اوپن اور مسابقتی (competitive) ہو گی اتنا ہی یہ حقیقت کھل کر سامنے آئے گی –

جیسے ہی کوئی لبرل اصلاحات کی جاتی ہیں وہ نئے مواقع اور امکانات پیدا کرتی جاتی ہیں جو پہلے نہیں پائے جاتے تھے- مارکیٹ کی قوتیں غیر محسوس طور پر سوسائٹی کے غریب اور امتیازی سلوک کا شکار افراد کے لئے معاشی اور سماجی ترقی لاتی ہیں-

(بشکریہ فاؤنڈیشن فار اکنامک ایجوکیشن) (32)

دکاندار روزانہ دکان کیوں کھولتا ہے اور سوشل میڈیا ہم کیوں استعمال کرتے ہیں ؟

دکاندار روزانہ بلا ناغہ دکان اس لیے کھولتا ہے کہ اس کے پاس موجود وسائل اور متبادل پیشوں میں بہتر انتخاب یہی دکانداری ہے ۔اس کے ویلیو ججمنٹ سسٹم میں یہی اس کا حسن انتخاب ہے۔

کیا ہم نے کبھی سوچا کہ لوگ سوشل میڈیا ،ٹویٹر یا انسٹا گرام کیوں استعمال کرتے ہیں ؟ ان کمپنیوں کے مالکان نے تو کبھی لوگوں کے دروازوں پر دستک نہیں دی کہ آئیں اسے استعمال کریں۔اس لیے کہ ہمارا سیلف انٹرسٹ اور ہماری یہ خواہش کہ ہم اپنی ورچوئل سوشل لائف سے جڑ کر رہیں اور لطف اندوز ہوں، ہمیں اس ویب سائٹ پر لے جاتے ہیں۔سوال یہ بھی ہے کہ وہ کونسی قوت محرکہ ہے جو ان اداروں کے منتظمین کو مجبور کرتی ہے کہ ان کی ویب سائٹ کا استعمال لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ آسان مطلب User Friendly ہو ،اور مزید سے مزید لوگ ان ویب سائٹس سے جڑ کر رہیں – وہ قوت محرکہ یہ ہے کہ ان سوشل ویب سائٹس سے جڑی کمپنیوں کا سیلف انٹرسٹ (کمپنی مفاد) اسی میں ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ جڑیں اور وہ نفع کمائیں ۔

لوگ فیس بک اس وقت تک استعمال کریں گے جب تک موجودتمام متبادلات میں وہی لوگوں کو زیادہ سے زیادہ پسند آئے گی ، تب ہی لوگ اپنے قیمتی وقت کو اس میں کھپائیں گے ۔ وگرنہ وہ کسی اور بہتر ویب سائٹ یا سماجی رابطوں کے کسی دوسرے ذریعے سے رجوع کر لیں گے۔یہی معاملہ فیس بک بمقابلہ انسٹا گرام میں بھی ہم نے دیکھا۔فیس بک کا بانی مارک اپنے صارفین (users) کو اس لیے زیادہ سے زیادہ Facilitate کرنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ اس میں ہی اس کا نفع ہے اور یہ نفع (پرافٹ) کی جستجو دراصل سیلف انٹرسٹ کی ہی جستجو کا نام ہے۔ یہ مارک کا بزنس ہے جس نے اسے عالمگیر شہرت دی ہے اور اس نے پوری دنیا کو ایک ویب سائٹ یعنی فیس بک پر اکٹھا کر دیا ہے ۔یہ اس کا اپنی ذات ،صلاحیتوں اور دستیاب وسائل میں سب سے بہتر پروفیشن کا انتخاب ہے۔

سیلف انٹرسٹ میں افراد کے گروپ کا سائز اور معلومات و کمیونیکشن کا مسئلہ :

سوسائٹی میں گروپس کے سائز اور اپنے حجم کے اعتبار سے دو اقسام ہیں ۔

1۔ایک چھوٹا گروپ جیسے خاندان ،کمیونٹی ،ٹیم،آرگنائزیشن،آرمی، محلہ، مذہبی تنظیمیں وغیرہ۔ اس میں افراد ایک دوسرے کو جانتے ہیں ۔ملتے جلتے رہتے ہیں اور ہر فرد جانتا ہے کہ دوسرے فرد کی ترجیحات کیا ہیں اور وہ کیا مقاصد ہیں جنہیں حاصل کرنے کی وہ جستجو میں مصروف ہے ۔یہاں سیلف انٹرسٹ کا دائرہ سکڑ جاتا ہے اور گروپ کے انٹرسٹ کو ترجیح حاصل ہوجاتی ہے۔

- مثال کے طور پر ایک خاندان ہے اس کے ممبرز کے لیے ضروری ہے کہ وہ خاندان کے انٹرسٹ کو اپنے ذاتی انٹرسٹ پر فوقیت دیں۔ ورنہ خاندان قائم نہ رہ سکے گا۔
- ایک سپورٹس ٹیم ہے۔اگر ٹیم کا ہر رکن پوری ٹیم کے بجائے محض اپنی ذات کے لیے کھیلے گا تو ٹیم ہار جائے گی۔
- اسی طرح ایک کمرشل آرگنائزشن یعنی کمپنی ہے ۔ اگر اس کے ارکان آرگنائزیشن کے مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دیں گے تو آرگنائزیشن کی کارکردگی مجروح ہوگی اور وہ یقینا دیوالیہ ہو جائے گی ۔

گروپ جتنا چھوٹا ہوتا ہے اتنا ہی اس کے ارکان ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں ۔ان کے مفاد باہم یکجاہوتے ہیں۔ایک دوسرے کی پسند و ناپسند اور ترجیحات و مقاصد کو جاننے کے سبب گروپ کے ارکان ایک دوسرے کے لیے زیادہ دوستی اور خیر خواہی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ جیسے جیسے گروپ بڑا ہوتا جاتا ہے۔ ترجیحات و مقاصد کی کمیونیکیشن محدود ہوتی جاتی ہے ، مفادات میں تضادات آتے جاتے ہیں اور باہمی تعلق کمزور ہوتا جاتا ہے ۔مثال کے طور پر ہم اپنے گھر کے افراد کی کسی مشکل میں ضرور مدد کرتے ہیں مگر بھکاریوں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کم ہی مدد کرتے ہیں — دو افراد اگر وہ ہمارے فیملی ممبر نہیں اور ہم سے مالی امداد کے طلبگار ہیں تو ہم زیادہ سنجیدگی اور اخلاص سے صرف ان کی بات سنیں گے جس سے واقف ہوں گے —

یاد رہے کہ ہم سماج میں تعلقات محض اپنی معاشی ضروریات کے سبب نہیں بناتے بلکہ ان میں ایک اور جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے ، خوشی کی تلاش۔ہم بعض گروپ جیسا کہ مثال کے طور پر دوستوں کا گروپ انٹرٹیمنٹ اور خوشی کے حصول کے لیے بھی قائم کرتے ہیں۔ جب تک ہمیں خوشی حاصل رہتی ہے۔ہم اس گروپ سے جڑے رہتے ہیں اور جب یہ کیفیت کمزور ہوتی جاتی ہے ہمارا گروپ سے تعلق بھی کمزور ہوتا جاتا ہے۔

2۔ **بہت ہی بڑے گروپ /پوری سوسائٹی** : بڑے معاشروں میں تنوع پایا جاتا ہےیعنی ترجیحات و مقاصد میں اختلافات پایا جاتا ہے ۔یکسانیت نام کی چیز عموما عنقا ہوتی ہے۔اب ایک فرد دوسرے فرد کے انٹرسٹ کو اپنے ویلیو ججمنٹ سسٹم کے تحت قیاس (Speculate) نہیں کر سکتا اس لیے وہ اس کی انفرادیت اور سماج کے تنوع کا احترام کرتا ہے۔ ایک متنوع معاشرہ وہی ہے جس میں ہر فرد اور چھوٹے گروپس (افراد کی ایسوسی ایشنز) کو آزادی ہو کہ وہ اپنے مقاصد اور ترجیحات کو پر امن انداز سے Pursue کر سکیں۔

گروپ میں ہم اس کے ممبران کے ایک مخصوص دائرہ میں (مفادات کو) سمجھتے ہیں جب والدین پوری فیملی کے لیے آفس میں سخت محنت کر رہے ہوتے ہیں تو جانتے ہیں کہ ان کے بچوں کا مفاد اسی میں ہے۔ جب ہم ٹیم میں کھیل رہے ہوتے ہیں تو جانتے ہیں کہ ہمارا بطور کھلاڑی مفاد بھی ٹیم کی جیت میں ہے۔جب فوج میں ہمارا افسرہمیں کہتا ہے کہ جاؤ کیمپ سے باہر پہرہ دو تو ہم جان رہے ہوتے ہیں کہ ہم سب کی زندگی کا تحفظ بھی اسی میں ہے۔چھوٹے گروپ میں انفارمیشن (یعنی دوسرے کی پسند و ناپسند) کا مسئلہ نہیں ہوتا،مثال کے طور پر جب ہم سڑک پر چل رہے ہوتے ہیں تو ہر آتے جاتے اجنبی کے پاس سے خاموشی اور پرسکون چہرے سے گزر جاتے ہیں۔ جیسے ہی ہمیں کوئی شناسا نظر آتا ہے ہم فورا مسکرادیتے ہیں ، اور اس سے اس کا حال پوچھ رہے ہوتے ہیں۔جوں جوں ہم بڑی سوسائٹی میں پھیلتے جاتے ہیں ترجیحات و مقاصد کی معلومات کا مسئلہ گہرا ہوتا جاتا ہے اور اجنبیت بڑھتی جاتی ہے ۔ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہوتا کہ ہم جان سکیں کہ دوسرے انسانوں کا مفاد کس چیز میں ہے، انہیں کس چیز سے راحت پہنچتی ہے اور کس چیز سے رنج ،انہیں کیا پسند ہے اور کیا نہیں،اس صورت میں قابل عمل اور متوازن رویہ یہی ہے کہ ہم اپنے کام سے کام رکھیں اور انہیں اپنی شخصی آزادی ، نجی زندگی کے احترام اور سیلف انٹرسٹ کو pursue کرنے دیں –

مارکیٹ سیلف انٹرسٹ کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے

مارکیٹ بھی دراصل افراد کے سیلف انٹرسٹ سے پورے معاشرے کے سوشل انٹرسٹ کا نام ہے۔ایک کارجو (Entrepreneur) کا سیلف انٹرسٹ پرافٹ میں ہوتا ہے۔نفع کا حصول ہی اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ ایسی چیز بنائے جو لوگ پسند کرتے ہیں ،جولوگوں کے انفرادی سیلف انٹرسٹ کی مجموعی طلب ہے، اس چیز کو ویسے بنایا جائے، قیمت اور کوالٹی میں جیسے وہ لوگ چاہتے ہیں اور جو انہیں باقی متبادلات (Alternatives) میں سب سے بہتر لگے۔اس پورے معاملہ کو ایڈم سمتھ اس طرح بیان کرتا ہے۔

"It is not from the benevolence of the butcher, or the baker, that we expect our dinner, but from their regard to their own self-interest"

(قصاب یا نانبائی کا لطف و کرم نہیں بلکہ ان کے اپنے معاشی فائدے کے طفیل ہم اپنے ڈنر کی ان سے امید رکھتے ہیں)۔(33)

سیلف انٹرسٹ ،سوشل انٹرسٹ سے متصادم نہیں۔

اگر سیلف انٹرسٹ کا وہی مطلب ہوتا جوسوشلسٹ حضرات یا ملا حضرات بیان کرتے ہیں تو آج مغرب تباہ ہوچکا ہوتا کیونکہ وہاں کا مارکیٹ سسٹم اپنی اصل میں فرد کے سیلف انٹرسٹ پر انحصار کرتا ہے۔ جبکہ صورتحال ویسی نہیں جیسے ملا و سوشلسٹ حضرات بتاتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ سیلف انٹرسٹ کا اردو ترجمہ لالچ (Greed) غلط کیا گیا ہے۔

رومانیت پسندی میں لوگوں کو تبلیغ و تلقین کی جاتی ہے کہ وہ اپنے سیلف انٹرسٹ کو سرنڈر کر کے کسی مفروضہ سوشل انٹرسٹ کی آمریت میں آجائیں۔ایک فرد کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا اس لیے کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ دوسرے افراد کا مفاد کس چیز میں ہے یوں اپنی آمریت نافذ کر کے لوگوں کو اپنی پسند و ناپسند اور انتخاب کے قبضہ میں لیا جائے۔ سوشل انٹرسٹ کبھی نافذ نہیں ہوتے بلکہ یہ سوسائٹی میں develop ہوتے ہیں -

حقیقت یہ ہے کہ مطلق العنانیت اور آمریت نے ہمیشہ اپنے جواز میں سوشل انٹرسٹ کے کسی مفروضہ تصور کو ہی پیش کیا ہے۔ اس بارے میں ہٹلر و مسولینی کیا کہتے تھے ملاحضہ فرمائیں -

"فرد کے حقوق ہوتے ہی نہیں، اس کے فقط فرائض ہوتے ہیں– (ہٹلر)" (34)

"ہماری قوم صرف ایک سادہ اصول سے صحت یاب ہو سکتی ہے۔ سوشل انٹرسٹ(سماجی مفادات) کو سیلف انٹرسٹ (انفرادی مفادات) پر ترجیح دی جائے۔ (ہٹلر)" (35)

"یہ اصول کہ سوسائٹی جو لوگوں سے وجود میں آتی ہے، صرف ان لوگوں کی فلاح اور ان کی آزادی کے لئے ہی قائم کی جاتی ہے، فطرت کے منصوبہ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر کلاسیکل لبرل ازم سے مراد انفرادیت پسندی ہے تو فاشزم سے مراد صرف گورنمنٹ ہے– مسولینی " (36)

سیاست میں جمہوریت ہو یا سیکولرازم،سوسائٹی میں تنوع پسندی ہو یا معیشت میں فری مارکیٹ کیپٹلزام ،یہ اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتے جب تک افراد کو ان کے ارادے و عمل میں آزاد نہ کر دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے سیلف انٹرسٹ کو Pursue کر سکیں۔ہمیں دوسروں کے ذاتی نظام برائے ویلیو ججمنٹ کا احترام کرنا چاہیے۔حقیقت یہ ہے کہ مغربی معاشرے آج زیادہ امیر و خوشحال ،زیادہ جمہوری،زیادہ متنوع اور زیادہ سیکولر ہیں جس کی وجہ ان میں وقت کے ساتھ ساتھ پنپنے والی انفرادیت پسندی کی اقدار ہیں۔

اور ملٹن فریڈمین نے اسے اپنے خوبصورت الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے –

"The Only Person who can truly persuade you is yourself." (37)

وہ واحد شخص جو آپ کے مفادات حسن نیت اور حسن منصوبہ و نتیجہ سے pursue کرسکتا ہے وہ کوئی اور نہیں صرف آپ ہیں ۔

جب ہم کسی پرائیویٹ کمپنی کے ہوٹل میں جاتے ہیں تو کسٹمر ریلیشن آفیسر ہمیں پروٹوکول دیتے ہیں،کوالٹی دیتے ہیں ، ان کی کوشش ہوتی ہے کہ جب تک ہم یہاں رہیں ان کی خدمت سے مطمئن رہیں اور آئندہ بھی اس شہر میں قیام کے لیے ان کے ہوٹل کا انتخاب کریں۔ اس سلسلے میں قیمت اور کوالٹی کو ترجیحی بنیادوں پر بہتر بنایا جاتا ہے۔یہی صورتحال بنک کی سروسز میں بھی ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ کسٹمر ریلیشن کی سہولیات و سروسز مارکیٹ کا پروڈکٹ ہیں۔ یہ سروسز سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک میں نہیں پائی جاتی تھیں اور پرائیویٹ سیکٹر کے علاوہ ہمارے گورنمنٹ سیکٹر میں بھی ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے ۔

پاکستان میں اس کی مثال ہمارے ٹیلی کمیونیکشن سیکڑ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ جب مارکیٹ پر پی ٹی سی ایل کی اجارہ داری تھی تو اس کا نتیجہ کیا تھا ، کم کوالٹی مگر مہنگی سروسز اور ٹیلی فون لائنز کے حصول اور بلنگ (Billing) کے لیے شدید مشکلات تھیں ۔جب اس شعبے کو پرائیوٹائز کیا گیا تو اس کے بہتر نتائج بھی ہمارے سامنے آئے۔مارکیٹ کو وسعت ملی ہے ، کوالٹی بہتر اور قیمت انتہائی کم ہوتی ہے ، کنیکشن کے حصول اور بلنگ کی مشکلات تقریبا صفر ہیں،صارفین زیادہ بہتر سروسز سے مستفید ہورہے ہیں، حکومت کو ٹیکسز کی شکل میں زیادہ فائدہ ہورہا ہےاور مارکیٹ کی وسعت سے روز گار اور لوگوں کی آمدن میں اضافہ ہوا ہے۔

سیلف انٹرسٹ اور سیکھنے کی خوبی۔

یہاں ہم فرد کے شخصی نظام اقدار کو اس کے تجربات (Experiences)کے حوالے سے بھی دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ اس میں Learning یعنی سیکھنے کی خاص خوبی پائی جاتی ہے۔ فرد جب ایک تجربہ سے گزرتا ہے توسیکھتا ہے۔اگر وہ بہتر نتائج پاچکا ہوتا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اگلے تجربہ میں مزید بہتر نتائج برآمد ہوں اور اگر وہ غلط نتیجہ کا سامنا کر رہا ہوتا ہے تو وہ حتی الامکان کوشش کرتا ہے کہ اس تجربہ کو دوبارہ نہ دہرائے۔ہمارے معاشی فیصلوں میں یہ خوبی لازمی طور پر پائی جاتی ہے۔ ہم ان چیزوں کو زیادہ دلچسپی اور سنجیدگی سے سیکھتے ہیں جن میں ہمارا سیلف انٹرسٹ زیادہ ہو ۔

مثال کے طور پر اگر ہم کسی دکان سے کوئی شے مہنگے داموں اور کم کوالٹی کی خرید تے ہیں جبکہ دوسری دکان پر وہی چیز اچھی کوالٹی اور کم داموں پر مہیا تھی تو ہم دوسری بار بہتر متبادل کی طرف جائیں گےاور سیکھنے کے اس عمل (learning) کی بدولت دوبارہ اس نقصان دہ تجربہ سے دوبارہ نہیں گزریں گے۔یاد رہے کہ learning اور بہتر انتخاب کامعاملہ اس وقت بہتر کام کر رہا ہوتا ہے جب کسی مخصوص شے یاخدمت کے سلسلے میں ہمارے پاس بہتر متبادل (Alternatives) موجود ہوں۔تاکہ ہم دوسرے متبادل کے ساتھ اپنے تجربہ کا موازنہ

کر سکیں اور اگلی مرتبہ بہتر چیز یا خدمت کو منتخب کریں۔ یہ صرف مقابلہ کی ثقافت میں ہی ممکن ہے کہ ہمیں ایک شے یا خدمت کی ایک سے زیادہ ورائٹیز (varieties) اور متبادلات میسر آتی ہیں۔

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ ہمیں تجربات و مشاہدات کرنے ، Trial & Error کی سائنس سے سیکھنے ، اور نتائج سے سبق سیکھ کر اپنی اصلاح کرنے کی آزادی میسر ہونی چاہیئے – اگر آزادی اور خود نگہبانی (Self Responsibility) نہیں ہو گی تو سیکھنے کا رجحان بھی ممکن نہیں ہو گا ۔

سیلف انٹرسٹ کی حدود۔

سیلف انٹرسٹ کی بھی اخلاقیات ہیں اور معاشی فلسفہ ان اخلاقیات کی پابندی کو دراصل افراد کے سیلف انٹرسٹ کا ہی تحفظ سمجھتا ہے۔ جیسا کہ آزادی کی اخلاقیات یہ نہیں کہ کسی دوسرے فرد کی آزادی پر حملہ آور ہوا جائے ، ویسے ہی سیلف انٹرسٹ کی اخلاقیات یہ ہیں کہ ہر فرد کو سیلف انٹرسٹ Pursue کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہو اور ایک فرد دوسرے فرد کے سیلف انٹرسٹ میں ناجائز طریقے سے حائل نہ ہو ۔

حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تمام شہریوں کے اس حق کا تحفظ کرے کہ وہ اپنے اپنے سیلف انٹرسٹ کو جائز طریقے سے Pursue کرسکیں۔ ذیل میں سیلف انٹرسٹ کے کچھ تقاضے اور پابندیاں ہیں۔ سیلف انٹرسٹ کے ضمن میں ان سوالات پر غور کرنا ہو گا

کیا اس دنیا میں کوئی ایسی سوسائٹی بھی ہے جو شخصی مفادات پر نہ چلتی ہو؟
کیا روس شخصی مفادات پر نہیں چلتا؟
کیا چین شخصی مفادات پر نہیں چلتا؟
اپنے شخصی مفادات کی جستجو کرنے سے کیا مراد ہے ؟
بعض لوگ کہیں گے کہ نہیں ہم ذاتی مفادات کو ترجیح نہیں دیتے وہ اور لوگ ہیں جو ذاتی مفادات کو ترجیح دیتے ہیں ۔
یاد رہے کہ دنیا ان تمام افراد سے چلتی ہے جو اپنے اپنے مفادات کی جستجو کر رہے ہیں۔

انسانی تہذیب کے بہترین کارنامے سرکاری بیوروکریسی نے نہیں سرانجام دیئے.
آئین سٹائن نے اپنا نظریہ کسی بیوروکریٹ کے حکم پر نہیں پیش کیا تھا۔
ہنری فورڈ نے بھی اس طرح سے آٹو موبائل انڈسٹری میں انقلاب برپا نہیں کیا تھا۔

صرف ایک طریقہ ایسا ہے جس سے لوگ غربت کے پھندے سے نکل سکتے ہیں جس کی آپ سب کو فکر ہے، صرف ایک طریقہ جو اب تک کی تاریخ میں کامیاب رہا ہے، وہ سرمایہ دارانہ نظام ہے اور آزاد تجارت کا نظام ہے۔
اگر آپ جاننا چاہتے ہے کہ کہاں لوگ بدترین حالت سے دوچار ہیں ؟ ....
یہ وہ معاشرے ہیں جہاں سرمایہ دارانہ نظام نہیں یا اس سے انحراف کیا گیا ہے۔
اسی لئے انسانی تاریخ مکمل طور پر واضح ہے کہ عام شہریوں کے لئے بہترین طرز زندگی کا بندوبست قائم کرنے کے سوائے کیپٹل ازم اور فری ٹریڈ کے اور کوئی متبادل دریافت نہیں ہوسکا جو ایک شمع کو یوں تخلیقی سرگرمیوں میں تھام لے کہ اس کی روشنی چہار سو پھیل جائے۔
(ملٹن فریڈ مین)

معاشی زندگی میں کامیابی کے دو طریقے ہیں۔

1) مارکیٹ کا سامنا کریں ، مقابلہ کی ثقافت میں کام کریں اور صارفین جو ڈیمانڈ کرتے ہیں وہ اشیاء و خدمات مہیا کر کے نفع کمائیں
2) اجارہ داری (مناپلی) قائم کرنے کی کوشش کی جائے ، مقابلہ کی ثقافت سے انحراف کیا جائے اور انڈسٹری میں اپنے مدمقابل کو ناجائز طریقے سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے ۔

یاد رہے کہ یہ طریقہ مقابلہ کی ثقافت میں اصولی طور پر بھی ممکن نہیں کہ کسی کمپنی کو کسی سیکٹر میں سرمایہ کاری کرنے کی اجازت نہ دی جائے ۔یہ صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کسی مخصوص انڈسٹری کے طاقتور عناصر سیاسی اثر و رسوخ استعمال کر کے اپنے حق میں کوئی قانون سازی کروا لیں یا ریاستی انتظامیہ کی مدد حاصل کر کے دوسرے فریق کو جبر ،تشدد اور دھمکی سے مقابلہ کی مارکیٹ سے باہر رکھنے کی کوشش کریں۔ سیاسی اثر و رسوخ اور جبر سے دوسروں کو سیلف انٹرسٹ سے محروم رکھنے کے سنگین نتائج نکلتے ہیں۔اس سے مقابلہ کی ثقافت ختم ہوجاتی ہے، اور سوشل انٹرسٹ کمزور پڑجاتا ہے۔ (اس موضوع کو آگے تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔)

پاکستان میں بدقسمتی سے اجارہ داری کی سیاست و معیشت کا راج ہے ، یوں یہاں نہ مقابلہ کی ثقافت کو فروغ مل سکا ہے ، اور نہ ہی سوشل انٹرسٹ (سماجی مفادات) کا دائرہ کار وسیع پیمانے پر پھیل سکا ہے ، جیسے ہم اقوام مغرب میں دیکھتے ہیں۔یہاں صرف سیاست ومعیشت میں ہی نہیں بلکہ سماج اور چھوٹے چھوٹے سماجی گروپوں میں بھی جبر و استحقاق اور جارہ داری کی ثقافت کا غلبہ ہے۔خاندانی نظام کو ہی دیکھ لیں جس میں مرد عورت کے حقوق پر قابض ہے۔ بیٹے کو بیٹی پر استحقاق حاصل ہے۔ ریاستی سطح پر دیکھیں تو سیاست میں اسٹیبلشمنٹ کاپورے سیاسی نظام پر قبضہ و کنٹرول ہے۔ ان تمام مسائل کا حل یہی ہے کہ ہر میدان میں اجارہ داری و استحقاق کی ثقافت کی نفی کی جائے، اور

مقابلہ و انفرادیت پسندی کی اقدار کو فروغ ملے تب جاکر ہی سیاست جمہوریت پسنداور عوام دوست بنے گی ، معیشت سوشل انٹرسٹ کو جنم دے گی اور سماج میں رضاکارانہ اشتراک کی فضا کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے گاتاکہ تمام انسان اپنی خوشی اورآزادی کو Pursue کر سکیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عظیم کامیابیاں (achievements) گورنمنٹ بیوروز کی بدولت نہیں ۔جن چیزوں کو ہم تہذیب و تمدن کا کارنامہ کہتے ہیں اور جن ایجادات و دریافتوں اور آئیڈیاز پر فخر کرتے ہیں ، وہ آزادی ارادہ و عمل کی ذاتی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔(38) آئنسٹائن نے اپنا نظریہ بیوروکریٹس کے حکم پر نہیں تخلیق کیا تھاکر رہا ہے۔وہ صرف اپنے انٹرسٹ اور خوشی کو pursue کر رہا تھا ۔

سود....

جدید معیشت کی رو سے شرح سود میں احسان ،انصاف ،اور استحصال کا مقدمہ سمجھنے کے لئے تین مثالوں سے مدد لیتے ہیں–

میرے نانا جان نے آج سے تقریبا چالیس سال قبل اپنے ایک رشتہ دار حاجی محمد کو "کلر" (سرائیکی لفظ ، معانی گوبر کی کھاد) بیچا جو کل ساٹھ بورے تھے جن کی کل مالیت اس وقت تقریبا نوے روپے بنی۔ حاجی محمد اس وقت ادائیگی نہ کر سکے ، اور بعد میں بھی میرے نانا جان کے بار بار کے تقاضوں کے باوجود بھی انہوں نے پیسوں کی ادائیگی میں تاخیر کی ۔آخرکار میرے نانا نے پیسے مانگنا بند کر دیا ۔ چالیس سال بعد میرے ماموں اور حاجی محمد کے بیٹے میں لین دین کا ایک تنازعہ پیدا ہوا جس کے سبب میرے نانا نے غصہ میں آ کر حاجی محمد سے کہا کہ گوبر کی کھاد کے پیسوں کی تم نے ادائیگی نہیں کی تھی ، تم پہلے وہ لوٹاؤ ۔ حاجی محمد نے نوے روپے جیب سے نکالے اور میز پر رکھ دیئے ۔ میرے نانا حیران رہ گئے انہوں نے کہا کہ مجھے گوبر کے کھاد کی موجودہ مارکیٹ پرائس (قیمت) پرپیسے چاہئیں ،حاجی محمد نے ان پر سود خوری کا الزام لگایا ، اور معاملہ مزید الجھ گیا۔ سوال یہ ہے کہ انصاف نوے روپے لینے میں ہے یا موجودہ مارکیٹ ویلیو پر پیسوں کی وصولی میں ہے ؟ اور اس واقعہ میں استحصال کہاں ہے اور کون کر رہا ہے ؟

میرے ایک دوست محمد ارشد ملتان میں ایک کمپنی میں کام کرتے ہیں ، مشرف دور میں ہوم فنانسنگ کا چرچا ہوا ، انہوں نے بنک سے ہوم فنانسنگ (گھر پر قرض کی ایک قسم) لی ، جس کا دورانیہ بیس سال تھا ۔ وہ اسی گھر میں رہتے ہیں جس کی انہوں نے فنانسنگ کروائی ہوئی ہے ، وہ ماہانہ قسطوں میں ادائیگی کررہے ہیں جو اس سے نسبتا کم ہے اگر وہ ویسا ہی کوئی گھر کرایہ پر لیتے ۔ اب وہ بیس سال بعد یعنی 2021ءمیں اپنے گھر کے مکمل مالک ہوں گے ۔ اسی شہر میں ایک اور دوست ہیں خالد صاحب جو ایک سرکاری ملازم ہیں ۔ خالد صاحب 1998 میں ملتان شفٹ ہوئے ، ماہانہ آج کل دس ہزار گھر کا کرایہ ادا کرتے ہیں ، اور جب مالک مکان کہے انہیں ایک ماہ کے نوٹس پر فورا گھر خالی کرنا ہوتا ہے ، گھر خالی کرنا کیسا جذباتی سانحہ ہے ہر صاحب گھر اسے سمجھ سکتا ہے ...اب سوال یہ ہے کہ استحصال محمد ارشد

کے ساتھ ہوا جو بیس سال کی ماہانہ (مکان کرایہ کے برابر) ادائیگیوں کے بعد گھر کے مکمل مالک بن جائیں گے یا خالد صاحب کے ساتھ جو 1998 سے ماہانہ کرایہ کی صورت میں ادائیگی کے باوجود مالک مکان کے رحم و کرم پر ہیں ؟

میرے ایک ماموں بہت بڑے بیوپاری ہیں ، جو دیہات میں کسانوں کو اس شرط پر کھاد، سپرے، اور دوسری اجناس دیتے ہیں کہ جب فصل تیار ہو گی تو کسان انہیں وہ فصل بیچ کر اپنا قرض چکائے گا اور بقیہ رقم وصول کر لے گا۔ قرض کا عمومی دورانیہ تین سے چار ماہ ہوتا ہے۔ کھاد کی اگر نقد مالیت ایک ہزار ہے تو تین ماہ بعد تیرہ سو سے پندرہ سو وصول کی جاتی ہے - اس سلسلے میں انہیں ہمارے علاقہ کے تمام علماء کا تعاون حاصل ہے جو فرماتے ہیں کہ یہ اجناس کا لین دین ہے سود یا ربا نہیں ...جبکہ حکومت پاکستان کی زرعی ترقیاتی بنک یا دوسرے سبسڈی پر چلنے والے ادارے کسانوں کو سہ ماہی یا سالانہ قرض دیتے ہیں جن پر انٹرسٹ ریٹ تقریبا دس فیصد کے آس پاس ہوتا ہے (جس میں مرکزی بنک کی موجودہ کم شرح کی بدولت مزید کمی متوقع ہے) - ایک ہزار کے قرض پر صرف اسی سے سو روپے - سوال یہ ہے کہ انصاف کس میں ہے اور استحصال کس میں ؟

جدید معیشت سود کے تین جواز پیش کرتی ہے جن پر کھلے ذہن سے غور کرنے کی ضرورت ہے–

1. مہنگائی ... مہنگائی کی پیمائش کا طریقہ سادہ ہے – روزمرہ کے عام استعمال کی وہ تمام اشیاء و خدمات جن کو ہر ایک استعمال کرتا اور حاصل کرتا ہے ان کے حوالے سے مہنگائی کی پیمائش کا طریقہ سمجھا جا سکتا ہے ۔ فرض کیا کہ ہم ایک سو ایسی اشیا و خدمات لیتے ہیں اور ان کی دو ہزارچودہ میں کل قیمت کا دو ہزارپندرہ کی کل قیمت سے موازنہ کرتے ہیں ، اگر کل قیمتوں میں اضافہ پانچ فیصد ہوا تو ہم کہیں گے کہ مہنگائی پانچ فیصد ہے اور اگر دس فیصد اضافہ تو ہم کہیں گے کہ مہنگائی دس فیصد ہے ۔ مہنگائی کے ساتھ ساتھ روپے پیسے کی ویلیو یا قوت خرید میں کمی ہوتی ہے - مثال کے طور پر اگر دو ہزار پانچ میں ایک روٹی کی قیمت ایک روپے تھے اور دو ہزارپندرہ میں اسکی قیمت اگر تین روپے ہے تو روٹی کے اعتبار سے مہنگائی میں دو سو گنا اضافہ ہوا ہے ، اور ایک روٹی کے ہی حساب سے ایک روپے کی قوت خرید میں دو سو گنا کمی ہوئی ہے - اسے روپے میں فرسودگی (depreciation) کہتے ہیں–

2. نقصان کا خطرہ (Risk) ... اگر میں کسی قریبی دوست یا عزیز کو قرض دیتا ہوں تو یہ خطرہ موجود ہوتا ہے کہ کیا وہ مجھے واپس کرے گا یا نہیں ۔ اسی طرح اگر میں کسی انجان یا کم واقف شخص کو قرض دیتا ہوں تو عدم ادائیگی کا خطرہ مزید بڑھ جاتا ہے ۔ بنکوں کے ڈپازٹرز (پیسے امانت رکھنے والے) کے لئے یہ خطرہ نسبتاً کم ہوتا ہے ،مگر موجود ضرور رہتا ہے ۔ گزشتہ صدی میں بہت بڑی تعداد میں بنکوں کے بحران آئے ہیں جن میں بنک اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنے ڈپازٹرز کو ان کی مطلوبہ رقم واپس کر سکیں ۔ اس بحران کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بنک جن کمپنیوں کو آگے قرض پر رقم فراہم کرتا ہے ، وہ اپنے اپنے کاروبار میں خسارہ کی صورت میں بنک کو ادائیگی میں ناکام رہتے ہیں

یوں بنک بھی اپنے ڈپازٹرز کو بوقت ضرورت ادائیگی میں ناکام ہو جاتا ہے ۔ تمام ممالک میں حکومتیں فورا اقدامات کر کے بنکوں کو بیل آوٹ (فوری ضرورت کی رقم) فراہم کرتی ہیں یوں عارضی طور پر خطرہ ٹل تو جاتا ہے مگر بالکل ختم نہیں ہوتا ۔

میری رائے میں محض قرض حسنہ کی بنیاد پر بڑے منصوبوں کی فنانسنگ ناممکن ہے ، اور بنک کے بغیر محض غیر ادارہ جاتی سماجی تعاون پر موجودہ پیچیدہ دنیا کی معاشی سرگرمیوں کو منظم کرنا بھی ناممکن ہے۔

اسی طرح بنک بھی مختلف کمپنیوں کو قرض دیتے ہوئے رقم کی وصولی پر خطرہ کو مدنظر رکھتے ہیں ۔ اگر وصولی کے امکانات انتہائی کم ہیں تو قرض دینے سے انکار کر دیا جاتا ہے ، بصورت دیگر خطرہ کی نوعیت کی بنیاد پر ان پر شرح سود لاگو کیا جاتا ہے ۔ بنک اور دوسرے فنانشل اداروں کے پاس کمپنی کے خطرہ ڈیفالٹ کو پیمائش کرنے کے لئے ریاضیاتی اور شماریاتی طریقے وافر طور پر موجود ہوتے ہیں جنہیں وہ قرض دیتے ہوئے استعمال میں لاتے ہیں ۔

3 . تلافی یا معاوضہ ادا کرنا ... اس نکتے کو سمجھنے سے پہلے ایک بات یاد رہے کہ اس کے باوجود کہ بنکنگ اور فنانشل سیکٹر پوری دنیا میں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ منظم ہو رہے ہیں ، مگر عزیزوں رشتہ داروں اور دوستوں کے درمیان قرض حسنہ کی روایت اب بھی پوری دنیا میں موجود ہے ۔ لوگ اپنے عزیز و اقارب کو قرض دیتے ہیں اور وہ انہیں واپس ادا بھی کرتے ہیں ۔ اس جذبہ کی حوصلہ افزائی یقینا ضروری ہے ۔ مگر یاد رہے کہ ہمارا اس طرح کا تعاون ایک تو زیادہ قریبی لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے تو دوسری طرف اس سے حاصل ہونے والے قرض کی کل مقدار بھی محدود ہوتی ہے جو کسی بڑے یا درمیانی درجہ کے پروجیکٹ کے لئے کافی نہیں ۔ دوسری بات یہ کہ یہ تعاون اپنی بنیاد میں رضاکارانہ ہے ، اگر کسی فرد کو اپنے کاروبار کے لئے قرض کی ضرورت ہے تو وہ کسی بھی قریبی شخص کو مجبور نہیں کر سکتا کہ مجھے ہر صورت میں قرض دیا جائے ۔ یا ایک شخص باصلاحیت ہے ، اس کے پاس کاروبار کے بہتر مواقع موجود ہیں ، مگر اس کے عزیز و اقارب میں ایسے صاحب حیثیت لوگ موجود نہیں جو اس کی مالی مدد کر سکیں تو کیا اس صورت میں اس فرد کی توانائیوں کا ضیاع ایک معقول بات ہے ؟

دور جدید کی معاشی سرگرمیاں بنک و فنانشل سیکٹر کے بغیر نہ منظم ہو سکتی ہیں اور نہ جاری رہ سکتی ہیں۔ بڑے پروجیکٹس کے لئے اربوں روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ اربوں روپے ایک فرد یا چند افراد مل کر نہیں فراہم کر سکتے اس کے لئے ایک بہت بڑی تعداد میں لوگوں کے مالی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ لوگ کسی ایسے شخص سے مالی تعاون کیوں کریں جسے وہ جانتے ہی نہ ہوں؟ یا دوسرے لفظوں میں انہیں مالی مدد کرنے کی کیا ضرورت ہے ، اگر ان کے پاس جو پیسے ہیں وہ خود انہیں کہیں انویسٹ کر دیں جیسے کوئی زمین خرید کر رکھ لیں ،چونکہ زمین کی قیمت بڑھتی جاتی ہے اس لئے کل کو انہیں اس سرمایہ کاری پر نفع مل جائے گا ؟ لوگوں کے پاس یہ بھی آپشن موجود ہے کہ وہ مستقبل کے لئے پیسے محفوظ کرنے یا کسی کو قرض دینے کے بجائے اسے آج خرچ کر لیں ؟

یوں جدید معاشی نظام لوگوں کی اس قربانی کی صورت میں تلافی کرتا ہے یا دوسرے لفظوں میں انہیں اس بات کا معاوضہ ادا کرتا ہے کہ وہ خود سرمایہ کاری کرنے یا خرچ کرنے کے بجائے ان کے کسی درمیانہ یا بڑے درجے کے پروجیکٹ میں مالی تعاون کریں - اس معاوضے کا کیسے تعین ہو گا ؟ اس کی صورت یہ ہے کہ آپ ایک ملک کی معیشت میں تمام کمپنیوں کا اوسط نفع نکالیں، اس اوسط نفع سے شرح مہنگائی اور خطرہ (رسک) کے چانس کو نفی کریں تو حاصل ہونے والا عدد سرمایہ کاری پر ملنے والے نفع (rate of return) یا معاوضہ ہو گا۔

اسی طرح آج کل شرح سود کے تعین میں گورنمنٹ کی پالیسیوں کا بھی عمل دخل بڑھ گیا ہے جب مارکیٹ بہت زیادہ پھیل جائے اور اچانک بحران کا خدشہ ہو تو گورنمنٹ شرح سود میں اضافہ کر دیتی ہے ، اگر مارکیٹ میں بحران ہو تو شرح سود میں کمی کر کے معاشی سرگرمیوں کو تیز کرنے کی کوشش کرتی ہے - مگر یہ ہمارا اس وقت موضوع نہیں کیونکہ اس کا کلاسیکل معاشیات کی بنیادوں اور انٹرسٹ ریٹ (شرح سود) کے بنیادی مباحثہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ویسے بھی کلاسیکل لبرل معیشت حکومت کو یہ اختیار دینا پسند نہیں کرتی کہ وہ مصنوعی مہنگائی پیدا کرے اور شرح سود کے تعین میں ان تین بنیادی اجزا کو اہمیت دیتی ہے جن کا اوپر ذکر آیا –

انصاف و استحصال کا معاملہ... جیسا کہ ہم نے پہلے اس کا ذکر کیا کہ عموماً کسی ملک میں شرح سود شرح مہنگائی پر انحصار کرتا ہے اور مہنگائی کا تعین عام ضرورت کی کل اجناس اور خدمات کی قیمتوں میں اضافہ یا کمی سے ہوتا ہے۔ جن ممالک میں مہنگائی کی شرح کم ہے، وہاں شرح سود کم ہے اور جہاں مہنگائی زیادہ ہے تو وہاں شرح سود زیادہ ہے ، مثال کے طور پر پاکستان میں صدر زرداری کے دور میں مہنگائی کی شرح بہت زیادہ تھی تو شرح سود بھی بہت زیادہ تھا -اسی طرح موجودہ حکومت میں مہنگائی کی شرح کم ہے تو مرکزی بنک کا شرح سود بھی کم ہے - ایران میں شرح سود (اس تحریر کو لکھنے کے وقت) بیس فیصد سالانہ ہے تو اسکی وجہ بھی وہاں مہنگائی کی شرح کا تقریبا سولہ فیصد ہوناہے جو دو سال قبل کے چالیس فیصد سے گری ہے تو ساتھ ساتھ ملکی شرح سود بھی گرتا چلا آیا ہے - امریکہ کا تین ماہ کے قرض پر شرح سود صفر اعشاریہ چار صفر فیصد ہے کیونکہ وہاں مہنگائی کی شرح ماہ اکتوبر میں صفر اعشاریہ دو فیصد تھی -

انصاف پر مبنی انٹرسٹ ریٹ وہ ہے جس میں مہنگائی کی شرح ،رسک کی شرح (کمپنی کے دیوالیہ ہونے کے خطرہ کی شرح)، اور اپنی آج کی ضرورت کو مستقبل کے لئے قربان کرنے کا معاوضہ دیا جائے یاد رہے کہ انصاف پر مبنی یہ شرح سود مارکیٹ میں مقابلہ کی ثقافت میں ازخود قائم ہو جاتا ہے - اگر انٹرسٹ ریٹ ان تینوں اجزا کے کل سے کم یا زیادہ ہو تو وہ استحصال ہے اور اگر برابر یا تقریبا برابر ہو تو وہ جدید معیشت کی رو سے انصاف ہے - اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ احسان پر مبنی قرض جسے ہم قرض حسنہ کہتے ہیں اس کا بھی راستہ ویسے ہی کھلا ہے جیسے پہلے کھلا تھا اور کسی بھی مہذب سماج میں قرض حسنہ کے جذبات و تعاون کو ہمیشہ قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے - یہ آپ منحصر ہے کہ آپ کسی کو قرض دیتے ہوئے اس پر احسان کرتے ہیں، انصاف کرتے ہیں یا استحصال -

قدرتی وسائل کی نہیں، سیلف انٹرسٹ اور انسانی سرمائے کی معیشت

معیشت، سیاست اور سماجیات کے ماہرین کی اکثریت کا اس بنیادی کلیہ پر اتفاق ہے کہ معاشی ترقی سیاسی و سماجی ترقی کا زینہ ہے اور یہ کہ اگر کوئی سماج غربت و افلاس میں مبتلا ہے، تو اس کی سیاست میں استحکام ممکن ہے اور نہ ہی اس کی سماجی اخلاقیات مہذب و متمدن ہو سکتی ہے۔ تاہم اس اصول کو جب تیل کی دولت سے مالامال عرب معیشتوں پر لاگو کیا جاتا ہے تو ہم وہاں معیشت اور سیاست و سماج کا یہ باہمی تعلق نہیں دیکھ پاتے ۔ اس کی کیا وجہ ہے ؟

ماہرین کہتے ہیں کہ قومی پیمانے پر معیشت اور روشن خیالی کا تعلق صرف وہاں پایا جاتا ہے جہاں قومی پیداوار صنعتی ہو ، اور ان صنعتوں کا بنیادی انحصار خام مال یا قدرتی وسائل پر نہیں بلکہ انسانی وسائل (ہیومن کیپٹل) پر ہو ۔ انسانی وسائل یا سرمائے میں اضافہ تعلیم سے ہوتا ہے اور تعلیم صرف اسکول سے ڈگری لینا نہیں بلکہ نصاب کی روشن خیالی، مکالمہ کے تمدن، تعلیمی نصاب میں آزادی یعنی سرکاری جبر کی عدم موجودگی ، علوم کے عملی زندگی میں معاشی و سماجی فائدہ اور سماجی و فطری سائنس میں ایجادات، دریافت اور اختراع کے بنیادی محرک کی بیداری اور حوصلہ افزائی میں ہے ۔ علم کا مقصد محض یہ جاننا نہیں کہ کون کیا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک مخصوص عملی سرگرمی کیسے سرانجام دینی ہے۔ ... کون کیا ہے ؟ کا جواب، نصاب اور لائبریری سے مل سکتا ہے ، جبکہ کسی بھی مخصوص عملی سرگرمی کو سرانجام دینے کا ہنر محض سازگار عملی میدانوں میں میسر آئے گا یوں نصابی تعلیم اور صنعتوں کا براہ راست تعلق وجود میں آتا ہے۔

عرب دنیا کی معیشت نہ تو انسانی وسائل پر انحصار کرتی ہے اور نہ ہی صنعتی پیداوار پر بلکہ اس کا انحصار محض خام تیل کی پیداوار پر ہے۔ یوں سائز میں بہت بڑی معیشتوں کے حامل ہونے کے باوجود امیر عرب معاشرے نہ صرف ایجادات و اختراعات میں ترقی یافتہ دنیا سے پیچھے ہیں ، بلکہ ان کی سیاست و سماجیات بھی کھوکھلی اور ناکارہ ہے ۔اسی لئے مشرق وسطی کے مستقبل سے متعلق سوچنے والے اذہان کہتے ہیں کہ تیل کی معیشت کے خاتمہ کے بعد عرب ممالک افریقی ممالک کی پسماندگی کا منظر پیش کریں گے۔

شہریوں کے سامنے جوابدہ سیاست (جمہوریت) کا تصور صرف وہاں ممکن ہے جہاں حکومت کی آمدن کا انحصار ٹیکس کی وصولی پر ہو ، حکومتیں جب شہریوں سے ٹیکس وصول کرتی ہیں تو ان کے سامنے جواب دہی اور ان کی مادی فلاح کا وعدہ پہلے کرتی ہیں ۔ دنیا بھر کی سیاست و معیشت کے اعداد و شمار آج ہمارے پاس موجود ہیں ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ معاشرے جہاں حکومتیں ٹیکس تو وصول کرتی ہیں مگر جواب دہ نہیں ہوتیں اور نہ ہی شہریوں کی فلاح کے لئے سرگرم ہوتی ہیں ، وہاں کی کاروباری سرگرمیاں زیادہ سے زیادہ ٹیکسز کی ادائیگی سے انحراف کرتے ہوئے بے ضابطہ (انفارمل) معیشت کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔ یہ معاملہ ان معیشتوں کے ساتھ بہت زیادہ ہے جو یا تو کلی طور پر حکومت کے کنٹرول میں ہوتی ہیں (جیسے کمیونسٹ معیشت) یا پھر قدرتی وسائل پر انحصار کرتی ہیں (جیسے عرب ممالک ، افریقی ممالک ،

لاطینی امریکہ کے کچھ ممالک وغیرہ) ۔ ایسی معیشتوں میں آمریت بہت آسان ہے کیونکہ آمر کو ریاستی معاملات کے لئے شہریوں کی مالی مدد (جسے ہم ٹیکسز کہتے ہیں) کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ، یوں وہ ٹیکسز کے بدلے جواب دہی اور مادی فلاح کے براہ راست تعلق کے بکھیڑے سے آزاد رہتا ہے۔

اسی طرح ماہرین قدرتی وسائل اور کرپشن کا باہمی تعلق بھی بیان کرتے ہیں ، وہ کہتے ہیں ایسی معیشت جس کا انحصار قدرتی وسائل پر ہو، اس کی تمام اجارہ دار قوتوں کے درمیان وسائل پر زیادہ سے زیادہ قبضہ کی جنگ چھڑ جاتی ہے ، یہ جنگ سرد جنگ بھی ہو سکتی ہے جس میں تمام قوتیں بظاہر پر امن رہتے ہوئے سازشوں اور دھوکہ دہی سے باہم وسائل اور اقتدار کے لئے لڑتی رہتی ہیں اور یا پھر یہ باہمی تصادم خانہ جنگی کی کیفیت اختیار کر لیتا ہے جس میں ایک گروہ باقی تمام گروہوں کو زیر کر کے وسائل اور انہیں استعمال کرنے کی طاقت (اقتدار) پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اس گروہ کو شکست دینے کے لئے کوئی اور گروہ کھڑا ہو جاتا ہے، یوں خانہ جنگی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑتا ہے، سرد جنگ کا ماحول اگر ہمیں لاطینی امریکہ میں ملتا ہے تو افریقہ میں ہم بآسانی وسائل پر قبضہ کی خانہ جنگی دیکھ سکتے ہیں۔ چونکہ تمام قدرتی وسائل بیوروکریسی کے قبضہ اختیار میں ہوتے ہیں ، اور ان کی پیداوار و تقسیم کے نظام کا باقاعدہ سے حساب کتاب رکھنا اور پھر اس کا آڈٹ کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے ، یوں بیورو کریسی اپنے اختیارات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے لئے زیادہ سے زیادہ مالی فوائد سمیٹتی ہے ۔ وہ ممالک جن کی معیشت کا بنیادی انحصار قدرتی وسائل پر ہے وہاں کی بیوروکریسی ماہرین کی تحقیقات کے مطابق زیادہ کرپٹ ہے اور ان کے بیرون ملک کی بینکوں میں بہت زیادہ خفیہ بنک اکاؤنٹ ہوتے ہیں جب کہ تمام شہریوں کے سیلف انٹرسٹ اور صنعت کاری پر انحصار کرنے والی معیشت زیادہ سے زیادہ عوامی اور کم سے کم بیوروکریٹک ہوتی ہے ، یوں کرپشن کے مسائل آزاد سرمایہ دار صنعتی معیشتوں میں انتہائی کم ہوتے ہیں۔

اسی طرح قدرتی وسائل کی معیشت میں تمام چھوٹی چھوٹی اکائیاں یا دوسرے لفظوں میں شناختیں عدم تحفظ اور احساس کمتری کا شکار ہوتی ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتی ہیں کہ انہیں وسائل دولت کی تقسیم میں کم حصہ دیا جا رہا ہے اور کسی دوسرے خاص کو زیادہ نوازا جا رہا ہے ۔ دیہات شہر سے تعصب رکھتے ہیں کہ سب وسائل وہاں خرچ ہو رہے ہیں اور ہمیں حصہ نہیں مل رہا۔ پاکستان کے صوبوں اور مختلف قومیتوں کے درمیان جھگڑے کی ایک بڑی وجہ قدرتی وسائل کی تقسیم کا جھگڑا بھی ہے ۔ سندھ پانی پر جھگڑتا ہے ، بلوچستان معدنی وسائل پر لڑتا ہے اور سرائیکی علاقے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ملک کو سب سے زیادہ زرعی پیدا وار دے کر بھی محروم ہیں۔

جبکہ انسانی وسائل ، صنعت کاری ، اور آزاد مارکیٹ (فری مارکیٹ) کی ثقافت پر قائم معیشت میں ہر فرد اپنے سیلف انٹرسٹ کی جستجو میں ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی تربیت کرے اور وہ بدلتی معاشی حقیقتوں سے سیکھے ۔ اسی طرح ہر علاقہ کی کوشش ہوتی ہے کہ سرمایہ کاروں کو زیادہ سے زیادہ سہولیات بہم پہنچا کر صنعت کاری کو فروغ دے ،تاکہ زیادہ سے زیادہ ریونیو کمائے اور پھر اپنے لوگوں پر خرچ کرے ۔ یہاں ٹیکس کی سیاست کو فروغ ملتا ہے اور مقابلہ کی ثقافت پیدا ہوتی ہے جو زیادہ پیداواری صلاحیت کے حصول کی کوششوں میں سائنس

و ٹیکنالوجی کے تمدن کو پیدا کرتی ہے۔ انسانی وسائل و صنعت کاری میں مزید اضافے کی کوششوں میں سماجی علوم کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کیونکہ ان علوم کا سماج میں بہتر اورپیداواری نظام کے قیام میں گرانقدر حصہ ہوتا ہے ۔

امریکہ کی پچاس ریاستیں ہیں اور آئین کی رو سے ہر ریاست کو یہ بنیادی حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہیں امریکی فیڈریشن کو چھوڑ سکتی ہیں مگر یہ ریاستیں وسائل پر ایسے کیوں نہیں لڑتیں جیسے ہمارے ہاں جھگڑا ہے ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکی معاشرہ صنعتی اقدار پر قائم ہے، اور صنعت کاری کا یہ نظام انسانی وسائل کی ترقی پر انحصار کرتا ہے۔ ہر ریاست دوسری ریاستوں سے مقابلہ کی کیفیت میں ہے کہ اپنی جغرافیائی حدود میں زیادہ سے زیادہ صنعت کاری کو فروغ دے اور ہر ریاست میں ہر فرد مقابلہ کی ثقافت میں اپنا مقام آپ پیدا کرنے کی جدوجہد میں ہے –

پاکستان میں اٹھارویں ترمیم کے بعد حاصل ہونے والی صوبائی خودمختاری ، مقابلہ کے تمدن کی ترویج و فروغ میں کلیدی کردار ادا کر سکتی ہے اگر صوبے اپنی بنیادی ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہوئے انسانی وسائل ، مقابلہ کی ثقافت اور صنعتکاری پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں اور اپنی معیشت کو آزادانہ بنیادوں پر ایک آزاد سماج میں آزاد افراد سے ان کے سیلف انٹرسٹ کی بنیاد پر پنپنے دیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ مستحکم جمہوریت ان ممالک ہی میں قائم ہو سکی ہے جنھوں نے اپنی معیشت کو صنعتی بنیادوں پر کھڑا کیا۔ صنعتی بنیادوں پر کھڑا کرنے کی اس کوشش میں انہیں صرف انسانی وسائل کی ضرورت محسوس ہوئی جبکہ قدرتی وسائل کی اہمیت ثانوی رہی ۔ہانگ کانگ، جنوبی کوریا، جاپان اور تائیوان وغیرہ میں قدرتی وسائل کی انتہائی قلت ہے مگر اس کے باوجود یہ صف اول کی معیشتیں ہیں اور ان ممالک میں جمہوریت کا راستہ معاشی ترقی سے شروع ہوتا ہے۔ یہی معاملہ مغرب کا ہے، مغرب نے پہلے معاشی ترقی کی اور پھر جا کر یہ ممالک روشن خیال ، متمدن اور جمہوری بنے ۔

پاکستان میں ترقی سے متعلق جس بیانیہ کی گونج سنائی دیتی ہے ، وہ زرعی ترقی اور قدرتی وسائل کو ترجیح دیتا ہے ۔ پاکستان میں زرعی ترقی سے متعلق چار گزارشات ہیں ۔

اوّل : پاکستان میں زراعت کے عروج کا دور ایوب دور کا سبز انقلاب ہے۔ اس انقلاب کی بنیاد میں ایک طرف ٹیکنالوجی جیسے ٹریکٹر و ٹیوب ویل کا پاکستانی زراعت میں استعمال ہے تو دوسری طرف یہ سبز انقلاب صنعتی انقلاب سے جڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی صنعت کاری کی رفتار مدہم ہوئی، زراعت میں ترقی کی رفتار بھی سست پڑ گئی ۔ یوں تجربہ یہ بتاتا ہے کہ آئندہ بھی کامیاب صنعت کاری کا عمل ہماری زراعت کو مزید فروغ دے گا ۔

دوم : پاکستان کی زراعت میں اتنی سکت نہیں کہ وہ سات کروڑ سے زائد پاکستانی لیبر فورس کو روزگار دے سکے - صرف صنعتکاری ہی سے لا محدود تعداد میں روزگار پیدا کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صنعتکاری کے عمل میں جتنی زیادہ لیبر فورس استعمال ہو گی اتنا ہی یہ پھیلے گی ۔

سوم : زراعت ہمیشہ موسمی تغیرات کی زد میں رہتی ہے ۔ پاکستان میں کپاس، گنا اور چاول کا موسم سیلابوں اور مون سون بارشوں کی زد میں رہتا ہے اور یہی فصلیں ہیں جن پر ہماری زراعت کا زیادہ تر انحصار ہے ۔ جب بھی سیلاب و مون سون بارشیں کم ہوتی ہیں، فصل پر ان کا منفی اثر پڑتا ہے ۔ اور جب یہ زیادہ ہوں تو فصل تباہ ہو جاتی ہے، یوں ہماری قومی پیداوار ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے۔ دوسری طرف صنعتوں کی پیداوار پر موسموں کے تغیر کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔

چہارم: زرعی معیشت پر انحصار کا مطلب روایتی جاگیردارانہ تمدن کا تسلسل ہے ۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم صنعتکاری کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیتے ہوئے انسانی وسائل کی ترقی پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں اور شہریوں پر بھروسہ رکھیں کہ وہ اپنے لئے بہترین طرز زندگی کما سکتے ہیں اگر مواقع کی مساوات و آزادی کو رواج ملے ، استحقاق زدہ معیشت کا خاتمہ ہو اور مقابلہ کی ثقافت کو فروغ ملے وگرنہ اس کے بغیر معاشی ، سیاسی ، اور سماجی ترقی کا کوئی راستہ ممکن نہیں۔

آزادی تبادلہ و تعاون : جبر سے بغاوت کا نام ہے

معاشرت کے جتنے بھی شعبے ہیں بشمول سیاست و معیشت ، ان کی مثالی شکل یہ ہے کہ ان کی بنیاد رضاکارانہ تعاون و اشتراک پر ہو – کوئی بھی سماجی معاملہ اگر جبر سے طے کیا جائے گا تو یہ ظلم و ناانصافی کی ایک بدترین شکل ہو گی – فری مارکیٹ کو اگر مختصر الفاظ میں بیان کیا جائے تو اس سے مراد ایسا معاشی نظام ہے جس کی بنیاد فرد اور فرد سے وجود میں آنے والے گروپس یا آرگنائزیشنز (جیسے کمپنی ، انجمن ، جماعت ، پارٹی وغیرہ) کے باہم رضاکارانہ تعاون و تبادلہ پر ہے جس میں تمام لوگ ایک دوسرے سے اشیاء و خدمات کا تبادلہ کرتے ہیں اور پیداوار کے عمل میں ایک دوسرے سے تقسیم محنت (ڈویژن آف لیبر) کی شکل میں تعاون کرتے ہیں – یا دوسرے الفاظ میں یہ فرد اور ان کے گروپس کے باہم مگر انفرادی لین دین (Transaction) کا مجموعہ ہے – لین دین یعنی ٹرانزیکشن افراد کی باہمی رضامندی سے ہوں گی ، معاہدوں (Contracts) سے معاشی معاملات طے کئے جائیں گے ، اور فریقین کو آزادی حاصل ہو گی ، چاہیں تو کسی کنٹریکٹ کا حصہ بنیں یا انکار کر دیں ، یہ ان کے حق انتخاب کا معاملہ ہے –

مثال کے طور پر جب ہم مارکیٹ میں کوئی چیز خریدنے جاتے ہیں تو اس دوران جو لین دین (ٹرانزیکشن) ہم کرتے ہیں (مثال کے طور پر کسی چیز کی خریداری) تو وہ بنیادی طور پر ہماری آزادی ارادہ و عمل پر انحصار کر رہی ہوتی ہے – ہم نے کس دکان سے خریدنا ہے ،کیا خریدنا ہے ، کتنا خریدنا ہے ، یہ سارے معاشی فیصلے ہماری مرضی سے ہو رہے ہوتے ہیں اور یہی حق دکاندار کے پاس بھی ہوتا ہے کہ چاہے تو وہ چیز ہمیں بیچے ورنہ انکار کر دے – ہم دکاندار پر جبر نہیں کر سکتے کہ وہ لازما ہمیں ہی چیز بیچے اسی طرح دکاندار بھی ہم پر جبر نہیں کر سکتا کہ کوئی بھی چیز لازما مجھ سے ہی خریدو – جب تک ہم وہ چیز نہیں خرید لیتے وہ چیز دکاندار کی پراپرٹی ہوتی ہے اور جب وہ دکاندار کسی میڈیم آف ایکسچینج (مثال کے طور پر کرنسی کا تبادلہ) میں وہ چیز ہمیں بیچ دیتا ہے تو وہ چیز اب ہماری پراپرٹی بن جاتی ہے – یاد رہے کہ بغیر پراپرٹی کے حق کے معاشی زندگی میں آزادی تبادلہ و تعاون بھی ممکن نہیں اور بغیر "حق ملکیت" کے فری مارکیٹ بھی نہیں پائی جاتی –

کنٹریکٹ کی بنیاد فریقین (بیچنے والا اور خریدنے والا) کا شخصی نظام اقدار ہے – جیسا کہ شروع میں بتایا گیا کہ جب خریدار و سیلر کسی بھی شے کی اصل ویلیو پر متفق ہو جاتے ہیں یا وہ کمپرومائزز (مثال کے طور پر Bargaining) کی بدولت دونوں فریق کے درمیان ویلیو یکساں ہو جاتی ہے تو کنٹریکٹ وجود میں آتا ہے – ایک فری مارکیٹ معیشت کی اخلاقیات یہی ہے کہ تمام افراد کے شخصی نظام اقدار کا احترام کیا جائے ، اور اس احترام کی صورت رضاکارانہ تعاون و تبادلہ ہو – کسی معاشی معاملے میں جبر سے مراد یہی ہے کہ آپ فرد کی ذاتی صلاحیت و قابلیت پر اعتماد نہیں کرتے کہ وہ صحیح ویلیو کا تعین کیسے کر سکتا ہے ، نہ اسے آزادی دیتے ہیں کہ وہ اپنی ترجیحات و مقاصد کی جستجو کر سکے -

آزادی تبادلہ و تعاون کے لیے ایک شرط اگر آزادی ہے تو دوسری شرط دوسرے فرد کے نظام اقدار کا احترام ہے - اہم بات یہ ہے کہ رضاکارانہ تعاون و تبادلہ متعلقہ فریقین کے باہمی فائدے (mutual advantage) کی بنیاد پر ہوتا ہے۔دونوں فریقین اپنی اپنی مخصوص ویلیوز کا تعین کرتے ہیں ، اس میں بحث و مباحثہ (Bargaining) کرتے ہیں اور جہاں دونوں کے مفادات میں یکسانیت آتی ہے وہ کنٹریکٹ میں آجاتے ہیں۔جبر کی ثقافت میں باہمی فائدے کے کنٹریکٹس (contracts) کا تصور نہیں پایا جاتا ، اس میں فریقین اپنے سیلف انٹرسٹ کی جستجو نہیں کر سکتے بلکہ فریقین کے علاوہ کوئی اور متعلقہ اتھارٹی اپنی متعین کردہ ویلیو نافذ کرتی ہے کہ آیا فریقین کو کن کن ویلیوز پر باہمی اشتراک کرنا چاہیے۔اگر آپ کے پاس حق ملکیت (پراپرٹی رائٹس) ہوں تب بھی زبردستی کے اشتراک کی یہ جابرانہ قسم دراصل ظلم و نا انصافی اور عملی شکل میں بے کار ہے۔

رضاکارانہ تعاون و تبادلہ میں سوشل انٹرسٹ پایا جاتا ہے۔یہ معیشت کی خود تنظیمی کی صلاحیت میں کام کرتی ہے اور افراد کے حقوق کا تحفظ اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔ رضاکارانہ تعاون و تبادلہ عملی صورت میں صرف اس وقت کامیاب ہے جب مقابلہ کی ثقافت پائی جائے اور افراد کے پاس ایک سے زائد متبادل موجود ہوں - جب ایک صارف (کنزیومر) کسی فروخت کنندہ یعنی سیلر سے مطمئن نہ ہو تو کسی دوسرے سیلر سے رجوع کر سکے ۔اس میں سیلر کا سیلف انٹرسٹ بھی محفوظ ہے کہ اگر اسے ایک صارف صحیح قیمت نہیں دے رہا تو اس کے پاس مارکیٹ میں دیگر صارفین بھی موجود ہیں- ایک ورکر (employee) اگر اپنی کمپنی کی انتظامیہ سے محفوظ نہیں جب اسے لگے کہ اس کے افسران اسے اس کی محنت کے بدلے مناسب سیلری نہیں دے رہے تو وہ کسی اور کمپنی سے رجوع کر سکتا ہو۔ اسی طرح کمپنی کا سیلف انٹرسٹ بھی محفوظ ہے کہ اگر وہ کسی ورکر کی کارکردگی یا رویے کو غیر مناسب سمجھتی ہے تو اس سے چھٹکارا حاصل کر کے کسی دوسرے ورکر کو نوکری پر رکھ سکتی ہے۔آزادی تبادلہ و تعاون اپنی اصل میں اپنی رفعت ذات کے ادراک اور خود تنظیمی (Self organization) کا نام ہے۔

ہم آمریت کا کیوں انکار کرتے ہیں ، محض اس لیے نہیں کہ ہمیں آمر کی نیت پر شک ہوتا ہے،بلکہ خاص طور پر اس لیے کہ ایک فرد یا چند افراد کا مراعات یافتہ گروہ عملی طور پر یہ صحیح طے نہیں کر سکتے کہ فرد کا سیلف انٹرسٹ کس چیز میں ہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ "لینن" اچھی نیت کا بندہ تھا۔نہ ہٹلر کی نیت پر شک ہے، نہ مسولینی کی اور نہ سٹالن و ماؤزے تنگ کی، ہمارا مقصود نیتوں کے جائزے لینا نہیں بلکہ مطلوب نتائج کی جستجو ہے - ان افراد نے وہ سب کیا جو انہیں درست لگا ،مگر انہوں نے اپنے علاوہ دوسرے افراد (یعنی شہریوں) کی ذاتی صلاحیتوں اور قابلیتوں پر اعتماد نہ کیا کہ وہ بھی ان کی طرح اپنے لیے بہتر سوچ اور عمل کر سکتے ہیں ۔ہٹلر نے اپنے مقصد پر جان دیدی کہ یہ اس کی نیت کے اخلاص کو ظاہر کرتی ہے مگر اس کی آمریت کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ شہریوں کے لیے ہر گز مخلص نہ تھے۔

جب ہم رضاکارانہ تعاون و تبادلہ کو چھوڑ کر جبر کا استعمال کرتے ہیں تو جلد ہی جبر کی بری طاقتیں اچھی نیتوں پر غالب آجاتی ہیں۔سو شلسٹ و فاشسٹ ریاستوں کی اصل فطرت سیاسی سماجی اور معاشی میدان میں جبر ہے۔ اس میں ریاست آقا ہے جو سینٹرل پلاننگ پر یقین رکھتی ہے ،جو طے کرتی ہے کہ لوگوں نے اپنی سیاسی سماجی اور معاشی زندگی کیسے گزارنی ہے ، کیا کرنا ہے ، کیسے کرنا ہے ، کیوں کرنا ہے ، کب کرنا ہے اور انہیں اس کا کیا ، کتنا ، کیسے ، اور کیونکر انعام دیا جائے۔طاقت کی فطرت کے بارے میں لارڈ ایکٹن خوب کہتا ہے:

Power corrupts, absolute power corrupts absolutely

(طاقت بد عنوان ہوتی ہے۔جتنی طاقت بے قابو ہوگی اتنی بدعنوانی بے قابو ہوگی۔) (39)

جبر کی بنیاد یں ، طاقت کے ارتکاز (Concentration of Power) میں ہوتی ہیں۔جتنا طاقت ایک مرکز پر مرتکز ہوگی اتنا ہی جبر پیدا ہوگا - طاقت کی لبرل اپروچ (approach) یہ ہے کہ طاقت پورے سسٹم میں پھیلی ہوئی ہو اور عدم مرکزیت (ڈی سنٹرلائزڈ) میں پائی جائے – جب سارا نظام طاقت پر چل رہا ہوتا ہے اور طاقت ایک مخصوص عہدے یا ادارے میں مرتکز (Concentrated) ہو جاتی ہے تو اس پر جلد وہ لوگ قابض ہو جاتے ہیں جو طاقت کو کنٹرول کرنے ، اس کی لابنگ کرنے اور اس کے استعمال میں ماہر ہوتے ہیں۔یہ صورتحال اس وقت مزید خطرناک ہوجاتی ہے،جب پاور کے جملہ ذرائع پر قابض شخص یا ادارہ اپنی نیت کی صداقت یا پاکیزگی کو حتمی سمجھ کر پورے خلوص سے اسے شہریوں پر نافذ کر دیتا ہے -ایسے لوگوں کو نتائج نہیں بلکہ اپنی نیت کی صداقت پر یقین ہوتا ہے۔ یوں یہ نہ صرف اپنے اعمال کے نتائج سے نہیں سیکھتے بلکہ ہمیشہ اپنے خیال یا نظریے کے خول میں بند رہتے ہیں -

یہاں ایک نقطہ انتہائی اہم اور قابل غور ہے،جنگیں اور بڑے درجہ کے تنازعات افراد کے رضاکارانہ تعاون کی وجہ سے نہیں ہوتے بلکہ اس کی وجہ طاقتوں کی بے مہار لڑائی (Power Struggle) ہوتی ہے۔ طاقت خاص طور پر سیاسی طاقت آہستہ آہستہ اپنا دائرہ کار اور اثر و رسوخ پھیلاتی جاتی ہے - اس کی فطرت جابرانہ اور بے رحم ہوتی ہے جبکہ تجارت اور پیداواری سرگرمیاں یہ وہ اچھائیاں ہیں جو محض انسانوں کے باہمی رضاکارانہ تعاون اور تبادلہ کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔افراد اپنے باہمی تعلقات میں سرکش نہیں ہیں۔ہماری ضروریات و خواہشات ، مسرت کی جستجو اور شخصی نظام اقدار ہمیں تعاون پر آمادہ اور پر امن رکھتے ہیں۔تہذیب ہم سب قائم کرتے ہیں جب کہ تباہ طاقت کے ارتکاز یا بحران کے سبب ہوتی ہے ،مثال کے طور پر چین اور امریکہ کے درمیان قربتیں تجارت و معیشت کی وجہ سے ہیں جب کہ مسائل سیاست کی بے مہار لڑائی کی وجہ سے ہیں۔

آج دنیاکی معیشت امن اور تجارت چاہتی ہے ۔جبکہ سیاست کا بے لگام گھوڑا طاقت کی جستجو اور اقتدار و اختیار کی طلب میں دنیا میں فساد برپا کر رہا ہے۔ انسانیت کا امن وخوشی ، انسانوں کی آزادی ، مساوات و انصاف ، باہمی رضاکارانہ تعاون و تبادلہ میں ہے نہ کہ جبر کے حضور سر نگوں ہونے اور بلاآخر اسی راہ میں سر کٹوانے میں ہے ۔

عدم مداخلت (NonInterventionism) کی پالیسی ، نوآبادیاتی عہد اور امریکی جنگی جنون ۔

عدم مداخلت کی پالیسی سے مراد یہ ہے کہ ایک قوم یا ریاست اس اصول پر قائم رہے کہ وہ دوسرے ممالک کے قومی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی ،اور نہ ہی اپنے ملک میں موجود علاقائی شناختوں کے نجی معاملات میں مداخلت کی جائے گی ۔ کسی پر جبر نہیں کیا جائے گا اور تعلقات ریاست سے فرد ، فرد سے سوسائٹی یا فرد سے فرد رضاکارانہ ہوں گے – عدم مداخلت کے اس تصور کا مطلب تنہائی پسندی ہر گز نہیں بلکہ اس سے مراد شخصی آزادیوں اور دوسری اقوام کے قومی وقار اور حق خود ارادیت کا احترام ہے –

اس تعریف کو اگر ہم مزید پھیلائیں تو درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں –

- عدم مداخلت ایک قومی پالیسی ہے جس کا اطلاق داخلہ اور خارجہ دونوں پالیسیوں پر ہوتا ہے – خارجہ میں ریاست عزم کرتی ہے کہ وہ دوسرے ممالک کے معاملات میں بغیر ان کی مرضی کے مداخلت نہیں کرے گی – اور داخلہ میں حکومت اپنے ملک میں موجود تمام علاقائی شناختوں کے معاملات میں بھی "بغیر ان کی اجازت اور کسی انسانی حقوق کے تنازعہ" کے مداخلت نہیں کرے گی –
- تنوع کا لازمی احترام کیا جائے گا اور جبر کی ہر صورت میں ممانعت ہو گی
- سوائے دفاع کے دوسرے ممالک کے خلاف یا علاقائی شناختوں کے خلاف کسی بھی قسم کی عسکری سرگرمیوں سے اجتناب برتا جائے گا
- ملکی و بین الملکی تنازعات کی صورت میں گفت و شنید اور مفاہمت کی پالیسی پر ہی عمل کیا جائے گا–

یہاں ایک بات یاد رہے کہ حکومت اچھی نیت سے بھی کسی دوسرے ملک یا اپنے ملک میں موجود نجی شناختوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتی کیونکہ وہ دروازہ جو اچھی نیت سے کھولا جاتا ہے بری نیت کے آمر کے لئے بھی کھلا ہی رہتا ہے – طاقت کی اپنی نفسیات ہے ۔ ضروری ہے کہ اجتماعی معاملات میں اس دروازے کو ہی بند رہنے دیا جائے جس سے استحصال کا خطرہ سر پر لٹکتا رہے – ہم امریکی خارجہ پالیسی کو ہی بطور مثال دیکھتے ہیں –

امریکہ کی اعلان آزادی سے لے کر جنگ عظیم تک خارجہ پالیسی عدم مداخلت کی ہی تھی اعلان آزادی کے مصنف اور امریکی ریاست کے بانی تھامس جیفرسن نے امریکی خارجہ پالیسی اس طرح بیان کی تھی –

امن ، تجارت اور قابل بھروسہ دوستی تمام ممالک سے .....، جھگڑالو تعلقات کسی سے نہیں –(40)
بینجمن فرینکلن نے کہا تھا :
اپنے کام سے کام رکھنا ....، حقیقی امریکی منشور ہے - (41)

اعلان آزادی سے جنگ عظیم تک امریکہ اسی عدم مداخلت کی پالیسی پر قائم رہا – امریکہ سپین جنگ جو 1898میں لڑی گئی اس سے متعلق امریکی ریاست کا یہ جواز تھا کہ اعلان جنگ سپین نے کیا تھا اس لئے یہ جنگ صرف دفاعی تھے - سپر پاور بننے کے بعد امریکہ نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ اب بھی ہنوز اس کی پالیسی عدم مداخلت کی ہی رہے گی – مگر جلد ہی صحیح نیت کا مداخلت پسند جذبہ امریکی منصوبہ سازوں کے ذہنوں پر حاوی ہو گیا اور امریکی ریاست یہ سمجھنے لگی کہ اس پر پوری دنیا میں جمہوریت کو پھیلانے اور لبرل آرڈر قائم کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے – جب صحیح نیت نے مداخلت کے دروازے کھول دیئے تو بری نیت کی پالیسیز اور اس کے ذمہ دار افراد کے عزائم کا راستہ روکنا آسان نہ رہا کیونکہ امریکہ کی خارجہ پالیسی جوابدہی سے ویسے بھی محفوظ ہے – یوں پھر طاقت کے اندھا دھند استعمال کی پالیسی کو رواج ملا – اچھی نیت مگر برے طریقہ کار یعنی مداخلت پسندی کے سبب پالیسیوں کی ایسی کھچڑی پکی کہ اب عجیب صورتحال ہمارے سامنے ہے – اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے مسائل میں امریکی خارجہ پالیسیوں کے کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا –

جب عدم مداخلت کی پالیسی کو ترک کیا جا رہا تھا تو اس وقت بھی خبردار کیا گیا تھا کہ اس کا انجام بہتر نہیں ہو گا – تھیوڈرو روزویلٹ نے 6 دسمبر 1904 کو کہا تھا، ''مغربی نیم کرہ ارض میں ریاستہائے متحدہ کی ' مونرو ڈاکٹرائن ' کے ساتھ وابستگی امریکہ کو خواستہ ناخواستہ مجبور کر دے گی کہ وہ بدعملی کے واضح اعمال کے خلاف ایک بین الاقوامی پولیس پاور کے استعمال کو اپنا لے"۔ (42)

بین الاقوامی پولیس پاور سے مراد سوائے فاشزم کے کچھ نہیں جس میں ریاستی طاقت اور اختیار کی نفسیات اور عزائم بے لگام ہو جاتے ہیں –

عدم مداخلت کا اصول ایک لبرل تصور ہے – اس کی رو سے ریاست نہیں بلکہ شہریوں کی نجی تنظیمیں جیسے ایمنسٹی انٹرنیشنل اور دوسرے انسانی حقوق کی آواز اٹھانے والے پرائیویٹ ادارے وغیرہ اگر داخلہ و خارجہ معاملات میں کسی مظلوم کی مدد کرنا چاہیں (جو کہ لبرل ازم میں پسندیدہ عمل ہے) تو وہ کسی مظلوم فریق کی اخلاقی نظریاتی اور مالی مدد کر سکتے ہیں مگر کسی بھی صورت میں عسکری مدد نہیں کی جا سکتی اور

نہ ہی عسکریت کی حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے کیونکہ عدم تشدد اور مفاہمت و گفت شنید کی پالیسیز کا لبرل ازم میں مقام و مرتبہ بلند تر ہے –

عدم مداخلت کی پالیسی پر مشہور ترین لبرل فلسفی جان سٹارٹ مل لکھتے ہیں :
"دو ریاستوں کے درمیان تعلقات کی بنیاد صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ ہے اخلاقیات – اسی طرح شہریوں کے درمیان تعلقات کی بنیاد بھی اخلاق ہے – اگر دو ملکوں میں ایک مہذب ہے اور دوسرا وحشی مزاج تب بھی اختلاف کی بنیاد اخلاقیات ہی ہو گی – اس اختلاف میں اخلاقیات سے ماوراء کوئی بھی عمل پسندیدہ نہیں – (43)
اس پورے موضوع پر ان کا ایک مختصر رسالہ A Few words on Non-Interventionism ایک بہترین مطالعہ ہے (44)-

کیا نوآبادیات سرمایہ داری نظام کے سبب تھیں ؟

کیپیٹلزم پر ایک الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ اس نے نوآبادیاتی عہد کو قائم کیا اور لوگوں کو لوٹا - اسی طرح اس پر دوسرے ممالک میں جنگیں کرانے کا بھی الزام لگایا جاتا ہے – حالانکہ کیپیٹلزم کی بنیادی قدر پیداوار ہے ، تجارت یعنی کامرس ہے ....، اور کاروبار ہیں – پیداوار ، تجارت اور کاروبار کو امن و امان کی ضرورت ہوتی ہے – بدامنی میں یہ ناممکن العمل ہیں – جنگ اور کامرس ایک دوسرے کے متضاد ہیں – جب جنگیں ہوتی ہیں تو معیشت اجڑ جاتی ہے اور تمام سرمایہ دارانہ مفادات تباہ ہو جاتے ہیں – آئیے اس مفروضے کو قدرے تفصیل سے سمجھتے ہیں کہ کیا نوآبادیاتی نظام کی وجہ سرمایہ داری نظام تھا ؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی خطہ ارضی کو نوآبادیاتی بنانا ، وہاں کے لوگوں کو زیر قبضہ رکھنا ، اور شہریوں کی شخصی آزادیوں اور مواقع میں مساوات کا استحصال کرنا لبرل ازم کے بنیادی اصولوں حق انتخاب اور آزادی تعاون و تبادلہ سے متصادم ہے – ہندوستان میں نوآبادیاتی طاقتوں نے ان علاقوں میں اپنا جبر نافذ کیا تھا جو پہلے علاقائی جاگیرداروں، راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کے زیر قبضہ تھیں – نوآبادیاتی عہد پتھروں کے عہد سے لے کر زرعی عہد کے آخر تک ایک تسلسل کے ساتھ قائم رہا ہے- دوسروں ملکوں پر حملہ کرنا انہیں مطیع بنانا اور لوٹ مار کرنا پسندیدہ عمل تھا جسے فاتحین کی تاریخ بہادری شجاعت اور عظیم کام کے طور پر یاد رکھتی تھی جیسے سکندر اعظم کو دی گریٹ " کا خطاب دینا – خود ہندوستان کی یہی تاریخ ہے – کہا جاتا ہے کہ وادی سندھ کے مکین افغانستان ترکی ایران اور سنٹرل ایشیا کے دوسرے ممالک سے ہجرت کر کے یہاں آ بسے – جبکہ ہندوستان کی دیسی نسلیں دیہاتوں میں رہتی تھیں زراعت کرتی تھیں اور وادی سندھ کے مکینوں کو زرعی اجناس بیچتی تھیں کیونکہ وادی کے مکینوں کا ذریعہ معاش زراعت کے بجائے تجارت اور غیر زرعی پیشے تھے – آرینز جنھوں نے گنگا کی دلدلی زمین کو ایک تہذیب دی وہ خود سینٹرل ایشیا سے آئے تھے اور انہوں نے یہاں کے لوگوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنایا تھا – مسلمان بھی

یہاں بطور حملہ آور آئے اور انہوں نے یہاں زرعی نو آبادیات قائم کیں جس میں نمایاں رتبہ افغانیوں ایرانیوں اور سنٹرل ایشیا یعنی ترکی وغیرہ کے لوگوں کے لئے مخصوص رہا ہے –

ایسٹ انڈیا کمپنی ایک مرچنٹائل اجارہ داری تھی جسے اس وقت کے برطانوی شاہ نے ہندوستان پر اجارہ داری دی تھی – اس کے ہندوستانی دیسی ملازمین کی نظر میں ...، مقامی راجاؤں نوابوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں کوئی فرق نہیں تھا بلکہ ایک بڑی تعداد میں سپاہی اپنے دیسی آقاؤں کو چھوڑ کر کمپنی کی فوج میں بھرتی ہوئے کیونکہ یہاں مراعات دیسی سرداروں کی نسبت بہت زیادہ بہتر تھیں – یہی سبب ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیسی سپاہیوں کی مدد سے ہی دیسی اقتدار کو ختم کیا تھا اور اپنا قبضہ قائم کیا جو بلاشبہ دور حاضر کی اخلاقیات کی رو سے قابل مذمت ہے کیونکہ یہ قبضہ ہندوستانی باشندوں کے بنیادی انسانی حقوق اور حق انتخاب سے متصادم تھا –

نوآبادیات کو سرمایہ دارانہ لبرل عہد میں نہیں بلکہ مرچنٹائل ازم اور نیشنلزم کے دور میں قائم کیا گیا-

نو آبادیات کیپیٹلزم کے عہد میں قائم نہیں ہوئی تھیں بلکہ اس وقت پوری دنیا میں زرعی عہد تھا جبکہ برطانیہ میں بطور ذریعہ پیداوار زرعی اور بطور معیشت مرچنٹائل ازم کا عہد تھا - مرچنٹائل ازم ایک ایسا نظام ہے جس کے مطابق

- ملکوں کی معیشت یا دولت کا انحصار ایسی تجارت پر ہے جس کا کلی انحصار ایکسپورٹ پر ہو اور امپورٹ یا تو کم سے کم ہو یا بالکل ہی نہ ہو –
- اس نظام کے مطابق دولت سونا چاندی اور قیمتی دھاتیں ہیں –
- یہ نظام حکومتوں کو معاشی عمل میں زیادہ سے زیادہ مداخلت کی ترغیب دیتا ہے – اس کی رو سے حکومتیں ایک طرف تو دوسرے ملکوں سے امپورٹ پر پابندیاں لگا دیں یا بھاری ٹیرف لاگو کر دیں تاکہ امپورٹ کو روکا جائے ، دوسری طرف یہ نظام حکومتوں پر زور دیتا ہے کہ وہ دوسرے ممالک میں منڈیوں کی تلاش میں اپنے اثر رسوخ کو استعمال کریں – اسی لئے یہ نظام نو آبادیات کے قیام کی ضرورت پر زور دیتا ہے –
- اس نظام کی رو سے ایک ملک اس وقت امیر ہو سکتا ہے جب تک کہ دوسرا ملک اس کے نتیجے میں غریب نہ ہو – یہ نظام معیشت کو متعین ٹکڑے (Fixed Pie) کی طرح سمجھتا ہے جس کی رو سے اپنا حصہ بڑھانے کے لئے دوسرے کا حصہ چھیننا ہو گا –

مرچنٹائل ازم کی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مخالفت ایڈم سمتھ نے کی جس کا شمار کیپیٹلزم کے صف اول کے مفکرین میں ہوتا ہے – سمتھ کا کہنا تھا کہ

- امپورٹ اور ایکسپورٹ دونوں ملک کی معیشت میں اہم ہیں جنہیں ڈیمانڈ اور سپلائی کی قوتیں پیدا کرتی ہیں – انہیں آزاد ہونا چاہیئے اور حکومت کو فری ٹریڈ یعنی آزاد تجارت کی پالیسی پر عمل کرنا چاہیئے -
- دولت سونا چاندی نہیں بلکہ پیداوار ہے – جس ملک کی ملکی پیداوار جتنی زیادہ ہو گی وہ ملک اتنا ہی زیادہ دولت مند ہو گا –
- حکومتوں کا معیشت میں کوئی باقاعدہ کردار نہیں – حکومت کا کام صرف انتظامی ہے –
- ہر ملک کے لوگوں کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ ملک کے اندر سے یا باہر سے جہاں سے بھی کوئی چیز خریدنا چاہیں یا بیچنا چاہیں خرید سکتے ہیں اور بیچ سکتے ہیں – اسے لبرل ازم کی رو سے آزادی تعاون و تبادلہ کہتے ہیں –
- سمتھ کا کہنا تھا کہ دو ملکوں کی باہمی تجارت سے دونوں ملکوں کی معیشت مظبوط ہو گی اور ان کی دولت میں اضافہ ہو گا – امپورٹ ناگزیر ہے ..، اس سے یہ مراد ہے کہ متعلقہ چیز دوسرے ملک کے لوگ ہم سے بہتر اور سستی بنا رہے ہیں جس سے صارفین کا فائدہ ہے –
- معیشت حجم متعین (Fixed Pie) نہیں بلکہ پیداواری عمل سے کل دولت میں اضافہ ہوتا ہے – اس لئے پیداوار اور تجارت کے عمل میں تمام فریقین فائدے میں رہتے ہیں - (45)

جیسے جیسے کیپیٹلزم ترقی کرتا گیا اور مرچنٹائل ازم کی معیشت ختم ہوتی گئی یہ تصور زیادہ کھل کر سامنے آتا گیا کہ نوآبادیات بوجھ ہیں اور یہ موجودہ معاشی بندوبست سے مطابقت نہیں رکھتیں – 1852میں مشہور برطانوی مدبر ڈزرائیلی نے اپنی مشہور "کھلے امکانات کی پالیسی" کا اعلان کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا تھا "ہماری نو آبادیات چکی کے ان پاٹس کی طرح ہیں جن میں ہماری گردن پھنس چکی ہے" (46)

کیپیٹلزم نے پہلے دن سے مرچنٹائل ازم اور نو آبادیات کی پالیسی کی مخالفت کی ہے – آج بھی فری مارکیٹ معیشت دان " تجارتی تحفظ کی ریاستی پالیسیز جسے Protectionismکہتے ہیں " کے شدید ترین ناقد ہیں - جب مرچنٹائل ازم کے ہر طرف چرچے تھے یہ فری مارکیٹ لبرل ازم کے مفکرین جیسے بینتھم ، والٹیئر ،سمتھ اور Diderot ہی تھے جنھوں نے کھل کر نوآبادیات کی پرزور مذمت کی اور اسے لبرل ازم کے تصور " آزاد تجارت" سے متصادم قرار دیا تھا – انہوں نے لکھا "نو آبادیات سراسر خسارہ ہیں اس میں قوموں کا کوئی نفع نہیں اور یہ آزادی تجارت کے تصور سے متصادم ہیں " – (47)

ہم سب جانتے ہیں کہ موجودہ یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکہ (USA) ایک برطانوی نوآبادیات تھی – اس نو آبادیات کے خلاف کن لوگوں نے فکری و عملی مزاحمت کی تھی اور کن لوگوں نے اعلان آزادی لکھا تھا ؟ یہ سب اپنے عہد کے لبرل تھے جو آزادی تجارت کے تصورات کے حامی یعنی فری مارکیٹ کیپٹلسٹ تھے –

سرمایہ داری نظام کا نو آبادیات سے متعلق موقف جاننے کے لئے آ ئیے ایڈم سمتھ کی کتاب ویلتھ آف نیشن کو دیکھتے ہیں جو اپنے عہد میں نو آبادیات کا سب سے بڑا مخالف مشہور تھا – اپنی کتاب ویلتھ آف نیشن میں اس نے نو آبادیات کو معاشی خوشحالی اور لبرل اخلاقیات کے اصولوں سے متصادم قرار دیا – (48) اس کتاب کے ساتویں باب میں وہ امریکہ میں یورپی نو آبادیات کی تاریخ اور اعداد و شمار کا جائزہ لیتا ہے اور ان پر نظریاتی و عملی بنیادوں پر ٹھوس تنقید کرتا ہے – جس کا خلاصہ اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ

"برطانوی حکمرانوں کو چاہئے کہ اپنی تمام نو آبادیات چھوڑ دیں اور رضاکارانہ طور پر اختیارات مقامی لوگوں کے حوالے کر دیں تاکہ وہ اپنی حکومت منتخب کر سکیں ، اپنے لئے قانون بنا سکیں ، اور ان قومی پالیسیوں پر عمل کریں جو وہ اپنے لئے مناسب سمجھتے ہیں " (49)

دلچسپ بات یہ کہ اسی کتاب میں سمتھ ان دو وجوہات کا بھی ذکر کرتا ہے جو اس کے خیال میں نو آبادیات کے قیام و تسلسل کی وجہ ہیں –

1. نو آبادیات بد قسمتی سے یورپی اقوام کا فخر بن گئی ہیں – یہ طاقتور اقوام اس بات پر اتراتی ہیں کہ کتنے علاقے اب تک انہوں نے اپنے قبضے میں کئے ہیں اور ان پر اپنی نو آبادیاتی قائم کی ہے –
2. سیاست دانوں اور حکومت کے بھی اس میں مفادات ہیں کیونکہ جن کمپنیوں کو ان نو آبادیات پر اجارہ داری دی گئی ہے وہ اس کے بدلے ان سیاست دانوں بیوروکریٹس اور شاہی درباریوں کو رشوت سے نوازتی ہیں – اسی لئے سمتھ کہتا ہے کہ جب معیشت پر ریاستی اہلکاروں کو مداخلت کا اختیار ملتا ہے تو وہ اسی طرح رشوت اور کرپشن کے ذریعے اپنی ذاتی مفادات (جسے جدید معیشت کی اصطلاح میں Rent Seeking کہا جاتا ہے) کو Pursueکرتے ہیں – سمتھ کہتا ہے کہ اگر مارکیٹ آزاد نہ ہوئی تو ان نو آبادیات کو آزاد کرانا ممکن نہیں رہے گا –(50)

عہد مابعد ایڈم سمتھ –

یہ انیسویں صدی کے اوائل کی بات ہے جب برطانوی لبرل ازم نے برطانوی قومی منصوبوں پر اثر انداز ہونا شروع کیا –اٹھارہ سو بیس کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کا آزاد مارکیٹ کا تصور بھی برطانوی مارکیٹ کو بدلنے لگا – اگر نو آبادیات کی وجہ سرمایہ دارانہ نظام ہوتا تو صنعتی انقلاب اور سرمایہ دارانہ عہد کے شروع ہوتے ہی نو آبادیات میں اضافہ ہوتا اور اس کی افادیت بڑھتی مگر تاریخ اس کے برعکس کہانی سناتی ہے کہ سرمایہ داری کے تمام مفکر بھی نو آبادیات کے خلاف تھے اور یہ کیپیٹلزم کی معیشت کی رو سے بوجھ بھی بن چکی تھیں جس کے نتیجہ میں برطانیہ کی نوآبادیات کے حوالے سے پالیسی کمزور پڑ گئی –

انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی نو آبادیات سیاسی طور پر اتنی طاقت ور ہو چکی تھیں کہ داخلی منصوبوں اور انتظام پر اثر انداز ہونا شروع ہوئیں - یہ تاریخ میں پہلا اور انوکھا واقعہ تھا کہ مقبوضہ علاقے کے لوگ زیادہ سے زیادہ سیاسی آزادی مانگ رہے تھے اور قابض قوتیں گفت و شنید اور مفاہمت پر مجبور تھیں – سیاسی حقوق مانگنا غداری نہیں رہا تھا بلکہ اسے بطور حق تسلیم کیا جا رہا تھا – ان نوآبادیات میں کھلے امکانات کی پالیسی (Open Door Policy) رائج ہوئی جسے برطانوی مدبر ڈزرائیلی نے پیش کیا جو لبرل کیپیٹلزم سے متاثر تھیں - اس پالیسی میں برطانوی شہریوں، غیر ملکیوں ، اور نوآبادیات کے مقامی افراد کے درمیان حقوق کی مساوات کا عہد کیا گیا – معیشت میں آزاد تجارت کی پالیسی کا وعدہ کیا گیا جس کی رو سے ریاست مقامی و غیر ملکی کمپنیوں میں تفریق نہیں کرے گی اور مارکیٹ میں سوائے امن و امان کے کسی بھی دوسرے معاملے میں مداخلت نہیں کرے گی –

جوں جوں لبرل اقدار مضبوط ہوتی گئیں اور ان کا ریاستی پالیسیوں پر اثر و رسوخ بڑھتا گیا ویسے ویسے نوآبادیات کے خلاف رائے عامہ بھی ہموار ہوتی گئی – آزاد مارکیٹ نے معیشت کی ہیئت ہی بدل دی اور اب یہ نوآبادیات الٹا مالیاتی بوجھ بن گئی تھیں – نوآبادیات کے مسئلہ کا حقیقی حل یہ تھا کہ برطانوی وہاں سے نکل جائیں اور ان علاقوں کے لوگ اپنے حق خود ارادیت کے تحت اپنی سیاسی سماجی اور معاشی تنظیم نو کریں – مگر انیسویں صدی کے لبرل لٹریچر میں یہ بحث زور شور سے جاری ہے کہ اگر برطانوی یہ علاقے چھوڑتے ہیں تو وہاں کس قسم کی صورتحال جنم لے گی – عمومی اتفاق یہ تھا کہ انارکی ، خانہ جنگی اور قحط پھیلے گا کیونکہ یہاں کا ڈھانچہ ایسا نہیں کہ کسی سیاسی تبدیلی کو فورا جذب کر سکے – انڈیا کے بارے میں یہ تصور تھا کہ یہاں راجے مہاراجے اور نواب پھر آپس میں لڑیں گے اور شاہی حکومتوں کا دور لوٹ آئے گا – اس لئے بہتر یہ سمجھا گیا کہ ان علاقوں میں ریاست امن و امان کو قائم رکھتے ہوئے نئے سیاسی سماجی اور معاشی ڈھانچہ کو نشوونما کے مواقع دے اسی سبب سے ہندوستان میں کانگریس اور دیگر نمائندہ سیاسی جماعتوں کو قائم کرنے کی ترغیب دی گئی تاکہ یہاں کے شہری نمائندہ سیاست کے رموز سیکھیں اور سیاسی مکالمہ کے آداب و اسلوب سے واقف ہوں –

نیشنلزم اور نوآبادیات ؟

ضروری ہے کہ ہم پہلے نیشنلزم کو مختصرا سمجھ لیں کیونکہ عہد حاضر میں لبرل ازم کو جن خاص چیلنجز کا سامنا ہے ان میں سوشلزم فاشزم اور نیشنلزم سب سے خطرناک ہیں – کیونکہ عالمی لبرل اقدار جیسے آزادی تجارت ، ملکی و بین الملکی امیگریشن ، محنت و سرمایہ اور علم و ثقافت کی گلوبلائزیشن کو یہی تینوں تصورات نقصان پہنچا رہے ہیں –

نیشنلزم ایک سیاسی سماجی اور معاشی تصور ہے جس کی رو سے ایک

- شہری کی وفاداری اور عقیدت کا محور اس کی ریاست ہے -

- شہری کے لئے لازم ہے کہ وہ ریاستی مفادات کو چاہے وہ اس کے فہم کے مطابق اچھے ہیں یا برے کبھی چیلنج نہ کرے –
- اور ہمیشہ اپنے شخصی و گروہی مفادات کو اس کے تابع رکھے –

قومیت کے اس تصور نے اٹھارویں صدی کے آخر میں سر اٹھایا جب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ختم ہوئیں اور ان کی جگہ ایک بڑی سلطنت قائم ہوئی – اس سے پہلے تمام انسانی تاریخ میں وطن کا تصور محض اپنی جنم بھومی اور مسکن تک محدود تھا – مثال کے طور پر ایک فرد کے لئے اس کا گاؤں قصبہ یا شہر ہی وطن تھے جس سے وہ نفسیاتی طور پر الفت رکھتا تھا – اپنے آباؤ اجداد کی ثقافت کو اپنی شناخت سمجھا جاتا تھا – لیکن قومیت کے اس نئے تصور نے سب بدل ڈالا – اب آپ کا جس ملک سے تعلق ہے اس کی سرحدیں جہاں تک ہیں وہ آپ کا ملک ہے اور ضروری ہے کہ اس پورے ملک کو وطن سمجھتے ہوئے اس سے محبت کی جائے – کوئی چیز اچھی ہے یا بری اس کا معیار اب ملکی یا ریاستی مفادات قرار پائے – اگر کوئی مخصوص علاقائی ثقافت قومی مفاد کے کسی مفروضہ تصور سے مطابقت نہیں رکھتی تو اسے ترک کر دینا عین حب الوطنی اور پسندیدہ عمل ہے – اس سے دو بڑے سنگین مسائل پیدا ہوئے –

1. چھوٹی علاقائی شناختوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جانا لگا کیونکہ نیشنلزم ایک ریاست میں ہر چیز کو ایک مخصوص یکسانیت میں دیکھنے کا قائل ہے – اس کے نزدیک قومیت کا اظہار تنوع میں نہیں بلکہ یکسانیت میں ہے – ہر وہ چیز جو یکسانیت پسند نہیں وہ قومی مفاد سے متضاد ہے – مثال کے طور پر جب پاکستان 1947 میں قائم ہوا تو ہمیں فوراً مقامی شناختیں بری لگنے لگیں - یہاں جو قومی ریاست قائم ہوئی اس نے اردو کو علاقائی زبانوں پر ترجیح دی جو یہاں کی اکثریتی آبادی کی زبانیں تھیں – ان مقامی زبانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جانے لگا – اردو سٹیٹس کو کی نمائندہ زبان بن گئی – یہاں تک کہ مشرقی پاکستان کے شہریوں نے جو ملک میں آبادی کے حساب سے اکثریت میں تھے جب بنگالی زبان کا مدعا کھڑا کیا تو انہیں قومی مفاد کا دشمن اور غدار قرار دیا گیا –

آج بھی ریاستی نفسیات وہی ہے – اگر پاکستان میں علاقائی شناختیں جیسے "سرائیکی شہری" زبان کی بنیاد پر علیحدہ صوبے کا مطالبہ کرتے ہیں تو اسے قومی مفاد سے متصادم سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ آپ انتظامی بنیادوں پر اگر صوبہ مانگتے ہیں تو اس پر غور کیا جا سکتا ہے مگر لسانی بنیادوں پر یہ تقاضا یکسانیت کا دشمن ہے اور اس سے تفریق پیدا ہوتی ہے – پاکستان میں ہر زبان اردو کے جبر کا شکار ہے اور اردو چونکہ ریاستی چھتری کے نیچے اجارہ داری سے لطف اندوز ہو رہی ہے اس لئے اس پر اگر سوال اٹھائے جاتے ہیں اور علاقائی زبانوں کا مقدمہ زیر غور لایا جاتا ہے تو اسے حب الوطنی سے متصادم سمجھا جاتا ہے –

2. خارجہ پالیسی میں ریاست جس دوسرے ملک کو دوست سمجھے نیشنلزم کے فلسفہ کی رو سے شہری بھی اسے دوست سمجھیں اور جسے دشمن سمجھے شہری بھی اس سے عداوت رکھیں – اگر ریاست یا حکومت کی دوستی وقت کے ساتھ ساتھ بدل رہی ہے تو شہری بھی اپنے جذبات وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے جائیں کیونکہ یہی نام نہاد قومی مفادات کا تقاضا ہے –

نیشنلزم اس مفروضہ پر قائم ہے کہ شہریوں کے شخصی یا گروہی مفادات قومی مفادات سے متصادم ہوتے ہیں – اس لئے قومی مفادات کا تحفظ لازم ہے یوں ریاست کو اجارہ داری دی گئی کہ وہ سیاست معیشت اور ثقافت پر کمانڈ و کنٹرول رکھے اور جس چیز کو اپنے مفروضہ قومی مفادات سے متصادم سمجھے اس سے جنگ کرے –

لبرل ازم نے ابتداء ہی سے نیشنلزم کے اس تصور کی مذمت کی ہے – نیشن اسٹیٹ وقت کا ناگزیر تقاضا تھا اور اب بھی ہے اس لئے اس کے قیام کو پسند کیا گیا مگر لبرل ازم نے ہمیشہ اس کے محدود انتظامی کردار کو قابل تحسین سمجھا ہے – لبرل تصور ہے کہ انسان پوری دنیا میں تاریخی ثقافتی جغرافیائی اور دیگر اسباب کی بدولت اقوام میں بٹے ہوئے ہیں – یہ تقسیم نہ نظریاتی ہے ، نہ حتمی اور نہ ہی اخلاقی ہے – ہم سب اپنی اول شناخت میں انسان ہیں اور انسانیت و اخلاقیات کا رشتہ ہمیں سرحدوں میں تقسیم نہیں کرتا – اپنے وطن سے محبت فطری ہے مگر اس کی بنیاد پر اچھائی برائی کی تقسیم کرنا عقل دوستی (rationality) اور دلیل پسندی (Reasoning) سے بغاوت ہے – اپنے ملک کے مفادات کے لئے دوسرے ممالک کے شہریوں کا استحصال انسانی بنیادوں پر ایک مکروہ ترین جرم ہے –

اچھائی برائی کے تصورات کو قومیت کے حوالے سے دیکھنا کہ جس میں سیاست دان بیورو کریٹس اور " سٹیٹس کو" کے گروہ مل کر پہلے قومی مفادات متعین کریں اور پھر عوام کو حکم دیا جائے کہ وہ بلاچوں چراں ان پر ایمان لے آئیں ایک باطل تصور ہے اور فاشزم سے زیادہ فکری و عملی نسبت رکھتا ہے – یہی وہ حقیقت ہے کہ جس کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ فاشزم نے سوشلزم اور نیشنلزم کی کوکھ سے جنم لیا تھا –

لبرل ازم نے نیشنلزم کی کس طرح مخالفت کی مشہور لبرل کیپٹلسٹ مصنف میزز کے بیان کا خلاصہ درج ذیل ہے –

1 . لبرل ازم نے دوسرے ملکوں پر حملہ کر کے قبضہ کرنے کو توسیع پسندانہ امپیریل ازم قرار دیا اور اس کی بھرپور مخالفت کی – یہ تاریخ میں پہلی بار ہو رہا تھا کہ باقاعدہ علمی و عملی تحریک سے دوسرے ممالک کو فتح کرنے کے جنون کو شجاعت نہیں بلکہ ظلم قرار دیا جا رہا تھا –

2. کسی بھی ملک کی زمین اس کے بادشاہ یا ریاست کی نہیں بلکہ شہریوں کی ہوتی ہے – اس لئے اپنے ملک میں یا کسی یا کسی دوسرے ملک کسی کی زمین پر قبضہ ناجائز ہے اور بنیادی انسانی حقوق سے متصادم ہے – حکومت انسانی سوسائٹی کے انتظامی بندوبست کا نام ہے – ریاست کسی بھی شہری سے اس کی زمین نہیں چھین سکتی –

3. اقتدار اعلیٰ کسی بھی ریاست میں خدا یا بادشاہ یا بذات خود ریاست کے پاس نہیں ہوتا بلکہ یہ شہریوں کے پاس ہوتا ہے – کوئی بھی بادشاہ یا ملکہ اپنے اقتدار کو خدا سے منسوب کر کے (جیسے اس دور میں مشہور شاہی سلوگن تھے "God save King"یا "God save Queen"اور بادشاہ یا ملکہ کے اقتدار کو خدا سے منسوب کیا جاتا تھا) یا نسلی برتری ثابت کر کے اپنے اقتدار کو جائز قرار نہیں دے سکتا – انہی تصورات کا اثر تھا کہ فرانس کے بادشاہ نے اپنا ٹائٹل " کنگ آف فرانس " سے بدل کر "کنگ آف فرنچ " اور بیلجیم کے بادشاہ نے اپنا ٹائٹل "کنگ آف بیلجیم " سے بدل کر "کنگ آف بیلجئنز " رکھ لیا تاکہ اقتدار کو لوگوں سے نسبت دی جائے –

4. کسی ملک کا جائز حکمران صرف وہ ہو گا جسے وہاں کے شہری منتخب کریں گے – اس کے علاوہ حکمرانی کا کوئی جائز جواز نہیں –

5. ریاست اپنے دائرۂ کار میں محدود رہے اور وہ فرد و سوسائٹی کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتی – ریاست اپنے ارادہ کا جبر شہریوں پر نافذ نہیں کر سکتی–

6. ملکی اور بین الملکی امیگریشن تمام انسانوں کا بنیادی حق ہے – یہ دنیا تمام انسانوں کی ہے – ایک انسان جہاں بھی رہنا چاہے اسے حق حاصل ہے کہ وہاں کی سکونت اختیار کرے –

7 . سرمایہ و محنت اور علم و ثقافت کی گلوبلائزیشن کے حق کی حمایت کی گئی –

8 . جس طرح چرچ کو ریاست سے دور رکھنے کی بات ہوئی ویسے ہی اس بات کو اٹھایا گیا کہ ریاست سکول سے دور رہے کیونکہ نیشلسٹ بیانیہ کہیں اور سے نہیں تعلیم کے راستے حب الوطنی اور قومی مفاد کے نام پر طلباء کے ذہنوں میں ٹھونسا جاتا ہے –(51)

انیسویں صدی کے آخر میں مغربی اقوام میں نو آبادیات بڑھنے کا رجحان نیشلسٹ اثرات کے سبب پھر سے بڑھ گیا ، باوجود اس کے کہ یہ نو آبادیات معاشی اعتبار سے سراسر نقصان تھیں – فرانس نے افریقہ میں اپنی سلطنت وسیع کی ، جرمنی نے بھی افریقہ اور پولینیشیا کے علاقوں کو اپنی کالونی بنایا – روس جاپان اور امریکہ نے بھی دنیا کے مختلف ممالک میں نئے علاقے مقبوضہ بنائے – اہم بات یہ ہے کہ حکومتوں کے ان مہم جو اقدامات کا مقصد کسی طرح سے بھی معاشی نہیں تھا بلکہ قوم پرستانہ تھا –

اس سلسلے میں جرمن نو آبادیات کی مثال دیکھئے –باقاعدہ ثبوت موجود ہیں کہ جرمن بنکاروں اور کاروباری افراد نے حکومت کی نئے علاقوں کو فتح کرنے کی پالیسیوں کو احمقانہ اور وسائل کا ضیاع قرار دیا اور ان کی مخالفت کی – یہاں تک کہ جب ان زیر قبضہ علاقوں میں محفوظ تجارت کی پالیسی نافذ کی گئی جس کی رو سے ان علاقوں میں سوائے جرمن کمپنیوں کے کوئی اور کمپنی امپورٹ اور ایکسپورٹ کا کام نہیں کر سکتی تھی تب بھی جرمن کمپنیوں نے ان علاقوں میں اس سبب توجہ نہ دی کہ وہاں کاروبار کے مواقع دوسرے علاقوں کی نسبت موجود ہی نہیں تھے – جنگ عظیم اول سے بالکل پہلے جرمنی کی اس کی نو آبادیات سے تجارت اس کی کل بین الاقوامی تجارت کے ایک فیصد کا بھی نصف تھی – پچیس ہزار سے بھی کم جرمن جن کی اکثریت بیورو کریسی سے تعلق رکھتی تھی ان زیر قبضہ علاقوں میں رہتے تھے – دلچسپ بات یہ کہ دنیا کے ہر بڑے شہر میں جرمن تاجروں اور ان کے جرمن ملازمین کی تعداد پچیس ہزار سے زائد تھی (52)

یہاں ایک اور بات بھی دلچسپ ہے وہ یہ کہ جب جرمن نو آبادیات قائم ہوئی تھیں اس وقت کی جرمن حکومت کیپیٹلزم سے خاص طور پر عداوت رکھتی تھی ۔ کیپیٹلزم کے تصور برائے فری ٹریڈ کو ناپسند کیا گیا اور معیشت پر زیادہ سے زیادہ سیاسی مداخلت کو انتہائی پسندیدہ قرار دیا گیا تھا ۔ جرمن چانسلر بسمارک اور اس کے Kaiser کی پالیسیوں کو کسی طرح سے بھی کیپیٹلزم کی پالیسیاں قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ یہ سراسر مہم جوئیانہ تھیں جو نیشلسٹ اثرات سے متاثر تھیں ۔
جاپان اور روس کے حوالے سے بھی یہی سیاسی صورتحال تھی جس میں ان مہم جوئیانہ اقدامات کے درج بالا اور کچھ دیگر بہت سارے اسباب تھے ۔

فرانس نے جب قوم پرستانہ اور مداخلت پسندانہ پالیسیوں کے سبب نو آبادیات کے منصوبوں پر عمل کیا ، اس وقت جمہوریہ تھا ۔ اٹھارہ سو ستر کی فرانس جرمن جنگ جس میں فرانس کو شکست ہوئی تھی اور اس کے "الاسکی ۔ لورین " صوبے جرمنی کے زیر قبضہ چلے گئے تھے ، کے سبب فرانسیسی قوم پرستانہ جذبات انتہائی مجروح ہوئے تھے ۔ اس لئے ایسے میدان تلاش کئے گئے تھے کہ کسی طرح فرانسیسی فخر ، خود اعتمادی اور مورال دوبارہ بلند کیا جائے جس کا سب سے آسان طریقہ نو آبادیات ہی تھیں ۔ یوں شمالی افریقہ پر فرانسیسی افواج چڑھ دوڑیں ۔ تاریخی ریکارڈ موجود ہے کہ اس مہم جوئی کا کوئی بھی کاروباری مقصد نہیں تھا کہ کیپیٹلزم کو الزام دیا جائے اور نہ ہی کوئی کاروباری مفادات حاصل کئے جا سکے ۔ فرانسیسی تجارت پر ان نو آبادیات کے اضافہ سے کوئی خاص فرق نہ پڑا جس طرح جرمنی کے معاملہ میں ہم نے دیکھا ۔

اس پورے عرصہ کے دوران برطانیہ اپنے ملک اور اپنی نو آبادیات میں اسی "کھلے امکانات کی پالیسی" پر کاربند رہا ۔ اس دوران ایڈم سمتھ اور ان کے ہم خیال ساتھیوں ،شاگردوں اور ہمنواؤں کی فکری جدوجہد اور قومی معاشی پالیسیوں پر اثرات کی بدولت برطانیہ تجارت میں کم سے کم حکومتی مداخلت کی پالیسی پر قائم رہا اور سیاست و ثقافت میں برطانوی لبرلز ، نو آبادیات اور امپیریلزم کی ریاستی پالیسیوں کی مخالفت کرتے رہے کیونکہ یہ بنیادی انسانی حقوق سے متصادم سمجھی گئیں ۔

امریکہ سپین جنگ 1898 میں لڑی گئی ۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ امریکی نیوی کے ایک بحری جہاز "Maine" کو "ہوانا ہاربر" پر پراسرار طور پر سمندر غرق کر دیا گیا جس کا الزام سپین پر لگا ۔ سپین نے بار بار وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کے لئے ایسی اصلاحات کرے گا کہ ایسا واقعہ دوبارہ نہ پیش آئے ۔ مگر اس وعدہ پر عمل نہ ہو سکا ۔ اس وقت ریپبلکن صدر ولیم مکینلی کی حکومت تھی ۔ اپوزیشن میں ڈیموکریٹک پارٹی تھی جس نے حکومت پر شدید دباؤ ڈالا کہ وہ جنگ کا اعلان کرتے ہوئے سپین کو اس جنگی جرم کا سبق سکھا دے مگر ریپبلکن صدر جنگ کو ٹالتے رہے ۔ میڈیا میں اس وقت جنگ کی حمایت میں پرزور پروپیگنڈہ جاری تھا جس میں جوزف پولٹزر اور ولیم ہرسٹ پیش پیش تھے ۔ میڈیا کے اس جنگی جنون اور مسخ کردہ معلومات کی بنیاد پر صحافت میں "Yellow Journalism" کی اصطلاح مشہور ہوئی ۔

امریکہ نے سپین کو الٹی میٹم دیا کہ یا تو بحری جہاز کی تباہی کے مجرمین کو سزا دے کر آئندہ کے لئے ایسے اقدامات کا راستہ روکا جائے ورنہ کیوبا خالی کر دیا جائے - جواباً سپین نے جنگ کا اعلان کر دیا اور جنگ چھڑ گئی - یہ جنگ کچھ ماہ جاری رہی جس میں سپین کو شکست ہوئی –

کیوبا ریاست متحدہ امریکہ کے لئے خاص طور پر اس جنگ کے بعد انتہائی اہمیت اختیار کر گیا تھا – اس پر امریکی فوجی قبضہ سے پہلے صدارتی فنڈ جاری کیا گیا تھا جس کی رو سے کیوبا کو باقاعدہ خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا تاکہ اپنا دفاع مضبوط بنایا جائے – کیوبا اٹھارویں صدی سے پہلے امریکہ پر قابض برطانویوں کے لئے بھی انتہائی اہم تھا کہ کسی طرح اسے حاصل کیا جائے – آزادی کے بعد بھی یہ رحجان قائم رہا کیونکہ کیوبا کی طرف سے کسی بیرونی قوت کے حملے کا خدشہ رہتا تھا –
جنگ کے کچھ ماہ بعد سپین اور امریکہ کے درمیان پیرس امن معاہدہ ہوا جس کی رو سے سپین نے پہلے کیوبا، پیرتو ریکو، گوام، اور فلپائن کو چھوڑا اور آخرکار یہ علاقے خودبخود امریکی نوآبادیات بن گئے – یاد رہے کہ یہ علاقے باقاعدہ جنگ سے زیر قبضہ نہیں لائے گئے اور نہ ہی ان میں کوئی باقاعدہ تجارتی و کاروباری مقاصد تھے – اس وقت بھی اور آج بھی ان علاقوں میں امریکی تجارتی مفادات نہ ہونے کے برابر ہیں مگر سیاسی اور فوجی مقاصد ہنوز قائم ہیں –

سپین امریکہ جنگ چاہے اس کی نوعیت دفاعی تھی، امریکی لبرلز نے پرزور انداز میں مذمت کی – جس کے لئے ایک تنظیم "انٹی امپیریالسٹ لیگ Anti-Imperialist League" قائم کی گئی جس کا مقصد امریکہ کی اس جنگ کے بعد قائم ہونے والی نوآبادیات کی پالیسیوں کے خلاف جدوجہد کرنا تھا – اس تنظیم کے روح رواں تین لوگ تھے : ولیم گراہم سمر (اپنے عہد کا مقبول ترین لبرل کیپٹلسٹ)، مارک ٹوون (جو بعد میں 1901-10 تک امریکی نائب صدر رہے) اور مشہور امریکی بزنس مین Edward Atkinson تھے جنہوں نے امریکی کاروباری طبقہ کی نمائندگی کی –

اس تنظیم کا منشور ان الفاظ پر مبنی تھا –
" ہم سمجھتے ہیں کہ امپیریل ازم کی پالیسی آزادی سے متصادم ہے اور فوجی مقاصد (Militarism) رکھتی ہے – یہ ایک ایسی برائی ہے جو ہماری آزادی کی دشمن ہے – ہم سمجھتے ہیں کہ اب یہ لازم ہو گیا ہے کہ ہم واشنگٹن اور لنکن کی اس سرزمین پر یہ عزم دوبارہ دہرائیں کہ تمام انسان جن کا کسی بھی رنگ و نسل سے تعلق ہے انہیں اپنی زندگی، آزادی، اور خوشی کی جستجو کا حق حاصل ہے - .... ہم اس موقف پر قائم ہیں کہ جائز حکومتیں صرف وہی ہیں جنہیں لوگ منتخب کریں (نہ کہ قبضے سے قائم کردہ حکومتیں) – ہم پرزور الفاظ میں کہتے ہیں کہ لوگوں کو ان کی مرضی کے بغیر محکوم رکھنا جارحیت اور جرم ہے اور یہ ہماری سابقہ حکومتوں کی روایات اور نمایاں اصولوں سے کھلم کھلا متصادم ہے " (53)

اس لیگ میں اپنے عہد کے لبرلز جنہیں آج کل کلاسیکل لبرلز کہا جاتا ہے پیش پیش تھے – یہ لبرلز آزادی تجارت ، سونے کے بطور کرنسی استعمال (یعنی گولڈ سٹینڈرڈ) ، اور محدود دائرۂ کار کی حکومت کے حامی تھے – اس تحریک کا مزاج اور مقاصد جاننے کے لئے ہمیں اس کے روح رواں ولیم گراہم سمر کے بارے میں جاننا ہو گا –

سمر 1840 میں پیدا ہوا اور 1910 میں اس کی وفات ہوئی – سمر اپنے عہد میں لبرل کیپیٹلزم اور ارتقاء پسند نظریات کی وجہ سے بہت مقبول تھا – Yale یونیورسٹی کے اس پروفیسر نے امریکی کی نوآبادیات امپیریلزم کی پالیسی کی ان الفاظ میں مذمت کی –

"توسیع پسندی یعنی امپیریلزم، امریکی شہریوں کی روایات اصولوں اور مقاصد سے متصادم ہے – یہ ہمیں مشکلات اور سیاسی خطرات میں ڈبو دے گی جن سے آج تک ہم محفوظ رہے ہیں–"(54)

ایک اور جگہ سمر لکھتے ہیں –
"ہم سپین کو جنگی میدان میں شکست دے چکے ہیں مگر نظریات اور قومی سیاسی مقاصد میں اس سے شکست کھا رہے ہیں – توسیع پسندی یعنی امپیریلزم اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ یہ قومی خوشحالی کا قدیم فلسفہ ہے جس کا پہلے بھی جنم سپین سے ہوا تھا (جب کولمبس نے اسپینی حکومت کی مدد سے امریکہ کو کالونی بنایا تھا) اور اب بھی سپین سے اس کا جنم ہوا ہے (جب ہم نے دوسری اقوام کو اپنی نوآبادیات بنا لیا ہے) – یہ فلسفہ بدقسمتی سے قومی غرور اور قومی لالچ کو اپیل کرتا ہے اور لوگوں کی اکثریت کے لئے دلفریب ہے اس لئے مقبولیت پسند اثرات کے لحاظ سے بہت مضبوط ہے – یہ اوہام کا مجموعہ ہے – اگر ہم نے آگے بڑھ کر اس کے خلاف جدوجہد نہ کی تو یہ ہمیں برباد کر دے گا جیسے اس نے سپین کو دیوالیہ کر دیا ہے – "(55)

سمر ان توسیع پسندانہ اور قوم پرستانہ رجحانات کا مذاق اڑاتا ہے جو امپیریلزم کی وجہ ہیں – وہ قوم پرستی اور حب الوطنی کو باہم متضاد سمجھتا ہے – اس کے الفاظ ہیں :
" ایسے لوگ ہمارے ملک میں موجود ہیں جو اپنے قومی غرور میں گرفتار ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ امریکہ نے اب جنگ سے دنیائے اقوام میں اپنا ممتاز مقام پایا ہے " (56)

سمر ایک دوراندیش مفکر تھا – وہ امریکہ میں ابھرتے ہوئے قوم پرستانہ جذبات کو دیکھ رہا تھا – اس نے امریکہ کو خبردار کیا کہ اس کے توسیع پسندانہ اقدامات کے سنگین نتایج نکلیں گے – اور تاریخ میں ہم نے دیکھا کہ جب امریکہ نے "عدم مداخلت کی لبرل پالیسی " کو چھوڑا اور فاشسٹ قسم کے "فے بیان " اور " کنیزین " نظریات کو قبول کیا تو وہی نتائج نکلے جس سے سمر نے خبردار کیا تھا – سمر کہتا ہے –

"وہ کیسے دن ہوں گے جب ہماری موجودہ خوبیاں ختم ہو جائیں گی اور ہم ان قدیم زوال پزیر اقوام کی طرح ہو جائیں گے ؟ جواب ہے : جنگ ،ملکی قرضے ، ٹیکسوں کی بھرمار ، سیاسی عیاریاں ، اپنے دائرۂ کار میں وسیع و عریض حکومت ، ظاہری نمود و نمائش ، بڑی افواج ، شاہانہ اخراجات ، بددیانت سیاست .....، اور امپیریلزم " (57)

حق انتخاب میں ہی آزادی ہے

ایک مسابقتی معاشرے میں حق انتخاب سے مراد یہ ہے کہ اگر ایک شخص ہماری امنگوں پر پورا نہیں اتر رہا تو ہم کسی دوسرے سے رجوع کر لیں – مگر جب ہم اجارہ داری کا سامنا کرتے ہیں تو ہم اس کے مطلق رحم و کرم پر ہوتے ہیں – اسی طرح کوئی بھی ایسی سرکاری اتھارٹی جو پورے ملک کے معاشی نظام کو کنٹرول کر رہی ہوتی ہے بہت زیادہ طاقتور اجارہ دار قوت کی طرح کام کرتی ہے - اس کے پاس مکمل اختیار ہوتے ہیں کہ وہ فیصلہ کرے کہ ہمیں کیا عطا کیا جائے اور کن شرائط پر عطا کیا جائے – وہ صرف اس بات کا فیصلہ نہیں کرتی کہ ہمیں کون سی اشیاء و خدمات فراہم کی جائیں اور کس مقدار میں فراہم کی جائیں بلکہ اس بات کا بھی فیصلہ کر رہی ہوتی ہے کہ لوگوں کے درمیان اشیاء و خدمات کی تقسیم کس درجے کی ہو (یعنی حکومت بذات خود طبقات قائم کر رہی ہوتی ہے اور لوگوں کو تقسیم کر رہی ہوتی ہے)

– فریڈرک ہائیک

فری مارکیٹ کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تمام افراد چاہے وہ پروڈیوسر ہیں یا کنزیومر انہیں حق انتخاب حاصل ہے کہ بطور پروڈیوسر وہ جو چیز پیدا کرنا چاہیں ، پیدا کریں ، جو ٹیکنالوجی استعمال کرنا چاہیں استعمال کریں،جس قیمت پر اورجس صارف کو بھی بیچنا چاہیں انہیں اس کا حق حاصل ہے،کیونکہ وہ اس چیز یا خدمت کو پروڈیوس کر رہے ہیں اور وہ ان کی پراپرٹی ہے - اسی طرح صارفین کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ جس پروڈیوسر کی بھی چاہیں وہ چیز خریدیں ،جو قیمت اور کوالٹی انہیں پسند ہو وہ ڈیمانڈ کریں اور کسی بھی خریدی گئی شے کو جس طرح چاہیں خرچ کریں انہیں اس کا حق حاصل ہے کیونکہ وہ چیز اب خریدنے کے بعد ان کی پراپرٹی بن چکی ہے -

حق انتخاب دراصل آزادی انتخاب (Freedom to choose) کا معاملہ ہے- انتخاب (Choice) سے مراد یہ ہے کہ جب خریدار و سیلر کے درمیان اشیاء و خدمات کا تبادلہ ہونے لگے تو اس دوران ایک باقاعدہ معاہدہ لازمی ہے جس میں کسی بھی شے کی پراپرٹی اب سیلر سے خریدار کو منتقل ہوجاتی ہے- عموما جب ہم کسی دوکان پر کوئی شے خرید تے ہیں تو جو رسید دکاندار ہمیں دیتا ہے اس میں تاریخ ،شے کا نام اور خصوصیات ،قیمت ،سیلر کا نام اور خریدار کا نام لکھا ہوتا ہے-انوائس یا رسید دراصل اس ایگریمنٹ کا ثبوت ہے کہ دکاندار نے اس قیمت کے بدلے فلاں شے فلاں خریدار کی ملکیت میں منتقل کر دی اور اب وہ خریدار جس طرح چاہے اسے استعمال کر سکتا ہے بشرطیکہ کسی بھی منفی استعمال کی صورت میں وہ قانون کے سامنے جوابدہ ہو گا-

جس طرح جمہوریت میں ہم شہریوں کو حق انتخاب دیتے ہیں کہ وہ اپنے لیے گورنمنٹ منتخب کریں،ویسے ہی آزاد سماج میں مذہبی آزادی ،آزادی اظہاررائے اور تنوع پسندی وغیرہ جیسے حقوق تسلیم کئے جاتے ہیں۔اسی طرح معیشت میں بھی اشیاء و خدمات کی مد میں حق انتخاب (Freedom to choose) لازمی ہے۔یہ سب ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں ۔ معیشت میں لبرل ازم یہی ہے کہ فرد کو اپنے معاشی فیصلوں اور ذاتی زندگی کی ترجیحات میں آزادی حاصل ہو جس کا اظہار وہ اپنے بطور پروڈیوسر و کنزیومر آزادانہ حق انتخاب سے کرتا ہے۔

حق انتخاب کے اظہار میں تنوع پایا جاتا ہے،کیونکہ جس طرح ایک فرد کی معاشی ترجیحات ، فیصلے اور اس کا ذاتی نظام اقدار مختلف ہے اسی طرح تمام افراد کے بطور پروڈیوسر و کنزیومر چوائسز میں انتخاب کے رویے بھی مختلف ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مارکیٹ میں ایک ہی ضرورت کی اشیا مختلف ورائٹیز میں دستیاب ہوتی ہیں۔کنزیومر کے رویے ان ورائٹیز کے انتخاب میں ناقابل پیش گوئی (Unpredictable) ہوتے ہیں وہ جن چیز کو جتنا زیادہ ویلیو دیں گے مارکیٹ میں ان کی اہمیت بڑھے گی۔

مثال کے طور پر ٹیلی کمیونیکیشن انڈسٹری میں اس وقت آئی فون اور سام سنگ مارکیٹ کی قیادت کر رہے ہیں ،صارفین کی ترجیحات میں ان کی ویلیو زیادہ ہے،نوکیا کنزیومرز کی کامیاب چوائس نہیں رہا اور مارکیٹ میں اب بالکل پیچھے رہ گیا ہے ،جبکہ کچھ سال پہلے وہ مارکیٹ لیڈر تھا۔ باقی موبائل کمپنیاں جیسے ایچ ٹی سی اور سونی ایرکسن اور ایل جی وغیرہ بھی اپنے اپنے پروڈکٹ بیچ رہی ہیں ، جنہیں عوام کی ایک بڑی تعداد آئی فون اور سام سنگ کے مقابلے میں زیادہ ویلیو دے کر اپنا انتخاب بنا رہی ہے۔ ان سب موبائل کمپنیوں اور ان کے پروڈکٹس میں کنزیومرز کی مختلف چوائسز (انتخاب) دراصل کنزیومرز کی تنوع پسندی کا اظہار ہے۔ کوئی ایک یا دو موبائل کمپنیاں یا کوئی دو چار پروڈکٹس کنزیومرز کی چوائسز کے لیے کافی نہیں۔اسے ایک بڑی ورائٹیز یا متبادلات میں سے ایک کافی معقول اور بہتر متبادل کی ضرورت ہوتی ہے،جسے اس کا ویلیو سسٹم یعنی نظام اقدار متعین کرتا ہے۔

تمام انسانوں کی پسند و ناپسند میں نہ جمود ہے اور نہ ہی یکسانیت

فریڈم اور حق انتخاب کے مخالفین کا دعوی ہے کہ فرد کی ضروریات ، خواہشات اور ترجیحات مستقل (Constant & Uniform) ہوتی ہیں جنہیں کوئی اتھارٹی یا گورنمنٹ لوگوں کے لیے پہلے سے متعین کر کے پورا کر سکتی ہے ۔ مثال کے طور پر سوویت یونین میں حکومت افراد کی پسند و ناپسند (چوائسز) کا خود ہی تعین (Predict) کرتی تھی اور بغیر کسی ورائٹی یا تنوع کے انہیں پورا کرنے کی مناپلی یعنی اجارہ داری رکھتی تھی۔اس میں حق انتخاب فرد کے پاس نہیں بلکہ بالادست بیورو کریسی اور سوشلسٹ راہنماؤں کے پاس تھا۔ایک فرد کو جس شکل و صورت اور کوالٹی کے جو جوتے مہیا کیے جاتے وہ باقی تمام کنزیومرز میں بھی شکل و صورت اور ڈیزائن میں ایک جیسے ہوتے تھے۔

مطلق العنانیت یعنی Authoritarianism کے نزدیک مارکیٹ میں قابل فروخت اشیاء (پروڈکٹس) میں تنوع سرمایہ داروں کی رنگین ترغیب ہے جس کے ذریعے وہ عوام کو لوٹنا چاہتے ہوتے ہیں۔

فری مارکیٹ کافلسفہ کہتا ہے کہ زندگی کے تمام میدانوں بشمول معیشت میں حقیقی آزادی فرد کے حق انتخاب میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری چوائسز مستقل اور یکساں نہیں ہیں۔ان میں تنوع اور ورائٹی ہے اسی سبب سے ہمارے معاشی فیصلوں میں بھی تنوع ہے کیونکہ تمام افراد کا ذاتی نظام برائے اقدار آزاد ،خود مختار اور انفرادیت پسند ہے۔

ہم انسان مکمل طور پر پرفیکٹ نہیں۔

یہاں ایک اہم نکتہ جس کی وضاحت ضروری ہے کہ جہاں چیزیں پرفیکٹ صورت میں موجود ہوں اور آپ کو اپنی ضروریات و خواہشات کا بھی پرفیکٹ علم ہو کہ آپ کو فلاں چیز یا ورائٹی اپنے پرفیکٹ انداز میں مطمئن (Fulfill) کر دے گی تب بھی پسند و ناپسند کے انتخاب (چوائسز) کا مقدمہ کمزور پڑ جاتا ہے ۔اکنامک سسٹم میں پسند و ناپسند کے انتخاب سے مراد یہ ہے کہ آپ کو (جی ہاں ہم سب کو) بھی اپنی ضرورت و خواہش کا سو فیصد حتمی اور پرفیکٹ علم نہیں مگر اس دنیا میں آپ سے زیادہ کوئی بھی آپ کی ضروریات اور خواہشات کو نہیں سمجھ سکتا اور یہ بھی کہ کوئی بھی پروڈکٹ یا سروس آپکی ضرورت یا خواہش کو سو فیصد (Perfectly)مطمئن نہیں کر سکتی ، عموما کچھ ناکچھ کبھی کم تو کبھی زیادہ نقص (Imperfection) مگر بہرحال باقی رہتا ہے ۔

ہمارا سامنا اشیا و خدمات سے ہوتا ہے۔ جن میں ورائٹی ہے اور ہر ہر پروڈکٹ یا سروس کی مختلف خصوصیات ہیں ۔ہم اپنے نظام اقدار کو استعمال میں لاتے ہوئے کسی ایک کا انتخاب کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک ہماری ضرورت ،خواہش اور بجٹ کے عین مطابق اور سب سے بہتر ہو۔جب ہم اسے استعمال کرتے ہیں تو ہم سیکھتے ہیں ۔اگر ضرورت و خواہش بہتر مطمئن ہوئی تو ہم اپنے انتخاب میں مزید بہتر کی جستجو کرتے ہیں،اور اگر ضرورت و خواہش کی تکمیل صحیح طور پر نہ ہوئی تو اس سے سبق حاصل کرتے ہوئے اور اسے یا اس جیسی چیز کا انتخاب دوسری بار کرنے کے بجائے کسی دوسری بہتر شے یا خدمت کاانتخاب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ قدرپیمائی (evaluation) ، تجربہ اور سمجھ بوجھ ہمیشہ ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور یوں ہم اپنے رویوں میں لچکدار ہوتے ہیں۔

ہم انسان مکمل طور پر پرفیکٹ نہیں ۔ ہمارے رویوں میں غلطیاں بھی ہیں اور درستگیاں بھی ۔ درست رویوں کا امکان ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ہمیں کسی دوسرے کی نسبت اپنی ضروریات ،خواہشات ،اور اقدار کا زیادہ پتہ ہوتا ہے، جس سے بہتر فیصلوں کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اگر ہم صد فیصد

پرفیکٹ ہوتے تو ہم میں یکسانیت ہوتی ،تنوع نہیں کیونکہ ہم سب ایک ہی پرفیکٹ چیز پر ہوتے یوں ہم پر پرفیکٹ آئیڈیا کا جبر بھی ممکن ہوتا اور ہمارے رویے پرفیکٹ انداز میں ٹائم اور پلیس سے ماورا ہوکر مستقل ہی رہتے اور ان میں ارتقاء نہ ہوتا۔

ہمارے پاس محدود وسائل ہیں اس لیے ہمیں سیاسی و معاشی امور میں بہترین کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔اگر سیاست میں بھی تمام شہریوں کا فیصلہ ہر وقت پرفیکٹ ہوتا تو حکومت پر اپوزیشن کی ضرورت نہ ہوتی ، طاقت کے توازن کی جدو جہد نہ ہوتی اور ایک مخصوص مدت کے بعد دوبارہ الیکشن کی ضرورت نہ رہتی ،آزاد میڈیا کا کوئی کام نہ رہتا کیونکہ کچھ منفی دکھانے کو ہی نہ ہوتا اور سب اچھائیاں چونکہ یکساں ہوتیں اس لئے ان میں کوئی قابل غور بات ہی نہ رہتی –جبکہ حقیقی زندگی اس یوٹوپیا سے مختلف ہے اس میں ہمارا سارا سیاسی بندوبست پرفیکشن کی مسلسل جستجو میں رہتا ہے۔ وقت اور مقام کے ساتھ ہم آہنگی برقرار رکھتے ہوئے ہم مسلسل سیکھتے ہوئے ،نئے چیلنجز کا سامنا کرتے اور بہتر مواقع کی جستجو میں رہتے ہیں ، یہی ارتقاء کی محرک قوتیں ہیں– اسی لئے ارتقاء بھی وقت اور مقام (Place) کے اعتبار سے پرفیکشن کی جستجو ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا کہ انسانی زندگی ، اس کے فیصلوں اور انسانی پیداوار میں پرفیکشن نہیں پائی جاتی ۔یہی صورتحال اس وقت بھی پیدا ہوتی ہے جب پروڈیوسر کوئی غلط چیز پیدا کر دیتا ہے، جسے صارف کی پسند یعنی چوائس حاصل نہیں ہوتی ، یا اس چیز یا خدمت کی قیمت و کوالٹی صارف کے معیار کی نہیں ہوتی۔ اس طرح صارف بھی اپنے معاشی فیصلوں میں غلطی کر سکتا ہے مگر اس کے باوجود ہمارے پاس اور کوئی متبادل نہیں کہ فرد کی غلطی کرنے کی آزادی کو بھی تسلیم کیا جائے ۔اس سے مزید سمجھ بوجھ بھی پیدا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ امکان بھی ضرور پایا جاتا ہے کہ جسے ہم اس کے برپا ہونے سے پہلے غلطی سمجھ رہے ہیں وہ جب عملی صورت میں سامنے آئے تو اس کے نتائج حوصلہ افزا ہوں – کیا ایسا نہیں کہ بعض لوگوں نے جب کوئی آئیڈیا پیش کیا تو اسے شروع میں غلط قرار دیا گیا تھا مگر بعد میں وہ سچ ثابت ہوا – اسی طرح معیشت میں عموما جب کوئی نئی چیز آتی ہے تو اس پر بھی شک کیا جا سکتا ہے کہ آیا اس میں نفع ہے بھی یا نہیں – مثال کے طور پر جب بل گیٹس نے مائیکروسافٹ کا آغاز کیا تو بعض لوگوں کے نزدیک یہ ایک احمقانہ اقدام تھا مگر وقت نے ثابت کیا کہ بل گیٹس نہیں بلکہ مارکیٹ کے نجومی غلط تھے ۔فکر و عمل کی آزادی میں غلطی و اصلاح اور بہتر نتائج دونوں کے امکانات پائے جاتے ہیں، اور یہ ناگزیر ہے۔

انسانوں میں بہترین انتخاب کی صلاحیت ہے -

ایک بہتر نظام وہ ہے جو بہترین انتخاب کو انعام (ریوارڈ) دے اور غلط انتخاب پر سرزنش کرے– اپنی غلطیوں پر اصرار کرنے والے پیچھے رہ جائیں اور سیکھنے سمجھنے اور مزید بہتر کی جستجو کرنے والے آگے بڑھتے جائیں۔مارکیٹ کے نظام میں بھی فری مارکیٹ اسی ضرورت کو پورا کرتی

ہے۔ سیاست میں یہ راہ سیکولر ازم و جمہوریت میں ہے تو سماج میں اسے تنوع پسندی ،انفرادیت پسندی،بنیادی انسانی حقوق کی سر بلندی اور سماجی بندوبست میں خود تنظیمی کی صلاحیت کہتے ہیں۔

انسان اور دوسری مخلوقات میں فرق کرنے والی سب سے بڑی چیز شخصی انتخاب کی آزاد صلاحیت اور جمود کے برخلاف تنوع و تبدیلی پسندی ہے۔دوسری تمام مخلوقات کی فطرت و رویے جو ہورہا ہے اسے ہونے دیں (Just to happen) قسم کے ہوتے ہیں ۔ان کی فطرت اسی سبب سے جامد اور غیرمتنوع ہوتی ہے جبکہ انسان میں اس طرح کی جامد ، غیر متبدل (Unvaried) اور غیر متنوع فطرت نہیں پائی جاتی ہے۔ ہم میں ہر فرد دوسرے سے اپنے نظام اقدار کے اعتبار سے مختلف ہے۔ہم اپنی ترجیحات ، فیصلوں ، انتخاب ، سمجھ بوجھ اور علم و ٹیکنالوجی وغیرہ کی بنیاد پر بہتر نتائج کی جستجو میں رہتے ہیں اور اسی میں اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی خصوصیات ہمیں بقا اور ترقی دیتی ہیں ۔ اب تک کا جو تہذیبی و تمدنی سرمایہ ہم اکھٹاکر چکے ہیں اور کر رہے ہیں انہی اسباب سے ہے۔

ہمیں اعتماد رکھنا چاہئے کہ انسان اپنے انتخاب (choice) میں نادان نہیں ہیں ، ان میں عقل دوستی (Rationality) اور معقولیت پسندی (Reasoning) پائی جاتی ہے – ہمیں اپنی آزادی کے ساتھ اپنے آزادانہ حق انتخاب کی بنیاد پر اپنے مسائل حل کرنے ہیں۔اس کے بغیر جو بھی راستے ہیں وہ غیر ذمہ دار (Irresponsible) اور ناقابل اصلاح ہیں ۔ انسانوں کی دنیا صرف انسان ہی بساتے ہیں۔

ذہانت ہے توآزادی کی طلب ہو گی۔

ہمارے اندر آزادی انتخاب کی خوبی کے بڑے اسباب درج ذیل ہیں۔

1۔ آزاد ارادہ و عمل (Free Will)
2۔ہمارا شخصی نظام اقدار

ان دونوں میں ہماری ذہانت، تجربے اور سمجھ بوجھ کا مرکزی کردار ہے،اس بارے میں Étienne Gilson نے کیا خوب لکھا ہے۔

Where there is intelligence, there is free will, and the more intelligence there is by so much is there liberty (free will).(58)

(جہاں ذہانت ہے وہاں آزادی ارادہ و عمل ہے اور جہاں جتنی زیادہ ذہانت ہوگی وہاں اتنی زیادہ آزادی کی تڑپ ہو گی۔)

چونکہ ذہانت ایک فرد کا ذاتی جوہر ہے جو ہر دوسرے فرد میں اپنی صلاحیت ،رجحان ،اور باقی ان گنت پہلوؤں میں مختلف ہے ۔اس لیے انسانوں میں تنوع ہے۔اور انفرادیت کے اسباب میں ایک بڑا بنیادی سبب بھی یہی ذہانت ہے۔

حق انتخاب اجارہ داری کی ثقافت میں نہیں پایا جاتا

حق انتخاب (Freedom to choose) کا ایک بڑا جواز یہ بھی ہے کہ فرد چونکہ اپنے بارے میں دیگر تمام افراد ، اداروں ،حکومتوں ، ایجنسیوں اور علماء و دانشور حضرات سے زیادہ جانتا ہے ،اور چونکہ اس کے اعمال کا نتیجہ بھی اس کا ذاتی و انفرادی ہوتا ہے، اس لیے اسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی کو خود ہی کمانڈ و کنٹرول کرے- اس کے لیے اس کے پاس ان گنت خوبیاں بشمول ذہانت ، سیکھنے کی صلاحیت،سیلف گورننس ،خود تنظیمی ، دلیل پسندی اور آزادی ارادہ و عمل وغیرہ پائی جاتی ہیں۔تو اسے اپنی فکر و عمل کے انتخاب و نتائج میں بھی آزادی دی جائے ۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے جس کا ہم نے پہلے بھی ذکر کیا کہ حق انتخاب کا معاملہ محض وہاں پایا جاتا ہے جہاں آپ کے پاس متبادل بھی ہوں ۔مثال کے طور پر سیاسی نظام میں حق انتخاب کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ دوران الیکشن آپکے پاس انتخاب کے لئے ایک سے زیادہ امید وار بھی ہوں ، یوں آپ ان کی باہم قدرپیمائی (evaluate) کر سکیں ۔اگر امید وار صرف ایک ہی ہے تو ،تب یہ انتخاب نہ ہوا۔ اجارہ داری (Monoply) میں چونکہ حق انتخاب نہیں پایا جاتا اس لئے یہ بھی جبر کی ہی ایک صورت ہے۔اسے ایک کلاسیکل مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فرض کیا میں ایک اکیلے درخت پر پھل حاصل کرنے کے لیے چڑھ جاتا ہوں ۔ پھل توڑنے کے دوران میں نیچے اتفاقا ایک گہری تنگ و تاریک کھائی میں جاگرتا ہوں ، باہر نکلنے کی کوئی صورت نہیں رہی ۔اس مثال میں کسی دوسرے فرد نے میری آزادی کو سلب نہیں کیا۔مگر میں حقیقتا آزاد نہیں کیونکہ انتخاب سے محروم ہوں ۔ میں کوشش کے باوجود باہر آنے سے قاصر ہوں اور قید ہو گیا ہوں۔

ایک دوسری مثال لیتے ہیں۔میں اسی درخت پر پھل چنتا ہوں اور درخت سے نیچے اتر آتا ہوں ۔اب اگر میں چاہوں تو مشرق کو بھی جا سکتا ہوں مغرب کو بھی اور شمال و جنوب کو بھی ۔ اس صورت میں میرا شخصی نظام اقدار فیصلہ کرے گا کہ مجھے کس طرف جانا چاہیئے۔اس مثال میں بھی کسی نے مجھے آزاد نہیں کرایا مگر متبادل موجود ہونے کے سبب میں اپنے حق انتخاب اور آزادی سے لطف اندوز ہوا ہوں۔

ان دونوں مثالوں سے بیرونی ماحول کی افادیت و اہمیت بھی سمجھی جا سکتی ہے۔ایک بند معاشرے میں جہاں آپ کی انفرادی ترجیحات ، فیصلے اور نظام اقدار کو مثبت رسپانس نہیں کیا جاتا وہاں آپ کی موجودگی ایک غار میں قید کی طرح ہے جب کہ ایک آزاد اور انفرادی آزادیوں کو مطمئن اور شادباش کرتے معاشرے میں ہی آپ کو حق انتخاب حاصل ہوتا ہے اور وہی معاشرہ ہی آزاد اور انسان دوست کہلاتا ہے۔

ترغیبات کا نظام اور ہمارے رویے

اٹھارھویں صدی میں انگلینڈ کو سمگلرز کی قوم کہا جاتا تھا۔کہا یہ جاتا تھا کہ یہ قانون توڑنے والے اور منتشر المزاج لوگ ہیں مگر انیسویں صدی میں انگلینڈ دنیا کی سب سے بہترین قوم بن گئی جو قانون کی پابندی اور احترام کرنے والے تھے۔اٹھارھویں صدی میں یہاں کی بیوروکریسی کرپٹ ترین تھی جبکہ انیسویں صدی میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کی بیوروکریسی کو رشوت دینا آسان نہیں ،جیسا کہ اٹلی اور نیو یارک میں یہ آسان تھا۔ سوال یہ ہے کہ صرف ایک صدی میں ایسا کیا بدلا؟ جواب ہے ترغیبات (Incentives)

انیسویں صدی آزاد معیشت یعنی laissez faire کی صدی ہے۔جبکہ اٹھارھویں صدی کی تجارت میں بیوروکریسی کا کردار بہت زیادہ تھا۔آزاد تجارت کی پالیسی نے سول بیورو کریسی کے لیے کرپشن کی ترغیبات (Incentives) انتہائی حد تک کم کر دیں ۔ اب سمگلنگ کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی کیونکہ اب تجارت کے امور میں بیورو کریسی کی مداخلت ہی انتہائی محدود تھی ۔ کاروبار اور کاروباریوں کو محض خریداروں کی ضرورت تھی ، وہ چیز خریدتے ، اسے انگلینڈ امپورٹ کرتے اور پورٹ سے کلئیر کرواکر خریدار کو بیچ دیتے تھے۔

اسی طرح کا معاملہ انگریز شہریوں کی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ہوا۔Incentive بدلا تو اخلاقیات بھی بدل گئی۔اس موقع پر میں پھر اس دانا آدمی کی بات دہراؤں گا جو لکھتے ہیں۔

"زندگی کے تقاضے جب اصولوں کی اتباع کی بجائے انحراف سے پورے ہوں تو انحراف ہی رواج پاتا ہے" (59)

ایک بہترین نظام وہ ہے جو بہترین عمل کی ترغیب پیدا کرے۔جس سے ہماری ضروریات اور زندگی کے تقاضے پورے ہوں - جو ہمارے مثبت عزائم ،جذبوں اور توانائیوں کو مثبت رسپانس (Incentive) دیتا ہو۔

مثبت ترغیبات کے بہترین نظام کے بغیر محض اخلاقی پابندیوں پر اصرار لاحاصل ہے۔ خوشحال و آزاد معاشرے میں تمام افراد اپنی ضروریات و خواہشات ،ترغیبات و رجحانات اور ان کی بنیاد پر قائم نظام اقدار کی اتباع کرتے ہیں۔اسی طرح قوانین کے باب میں بھی قابل عمل قانون وہی ہے جو بہترین عمل کی ترغیب پیدا کرے جس میں زندگی کے مسائل کا سامنا کرنے اور بہترین مواقع کو خوش آمدید کہنے کی ترغیب پائی جاتی ہو ، وگرنہ باہر سے نافذ کردہ قانون اور وہ اصول و قانون جو انسان میں اس کا نظام اقدارپیدا کرتا ہے،میں تصادم آجاتا ہے۔یوں قانون کی پابندی محض ظاہر داری تو بن جاتی ہے ، مگر اصلا تمام اعمال انسان اپنے نظام اقدار کی بنیاد پر ہی کرتا ہے۔

ترغیبات کا نظام مجھے خوددار بناتا ہے -

ترغیبات کابہتر نظام.....، فرد کی خودنگہبانی (Self Responsibility) پر انحصار کرتا ہے۔میری صحت کی ذمہ داری مجھ پر ہے،ڈاکٹر پر نہیں - وہ دوران خرابی صحت میری مدد تو کر سکتا ہے،مگر میری صحت میری خود انتظامی اور خودنگہبانی کا نام ہے - ڈاکٹر ایک بیرونی کردار ہے اس کا کام محض یہیں تک ہے کہ وہ خرابی صحت کی صورت میں مجھے بہتر گائیڈ کرے ،مگر اصلی و اعلیٰ گائیڈ میری اپنی ذات ہے ، میری آزادی ارادہ و عمل اور میرا شخصی نظام اقدار ہے - اسی طرح علم کا حصول میری ذمہ داری ہے - معلم میرے اندر علم کے جملہ اسباق اور انکی سمجھ بوجھ نہیں انڈیل سکتا ۔خودنگہبانی اچھے کردار کی راہ ہموار کرتی ہے اور انہی بنیادوں پر ہی تہذیب و تمدن کی عمارت قائم ہوتی ہے ۔

اگر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میری زندگی میں کوئی معاشی مشکل آنے والی ہے یا آ سکتی ہے تو اس صورت میں اس مشکل کے معقول حل کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہی عائد ہوگی۔یوں میرے اندر بچت کی ترغیب پیدا ہوگی۔اور اگر مجھے معلوم ہو کہ کسی معاشی مسئلہ میں ریاست میری کفالت کرے گی تو میں بچت کے بجائے خرچ پر ہی توجہ مرکوز رکھوں گا۔اسی طرح اگر مجھے معلوم ہو کہ خرابی صحت کی صورت میں سارا خرچ مجھے اٹھانا پڑے گا تو میں اپنی صحت کے بارے میں زیادہ محتاط رہوں گا اور اگر مجھے پتہ ہوکہ خرابی صحت کی صورت میں مفت طبی سہولیات مجھے حاصل ہوں گی ، تو میرے اندر اپنی صحت کو متوازن رکھنے کی کم ترغیب پیدا ہوگی۔حقیقت یہ ہے کہ ہمارا عمل عموما ترغیبات و تحریکات کو اہمیت دے رہا ہوتا ہے - ہماری آزادی ارادہ و عمل کا عمومی جھکاو بھی اسی طرف ہوتا ہے جس طرف ہمیں سیلف انٹرسٹ ترغیب دے رہا ہوتا ہے -

حد سے زیادہ ٹیکسز پیداواری عمل کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں -

پراپرٹی رائٹس (حق ملکیت) محنت کی ترغیب پیدا کرتے ہیں – جبکہ ٹیکسز محنت کی ترغیب (Incentive) کم کر دیتے ہیں - مثال کے طور پر ہمارے پاس دو صورتیں ہیں اے اور بی -

Case B	
ٹیکس کے ادائیگی کے بغیر نفع :	100
ٹیکس (37 فیصد) :	37
باقی نفع :	**63**

Case A	
ٹیکس کے ادائیگی کے بغیر نفع :	100
ٹیکس (10فیصد) :	10
باقی نفع:	**90**

جیسا کہ ہم نے کیس اے اور بی میں دیکھا ٹیکس کی شرح کل نفع پر اثر انداز ہوتی ہے۔زیادہ ٹیکس مطلب نفع کے رجحان میں کمی آتی ہے جبکہ کم ٹیکس کی شرح کا مطلب ہے کہ نفع کے رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔نفع کا زیادہ رجحان پیداوار کی ترغیب پیدا کرتا ہے اورپیدا وار زیادہ روزگار کو جنم دیتی ہے، اور ملک کی قومی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ پیداوار ویلیو کو جنم دیتی ہے جبکہ گونمنٹ ریونیو یا اخراجات سے اکنامک ویلیو جنم نہیں لیتی بلکہ خرچ ہوتی ہے ۔

آزادی ارادہ و عمل (Free Will) اور ہمارے رویے -

آزاد ارادہ ، آزاد عمل کا محرک ہے- اس سے مراد یہ ہے کہ جب ہم کوئی اہم سرگرمی سرانجام دے رہے ہوتے ہیں یا ہمارے پاس بہت سارے متبادل موجود ہوتے ہیں اور ہمیں ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے تو ہم اپنی ذہانت ، تجربہ، نظام اقدار ،سیلف انٹرسٹ اور دلیل پسندی (Reasoning) جیسے عوامل کی مدد لیتے ہیں- ایک آزاد سوسائٹی میں یہ فیصلے بغیر کسی جبر و مزاحمت کے ہوتے ہیں۔

آزادی ارادہ و عمل سے مراد یہ ہے کہ انسان کی چوائسز (پسند و ناپسند) کو کنٹرول نہیں کیا جاسکتا ، نہ کسی قسم کے ذہنی و جسمانی اور قانونی و اخلاقی جبر کے تحت اور نہ ہی کسی قانون کوخدائی قانون کا نام دے کر انسانی ذہن و عمل کو جامد کیا جا سکتا ہے۔

آزادی ارادہ و عمل کے حامی ہماری سرگرمیوں کے مختلف اسباب و محرکات(causes)کے منکر نہیں بلکہ ان کا فقط یہ کہنا ہے کہ ان اسباب کو ردعمل (Responses) انسان پنے آزاد ارادے کے تحت دیتا ہے۔یہ ہر فرد کا ذاتی و انفرادی جوہر ہے کہ وہ ان اسباب و محرکات کو کس قابلیت و صلاحیت سے رسپانس کرتا ہے مگر یہ بات عمومی طور پر لازم ہے کہ فرد مختلف سرگرمیوں کو اپنے انتخاب (choices)سے ترتیب دیتا ہے۔

وہ لوگ جو انسانی آزادیوں کا انکار کرتے ہیں۔ان کے نزدیک آزادی ارادہ و عمل نام کی کوئی چیز فرد میں نہیں پائی جاتی ۔ان کے نزدیک انسان صرف اسباب (causes)کے رسپانسز میں مختلف حادثات (events) کا مظہر ہے - اس کے علاوہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ اسباب و محرکات ان کے نزدیک ہماری جنیاتی ساخت ،ماحول اور معاشرہ وغیرہ ہیں - اس آزادی ارادہ و عمل کے انکاری مکتب فکر کو نظریہ جبر و قدر (Determinism) کہتے ہیں - یہ تصور اس پرانے زرعی تصور سے جاملتا ہے جس کی رو سے ہمارے اعمال دراصل تقدیر کی صورت میں متعین ہیں۔ہم محض کٹھ پتلیاں ہیں جن کا تماشا تقدیر کے ہاتھ میں ہے۔

نظریہ جبر و قدر (Determinism) کے مطابق ہماری سرگرمیاں ہماری باڈی کیمسٹری ،ماضی کے تجربات ، ماحول اور سوسائٹی کے جبر سے سرانجام پاتی ہیں۔ یہ متعین اور حتمی ہیں اور ان پر فزکس و کیمسٹری اور بائیو لوجی کے قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک اسباب و محرکات (causes) ، رسپانسز اور نتائج (end result)طے شدہ ہیں اورآزادی ارادہ و عمل محض وہم و دھوکہ ہے۔اس نظریہ کے ماننے والے اسباب و محرکات (causes) اور اس کے رسپانسز کے حضور سرنگوں ہو جاتے ہیں اورآزادی ارادہ کو جہالت سمجھتے ہیں۔

فرض کیا کہ ہم چار افرادہیں ، اور ہمیں کسی ایک علت یا سبب (cause) کا سامنا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سبب کے جو رسپانسز سامنے آتے ہیں ، وہ ہم چاروں افراد میں یا تو مختلف ہے اور اگر ایک جیسے بھی ہیں تب بھی ان کی شدت یا گہرائی (Intensity) میں باہم اختلاف موجودہے۔ حقیقت یہ ہے ہمارے انفرادیت کے اسباب میں آزادی ارادہ کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔

یقیناً ہماری بائیوکیمسٹری ، جنیاتی ساخت اور ہمارے ماضی کے تجربات یا حادثات (events) سمیت ماحول و سوسائٹی کے مختلف محرکات کا ہمارے رسپانسز پر مختلف اثر موجود ہے مگر فرد پر ان کا مطلق جبر نہیں پایا جاتا - ہم ہنوز اسباب کے رسپانسز میں مختلف متبادل ردعمل (reactions) میں سے بہتر ایکشن کا انتخاب کر کے بہتر رسپانس دینے کی صلاحیت و قابلیت رکھتے ہیں،جس کا عملی اظہار ہماری انفرادیت کی شکل میں ہی ہوتا ہے۔

اگر ہم میں آزادی فکر و عمل نہ پائی جاتی تو سماج میں تنوع موجود نہ ہوتا۔ ہم سب میں یکسانیت ہوتی۔فرد کا علیحدہ تشخص موجود نہ ہوتا۔ انسانی معاشروں میں نہ ارتقاء ہوتا اور نہ تبدیلی پسندیاتبدیلی دشمن تحریکیں ہوتیں۔نہ علم دوستی ہوتی اور نہ ترقی وخوشحالی کی جستجو ہوتی۔بلکہ ہم سب دیگر تمام مخلوقات کی طرح اپنی فطرت میں جامد اور اسباب (causes)کے رسپانس میں مستقل المزاج ہوتے۔ انسانی معاشروں میں موجود تنوع باہمی اختلافات ،فرد کی ہر دم محسوس کی جانے والی انفرادیت ،فرد کے اعمال کا ان کے وقوع پزیر ہونے سے پہلے غیر معلوم ہونا (unpredictable) اور ہماری بہتر سے بہتر کی طرف جستجو ہماری فری ول کے سبب ہیں۔

ہم اپنے فیصلوں میں جب مختلف محرکات کو رسپانس کر رہے ہوتے ہیں یا کوئی واقعہ (event) ہمارے رسپانس سے جنم لے رہا ہوتا تو ہم اپنی سوچ بچار میں آخری نتیجہ (end result) کو پہلے قیاس (suppose) ضرور کرلیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس آخری نتیجہ پر ہماری اجارہ داری نہیں یہ غیر معلوم و غیر حتمی ہوتا ہے جب تک کہ واقع نہ ہو جائے اور انسانوں کے باب میں کسی کو بھی حتمی طور پر اپنے رویوں کے مثبت و منفی نتائج کا علم نہیں ہوتا ، اس لئے اکثر اوقات نتائج غیر متوقع ہوتے ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم اس آخری مطلوب نتیجہ کو حاصل کرنے کے لیے ہی اپنے پاس موجود تمام علم کو استعمال کرتے ہوئے دستیاب متبادلات (alternatives) میں سے ہی کسی ایک بہتر متبادل (alternative) کا انتخاب کرتے ہیں۔

ہمارے اندر موجزن حریت فکر و عمل کی بنیادیں بھی آزاد ارادہ میں ہیں ، جو جبر و تشدد سے بغاوت کرتی ہیں ۔ عموماً معاشرے کے بالادست طبقات اپنی مفروضہ سچائی کو تعلیمی نصاب اور دوسرے سماجی بندوبست کی شکل میں شہریوں کے اذہان میں خصوصا جب وہ طالب علم ہوتے ہیں ، انڈیلنے کی کوشش کرتے ہیں اور بہت ساری سرگرمیوں کو (جو کسی طرح بھی دوسرے انسانوں کے لیے نقصان دہ نہیں ہوتیں) جبر و تشدد یا قانونی جواز کی شکل میں ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے یوں ہمارے معقول انتخاب کو محدود کرنے اور اسے ناقص (imperfect)

بنانے کی کوشش کی جاتی ہے مگر یہی انسان ہے جو اس جبر کے خلاف بغاوت کرتا ہے ،شہید ہوتا ہے یا زندہ رہ کر اپنی آزادی ارادہ و عمل کے لئے جدوجہد جاری رکھتا ہے مگر اپنے حق انتخاب کو طویل مدت کے لئے سرنگوں نہیں کرتا۔ یہی سبب ہے کہ تاریخ کی بدترین آمریتیں اور جابرانہ اقتدار کے ادوار شخصی آزادیوں کے آگے ریت کے ستون ثابت ہوتے ہیں۔

فری ول ہر بیرونی جبر کے خلاف مزاحمت کرتی ہے اور شخصی آزادی کی آرزو پیدا کرتی ہے کہ فرد چونکہ اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے تو اسے ارادہ و عمل کی آزادی فراہم کرنا لازم ہے - یہ فرد کے ذاتی نظام اقدار کا تقاضا ہے۔ مگر آمریت کی آزاد ارادے سے مستقل عداوت چلی آ رہی ہے، وہ یا تو اس کا مطلق انکار کر دیتی ہے وگرنہ اسے غیر معتبر،جاہل اور ناقابل اعتماد قرار دے کر اس پر آمر کا ارادہ (will) نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔کیونکہ ایک آمر شخص یا طبقہ محض اپنی مرضی و خواہش اور ارادہ کو ہی معتبر ،قابل اعتماد اور تعلیم یافتہ سمجھتا ہے۔آمریت انسانی آرزؤں سے دشمنی کا نام ہے۔

یقیناً بہت سارے عوامل ایسے بھی ہیں جن پر ہمارا ڈائریکٹ کنٹرول نہیں جیسے ناگہانی صورتحال میں حادثات ،موسمی تبدیلیاں وغیرہ۔ماضی پر بھی ہمارا کنٹرول نہیں ہوتا، جیسے ہماری جائے پیدائش ،جو کہ ہمارے والدین کا انتخاب تھا – مگر یاد رہے کہ ماضی کے ان بہت سارے سماجی سیاسی اور معاشی واقعات (events) کے اسباب بھی ہمارے آباءواجداد کے آزاد ارادہ اور آزاد فیصلے تھے۔ اسی لیے ہم جب اپنے حال کو ماضی کا تسلسل کہتے ہیں تو اس کی اچھی و بری وراثتوں کی ذمہ داری بھی اپنی سابقہ نسلوں پر ہی ڈالتے ہیں۔

واضح رہے کہ انسان کی فطرت محض مادی نہیں۔ اگر محض مادی ہوتی تو اس پر مادہ کے ٹھوس ،غیر متبدل،جامد اور مستقل قوانین کا جبر موجود ہوتا ۔ فرد کی فطرت پر اس کی ذہانت (intellectualness) کا عمل دخل نمایاں اور غالب ہے۔اور ذہانت کی ہی یہ خوبی ہے جو فرد کے ذاتی نظام اقدار ،تجربہ و سمجھ بوجھ ،دلیل پسندی (Reasoning) اور اس جیسی دوسری ملتی جلتی خوبیوں کو جنم دیتی ہے۔ انسان اپنے "مادی وجود میں مادہ" اور "خصوصیات و قابلیتوں میں ذہن " کا حسین نمونہ ہے۔اس کا ثبوت یہ بھی ہے جو آئے دن ہمارے مشاہدے میں آتا ہے کہ ذہنی طور پر معذور افراد اپنے رسپانسز میں آزادی ارادہ و عمل کا نمونہ نہیں پیش کرتے ، ان کی زنگی محض جبلتوں (instincts) کے رسپانسز کا ہی نام ہے جن کے بارے میں یقینا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ جبر و قدر کی فطرت کے پابند ہیں -

اخلاقیات کی بنیادیں بھی صرف فری ول میں ہیں - آزاد ارادہ ہے تو ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں اگر ہم محض اسباب کے رسپانسز میں حادثات و واقعات (events) کا نام ہیں تو پھر ہم میں کوئی ہیرو اور کوئی ولن نہیں۔وہ جس نے کسی کمزور شخص سے اس کا گھر چھین لیا وہ بھی ظالم نہیں اور وہ جس نے کسی مجبور و بے کس کی مدد کی وہ بھی انسان دوست ہیرو نہیں ۔کیونکہ جبرو قدر کے نظریہ (Determinism) کی رو سے یہ رویے محض چند مخصوص اسباب و محرکات کے نتائج (consequences) ہیں ۔یوں کوئی نیکی

نیکی نہیں رہتی اور برائی کی بھی کوئی پہچان نہیں رہتی ۔محض علت و معلول (cause and effect) کی زنجیریں ہیں جو ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہیں کہ فردکو جکڑے ہوئے اس سے دن رات کی مشقت کروارہی ہیں۔ میری رائے میں یہ نظریہ جبر و قدر (Determinism) بذات خود انسانی شخصیت اور وقار کی توہین ہے ۔

آزاد ارادے کے بغیر اچھے عمل کا کوئی اخلاقی جواز نہیں۔ اس کے بغیر ہماری زندگی ،ہمارا عدالتی نظام، محض کھیل تماشا ثابت ہوتے ہیں ۔ ہم انصاف کے تصور کی یہ دلیل دیتے ہیں کہ ایسا نظام جو اچھے عمل کو جزا اور برے عمل کو سزا دے ۔اگر انسان جو اچھے عمل کا خود ذمہ دار نہیں کیونکہ اس کے اعمال محض مختلف عوامل کے نتائج ہیں تو جرم و سزا اور نیکی و جزا سے وہ ماورا ہونا چاہیے۔

یہاں ایک اہم نکتہ یا درہے جو قانون و عمل کے باہمی تعلق کو سمجھنے میں ضروری ہے وہ یہ کہ (جیسا کہ پہلے بتایا گیا) بہت سے ایسے عوامل ہیں جن میں انسان کے اپنے ارادے کا عمل دخل نہیں جیسے کہ کسی دوسرے فرد کا کوئی عمل چاہے وہ آپ کا قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا آپ کے تشخص یا اردگرد کے ماحول پر ضرور اثر پڑتا ہے جیسے یہ عام تصور کہ خود کش حملہ آور مسلمان ہیں اورچونکہ آپ بھی مسلمان ہیں اس لئے مسلمانوں سے متعلق جو خاص تصور پیدا ہوتا ہے اس کا آپ کو بھی سامنا کرنا پڑ جاتا ہے ۔ آپ کسی دوسرے فرد کے ارادہ و عمل کے ذمہ دار و جوابدہ نہیں۔کسی ایک فرد یا گروہ کا جرم پورے ملک یا انسانیت کا جرم نہیں۔

اگر کسی ایک فرد میں کوئی ایسی جبلت (instinct) پائی جاتی ہے جیسا کہ ہم جنسی کے ازدواجی تعلقات والوں (Guys & Lesbians) میں، اور ان کی فری ول اس معاملے میں بے بس ہے تو اس عمل کو برائی نہیں سمجھا جاسکتا ، اس پر کوئی قانونی چارہ جوئی بھی نہیں،یوں ان Gays کا بنیادی حق بن جاتاہےکہ وہ اپنی جبلت کو رسپانس کریں جس کے آگے وہ بے بس ہیں یہ ویسا ہی ہے جیسا کہ خواتین میں نسوانی جذبات و ادائیں ان میں فطری ہیں اور ان کے اظہار میں انہیں آزادی حاصل ہے – ایک اور مثال ذہنی طور پر معذور ہو جانے والے افراد کی بھی ہے – چونکہ وہ آزادی ارادہ سے محروم ہوتے ہیں اس لئے اپنے کسی عمل کے قانونی و اخلاقی طور پر ویسے ذمہ دار نہیں ہوتے جیسے عاقل و باشعور افراد – ذہنی طور پر نابالغ افراد کی گواہی تسلیم نہیں کی جاتی اور ان پر قوانین کا اطلاق بھی ذہنی طور پر بالغ افراد کی طرح نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ ۔

اس ساری بحث کو Frank Chodorov یوں سمیٹتے ہیں:

"وہ لوگ جو مارکیٹ میں انسان کو حق انتخاب نہیں دینا چاہتے ان کے نزدیک انسان میں آزادی ارادہ و عمل (Free Will) نہیں پائی جاتی ، یہ ایک افسانہ ہے ، اور انسان محض اپنے ماحول یا سماج کا پروڈکٹ ہے – یہ مقدمہ ناگزیر طور پر انسانی ضمیر یا روح یا شعور کا انکار ہے – ہر

بہترین آدمی اپنے ماحول سے ماوراء ہوتا ہے –وہ نہ صرف اس سے جنم پاتا ہے بلکہ اس کی فلاح میں اپنا حصہ ڈالتا ہے – سوسائٹی کا فرد پر یقینا اثر ہے مگر یاد رہے کہ انسان کا بھی سوسائٹی پر گہرا اثر ہے – اصل میں دونوں باہم تعامل کر رہے ہیں – (بدقسمتی سے) یہ حقائق عہد حاضر میں بھلائے جا رہے ہیں – "(60)

آزادی ارادہ و عمل اور مواقع کی آزادی

جیسا کہ بار بار کہا گیا کہ انسان ایک آزاد ارادہ رکھنے والی مخلوق ہے جس کا عمل بہت سارے متبادلات میں سے ایک بہتر متبادل کے انتخاب کا نام ہے یوں ایک انسان صرف اتنا آزاد ہے جتنا اسے مواقع حاصل ہیں۔

- مثال کے طور پر ایک امریکی ہم سے زیادہ آزاد ہے کیونکہ اسے ہم سے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔
- ایک پڑھا لکھا آدمی ان پڑھ سے زیادہ آزاد ہے کیونکہ وہ ان بہت سارے ری ایکشنز (reactions) میں سے ایک بہتر ری ایکشن کو اپنے تعلیم یافتہ نظام اقدار سے منتخب کر سکتا ہے –
- ایک امیر آدمی غریب آدمی سے چونکہ زیادہ خرید و فروخت کے مواقع رکھتا ہے اس لئے اس کا آزاد ارادہ و عمل اتنا زیادہ آزاد ہے جتنے اسے مواقع حاصل ہیں۔

مواقع کی مساوات بنیادی شرط ہے

معاشی زندگی میں فری مارکیٹ کا تصور مساوات بھی مواقع کی مساوات اور بنیادی انسانی حقوق میں مساوات کا تقاضا کرتا ہے مواقع کی مساوات موجود ہو تو ایک فرد اپنے آزاد ارادے ،ترجیحات، نظام اقدار ، سیلف انٹرسٹ ،تجربہ و سمجھ بوجھ اور دلیل پسندی (Reasoning) سے بہتر معاشی فیصلے کر کے معاشرے کا ایک کامیاب و کارآمد آدمی بخوبی بن سکتا ہے۔ وہ اپنی زندگی پر خود مختار ہے،جس میں تمام شخصی خوبیاں اس کی مددگار ہیں۔

آزادی ارادہ و عمل کا انکار ہماری سماجی زندگی کو کھوکھلا کر دیتا ہے -

یوں آزاد ارادہ کا انکار محض فرد کی شخصی زندگی کو متاثر نہیں کرتا بلکہ ہماری سماجی و سیاسی زندگی بھی اس سے متاثر ہوتی ہے۔

- ہمارا تصور جمہوریت بھی اس سے متاثر ہوتا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ملک کا سیاسی بندوبست جمہور کی جنرل ول (شہریوں کی اکثریت کی آزاد فکر) پر چلے گا۔

- سیکولرازم سے مراد یہ ہے کہ فرد پر مذہب و نظریہ کا جبر نافذ نہیں ہوگا بلکہ ان معاملات میں اسے آزادی فکر و عمل حاصل ہو گی۔
- تنوع پسندی دراصل تمام شہریوں کی آزادی فکر و عمل کے نتائج کو معاشرے کا حسن سمجھنے میں ہے
- اور بالکل یہی معاملہ فری مارکیٹ کا ہے جس میں شہریوں کے درمیان اشیاء و خدمات کے تعاون و تبادلے اور حق انتخاب ، ان کی بطور صارف و پروڈیوسر آزدی ارادہ و عمل کا اظہار ہوتا ہے–

اکنامک ماڈلز کا معاملہ

میکرو اکنامکس (macroeconomics) کو باقاعدہ آغاز جان کینز سے ملا۔اس سے پہلے معیشت محض مائیکرو اکنامکس (micro economics)کا نام تھی ، جس میں معیشت کا مطالعہ فرد اور افراد کے گروپس یعنی کمپنیوں و آرگنائیشن کے انفرادی معاشی فیصلوں اور رجحانات کی مدد سے کیا جاتا تھا،جن کا نظام اقدار ،سیلف انٹرسٹ ،آزادی فکر و عمل اور معقولیت پسندی راہنمائی کرتے ہیں اگر معیشت کو ایک کل میں بھی سمجھا جاتا تھا تو وہ بھی مائکرو اکنامکس کی بنیاد پر ۔ کینز کے بعد اکنامکس کا رجحان فرد وافراد کے گروپس کے بجائے معیشت کو ایک کل میں سمجھنے کی طرف مبذول ہو گیا۔اب فرد محض ایک اکائی تھی جو مجموعی (aggregates) رویوں کے ساتھ بہتی جاتی تھی۔اب وہ معاشی نظام کا مرکز نہیں رہا تھا جبکہ مرکزیت قومی معیشت کو مل گئی تھی ۔ترقی کا مطلب قومی ترقی تھا ۔ترقی کو فرد کے حوالے سے سمجھنے کا رجحان کینز معیشت میں انتہائی کم تھا۔

کلاسیکل لبرل اکنامکس فرد سے معاشرہ یا قوم کی طرف بڑھتی ہے ۔ مگر اب کنزین معیشت نے یہ تصور دیا کہ جملہ (aggregate) عناصر کی تبدیلی سے فرد کے انفرادی معاشی فیصلوں میں بھی خود بخود تبدیلی آ جاتی ہے ویسے ہی جیسے اس کی معیشت دان توقع کرتے ہیں
۔

قصہ مختصر یہ کہ کلاسیکل لبرل معیشت Micro Economics (مائیکرو اکنامکس) ہے جبکہ کینزین (نیو لبرل یا نیو لیبر) معیشت Macro Economics ہے۔کینزین معیشت نے پولیٹیکل اکانومی کو جواز دیا یعنی سیاست اور معیشت کو باہم یکجا کرنے کی کوشش کی اور گریٹ ڈپریشن سے پہلے گورنمنٹ کا سائز جو محض جی ڈی پی کے 3 سے 4 فیصد تھا بڑھ کر تیس سے چالیس فیصد ہوگیا۔

کینزین معیشت اپنی اساس میں جبر و قدر کے نظریہ (Determinism) کی ہی ایک عملی شکل ہے جس میں معیشت کو فرد کی آزادی فکر و عمل ،سیلف انٹرسٹ (شخصی مفادات) اور نظام اقدار کے بجائے حکومتی انتظام کے حوالے کر دیاجاتا ہے ۔کینزین اکنامکس کلاسیکل لبرل اکنامکس سے انحراف کا نام ہے۔

یوں کینزین قسم کی Macro Economics کے آغاز کے ساتھ ہی کل معیشت کو سمجھنے ،اس کی حرکیات پر غور کرنے اور معاشی منصوبہ بندیوں میں اکنامک ماڈلز(models) کو ترتیب دینے کی ذمہ داری معیشت دانوں کا پروفیشن بن گئی۔ جس کے لیے خاص طور پر فزکس ،ریاضی اور شماریات سے مدد لی گئی۔ ان ماڈلز میں فرد کے انفرادی رویوں کو پہلے سے ہی متعین کر لیا جاتا ہے۔ان میں ایک معیشت (Population) سے چند افراد کو بے قاعدہ (Random) یاکسی باقاعدہ (Symmetry) میں ایک گروپ (Sample) میں لیا جاتا ہے۔ان کے بقیہ تمام رویوں کو مستقل (constant) قیاس کر کے اس گروپ میں زیر مطالعہ عوامل (variables) میں تبدیلی کو تجربہ و مشاہدہ میں لایا جاتا ہے۔ اس سرگرمی سے جو مخصوص نتائج حاصل ہوتے ہیں انہیں پوری معیشت (پاپولیشن) کے لئے جنرلائز (generalize) کر دیا جاتا ہے ۔ یہ فرض کیا جاتا ہے کہ جو نتائج اس مخصوص(sample) کے افراد کے رویوں میں دیکھے گئے وہی نتائج اس معیشت کے باقی تمام افراد (پاکستان کے باب میں 20 کروڑ افراد) کے بھی ہوں گے۔

یہ تصور علم ، اکنامکس کو فزکس کیمسٹری اور بائیولوجی قسم کی نیچرل سائنس سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ جس میں جبر و قدر کا اطلاق پایا جاتا ہے جس کی رو سے جس طرح ہر بار دو ہائیڈروجن اور ایک آکسیجن کو ملانے سے پانی بنے گا اسی طرح جب بھی افراد کا معاملہ ان عوامل (variables) سے پڑے گا جو تجربہ میں اسٹڈی کئے گئے تو ان کے رسپانسز ہمیشہ اسی طرح متعین و محدود رہیں گے اور ان کا نتیجہ (end result) بھی ویسے حتمی ہوگا جس طرح تجربہ میں مشاہدہ کیا گیا۔ یہ لبرل ازم یعنی کیپٹلزم کے اس تصور کے منافی ہے جس کی رو سے تمام افراد کے رویے ان کی آزادی فکر و عمل کے تابع ہیں اور اسباب کے ریسپانسز میں تمام افراد کے درمیان تنوع ہے ۔ اسی طرح افراد کے رویوں کے نتائج (end result) بھی ہر بار یقینی و حتمی نہیں ہوتے بلکہ ان میں بھی تنوع پایا جاتا ہے کیونکہ سوشل سائنسز بالخصوص معیشت کا علم فرد و معاشرے کے ارتقاء کے حوالے سے ٹائم اور جگہ (Place) پر انحصار کرتا ہے جو اپنے وقت سے پہلے اپنے نتائج میں غیر حتمی ، ناقابل تعین اور ناقابل کنٹرول ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب معاشی بحران آتے ہیں ہم باوجود ہزاروں کی تعداد کے اکنامک ماڈلز کے اس کی پیش گوئی نہیں کرسکتے۔ یہ جو 2008 کا معاشی بحران برپا ہواتھا معیشت دان ہزاروں میکرواکانومی کے ماڈلز کے باوجود نہ اس کی پیش گوئی کر سکے اور نہ یہ حتمی طور پر بتا سکے کہ اب بحران سے نکلنے کے لئے کیا کرنا چاہیے کہ مطلوبہ مفید نتائج حاصل کر سکیں ۔ یہ بالکل ویسا ہی ہے کہ جب امریکی الیکشن ہوتے ہیں تو الیکشن سے پہلے سروے کے نتائج اور الیکشن کے نتائج میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے – اس کی یہی وجہ ہے کہ لوگوں کے رسپانسز وقت اور مقام (Place) کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور انہیں کسی بھی ماڈل سے حتمی طور پر predict نہیں کیا جا سکتا۔

کیا انسان ایک مشین ہے ؟

اسی طرح یہ تصور کہ انسان مشین ہے یہ لبرل کیپٹلسٹ آئیڈیا نہیں بلکہ یہ تو سوشلسٹ و فاشسٹ آئیڈیا ہے ۔لبرل ازم تو فرد کی آزادی ارادہ و عمل اور انفرادی صلاحیت و قابلیت برائے تعین اقدار کو سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کی اساس بناتا ہے ۔سوشلزم و فاشزم ہی اپنے سٹیٹ ازم میں فرد کی آزادی فکر و عمل کا انکار کرتے ہیں۔ انہیں فرد کے سیلف انٹرسٹ میں لالچ اور دنیا کی تباہی نظر آتی ہے ، وہ فرد کے نظام اقدار کو شخصی نہیں بلکہ سوشل سمجھ کر اس پر اپنی آمریت نافذ کرتے ہیں۔ وہ فرد کی شخصی آزادی کو گمراہی گردانتے ہیں اور اسے پلان کرنے،ڈیزائن کرنے ،کنٹرول کرنے اور ریگولیٹ کرنے کو ہی آزادی سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں نظام سوشلزم و فاشزم انسانوں کی آزادی تبادلہ (ایکسچینج) و تعاون (کوآپریشن) کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ انہیں انسانوں کی ذہانت ، خود نگہبانی ، خودداری اور خود انحصاری پر اعتماد نہیں۔

آزادی ارادہ و عمل ، فرد کا ذاتی نظام اقدار ،تجربہ و سیکھنے کی صلاحیت ،سیلف انٹرسٹ کی جستجو اور دلیل پسندی (Reasoning) پر بھروسہ ہر شخص کی منفرد شخصیت کے اعتراف کا نام ہے نہ کہ اسے کوئی بے شعور مشین سمجھنے کا نام ہے۔

ہمارا علم محدود ہے

"انسانی دماغ خود اپنی پیش قدمی کا (مکمل و حتمی) اندازہ بھی نہیں لگا سکتا" - (ہائیک)

کسی معاہدے یا ٹرانزیکشن میں آنے کے لیے یا کسی انڈسٹری یا پوری معیشت کو کنٹرول کرنے کے لیے اس سے متعلق مکمل و حتمی علم (نالج) کی ضرورت ہے۔ ٹرانزیکشن میں مجھے اس نالج کی ضرورت ہے کہ ٹرانزیکشن کی قیمت اور کوالٹی مارکیٹ کے اعتبار سے کیسی ہے ، آیا کیا اس صورت میں میں نفع کما سکوں گااور بطور ایک منتظم کے اگر میں معیشت کو کنٹرول کرنا چاہتا ہوں تو مجھے علم ہونا چاہیے کہ سوسائٹی کے تمام افراد (پاکستان کے کیس میں 20 کروڑ افراد) کب کہاں کیسے اور کیا معاشی معاہدے و لین دین کرتے ہیں ۔

ایک فرد ایک دن میں کل کتنے معاشی فیصلے کرتا ہے ،بہت ہی زیادہ۔اگر فرض کیا ان معاشی فیصلوں کی تعداد دس ہے تو تصور کریں بیس کروڑ افراد کل کتنے معاشی فیصلے کرتے ہونگے؟ اور دنیا کی آبادی اگر سات ارب سے زائد ہے تو کیا دنیا کے ان تمام گھروں کی تعداد میں معاشی فیصلوں کا علم ، حال ، مستقبل اور مخصوص جغرافیہ کے ریفرنس میں ، کسی ایک فرد گروہ ادارے یا پوری حکومت کے پاس ممکن ہے ؟ ہرگز نہیں۔ جس طرح یہ معاشی فیصلے اپنی خصوصیات میں غیرحتمی اور ناقابل تعین ہیں اسی طرح مارکیٹ اور ہماری انفرادی و سماجی زندگی کے تمام پہلو (سیاست سمیت) بھی حتمی طور پر ناقابل تعین ہیں۔

اگر پاکستان میں ایک سوشلسٹ معیشت قائم کی جاتی ہے جس میں مارکیٹ یا تو موجود نہیں ہو گی اور اگر موجود ہو گی بھی تو غیرنمایاں اور حکومت پاکستان کے مکمل کنٹرول میں ہو گی تو اس صورت میں بطور ایک منتظم یا معاشی منصوبہ ساز کے مجھے مکمل علم ہونا چاہئے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار مربع کلومیٹر کے رقبہ میں رہنے والے بیس کروڑ افراد کی ضروریات و خواہشات اس وقت کیا اور کتنی ہیں۔آج شام کو پورے ملک کے تمام علاقوں کے اعتبار سے کیا اور کتنی ضروریات و خواہشات ہوں گی : کل صبح ،کل شام ،پرسوں صبح، پرسوں شام اور اسی طرح ایک مخصوص مدت تک ملک کے تمام جغرافیائی مقامات (Places) کے اعتبار سے کتنی اور کہاں کہاں کیا کیا ضروریات و خواہشات ہیں– جیفری Tucker اس پر خوب تبصرہ کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ فرض کیا فرد سے متعلق مکمل علم جیسے کیسے کر کے ہمیں حاصل ہو ہی جاتا ہے اور ہم اس پر عمل بھی شروع کرنے لگتے ہیں – مگر اس وقفہ کے دوران ، جب علم کو اپنے وقت اور مقام کے اعتبار سے حاصل کیا اور پھر اس پر عملی اقدامات (Execution) شروع کئے ، علم وقت اور مقام کے اعتبار سے ہی بدل جائے گا ،آپ پرانی معلومات پر ہی فیصلے کر رہے ہوں گے اور وسائل کے ضیاع کا سبب بنیں گے چاہے آپ کی نیت جتنی بھی نیک اور صاف ہو – (61)

پاکستان میں یہ بیس کروڑ عوام جغرافیائی طور پر منتشر ہیں۔بڑے شہر ،چھوٹے شہر،دیہات قصبے گاؤں اور علیحدہ علیحدہ گھروں کی صورت میں یہ لوگ مقیم ہیں۔ان کی ضرویات و خواہشات بھی وقت کے ساتھ ساتھ لچکدار ہیں۔ ان کے معاشی فیصلوں میں بھی تنوع، ارتقاء، تبدیلی اور انفرادیت ہے۔ایک فرد اگر ایک گھر کا سربراہ ہے یا خود اپنی ذات کا مینیجر ہےتب بھی اسے خود حتمی طور پر نہیں پتا کہ ایک مخصوص عرصے کے بعد اس کی ضروریات و خواہشات کی کیا نوعیت ہو گی۔

گزشتہ صدی کے مشہور ترین فلسفی ،معیشت دان ، ماہر قانون اور سوشل ماہر شماریات فریڈرک ہائیک کہتے ہیں کہ ہم مستقبل تو دور کی بات ہے اپنے حال میں بھی ٹائم (مدت:کل پرسوں،ہفتہ ،مہینہ ،سال) اور Place (مقام: گھر گاوں شہر ،وقصبہ وغیرہ) کے اعتبار سے تمام شہریوں کی ضرویات خواہشات اور آرزوں کو مکمل اور حتمی طور پر نہیں جان سکتے۔ مستقبل ٹائم اور Place کے اعتبار سے اپنے وقت سے پہلے ناقابل مشاہدہ (unforeseeable) اور اپنے وقت سے پہلے غیر متعین اور غیر حتمی (unpredictable) ہے۔(62)

علم انسانوں کے مابین منتشر (dispersed) ہے۔جس طرح ایک معیشت پاکستان کے کیس میں بیس کروڑ افراد کی معاشی سرگرمیوں سے وجود میں آتی ہے اسی طرح ایک معیشت کا کل علم بھی عملی طور پر وقت اور مقام کے اعتبار سے ان بیس کروڑ افراد میں منتشر ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے وقت اور مقام کے حوالہ (Reference) سے اس میں اپنا اپنا حصہ کم و بیش رکھتا ہے ۔ہر ایک صارف کے پاس اپنے اپنے خرچ (consumption) کے اعتبار سے وقت اور مقام کا علم ہے جو حال کے اعتبار سے تو کسی حد تک مکمل ہے مگر مستقبل کے اعتبار سے اس میں بھی غلطی کا بہت زیادہ امکان ہے۔اسی طرح ایک پروڈیوسر کے پاس بھی وقت اور مقام کے ریفرنس میں علم (جو کہ ہر پروڈیوسر کا اس کی ذاتی خصوصیات کی وجہ سے ذاتی ہے یا آرگنائزیشن کی کیس میں نجی ہے) حال کے اعتبار سے کسی حد تک درست مگر مستقبل کے اعتبار سے غیر حتمی اور محدود ہے -

مثال کے طور پر پیپسی کولا ایک کمپنی ہے،جو لوگوں کی ایک مخصوص مشروب میں طلب کو پورا کرتی ہے۔اس کا انتظام وقت اور مقام کے اعتبار سے ڈیمانڈ اور سپلائی کی کوآرڈینیشن مانگتا ہے۔مقام کے اعتبار سے اس طرح کہ اگر اس کا پروڈکشن یونٹ ملتان میں ہے تو ضروری ہے کہ اپنے مخصوص ایریاز میں جیسے جنوبی پنجاب کے تمام شہروں ، قصبوں اور دیہاتوں میں کنزیومر ز کی طلب کو فوری رسپانس کیا جائے۔یہی ان کی نفع کے حصول کی قابلیت (Profitability) ہے۔اسی طر ح پیپسی کولا کے لیے دوسرا سر درد ٹائم میں لچک (Flexibility) کا ہے۔شام کو کنزیومرز کی طلب کیا ہوگی، کل کیا ہوگی، پرسو ں کیا ہوگی،ایک ماہ بعد کیا ہوگی،چھ ماہ بعد کیا ہوگی،کیا مارکیٹ میں کوئی دوسرا متبادل تو نہیں آجائے گاجو عوام کی توجہ کھینچ لے گا،کیا کوئی آپریشنل مسئلہ تو نہیں ہوجائے گا؟ کیا عوام کی طلب کو رسپانس کرنے میں کوئی جگہ رہ تو نہیں جائے گی؟ اس طرح کی تمام معاشی منصوبہ بندی کے لیے پیپسی کو مارکیٹ میں وقت اور مقام کے حوالے سے علم چاہیے۔جو ہائیک

کے خیال میں حال اور مستقبل کے حوالے سے نامکمل ،غیر حتمی، لچکدار اور ناقابل کنٹرول ہے - یہ ایک مستقل چیلنج ہے جس کا پیپسی کو مستقل سامنا کرنا ہے -

اگر پیپسی کے پاس یہ سارا مکمل اور حتمی علم عوام کی طلب سے لے کر رسد، حال و مستقبل کے وقت اور مقام کے اعتبار سے ہوتا تو مارکیٹ میں پیپسی کا کوئی مد مقابل نہ ہوتا۔ مارکیٹ مختلف پلئیرز کے درمیان تقسیم ہے تو اس کی وجہ مارکیٹ کا علم کسٹمرز کے وقت اور مقام اور طلب و ترجیح کے اعتبار سے تقسیم ہے اور ہر ایک جتنا علم رکھتا ہے اسی کے اعتبار سے ہی اتنی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

ہر ایک کو اپنے اپنے ریفرنس میں ہی علم حاصل ہے اور اس علم کو یعنی سوسائٹی کے سارے ضروری اور عملی علم (Knowledge) کو ایک جگہ ، فرد واحد یا کسی ایک ادرے میں یکجا نہیں کیا جاسکتا ۔ علم انفرادی و ذاتی (Personal) ہوتاہے اس کی ایک مجموعی شکل ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر اگر بیوروکریٹس مل کر بیس کروڑ شہریوں کی ضروریات ، خواہشات اور آرزؤں کو آج اکھٹا کر نا بھی شروع کر دیتے ہیں ، کسی بھی (فرض کیا) مثالی شماریاتی طریقے سے ،مہیا تمام اعداد و شمار کے ساتھ ، ذہین و قابل ترین عملہ کی مہارت کو استعمال کرتے ہوئے تب بھی جب تک یہ علم اکھٹا ہو کر اور summarize(ضروری نکات اور معنی خیز خلاصہ) ہوکر آئے گا اس وقت تک علم میں وقت اور مقام کے اعتبار سے تبدیلی آچکی ہوگی۔یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی اتھارٹی اس پر مکمل کمانڈ قائم نہیں کرسکتی،کیونکہ یہ انفرادی (فرد کے حوالے سے پرسنل) ہی رہتا ہے۔ یہ اپنے نمونہ (Pattern) میں مستقل نہیں کیونکہ ایک ہی فرد (کنزیومر یا پروڈیوسر) کے معاشی بطور کنزیومر یا پروڈیوسر رویوں میں وقت اور مقام کے اعتبار سے تبدیلی اور حساسیت پائی جاتی ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ کا بیان بھی ضروری ہے کہ فرد علم و معلومات کے اس سسٹم میں یوں لاثانی ہے کہ ایک سماج کا علم نہ صرف اس سماج میں تمام انسانوں کے علم کا مجموعہ ہے بلکہ ہر فرد جس وقت اور مقام کے ریفرنس میں رہ رہا ہوتا ہے ، اس کا صحیح علم (سو فیصد پرفیکٹ بالکل بھی نہیں) بھی صرف اسی کے پاس ہوتا ہے،۔جو پرفیکٹ اور مکمل نہ سہی مگر سوسائٹی میں موجود دوسرے افراد یا اداروں کی نسبت زیادہ صحیح ، واضح، قابل عمل، رسپانس اور فیڈ بیک (Feedback) میں لچکدار ، مخلص اور ذہین ترین ہوتا ہے۔ وہ اپنی آزادی فکر و عمل ، نظام اقدار ، سیلف انٹرسٹ ،دلیل پسندی (Reasoning) تجربہ ، اور سمجھ بوجھ سے ہی اسے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند اور مکمل بنانے کی کوشش کرتا ہے - اگر تمام معاشی فیصلے اس کی آزادی فکر و عمل پر چھوڑ دیے جائیں تو نتائج تمام انسانوں اور سوسائٹی کے لیے زیادہ بہتر اور مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور متبادل موجود بھی نہیں اور معاشی نظام کی کوآرڈینیشن بھی محض اسی طریقے سے ممکن ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا یہ معاملہ محض معیشت کے کسی ایک انتظامی ادارے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام افراد کے ساتھ بھی ہے کہ وہ اپنی اپنی پسند و ناپسند کے انتخاب (چوائسز) میں بھی مکمل اور پرفیکٹ علم نہیں رکھتے۔

- ایک بیوروکریٹ بھی نہیں جانتا کہ وہ جو کھانا کھا رہا ہے وہ فوڈ پوائزننگ تو نہیں پیدا کردے گا۔
- وہ جو واشنگ مشین خرید کر جا رہا ہے وہ کچھ عرصہ بعد خراب تو نہیں ہوجائے گی۔
- ایک پروڈیوسر کو بھی نہیں پتا ہوتا کہ وہ جو جوتے بنا رہا ہے جب اسے مارکیٹ میں لائے گا تو عوام اسے پسند بھی کریں گے بھی یا نہیں۔ایک فلم پروڈیوسر فلم بناتے ہوئے ہر وقت اس خطرہ میں رہتا ہے کہ آیا یہ عوام میں مقبول بھی ہوگی یا نہیں۔
- ایک کسان جب فصل اگارہا ہوتا ہے تو وہ اس کی کاشت کے وقت (unpredictable مستقبل) کی مارکیٹ کے بارے میں حتمی طور پر نہیں جانتا کہ آیا اسے اس وقت نفع ہوگا یا نقصان ؟

اسی تناظر میں ہائیک کیا ہی خوبصورت بات کرتا ہے کہ

"انسانی دماغ خود اپنی پیش قدمی کا (مکمل و حتمی) اندازہ بھی نہیں لگا سکتا –(63)

یوں ایک پروڈیوسر کے لیے نفع یہ بتاتا ہے کہ وقت اور مقام کے ریفرنس میں اس نے صارفین کی طلب و رجحان کے علم کی صحیح پیش گوئی کی ہے یا اپنے علم سے صحیح نتائج نکالے ہیں اور نقصان یہ بتاتا ہے کہ وہ وقت اور مقام کا علم حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے میں ناکام رہا ہے -

ہر فرد کے پاس اپنے معاشی کردار کے اعتبار سے علم کے کچھ کچھ حصے یعنی پیکٹس (Packets) کی صورت میں موجود ہیں جو اپنی حقیقت میں ہماری آزادی ارادہ و عمل (Free will)،ذہانت ، تجربہ و مشاہدہ (Learning) ،ہمارے ذاتی نظام اقدار ، سمجھ بوجھ اور دلیل پسندی جیسے دیگر اسباب کی بدولت ہمارے مفروضوں (Assumption) کی شکل میں ہی پائے جاتے ہیں جن میں غلطی کا امکان یقیناً موجود ہوتا ہے۔علم کی یہی منتشر صورت ہی ہے جو علم پر اور بالآخر سوسائٹی (بشمول معیشت و سیاست) پر کسی بھی قسم کی آمریت (چاہے وہ دانشوروں کی ہی کیوں نہ ہو) کو عملی طور پر ناکام بنا دیتی ہے۔

سوویت یونین کی انتظامیہ کے پاس صحیح نیت یا ارادہ کی کمی نہیں تھی۔جس چیز کی کمی تھی وہ یہ کہ ایک پوری معیشت کا علم رکھنا ، پھر اسے منظم کرنا اور کنٹرول کرنا نا ممکن ہے - سوویت انتظامیہ کو کل بیس ملین اشیاء و خدمات کی قیمتوں کو ایک مخصوص وقت اور مقام کے اعتبار سے پلان کرنا پڑتا تھا- کب کہاں اور کس چیز کی ڈیمانڈ پائی جائے گی اور اس کل ڈیمانڈ کو رسپانس کرنے کے لئے آج کتنی پیداوار حاصل کی جائے ؟ یہ وہ سوالات ہیں جو بیوروکریسی کا دردسر تھے جس میں ناکام رہی – کل 46سوشلسٹ ممالک کی بیورو کریسی ناکام رہی – اسی طرح فاشسٹ ممالک کا انجام ہوا – حقیقت یہ ہے کہ آمریت کا اصل سامنا علم سے ہی رہا ہے ، سماجیات کا علم ، نفسیات کا علم ، سیاسیات اور معاشیات کا علم جن کے حصول و کنٹرول میں آمریت ناکام رہی ہے -

جب دیگر معاشی اسباب (جیسے اشیاء کی لاگت میں تبدیلی) سے سوویت معیشت میں اگر ان قیمتوں کو تبدیل کرنا پڑتا تو اس کے لیے ایک طویل بیوروکریٹک طریقہ کار (Procedure) پایا جاتا تھا۔ جب وہ طریقہ کار (Procedure) مکمل ہوتا اس وقت تک قیمتوں اور ڈیمانڈ و سپلائی کی معلومات اپنے وقت اور مقام کے اعتبار سے بدل چکی ہوتی تھیں ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ بعض اشیاء گوداموں (وئیر ہاوسز) میں پڑی گل سڑ جاتی تھیں اور بعض اشیاء کی مختلف مقامات پر قلت پائی جاتی تھی ۔

اس طرح مقام (Place) کے ریفرنس میں بھی یہی صورتحال تھی۔اتنی بڑی معیشت کے کروڑوں صارفین جن میں ضروریات، خواہشات اوررجحانات کے اعتبار سے انفرادیت پائی جاتی تھی۔ اگر کبھی انہیں کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو جب تک بیوروکریسی اپنے طویل بیوروکریٹک طریقہ کار سے اس ضرورت یا خواہش کی پیداوار کے بعد رسد پہنچاتی اس وقت تک طلب اپنے ٹائم فریم کے اعتبار سے بدل چکی ہوتی، یا قحط برپا ہوچکا ہوتا ، یا صارف کسی دوسرے متبادل کی طرف منتقل ہو چکا ہوتا۔ نتیجہ وسائل کا ضیاع الگ سے اور صارفین کی زندگی اجیرن الگ سے ہوتی تھی ۔

سب سے دلچسپ صورتحال خدمات کے شعبوں میں دیکھنے میں آتی تھی ،آپ کو گھر میں پلمبر کی ضرورت ہے آپ نجی طور پر کسی پلمبر سے رجوع نہیں کر سکتے کیونکہ پرائیویٹ مارکیٹ تو سرمایہ داری کا کلچر ہے۔ یوں آپ آپ نے بیوروکریٹک ادارے سے رابطہ کیا ۔اس کے پاس ایک طویل لسٹ ہے۔ایک طرف پلمبرنگ کی خدمات فراہم کرنے والوں کی لسٹ ہے دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنہیں پلمبر کی خدمات درکار ہیں اور بیوروکریٹس پہلے آئیے، پہلے پائیے کی بنیاد پر آپ کو وقت دے رہا ہوتا ہے ۔ اس بارے میں مشہور ہے کہ ایک خاتون نے متعلقہ محکمہ کو کال کی کہ مجھے پلمبر کی سہولت درکار ہے۔ بیوروکریٹ نے خاتون کو اگلے سال ستمبر کی 10 تاریخ کا وقت دے دیا۔ خاتون نے پوچھا اگلے سال کی 10 ستمبر کو پلمبر کس وقت آئے گا ۔ بیوروکریٹ نے جواب دیا مادام اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کب آئے گا؟ ابھی تو اس میں ایک طویل مدت پڑی ہے ۔اس نے جواب دیا دراصل مجھے ٹیلی فون سروس بھی ٹھیک کروانی ہے اور متعلقہ بندہ بھی اگلے سال ستمبر کی 10 تاریخ کو صبح کے وقت آئے گا، میں پریشان ہوں کہیں دونوں ایک ہی وقت میں نہ آجائیں۔

ترقی امکانات کے آزاد وقوع پزیر ہونے کا نام ہے ۔

کیا ہم نے پتھروں کے دور (Stone age) سے اب تک جو ترقی کی ہے وہ بیوروکریسی کی منصوبہ بندیوں کے سبب ہے؟ ہر گز نہیں۔ ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ ترقی کا انحصار زیادہ سے زیادہ مواقع و امکانات سے ہے کہ انہیں آزادانہ وقوع پزیر ہونے دیا جائے۔

(Maximum of opportunities for accident to happen)

ارتقاء کی کاشت کاری نہیں ہوتی بلکہ یہ اتفاقی شکل میں افراد کی آزادانہ جستجو برائے ترقی سے برپا ہوتاہے۔ہم پتھروں کے دور سے جب زرعی عہد میں آئے تو زراعت بیوروکریٹس نے ایجاد نہیں کی تھی،زرعی ترقی میں ان گنت افراد کا وقت اور مقام کے ریفرنس میں اپنا اپنا تھوڑا زیادہ حصہ ہے۔ صنعتی انقلاب بھی ایک طرح سے اتفاقی تھا، اس کی پہلے سے منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی نہ ہی (دلچسپ بات یہ کہ) اس کی کسی ادارے ، شخص یا گروہ نے پیش گوئی کی تھی ۔ پھر پہلے صنعتی انقلاب سے دوسرے ،تیسرے اور چوتھے صنعتی انقلاب تک کی ترقی بھی کسی بیوروکریٹک ادارے کی منصوبہ بندی (Planning) کے سبب نہیں بلکہ تمام افراد کی ٹیکنالوجی، سرمایہ کاری اور لیبر سمیت مختلف ان گنت صورتوں میں آزادانہ خدمات (کنٹری بیوشن) کی وجہ سے ہے۔

یہ ترقی و خوشحالی کے امکانات کی کھڑکیاں اور دروازے جنہیں ہم خوشگوار اتفاقات (Favorable accidents) کہتے ہیں ، خود بخود وقوع پزیر نہیں ہوتے۔ ہم انہیں پہلے سے Predict کر کے ان کے لیے تیار نہیں بیٹھ سکتے۔بلکہ ان کا جنم انسانوں کے مختلف کردار (roles) یعنی پروفیشن سے ہوتا ہے جو اپنے مخصوص وقت اور مقام میں کام کرتے ہوئے درج ذیل عناصر سے اسے وجود میں لاتے ہیں

1. علم (Knowledge)
2. رویے (attitudes)
3. مہارتیں (Skills)
4. شوق و رجحانات وغیرہ

یہ معیشت میں ترغیبات (Incentive) سے وقوع پزیر ہوتے ہیں اور یہ ترغیبات فراہم کرنا معیشت میں مارکیٹ کی ذمہ داری ہے۔جس میں ایک ترغیب حق ملکیت (پراپرٹی رائٹس) بھی ہے۔

یہ خوشگوار اتفاقات مواقع (Opportunities) کی شکل میں سامنے آتے ہیں،اور ان میں کامیابی کی امید اور ناکامی کا خطرہ موجود ہوتا ہے۔یہ عموماً کہا جاتا ہے کہ جہاں رسک پایا جاتا ہے وہیں نفع (ریٹرن) کا امکان زیادہ پایا جاتاہے۔

Where is risk, there is return.

جو اس رسک کا سامنا کرتے ہیں ، اس سے اگر مثبت نتائج برآمد ہوتے ہیں تو وہ اس کا انعام (reward) نفع کی صورت میں پاتے ہیں۔مثال کے طورپر جب بل گیٹس نے مائیکروسافٹ کی بنیاد رکھی تو اکثر ماہرین کے نزدیک یہ ایک ناکام معاشی اقدام تھا۔جس میں بل گیٹس

کی مہارت ،پیسے اور دیگر وسائل کا ضیاع تھا۔ مگر اس نے اپنے ذاتی نظام اقدار اور سیلف انٹرسٹ کی بنیاد پر اپنی جستجو کو جاری رکھا اور کامیاب رہا۔

اسی طرح کی کہانی تقریبا تمام کامیاب کارجوؤں (Entrepreneurs) کی ہے۔ بعض اوقات غلط فیصلوں (Judgements) سے برے نتائج کا بھی سامنا ہوتا ہے اور وہ ناکام بھی ہوتے ہیں۔کیونکہ مستقبل کا حتمی اور مکمل علم کسی کے پاس بھی نہیں ، اگر ہوتا تو سب کامیاب ہوتے اور کوئی بھی ناکام نہ ہوتا –

خطرہ و انعام (Risk / Reward) کا یہ محرک پورے معاشی نظام کو متحرک اور ارتقاء پر مائل رکھتا ہے۔

اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ طویل دورانیہ (Long Run) کے نتائج اور کم دورانیہ (Short Run) کے نتائج میں عموما بہت فرق پایا جاتا ہے ۔ تاریخ کی اصل حرکت کم دورانیہ (Short Run) سے نہیں بلکہ طویل دورانیہ (Long Run)سے سمجھی جا سکتی ہے اور طویل دورانیہ دراصل خوشگوار اتفاقات کی داستان سناتا ہے –

کیا مارکیٹ کا مکمل اور حتمی (Perfect) علم ممکن ہے ؟

بعض معاشی نظریات اس مفروضہ پر قائم ہیں کہ ہر معاشی کارگزار (خریدار و سیلر) معاشی فیصلوں میں مکمل و حتمی (Perfect Information)علم رکھتا ہے۔اگر ایسا ہوتا تو مارکیٹ کا قیام بھی ناممکن ہوتا اور مقابلہ کی ثقافت کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔مارکیٹ کے قیام میں اور اس کے لین دین (ٹرانزیکشنز) میں افراد کے نامکمل اور اکثر اوقات اختلافی علم و معلومات کا کردار اہم ترین ہوتا ہے۔

علم میں اضافہ Trial & Error سے ہی ممکن ہے ۔

فرد ، سوسائٹی ، اور تہذیبوں کے عہد بہ عہد سیکھنے کے اس عمل میں Trial & Error کی اہمیت پوری انسانی تاریخ میں ثابت شدہ ہے اس کے بغیر سائنس وٹیکنالوجی میں ایجاد و دریافت اور ویلیو میں اضافہ (value addition) ناممکن ہے۔ اسی طرح سوسائٹی میں بھی ثقافت،مہارت اور رسومات وغیرہ کا بھی بڑا سبب یہی Trial & Error ہے۔جسے انسانوں نے وقت کے ساتھ ساتھ اور اپنے مخصوص مسکن کے اعتبار سے سیکھا ہے ہم بھی سیکھ رہے ہیں اور اسے علم ، ثقافت ، اور مہارتوں کی شکل میں اختیار کر رہے ہیں –

اسی طرح ہماری ترقی و خوشحالی اور علم میں بھی ہمارے سیکھنے (Learning) کا بھی بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ہم تجربات کرتے ہیں کبھی مثبت نتائج حاصل ہوتے ہیں اور کبھی نہیں۔ہم اپنے اعمال و افعال میں بعض اوقات غلطیاں کرتے ہیں،اور ان سے سیکھتے ہیں ۔ صحیح

عمل سے بھی ہم سیکھتے ہیں کہ اسے جاری رکھا جائے اور وقت و مقام کے ریفرنس میں اس میں مزید ویلیو شامل کرتے جاتے ہیں۔ نسل انسانی کا سیکھنے کا عمل مستقلا جاری ہے - یہ تہذیبوں کو نئی زندگی دیتا ہے۔یاد رہے کہ انسان سیکھتے ہیں جو مجموعی شکل یعنی تمام انسانوں کی شکل میں پورے معاشرے کا علم و تجربہ بن جاتا ہے۔ مگر ہنوز یہ اپنی فطرت میں رہتا پرسنل ہی ہے -

سیکھنے کا یہ مسلسل و مستقل عمل بھی خوشگوار اتفاقات کی جستجو ہے۔ اسے آزادانہ جاری رہنا چاہیے،اس پر پابندی دراصل اچھے مستقبل کے امکانات کا گلا گھوٹنا ہے - یہ عمل بیوروکریسی یا سیاستدانوں کی نگرانی میں ممکن نہیں ،خود بیوروکریٹس اور سیاستدانوں کو بھی سیکھنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔یادرہے کہ سیکھنے کا یہ عمل بھی وقت اور مقام کے محور میں مقید ہے۔ٹائپ رائٹر کے دور میں ہمیں ٹائپ رائیٹر کی ٹیکنالوجی اور اس کے استعمال کو سیکھنا پڑتا تھا، جبکہ اب ہمیں ونڈوز اور مائیکروسافٹ آفس کے سافٹ وئیرز کو سیکھنا پڑتا ہے۔ایک کسان کو "کی بورڈ ٹائپنگ" سیکھنے کی ویسے ضرورت نہیں جیسا کہ ایک اکاونٹس کے طالب علم یا پروفیشنل کو ہے -

تنوع علم کے غیر مکمل اور غیر حتمی (Imperfect) ہونے کے سبب ہے -

اگر ہمیں وقت اور مقام سے ماورا حتمی اور مکمل علم حاصل ہوتا تو نہ صرف ہم میں ہر فرد اپنے رویوں اور فیصلوں میں پرفیکٹ ہوتا۔ بلکہ یکسانیت کا دور دورا ہوتا۔ تنوع کی صورت اس وقت پائی جاتی ہے جب ہر فرد انفرادی طور پر یا گروپ کی صورت میں ، سیاست ثقافت اور معیشت میں ، اپنے اپنے یا گروپ کے مشترکہ نظام اقدار کو Pursue کر رہا ہوتا ہے اور ان کی سرگرمیوں کے نتائج میں تفریق پائی جاتی ہے -

علم حتمی و مکمل شکل میں دستیاب ہوتا تو آمریت راج کرتی -

اس طرح آمریت کا کام بھی آسان ہوجاتا،وہ تمام افراد کے رویوں کا وقت اور مقام کے ریفرنس میں صحیح صحیح علم رکھتی اور تمام اسباب بغاوت کو کنٹرول کر کے ہمارے رسپانسز اور تحریکوں کے نتائج (End Results) کو ان کے وقوع پزیر ہونے سے بھی پہلے کنٹرول کرلیتی۔یوں ہر فرد روبوٹ کی طرح ایک حتمی و مکمل گائیڈ لائن سے چلایا جا سکتا۔آمریت اس لیے ناکام ہے کہ اس کی وقت جگہ اور دیگر سرگرمیوں کے نتائج پر اجارہ داری نہیں۔ یوں افراد کے رویوں و فیصلوں پر اجارہ داری نہ ہونے کی وجہ انسانوں کا وقت اور مقام کے محور میں حتمی طور پر ناقابل تعین (Unpredictable) ہونا ہے۔

مستقبل کا مکمل و حتمی (پرفیکٹ) علم نہ ہونا بھی ارتقاء کا بڑا سبب ہے۔مثال کے طور پر جب انگلینڈ میں بادشاہ وپارلیمنٹ میں سیاسی رسہ کشی اور جوڑ توڑ اور کچھ لو کچھ دو کی مفاہمت چل رہی تھی۔اس وقت بھی بادشاہ کو اگر خبر ہوتی کہ اس کا انجام اس کی بادشاہت کا عملی طور پر خاتمہ ہے تو وہ کبھی بھی پارلیمنٹ کو نہ قائم ہونے دیتا اور نہ اسے مضبوط سے مضبوط تر ہونے دیتا۔دور جانے کی ضرورت نہیں ، اگر ضیاء

الحق (ہماری تاریخ کا بدترین آمر) کو پتا ہوتا کہ اس کے جہاز میں بم ہے تو وہ کبھی اس میں نہ بیٹھتا – اگر ہمیں ناکام منصوبوں کا پہلے سے علم ہوتا تو ہم انہیں کام میں ہی نہ لاتے ۔

سیاسی تبدیلیوں کا موجب بھی اتنے ان گنت عوامل ہوتے ہیں کہ نہ صرف ان کا شمار ناممکن ہے، بلکہ ان کی شناخت بھی ممکن نہیں ۔کیونکہ ان کی اکثریت پس پردہ ہے جو فطرت کے سنگ مستقل حرکت میں ہیں ۔

وسائل کی بہترین تفویض (Allocation) اور مارکیٹ کا نظام

وسائل کی صحیح تفویض (allocation) میں مکمل و حتمی اور پرفیکٹ علم و تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے جو کسی فرد واحد یا کسی ایک خاص گروپ یا ادارے کے پاس ممکن نہیں۔یہ تمام انسانوں اور پوری سوسائٹی میں کم و بیش منتشر (dispersed) ہے ہر ایک کے پاس اپنی ضروریات و خواہشات ، وقت اور مقام کے ریفرنس میں اس کا حصہ ہے ۔ یاد رہے جیسا کہ پہلے کہا گیا معیشت میں ضروریات و خواہشات کا علم انسانوں میں ذاتی (پرسنل) ہے – اس لئے ضروری ہے کہ وسائل کی صحیح تفویض کو سوسائٹی میں آزادانہ بنیادوں پر اور انسانوں کے باہمی معاملات میں تعاون و تبادلے اور تقسیم محنت کے سپرد ہی رکھا جائے اور اس آزادانہ تفویض پر کسی بھی قسم کی آمریت نافذ نہ کی جائے ۔

فریڈرک اے ہائیک : خیالات اور زندگی

فریڈرک اے ہائیک (پورا نام فریڈرک آگسٹ وان ہائیک) 8 مئ 1899 کو ویانا (آسٹریا) میں پیداہوا۔ان کے والد آگسٹ ایک فزیشن اور یونیورسٹی آف ویانا میں باٹنی کے پروفیسر تھے۔ ماں (فلیاٹاس) بھی ایک پروفیسر تھیں جو بعد میں آسٹریا کی نمایاں بیوروکریٹ بنیں۔

جنگ عظیم میں خدمات سرانجام دیں جو بطور شہری اس پر لازم تھیں ۔ جنگ سے پہلے ہائیک سوشلزم کے فے بیان (Fabian) مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا جو پرامن اور مسلسل و مستحکم تبدیلیوں سے گورنمنٹ کے اس کردار کو کہ وہ پرائیویٹ سیکٹر کو کنٹرول کرے ، کا حامی تھا۔ آسٹریا یہ جنگ ہار گیا،اور اس کے ملک میں سوشلزم غالب آگیا۔ ہائیک نے سوشلزم کی سیاست معیشت معاشرت اور اس کے انتظام کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جس نے اسے سوشلزم سے منحرف کردیا۔

1921 میں اس نے قانون میں پہلی ڈگری حاصل کی ۔اور 1923میں یونیورسٹی آف ویانا سے سیاسیات میں ڈاکٹریٹ کی دوسری ڈگری حاصل کی۔ اب اس کا رجحان اکنامکس کی طرف بڑھ گیا۔یہاں اس نے مشہور آسٹرین معیشت دان Ludwig Von Misses کی نگرانی میں اپنی تحقیق مکمل کی۔اکنامکس کی تعلیم نے اسے جلد ہی کارل مارکس کے مکتب فکر سے نکال کر ایڈم سمتھ کے مکتب فکر کا حامی

بنا دیا ، جس کی رو سے معاشی خوشحالی گورنمنٹ کی معاشی منصوبہ بندیوں اور معاشی عمل پر کنٹرول سے نہیں بلکہ خریدار و سیلر کے درمیان رضاکارانہ تعاون و تبادلہ (Voluntary cooperation and exchange) سے آتی ہے۔یہ ہر فرد کا سیلف انٹرسٹ (شخصی مفاد) ہی ہے جو معاشی عمل میں طلب ورسد کے نظام کو جاری رکھتا ہے ، نہ کہ گورنمنٹ کا کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم اس کا سبب بنتا ہے۔ اس نے ڈویژن آف لیبر کو یہاں سمجھا جس کی رو سے معاشی عمل میں شریک تمام افراد اپنے مخصوص علم اور مہارت کو آپس میں رضاکارانہ اور فطری بنیادوں پر بانٹ کر اور باقاعدہ فطری اور آزاد کوآرڈینیشن میں شئیر کر کے پروڈکٹس اور سروسز کو زیادہ مقدار اور بہتر کوالٹی پر پیدا کرتے ہیں۔اس نے کارل مینگر کی اہم ترین کتاب پرنسپل آف اکنامکس یہاں پڑھی جس نے اس کے ذہن میں پروڈکٹس اور سروسز کی ویلیوز ، اور اس کا خریدارو سیلر کے ساتھ تعلق کو مزید واضح کردیا۔

The value of any given product is determined not by amount of labor that went into making it or about the cost of production, but by the desire of buyer & sellers.

کسی بھی پروڈکٹ یا سروس کی ویلیو (قدر) اس محنت کی مقدار سے متعین نہیں ہوتی جو اس پروڈکٹ یا سروس کو پیدا کرنے کے لئے کام میں آئی ، اور نہ ہی کل پیداواری اخراجات پر یہ انحصار کرتی ہے بلکہ اس کا تعین خریدار و فروخت کنندان کی ضروریات و خواہشات (Desire) سے ہوتا ہے – (کارل مینگر) (64)

Mises کے ساتھ اس کا استاد و شاگردی والا رشتہ جلد ہی دوستی اور راہنمائی میں بدل گیا۔جس کا ہائیک پر بہت زیادہ اثر ہوا۔Mises اپنے عہد میں سب سے موثر آواز تھی جو کہتا تھا کہ سوشلسٹ معیشت عملی طور پر ناممکن ہے۔اس نے قیمتوں کے نظام اور اکنامک کوآرڈینیشن پر بہت کام کیا جو آج بھی پوری دنیا میں اپنی نوعیت کا منفرد ترین اور مقبول ترین کام ہے -

1929 میں اس نے پہلی کتاب "Monetary Theory and the Trade Cycle" مکمل کی اور 1931 میں لندن سکول آف اکنامکس (LSE) کی دعوت پر لندن چلا گیا جہاں اس نے مانیٹری پالیسی پر 4 لیکچر دیے۔یہ لیکچر اتنے زیادہ مقبول ہوئے کہ اگلے سال لندن سکول آف اکنامکس میں اسے اکنامکس کا پروفیسر بنادیا گیا۔ لندن سکول آف کامرس میں اس کی صلاحتیں کھل کر سامنے آئیں اور وہ اپنی عمر کے 35 ویں برس ہی دنیا کا مقبول ترین معیشت دان بن گیا – یہاں اس کا جو کام مشہور ہوا وہ تجارتی عمل (Trade cycle) پر تھا –

1930سے 1938 کے عظیم بحران (Great Depression) کے سبب معیشت میں عروج اور بحران ایک اہم موضوع بن گیا تھا – اس موضوع پر صرف ہائیک ہی نہیں بلکہ اس کا اس موضوع پر سب سے بڑا نظریاتی حریف جان کینز بھی اس موضوع پر تحقیق میں مصروف تھا – دونوں کے نظریات اس موضوع پر نہ صرف نظریاتی بنیادوں پر مختلف تھے بلکہ عملی بنیادوں پر بھی مکمل اختلاف کی صورت

پائی جاتی تھی – کینز کا کہنا تھا کہ بحران کے دوران گورنمنٹ اخراجات میں اضافہ مارکیٹ میں مجموعی طلب (ڈیمانڈ) کو بڑھا دیتا ہے یوں معیشت زیادہ سپلائی پیدا کرنے لگتی ہے اور ملک بحران سے نکل آتا ہے جبکہ ہائیک کا کہنا تھا کہ گورنمنٹ اخراجات مسائل کا قطعی حل نہیں بلکہ بذات خود مسائل کی وجہ ہیں – بحران جیسا کہ "گریٹ ڈپریشن" گورنمنٹ کی مارکیٹ کے عمل میں مداخلت کی وجہ سے ہے اور اب گورنمنٹ اقدامات نے ہی اسے پیچیدگی اور بد نظمی کا شکار بنا دیا ہے – یوں ہائیک اور کینز مارکیٹ کے طریقہ کار اور گورنمنٹ کے اس میں کردار کے موضوع پر باہم مدمقابل آ گئے – مگر ہوا یہ کہ کینز علمی بنیادوں پر اپنا نظریاتی و عملی مقدمہ جیت گیا –یوں کینزین معیشت ......،(جو کہ پاکستان کی درس گاہوں میں پڑھائی جاتی ہے اور حکومتی پالیسیوں پر اس کا غلبہ ہے) فری مارکیٹ معیشت پر چھا گئی – اس نے تقریبا تمام معیشت دانوں اور منصوبہ سازوں (پالیسی میکرز) کو متاثر کیا یہاں تک کہ 1940 کے اواخر تک ہائیک پس منظر میں چلا گیا اور بھلا دیا گیا –

ہائیک کا کام کثیر الجہتی (ملٹی ڈائمنشنل) ہے۔اس کے جن تصورات کو بہت زیادہ مقبولیت ملی وہ اس کا اکنامک آرڈر، فرد کا علم ، اور پوری سوسائٹی میں اس علم کی تقسیم یعنی ڈسٹری بیوشن پر کام ہے۔اس کے خیال میں اکنامک آرڈر آزاد قیمتوں کے نظام ، علم کی تمام انسانوں میں کم و بیش تقسیم (ڈسٹری بیوشن) کے سبب ان کے درمیان باہمی رضاکارانہ کوآپریشن اور کوآرڈینشن سے حاصل ہوتا ہے۔اسی سبب سے اس نے فاشزم، سوشلزم اور کینزین اکنامکس کی بھرپور مخالفت کی - وہ کینزین معیشت کو بھی ایک طرح کا سوشلسٹ اکنامک سسٹم سمجھتا تھا جو آہستہ آہستہ گورنمنٹ کی مزید سے مزید مداخلت سے کم شدت کے سوشلزم سے زیادہ شدت کے سوشلزم کا روپ دھار لیتا ہے

اس نے قیمتوں کو انفارمیشن سگنل کا نام دیا جو سوسائٹی کے علم اور پیداوار کو نظم و بندوبست (coordination) میں لاتی ہیں–

اس نے بتایا کہ مثالی سماج اور معاشی نظام وہ ہے جس میں خود تنظیمی کی صلاحیت (Spontaneous Ordering)پائی جاتی ہو
-

اس کا کہنا تھا کہ دولت کی پیداوار پر کسی طبقہ گروہ ادارے یا فرد واحد کا کنٹرول دراصل انسانی زنگی پر کنٹرول کے مترادف ہے۔ یوں سوسائٹی کے ہر شعبے پر آمریت کا قبضہ ہو جاتا ہے اور آزادیاں مفقود ہوجاتی ہیں۔

جنگ عظیم دوم کے بعد کنزین معاشی ماڈل کو امریکہ و برطانیہ میں نافذ کیا گیا اور فری مارکیٹ کیپٹلزم پس منظر میں چلا گیا۔ہائیک نے اس دور میں کہا تھا کہ اس کا انجام خطرناک ہوگا کیونکہ مارکیٹ میں کوآرڈینیشن ختم ہوجائے گی اور بے روزگاری و مہنگائی میں اضافہ ہوگا۔

1940 تک ہائیک محض ایک ماہرمعیشت دان تھا۔ اب اس نے سوشل فلاسفی کی طرف توجہ کی۔اس نے ایک شہرہ آفاق کتاب (اپنے موضوع کی مناسبت سے میری دانست میں پچھلی صدی کی سب سے بہترین تصنیف) Road to Serfdom لکھی۔ یہ کتاب انتہائی مقبول ہوئی ,خاص طورپر امریکہ و برطانیہ میں ۔دلچسپ بات یہ کہ چونکہ اس کتاب میں ایک غیر مقبول بیانیہ پیش کیا گیا تھا اس لیے وہ لوگوں کے رد عمل سے بھی ڈرا ہوا تھا۔اس وقت کا مقبول ترین بیانیہ کینزین معیشت کی شکل میں ریاستی رہنمائی کی (state led) مارکیٹ یعنی ایک طرز کا سٹیٹ کیپٹلزم تھا۔ اپنی کتاب میں ہائیک نے خبردار کیا کہ معیشت کو سنٹرل اتھارٹی یا وفاقی جبر کے ساتھ کنٹرول کرنے کا نتیجہ شہریوں کی غلامی اور افلاس ہے – ہائیک کا کہنا تھا کہ اگر گورنمنٹ نے معیشت کو منصوبہ بند (Plan) کیا جیسا کہ اس وقت کے دانشوروں اور سیاست دانوں کا مطالبہ تھا تو اس طرح شہری نہ صرف اپنے آزادیوں سے محروم ہو جائیں گے بلکہ معیشت بھی عدم توازن کا شکار ہو کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گی –

اس نے کلاسیکل لبرل ازم کے آئیڈیاز کو زندہ کیا اور ایک انٹرنیشنل سوسائٹی آف آئیڈیاز (Mont pelerin سوسائٹی)قائم کی۔اس نے آزاد فرد (Free Man) ،آزاد مارکیٹ (Free Market) اور آزاد معاشرے (Free Society) کے دفاع میں تاریخ ،سیاسیات ،معیشت اور فلسفہ کو بطور خاص اپنی دلیل کا مآخذ بنایا۔

اس کا ایک اور اہم کام کائرو انسٹیٹیوٹ کا دورہ اور وہاں قانون کی حکمرانی اور شخصی آزادیوں کی بنیاد پر قانون سازی پر مدلل و مفصل بات کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے بیسویں صدی میں لبرل ازم کو زندہ کردیا اور جان سٹارٹ مل کے بعد کلاسیکل لبرل ازم پر سب سے بہترین کام ہائیک کا ہی ہے۔

1962میں وہ جرمنی چلا گیا۔ جرمنی جا کر اس نے اپنی کتاب Law, Legislation and Liberty کا پہلا ایڈیشن مکمل کیا۔ یہ کتاب تین جلدوں میں لکھی گئ – پہلی جلد میں ایک منصوبہ بند سماجی معاشی اور سیاسی نظم (Planned Order) اور غیر منصوبہ بند یعنی آزاد نظم و تنظیم (Unplanned order) کے درمیان فرق بیان کیا گیا – ہائیک کے بقول غیر منصوبہ بند نظم و تنظیم کی مثال زبان (لینگویج) ، ثقافت اور مارکیٹ کی معیشت ہے اور منصوبہ بند نظم و تنظیم کی مثال سوشلزم ہے – دوسرے جلد میں اس پر بات کی گئ کہ عہد حاضر میں مقبول تصورات برائے سماجی انصاف میں کیا خرابی ہے – تیسری جلد میں ہائیک ایک مثالی معاشرے کے قانونی اور سیاسی اسٹرکچر پر بات کرتا ہے –

اس میں سب سے اہم بات Law اور Legislation میں فرق بیان کرنا ہے – ہائیک کہتا ہے کہ law وہ ثقافتی عنصر ہے جو خودکار انداز سے بغیر کسی اجارہ دار قوت کی منصوبہ بندی اور ڈیزائننگ سے معاشرے میں وجود پائے – یہ لوگوں کے اپنی روزمرہ زندگی میں ان گنت باہمی تعلقات تعاون و تبادلے اور میل جول سے وجود میں آتا ہے جیسا کہ زبان اور ثقافت کی مثال ہے – جبکہ Legislation جو

قانون ساز ادارے ایک ریاست میں مصنوعی بندوبست قائم کرنے کے لئے کرتے ہیں ، ایک طرح سے Law سے متضاد ہے – Legislation حکومت جبر سے نافذ کرتی ہے جس میں سوسائٹی اور ثقافت کی فطرت کو کنٹرول اور ڈیزائن کرنے کی کوشش ہوتی ہے – ہائیک کہتا ہے کہ بعض اوقات کوئی ثقافتی عنصر انسانی حقوق سے متصادم ہوتا ہے اس لئے Legislation مجبوری بن جاتی ہے مگر ضروری ہے کہ سماج کا نظم لاء کے سپرد ہو اور وہی حاوی رہے – اگر مجبوری میں Legislation کی بھی گئی ہے تو اسے اپنی حدود میں رکھا جائے اور وہ لاء سے ہر ممکن طور پر ہم آہنگ ہو – یہ توازن اور ہم آہنگی کیسے لائی جائے یہ بنیادی طور پر اس کتاب کا موضوع ہے – ہائیک کہتا ہے کہ ارتقاء لازم ہے کہ سوسائٹی سے پھوٹے نہ کہ اوپر سے نافذ کیا جائے اور بہترین سوسائٹی وہ ہے جو آزاد ہے اور ارتقاء پر مائل ہے –

جرمنی میں قیام کے دوران جب وہ یہ کتاب لکھ رہا تھا، شدید ڈپریشن کا شکار ہو گیا۔کیونکہ وہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کی ساری زندگی ضائع گئی۔وہ غیر مقبول تھا اور مایوس ہوچکا تھا۔ 1974 میں اسے نظریہ علم اور مارکیٹ میں قیمتوں کے نظام پر نوبل انعام دیا گیا۔اب نہ صرف اس کی توانائی بحال ہوئی بلکہ اس کی محنت و کارکردگی میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ وہ عالمی سطح پر مقبول ہوگیا۔ اب وہ دن بھی آئے جب ہائیک بار بار کہتا تھا کہ گریٹ ڈپریشن کے بعد جب کینزین معیشت ہر طرف رائج ہورہی تھی ، اسے یوں میدان خالی نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ اسے اس معیشت کی خامیاں کوتاہیاں بحث میں لانی چاہیں تھیں جنہوں نے بعد میں بہت برے نتائج چھوڑے ۔

1970 کے آخر میں ہائیک کی پیش گوئیاں سچ ثابت ہونا شروع ہوگئیں۔کینزین اکنامکس کی وجہ سے مہنگائی اور بے روز گاری کی شرح بہت زیادہ بڑھ گئی اور برطانیہ و امریکہ کی معیشتیں جمود کا شکار ہو گئیں۔اس وقت ہائیک ہی تھا جس کی باتیں جو اس نے پچاس کے عشرے میں کہیں تھیں، صحیح ثابت ہونا شروع ہوئی۔مارکیٹ میں جیسا کہ ہائیک نے پیش گوئی کی تھی ، گورنمنٹ کی بہت زیادہ پلاننگ کی وجہ سے کوآرڈینشن ختم ہو گئی اور اس میں کسی معاشی خرابی کے خلاف خود تنظیمی (Spontaneous ordering) کی صلاحیت نہیں رہی تھی ۔

سب سے پہلے یو کے میں مارگریٹ تھیچر نے ہائیک کے خیالات پر عمل کرنا شروع کیا۔ تھیچر کو پروفیسر ہائیک کی دیوانی کہا جاتا تھا۔ایک بار دوران مباحثہ تھیچر سے پوچھا گیا کہ آخر ان معاشی مسائل سے نکلنے کا فارمولا آپ کے پاس ہے کیا؟ تو اس نے ہائیک کی کتاب نکالی اور میز پر مارتے ہوئے کہا " یہ ہے میرا پلان "۔یوں جب انگلینڈ کی معیشت میں نمایاں اور بہتر تبدیلیاں آئیں تو امریکہ میں ریگن نے بھی ہائیک کے نظریات کو امریکی پالیسی کے لیے بطور راہنما گائیڈ لائن کے قبول کیا۔اسی دوران ملٹن فریڈ مین نے بھی لبرل معاشی بندوبست کے قیام میں امریکی حکومت کی خوب مدد کی۔مہنگائی اور بے روزگاری اپنی کم ترین سطح پر چلی گئی، اور امریکہ نے ترقی کا سفر بدستور جاری رکھا۔

وقت مزید آگے بڑھا اور اس کی علمیت کے اظہارمیں مددگار بنا۔ سوویت یونین منہدم ہوگئی اور دیوار برلن ٹوٹ گئی۔اس بات نے مغربی ماہرین اور سوویت اہل علم کو حیران کردیا کہ جب وہ باقاعدہ علمی اور نظریاتی بنیادوں پر پچاس اور ساٹھ کے عشرے میں کہتا تھا کہ کمیونزم آخر کار ناکام ہوکر ڈوب جائے گا۔ وہ کہتا تھا

Communism ultimately doomed to failure

تو اس وقت اس پر یقین کرنا مغربی دانشور کے لئے انتہائی مشکل تھا –

ہائیک نے اس موضوع پر خوب لکھا کہ آخر کار سوشلزم اور کمیونزم کیونکہ عملی طور پر ناقص ہیں اور ناکام ہیں مگر اسے نظر انداز کیا جاتا رہا تھا ۔وہ گمنامی میں رہا۔مگر جب واقعی میں ویسا ہوا جیسی اس نے پیش گوئی کی تھی تو اسے پوری دنیاء کے لبرلز اور اہل علم حلقوں میں نمایاں شناخت ملی اور اسے جان سٹارٹ مل کے بعد لبرل معیشت کا سب سے بڑا فلسفی معیشت دان تسلیم کیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ اگر پچھلی صدی کو چار ادوار میں تقسیم کیا جائے تو

1. پہلا دور لینن اور سوویت انقلاب کا ہے۔
2. دوسرا دور ہٹلر مسولینی اور فاشزم کا ہے۔
3. تیسرا دور کینزین معیشت کا ہے۔اور
4. چوتھا دور بلآخر ہائیک کا ہے۔

اسی سبب سے وہ کہا کرتا تھا کہ Ideas have consequences (نظریات کے بھی نتائج ہوتے ہیں اور ان نظریات کی صحت کا دارومدار ان نتائج پر ہوتا ہے)

ہائیک نے اپنی آخری کتاب "The fatal Conceit" 1988 میں لکھی جس میں سوسائٹی کے پوٹینشل پر سیر حاصل بحث کی گئی – اس میں ہائیک نے سوسائٹی کے پوٹینشل کو موضوع بحث بنایا اور اس میں ارتقاء کے اسباب بیان کئے – ہائیک کا کہنا تھا کہ دنیا میں کوئی بھی سماجی سیاسی اور معاشی جبر ارتقاء کا متبادل نہیں جو فطری ہوتا ہے اور مستحکم و کامیاب رہتا ہے –

وفات : تئیس مارچ 1992 کو جرمنی میں ۹۳ سال کی عمر میں وفات پائی –

اقوال زریں(66)

- مطلق مادی مساوات کا مطالبہ صرف مطلق العنان حکومت ہی پورا کر سکتی ہے۔
- انسانی دماغ خود اپنی پیش قدمی (یعنی مستقبل کے ہر اگلے قدم)کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔
- وہ آزادی، آزادی نہیں جو فائدہ مند نتائج کا علم ہو جانے کے بعد عطا کی جائے۔

- میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ عدالتی تحفظ کو " مطلق سماجی انصاف کے سراب " سے بڑھ کسی چیز نے نقصان نہیں پہنچایا۔
- میرے خیال میں یہ کہنا مبالغہ آمیز نہیں ہو گا کہ تاریخ بڑی حد افراط زر (inflation) کی تاریخ ہے، ایسی افراط زر جو حکومتیں اپنے ہی مفادات کے لیے وجود میں لاتی ہیں۔
- ہمارے لیے اس حقیقت کا سامنا کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ پیداوار میں مطلق مساوی تقسیم کے اصول شخصی آزادی کے تصور سے ہم آہنگی نہیں رکھتے۔
- ہماری اخلاقی روایات ہماری عقل کی ہمسفر ہیں، اس کا نتیجہ نہیں۔
- آہ وہ دانشور جن کی ذاتی خواہشات ان کی عقل کی حدود سے تجاوز کر گئیں—
- پارسا اور یک رخے مثالیت پسند سے پاگل پن تک کا سفر ایک قدم ہی کا ہے۔

حق ملکیت نہیں تو آزادی نہیں

جب ایک فرد کے پراپرٹی رائٹس محفوظ ہوتے ہیں اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اب وہ اس قابل ہے کہ پرسکون ہو کر اپنی محنت کے ثمرات سے لطف اندوز ہوسکے اور انہیں محفوظ بھی رکھ سکے ۔ یہ تحفظ ہی اس میں بنیادی طور پر اس پراپرٹی کے صحیح استعمال اور محنت کی ترغیب پیدا کرتا ہے ۔ اگر ہر شخص آزاد ہو کہ جا کر وہ فصل کاٹ لے جو کسان نے اگائی تھی ، اس پر محنت کی اور اسے تیار کیا ۔ اگر کسان کی کاشت پر اس کا حق تسلیم نہ کیا گیا تو اس میں یہ رجحان بھی ختم ہو جائے گا کہ وہ آئندہ بیج بوئے اور فصل کھڑی کرے ۔ فرض کیا آپ اپنا گھر تعمیر کرتے ہیں اور کوئی آ کر اس پر قبضہ کر لیتا ہے ، آپ کا اس گھر پر حق بھی تسلیم نہیں کیا جاتا تو آپ آئندہ گھر بنانا بھی نہیں پسند کریں گے ۔ ساری کی ساری پیداواری سرگرمیاں اور ساری تہذیب حق ملکیت کو تسلیم کرنے اور اس کے احترام پر قائم ہے ۔ ایک سرمایہ دارانہ نظام ... ، زندگی اور حق ملکیت کے تحفظ کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا ۔

(ہنری ہیزلٹ)

اکنامکس میں تین مسائل سب سے زیادہ اہم ہیں۔جو لازمی ہے کہ ہر معاشی بندوبست میں زیر غور لائے جائیں۔

1۔ ہماری ضروریات و خواہشات لا محدود ہیں۔ہم جب خواہشات کی ایک منزل حاصل کرلیتے ہیں تو ہماری آرزو ہوتی ہے کہ اس سے اگلی منزل تک جلد سے جلد پہنچا جائے۔ یہ انسانی آرزو ہر فرد کو ہر حالت میں محنت اور کامیابی کی طرف راغب رکھتی ہے۔ ایک بہترین معاشی بندوبست وہی ہے جو شہریوں کی معاشی ضروریات و خواہشات کو نہ صرف پورا کرے۔ بلکہ انہیں مزید سے مزید ترقی کے مواقع مسلسل فراہم کرتا رہے۔

2۔ ان لامحدود ضروریات و خواہشات کی تکمیل کے لیے وسائل و محنت کی ضرورت ہے۔وسائل بھی محدود ہیں اور ہماری محنت بھی۔ایک فرد ایک مخصوص دورانیہ سے زیادہ محنت نہیں کرسکتا۔اسی طرح وسائل بھی جب زیادہ استعمال ہوتے ہیں تو ان کے سائیڈ افیکٹ (جیسے آلودگی، شوروغیرہ) کے علاوہ ان کی کمی کاخطرہ بھی دوچار رہتا ہے۔مثال کے طور پر فوشل فیولز (Focial Fuels) ۔ایک بہترین معاشی بندوبست وہی ہے جو کم سے کم وسائل اور محنت کے خرچ پر زیادہ سے زیادہ فائدہ مند نتائج (Output) دے۔

3۔ تمام شہری آزاد ہیں ۔ان پر نہ سیاست کے نام پر اور نہ ہی معیشت و ثقافت کے نام پر جبر قائم کیا جاسکتا ہے۔آزادی میں فقر، امیر غلام سے بہتر ہے۔آزادی میں زندگی کا احساس اور اس کی مخفی طاقت حاصل کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ایک بہترین معاشی نظام تمام افراد کے رضاکارانہ تعاون و تبادلہ پر انحصار کرتا ہے نہ کہ جبر و آمریت سے کہ شہریوں سے اہرام مصر طرز کی غلامی کروائی جائے ۔

اب سوال یہ ہے کہ ان تینوں شرائط کو پورا کرنے والا نظام کونسا ہے ؟ اس سلسلے میں دو دعوے سامنے آتے ہیں۔

1۔کمیونزم و فاشزم : ان دونوں نظاموں میں سے ایک کا مقدمہ یہ ہے کہ نجی جائیداد ہونی ہی نہیں چاہئے، بلکہ سب اجتماعی ملکیت ہو جبکہ دوسرے نظام (فاشزم) کا دعویٰ ہے کہ نجی ملکیت کا حق فرد کو دیا جاسکتا ہے مگر یہ حق ریاست کی مرضی و شرائط کا پابند ہو گا۔جب ریاست چاہے گی کسی بھی سبب سے فرد کی نجی ملکیت ضبط کر سکے گی۔(67) یوں ہم ان دونوں نظاموں کو ریاستی آمریت یا مطلق العنانیت (Authoritarianism) یا سٹیٹ ازم کہ سکتے ہیں۔

2۔ فری مارکیٹ کیپٹلزم: فری مارکیٹ کیپٹلزم کا مقدمہ یہ ہے کہ ہر فرد کو حق ملکیت حاصل ہے اور اس کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری ہے۔ملکیت کے حصول کی بھی دو صورتیں ہیں۔

(1) جیسا کہ قدیم قبائلی طرز معاشرت میں ہوتا تھا کہ ملکیت دراصل بزریعہ طاقت قبضے کا نام تھا ۔ جس پر قبیلے باہم لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ یہ ملکیت چراگاہوں ، جھیل ،تالاب ،مال مویشی اور دوسرے ذرائع پیداوار سے متعلق ہوتی تھی۔یاد رہے کہ جائیداد کی اس قسم میں اس وقت فرد کی نجی ملکیت کے بجائے قبیلے کی مشترکہ جائیداد کا تصور رائج تھا۔

دور حاضر میں غریب ملکوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہاں طاقت و جبر کا بھیانک ارتکاز جس سے جنم لینے والا تسلط اور جبر کا بے دریغ استعمال جہاں نجی آزادیوں کا دشمن ہے وہیں عام شہریوں کے حق ملکیت کو بھی تحفظ حاصل نہیں۔ بالا دست طبقات عام کمزور شہریوں سے ان کی جائیدادیں چھین کر انہیں بے دخل کردیتے ہیں۔بعض علاقوں میں ان کے مردوں کا قتل عام معمولی سی بات ہے۔ افریقہ میں آج بھی قبائل وسائل پر ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں جیسا کہ قدیم زرعی ثقافت میں ہوتا تھا ۔(68)

(2 حق ملکیت کی دوسری قسم میں ریاست کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ امن عامہ کو بحال رکھتے ہوئے فرد کے حق ملکیت کا لازمی تحفظ کرے۔اس سیاسی و معاشی بندوبست میں جائیداد کو محنت اور کارجوئی(Entrepreneurship) سے جوڑا جاتا ہے ،ایک صحت مند معاشرے کی فضا میں فرد اپنی محنت، سرمایہ،ذہانت اور جملہ خوبیوں کو معاشی سرگرمیوں میں بطور ان پٹ (Input) استعمال میں لاتا ہے اور اس کے آوٹ پٹ کی ملکیت کا حق رکھتا ہے۔

سوشلزم اور کیپیٹلزم میں عموما مقاصد مشترک مگر طریقہ کار مختلف ہے۔

سوشلزم اور فری مارکیٹ کیپٹلزم کے درمیان فرق مقاصد کا نہیں۔ دونوں ہی اپنے شہریوں کے لیے مادی خوشحالی کے آرزو مند ہیں۔فرق صرف طریقہ کار کا ہے۔سوشلزم جبر،کنٹرول اور ریاستی آمریت سے یہ مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے جبکہ فری مارکیٹ اس کے لیے شخصی آزادی،آزاد سوسائٹی، جمہوریت، سیکولرازم اور آزاد مارکیٹ کی آرزومند ہے۔سوشلزم سمجھتا ہے کہ ترقی مہیا کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے ،جبکہ لبرل ازم یہ کہتا ہے کہ ترقی فرد خودپیدا (produce, develop) کرتا ہے جبکہ ریاست اس دوران محض اس کی مددگار اور سہولت کنندہ ہے.

حق ملکیت کا جواز

فردکے جملہ ان پٹس (inputs) اس کے ذاتی ہیں اور یوں ان کا نتیجہ بھی اس کا ذاتی ہے۔

مثال کے طور پر ایک کسان صبح سویرے اپنی کھیتی میں جاتا ہے۔اس پر محنت کرتا ہے،وقت پر بوائی اور اس کا انتظام کرتا ہے - اپنی جملہ صلاحیتیں بہتر کھیتی کے حصول کے لئے وقف کردیتا ہے۔اس کی اس محنت (کھیتی باڑی) کا آوٹ پٹ یعنی اناج اس کی ذاتی ملکیت ہے جس طرح اس کا ان پٹ اس کی ذاتی ملکیت تھا ۔اب وہ اس اناج سے متعلق حق رکھتا ہے جتنا چاہے گھر رکھے اور جتنا مارکیٹ میں جا کر جس قیمت پر بھی وہ مطمئن ہو بیچے.

ان پٹ اور آوٹ پٹ کی بہت ساری اقسام ہیں یہ محض کمپنی،فیکٹری اور روپیہ نہیں۔

- مثال کے طور پر ایک قلم کار کی محنت کا ان پٹ اس کا برسوں کا مطالعہ، غور و فکر، سوچ کے گہرے اور مرتب زاویے،پھر اس کی تحریر پر محنت اور اس کو کسی شاہکار شکل (کتاب یا کالم) میں لانا یہ سب اس کی ان پٹ اور آوٹ پٹ سے جڑی چیزیں ہیں۔یہ سب سرگرمیاں اس کی ذاتی (پرسنل) ہیں ان پر اس کا حق مسلم ہے۔
- ایک مصور کے لیے اس کی مصوری،ایک فنکار کے لیے اس کا فن ،ایک مزدور کے لیے اس کی مزدوری وغیرہ یہ سب ان پٹ اور آوٹ پٹ ہیں اور اس کاذاتی حق ہیں۔ اگر آپ فساد پرامن،غربت پر خوشحالی ، محدود وسائل کے بے دریغ ضیاع پر تخلیقی صلاحیت (پروڈکٹوٹی) اور وسائل کے کامیاب تفویض (Efficient allocation) کو ترجیح دیتے ہیں تو معلوم تاریخ میں فرد کے حق ملکیت پر قائم معاشی بندوبست کے علاوہ اور کوئی بھی بہتر متبادل نہیں۔

ملکیت محنت اور صلاحیت کے بہترین مصرف کا انعام ہے -

پراپرٹی محنت اور صلاحیت کے بہترین استعمال کا انعام (reward) ہے جو آپ مارکیٹ میں باہمی رضاکارانہ تعاون وتبادلہ سے کماتے ہیں۔اگر آپ بزنس مین ہیں تو آپ کی کارجوئیانہ (entrepreneoral) صلاحیتیں آپ کے اس انعام میں آپ کی مددگار ہیں۔اور اگر آپ کہیں ملازم (employee) ہیں تو آپ کی تخلیقی صلاحیتیں اور مہارت (skill) آپ کے اس انعام کے حصول میں آپ کی مددگار ہیں۔انعام یا جزا کے اس حصول کی خواہش تمام افراد میں محنت، صلاحیت کے بہتر استعمال،اور کامیابی کی ترغیب پیدا کرتی ہیں۔ایڈیسن ایک مقبول ترین سائنسدان اور بزنس مین تھا،جب اس نے ابھی بلب ایجاد بھی نہیں کیا تھا بلکہ اس کی ایجاد میں مصروف و مشغول تھا تو اپنے باپ کو خط لکھا:

"والد محترم میں ایک ایسی تحقیق و ایجاد میں مصروف ہوں جس سے ہماری غربت دور ہوجائے گی ، اورہم طبقہ امرا میں شمار کئے جائیں گے۔(69)

یہ غربت کے شکنجے سے نکلنے کی ترغیب دراصل محنت کی جزا کمانے کے لیے ہورہی تھی،جو بعد از ایجاد حق ملکیت (پراپرٹی رائٹس) کی صورت میں ایڈیسن کو ملی تھی جس کی بنا پر اس نے جنرل الیکٹرک نامی کمپنی قائم کی۔جو آج بھی ایک کامیاب کمپنی ہے۔ ایڈیسن کی اپنی محنت ، اپنی جزا کے حصول کے لیے ایک جدوجہد یعنی اس کا سیلف انٹرسٹ (شخصی مفاد) تھی مگر اس سے جنم سوشل انٹرسٹ (سماجی مفادات) نے لیا جس کی بدولت آج گھر گھر بجلی کے قمقموں سے روشن ہیں۔

کیا ہم نے کبھی سوچا کہ آخر سائنسی ترقی صرف فری مارکیٹ کیپٹلزم میں ہی کیوں ممکن ہو پائی ہے جب کہ کمیونزم اور فاشزم انتہائی درجہ کی ریاستی آمریت کے باوجوداس درجہ کی سائنسی ترقی حاصل نہ کرسکے؟ اس کی وجہ سائنسدانوں کی اپنی محنت کی جزا یا انعام کے حصول کے لیے جدو جہد (سیلف انٹرسٹ) ہے۔اس جدوجہد میں کمرشل ادارے ان کے مددگار ہیں کیونکہ ہر نئی ایجاد بے شمار کارجوئیانہ (Entrepreneurial) امکانات پیدا کرتی ہے۔ یوں سائنسدانوں اور کمرشل اداروں کی اپنے اپنے سیلف انٹرسٹ (مفادات) کے حصول کے لئے مشترکہ جدوجہد سوشل انٹرسٹ (سماجی مفادات) پیدا کرتی ہے۔

یہ حق جائیداد یا ملکیتی حقوق محض زمین یا فیکٹری کے لیے نہیں بلکہ پیداوار کے عمل میں شریک تمام محرکات اس کا حصہ ہیں،جیسے زمین کی ملکیت، محنت کی ملکت ، تخلیقی صلاحیتوں اور ان کے نتائج کی ملکیت، سرمایہ اور نفع و نقصان کی ملکیت،ایجادات اور دریافتوں کی محنت سمیت تمام ان پٹ اور آؤٹ پٹ اس کا حصہ ہیں۔

معاشی سرگرمیاں حق ملکیت کے بغیر ممکن نہیں۔

حق ملکیت معاشی سرگرمیوں کی بنیاد ہے۔ اس کے بغیر معاشی سرگرمیاں چل ہی نہیں سکتیں۔ جیسے مثال کے طور پر تجارت ہے۔ تجارت میں کیا ہوتا ہے کہ آپ اپنی ملکیت کی کوئی شے یا خدمت مارکیٹ میں لاتے ہیں۔اسے خریداروں کے سامنے پیش کرتے ہیں، خریدار جب اسے خریدتے ہیں تو آپ کرنسی یا کسی بھی میڈیم آف ایکسچینج یا بارٹر سسٹم (ملکیت کے بدلے ملکیت کا براہ راست تبادلہ) کے بدلے اپنے ملکیتی حقوق اس کے سپرد کردیتے ہیں۔اور جو کرنسی آپ کو حاصل ہوتی ہے اس سے آپ کوئی بھی ضرورت یا خواہش کی شے یا خدمت خرید کر اسے اپنی ملکیت میں لے لیتے ہیں۔ پھر یا تو اسے خرچ کرتے (Consume) کرتے ہیں ورنہ محفوظ (Save) یا انویسٹ کرتے ہیں ۔

مثال کے طور پر جب ہم کسی دکاندارکو سو روپے دے کر اس سے چینی خریدتے ہیں تو وہ بھی کرنسی کے بدلے آپ کو سو روپے کی ویلیو یعنی قوت خرید کے برابر کی چینی کی ملکیت آپ کے حوالے کرتا ہے یا آپ کسی حجام کی دکان پر جاتے ہیں پچاس روپے کے بدلے اپنے بال کٹواتے ہیں۔بال کٹوانے کی اس خدمت کے لیے آپ حجام کی مہارت اور اس کا وقت خریدتے ہیں۔

یہ تمام معاشی سرگرمیاں ملکیت کے تبادلوں کا نظام ہیں۔ ملکیت کے تصور کے بغیر یہ معاشی سرگرمیاں ناممکن ہیں۔ فری مارکیٹ کیپٹلزم فرد کو آزادی دیتا ہے کہ اشیاء و خدمات کے ان تبادلوں کو رضاکارانہ تعاون و اشتراک پر قائم کرے جس میں عام افراد کا حق انتخاب (Freedom to choose) موجود ہو۔مثال کے طور پر یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ آپ جس ہیر ڈریسر کو بھی پسند کریں اس سے بال کٹوائیں اور چینی سے جو بھی مقاصد حاصل کرنا چاہیں،چاہئے شربت بنائیں چائے یا حلوہ بنائیں یہ آپ کا حق انتخاب ہے۔

آزادی تجارت (فری ٹریڈ) کا مطلب پراپرٹی میں مکمل آزادی ہے۔ بشرطیکہ آپ نے یہ پراپرٹی اپنی محنت اور ایمانداری سے کمائی ہے اور آپ اپنی پراپرٹی کا جو استعمال کرنے جارہے ہیں اس میں دوسرے افراد کے بھی پراپرٹی رائٹس محفوظ ہیں۔

بغیر حق ملکیت کے معاشی زندگی میں تعاون و تبادلہ اور کوآرڈینیشن ممکن نہیں ۔

اگر پراپرٹی رائٹس نہیں دیے جائیں گے تو رضاکارانہ تعاون و تبادلہ بھی ممکن نہیں۔تب کوئی بھی شخص کوئی بھی چیز کسی دوسرے کے پاس دیکھے گا اور اسے پسند آگئی تو وہ اس کو یقینا چھین لینے کا مجاز ہوگا کیونکہ جس کے پاس وہ چیز پہلے سے اگر موجود ہے تو اس کا تو اس پر کوئی حق ہی نہیں۔ میرے پاس اگر کوئی چیز ہے اور کسی دوسرے فرد کو وہ پسند ہے تو وہ صرف اس صورت میں میرے پاس رہ سکتی ہے اگر اس پر میری ملکیت اور حق ہو۔اور اگر کوئی چیز کسی کی بھی ملکیت نہیں اور وہ نایاب یا محدود (rare) بھی ہے تو وہ محض اس کی ہوگی جس کے پاس آپ سے زیادہ طاقت ہوگی۔

حق ملکیت اور زائد (Surplus) ویلیو کا مسئلہ

پراپرٹی رائٹس سے متعلق ایک اور اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ اگر پراپرٹی رائٹس نہیں ہوں گے تو فرد اپنی سرپلس ویلیو (ضرورت اور خواہش سے زائد ویلیو) کہاں اور کیسے محفوظ (save) کرے گا۔ مثال کے طور پر اگر میں کسی دوسرے شخص سے زیادہ محنت کرتا ہوں وقت اور توانائی کے اعتبار سے یا تخلیقی صلاحیت کے استعمال سے تو اس طرح حاصل کی گئی سرپلس ویلیو کا کیا فائدہ ہوگا؟ کیا یہ محض ضائع ہوجائے گی؟ اگر ضائع ہوجائے گی تو میرے اندر محنت کی مزید ترغیب تو ختم ہوجائے گی یا اگر یہ محنت کی ترغیب قائم بھی رہی تب بھی اس کی حسب ضرورت و خواہش ویلیو کو خرچ کرنے کے بعد جو ویلیو بچ جائے گی تو کیا میں اسے ضائع کردوں یا اسے کہیں محفوظ کرسکتا ہوں؟ اگر محفوظ نہیں کرسکتا تو میں وقت کے ساتھ ساتھ اپنے معیار زندگی کو بہتر کیسے بنا سکوں گا؟ اگر ایک سوسائٹی کے تمام افراد اس زائد (سرپلس) ویلیو کو محفوظ (save) نہیں کرسکتے تو کیا ان کا مجموعہ سوشل ویلیو ضائع نہیں ہوجائے گی؟ اور اگر فرض کیا کہ اسے ریاست خود محفوظ (save) کرے گی تو اس صورت میں مجھے دوسروں سے زیادہ محنت اور پروڈکٹوٹی کی آخر کیا ضرورت ہے کہ محنت و صلاحیت کی جزا سب میں تقسیم ہو مگر اس کی مشقت میں اٹھاؤں؟

حقیقت یہ ہے کہ اگر ویلیو کو محفوظ (save) کرنے کا حق فرد کو حاصل نہیں تو ویلیو میں نشونما (growth) کے بجائے اس میں تنزلی(decline) آئے گی۔اس طرح پیداوار میں اضافہ ممکن نہیں کیونکہ ترغیبات(incentive) کا نظام ہی درہم برہم ہوجائے گا، جس کے نتیجے میں قحط برپا ہو گا اور ویلیو میں انحطاط (Shortage) پیدا ہوگی۔ویلیو کو محفوظ (save) بنائے بغیرایک کارجو (entrepreneur) ضروری سرمایہ (Capital) اکھٹا نہیں کرسکتا اور کارجویانہ (entrepreneurial) سرگرمیوں کے بغیر نہ نئے آئیڈیاز پنپ سکیں گے اور نہ ہی جدت ممکن ہو پائے گی۔اس کے بغیر نہ کامیاب صنعتی ترقی ممکن ہے اور نہ ہی صنعتی انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔

یہ جاگیر داری یا شہنشائیت میں ہوتا تھا کہ ساری اضافی (سرپلس) ویلیو چاہے وہ زرعی شعبے سے حاصل ہوتی تھی یا غلاموں کی محنت کے نتیجے میں پیدا ہوتی تھی، سب اہل اقتدار و حکومت کے پاس چلی جاتی تھی۔یوں غلاموں میں محنت کی ترغیب نہیں پائی جاتی تھی اور انہیں بذریعہ جبر و تشدد کام پر مجبور کیاجاتا تھا کیونکہ انہیں زائد محنت و پروڈکٹوٹی پر زائد (سرپلس) ویلیو نہیں حاصل ہوتی تھی۔ یوں ان کے نزدیک روز مرہ کی محنت کا مقصد اپنے آقاؤں کی خوشنودی تھی کہ وہ زندگی گزارنے کے لئے بنیادی ضروریات کھانا لباس چھت کی تکمیل کا ایک وسیلہ تھے۔ایک ایسا معاشرہ جس میں زائد (سرپلس) ویلیو اہل اقتدار واختیار کے پاس چلی جاتی ہے وہاں شہریوں کی حالت غلاموں جیسی ہوتی ہے اور وہ محنت سے کتراتے اور اپنے معیار زندگی سے مایوس ہوجاتے ہیں۔

اس تناضر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ حق ملکیت سے مراد یہ ہے کہ آپ کو اپنی ملکیت یا کل ویلیو کے استعمال کا حق حاصل ہے کہ چاہے ساری خرچ کریں یا اسے محفوظ (save) کریں۔اپنی سیونگ (saving) کو پڑا رہنے دیں یا اسے کسی کو ادھار یا امداد میں دے دیں یا اسے

کسی کارجویانہ (entrepreneurial) آئیڈیاپر انویسٹ کر دیں اور نفع کمائیں(یعنی مزید سرپلس ویلیو حاصل کریں) یا اپنی انویسٹمنٹ پر خسارہ (Loss) برداشت کریں اور اپنی ویلیو میں تنزلی (Decline) کا سامنا کریں۔

ہماری معاشی سرگرمیوں میں ویلیو ایک فرد سے دوسرے فرد یا ایک کمرشل ادارے سے دوسرے کمرشل ادارے یا ایک فرد اور دوسرے کمرشل ادارے کے درمیان منتقل ہوتی رہتی ہے۔ یاد رہے کہ ہم صرف ویلیو منتقل ہی نہیں کرتے بلکہ اسے پیدا بھی کرتے ہیں. اس ویلیو کی منتقلی یا اس کی پیداوار کے لئے ہم معاشی فیصلے کرتے ہیں جن کی بنیاد ہمارا نظام اقدار ، تجربہ و مشاہدہ (Learning) ، سمجھ بوجھ ،اور دلیل پسندی(Reasoning) وغیرہ ہیں۔اسی سبب سے ہم کہتے ہیں کہ معاشی آزادی (اکنامک فریڈم) کی اساس پراپرٹی رائٹس میں ہے اور پراپرٹی رائٹس کے بغیر کوئی فری مارکیٹ کیپٹلزم نہیں۔

یہی سبب ہے کہ لبرل اصول قانون میں حق ملکیت (پراپرٹی رائٹس) کو بنیادی انسانی حق ماناگیا ہے۔جن تین حقوق کی بنیاد پر لبرل قانون اور ریاستی بندوبست بنیادی طور پر قائم کیا جاتا ہے۔ وہ تین درج ذیل ہیں۔

1۔زندگی کا حق۔ یعنی جینے کا حق
2۔ شخصی آزادی اور مساوات ۔
3۔ ملکیت کاحق۔

لبرل اصول قانون کی رو سے ان تینوں حقوق کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری ہے اور ریاست اس ذمہ داری سے پہلو تہی نہیں کرسکتی۔

A man without property rights ---without the rights to the product of his own labor ----is not a freeman.

(ایک فرد جو پراپرٹی رائٹس (حق ملکیت)اور اپنی محنت کے نتائج کو استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتا وہ ایک آزاد فرد نہیں)

فری مارکیٹ کیپٹلزم میں پراپرٹی کی ملکیت(جائیداد)، اس کا انتظام اور کنٹرول نجی سیکٹر کے پاس ہوتا ہے جب کہ کمیونزم میں ساری پراپرٹی کی ملکیت اس کا انتظام اور کنٹرول ریاست کے پاس ہوتا ہے۔

صنعتی عہد کے بعد حق ملکیت نے عام شہریوں کو غلامی (Serfdom) سے نکالا۔

صنعتی عہد سے پہلے پراپرٹی فرد کا بنیادی حق نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ اس کی بنیادقبضہ استحقاق، اور اجارہ داری پر تھی۔بادشاہ اپنی پوری جنگی طاقت کے ساتھ حملہ آور ہوتا اور فتح کے نتیجے میں تمام مفتوحہ علاقوں کا مالک و مختار سمجھا جاتا تھا۔ وہ اس زمین اور اس کے انتظام کو پھر اپنے

حامیوں اور منتظمین میں تقسیم کردیتا تھا جو اس پراپرٹی سے حاصل ہونے والی زائد ویلیو کو کو ریونیو کی شکل میں بادشاہ کے حضور پیش کریتے تھے۔عام آدمی جو ان اشیاء اور اس زائد ویلیو کو پیدا کرتا تھا اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سسٹم کے اس جبر کو تقدیر کا نام دیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ یہی دستور ہے۔ مالتھس عام آدمی کی اس حالت کو فطرت کے جبر کے نام سے اس طرح بیان کرتا ہے۔

At nature's mighty feast, there is no vacant cover for him. (70)

ذرائع پیداوار محض زراعت تک محدود تھے،نوے فیصد سے زائد پیداوار زرعی شعبے سے تھی(71)۔ شہری معیشت کے بقیہ شعبے جیسی دستکاری،کھلونا سازی وغیرہ محدود تھیں۔روزگار کا سب سے بڑا اور واحد شعبہ محض یہی تھا۔ صنعتی انقلاب نے یہ سب بدل دیا۔ اب زرعی زمین کی ملکیت ہر فرد کا بنیادی حق قرار پائی جس کی بنیاد پر وہ محنت اور سرمایہ کی پروڈکٹوٹی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی زائد ویلیو کو محفوظ (save) اور Invest کر سکتا تھا۔اب معاشی سرگرمیوں نے آقا اور غلام کا فرق مٹا دیا۔اب ہر فرد برابر تھا۔ اس کی ان پٹ(Inputs) کا آؤٹ پٹ (Outputs) اب پروڈیوسر کا اپنا تھا جسے وہ رضاکارانہ تعاون و تبادلہ سے بیچ سکتا تھا اور زائد ویلیو سے مزید جائیداد خرید کر مزید ویلیو پیدا کر سکتا تھا۔اب اس کے پاس وقت کے ساتھ ساتھ مواقع بڑھتے گئے اور انتخاب کی آزادی نے اس کی صلاحیتوں کو اظہار کے مزید خوبصورت مواقع فراہم کیے۔

پراپرٹی رائٹس پر منڈلاتے خطرات:

1۔**ریاستی آمریت**: ریاست اپنی وسیع و عریض اور خطرناک سیاسی طاقت سے سوشل ویلفئیر کے نام پر یا کسی بھی دوسرے سبب سے فرد سے اس کا حق ملکیت چھین سکتی ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ قانون حق ملکیت کو بنیادی انسانی حق قرار دے کر ریاست کے ایسے کسی بھی قدم کو وقت سے پہلے روک لگائے اور سول سوسائٹی ہر دم متحرک رہے کہ اس بنیادی حق پر کسی بھی صورت میں سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔

ٹیکسز:ریاست سماج کا ایک ادارہ ہے۔ٹیکسز اس ادارے کے اخراجات کے لئے ادا کئے جاتے ہیں تاکہ اس کا اجتماعی بندوبست بخوبی سرانجام پائے۔جس طرح ریاست کی ذمہ داریاں محدود ہیں اسی طرح اس کے ٹیکسز کی شرح بھی محدود اور کم سے کم ہونی چاہئے۔ریاست جب سوشل ویلفئیریا مفروضہ تقسیم دولت یا کسی اور مد میں اپنی سرگرمیاں اور اخراجات بڑھاتی ہے توٹیکسز کی شرح میں اضافہ کرتی جاتی ہے یوں ٹیکسز ایک طرح سے جبر اور لوٹ بن جاتے ہیں، جو سوشل ویلفئیر پر کم اور بیورو کریسی کی من پسند خواہشات اور مفروضہ منصوبہ بندیوں پر زیادہ ضائع ہوتے ہیں۔ٹیکسز کی غیر منصفانہ بلند شرح پراپرٹی رائٹس پر حملہ ہے۔

حق ملکیت پر پابندیاں: جب ریاست پراپرٹی کی خرید و فروخت پر بعض علاقوں میں بعض شناختوں (نسل و زبان ،مذہب و قومیت اور وطنیت وغیرہ) پر جائیداد کی خرید و فروخت پر روک لگا دیتی ہے،یا جائیداد کی کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ قیمتوں کی حد متعین کردیتی ہے تو یہ بھی فرد کے حق ملکیت اور آزادی تعاون و تبادلہ پر حملہ ہے۔

جب ریاست ایک کمپنی یا انڈسٹری کی سرگرمیوں پر کنٹرول یا پابندی لگا دیتی ہے کسی بھی غیر منصفانہ بنیادوں پر تو یہ بھی اس کمپنی یا انڈسٹری کے مالکان کے حق جائیداد پر حملہ ہے کہ انہیں ان کی پراپرٹی کے مفید استعمال کے حق سے محروم کردیا گیاہے۔

کرپشن: جب ریاستی اداروں کے بیوروکریٹس یا سیاستدان اپنے سیاسی اثر ورسوخ کا مالی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جیسے مثال کے طور پر اگر کسی بے آباد علاقے میں نہر کھینچنے کا کوئی پروجیکٹ شروع ہوتاہے تو بیوروکریٹس (اپنے عزیز رشتہ داروں کو ترغیب دے کر) اس کے ارد گرد کی زمین پہلے ہی سستے داموں خود خرید لیتے ہیں اور جب نہر چل پڑتی ہے تو پراپرٹی کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اس طرح کی کرپشن یا اقرباء پروری بھی ملکیت کے حق کی خلاف ورزی ہے۔

حق ملکیت میں وسائل کی بہترین تفویض ہے -

حق ملکیت میں جہاں فرد کو اس کی معاشی زندگی میں آسانی اور فریڈم ملتا ہے وہیں سب سے بہتر وسائل کی تفویض(Resource Allocation) کا نظام بھی اسی سے ممکن ہے۔پرائیویٹ پراپرٹی کے ساتھ اس پراپرٹی کے تحفظ اور بہترین استعمال کی ترغیب (Incentive) جڑی ہوتی ہے۔جب ملکیت آپ کی ہے توآپ اس کو بہتر سے بہتر استعمال کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ کمایا جائے۔اور جب ملکیت کسی کی نہیں ہوتی بلکہ مشترکہ ہوتی ہے تو وہ درحقیقت کسی کی بھی نہیں ہوتی ،کیونکہ اس کے تحفظ اور اسے بہتر سے بہتر استعمال کی ترغیب و شوق یا تو انتہائی محدود ہوتا ہے یا بالکل بھی نہیں ہوتا۔

جب چین میں کیمونسٹ معیشت قائم تھی تو خوراک میں قلت (Shortage) ،بحران اور قحط عام سی بات تھی۔اور جب چین کیمونسٹ معیشت سے مارکیٹ کی معیشت میں منتقل ہوا تو یہ وہی کسان تھے اور وہی پراپرٹی تھی، نہ صرف آوٹ پٹ میں اضافہ ہوا بلکہ خوراک کی کمی ،بحران اور قحط کا بغیر کسی باقاعدہ حکومتی منصوبہ بندی(Central Planning)کے محض مارکیٹ کی ڈیمانڈ اور سپلائی کی آزاد و خودمختار قوتوں کے سبب خاتمہ ہوگیا۔

کیونکہ بہتر عمل کا بہتر نتیجہ ہی بہتر عمل کی ترغیب پیدا کرتا ہے۔ جب آپ کو معلوم ہو کہ آپ کے کسی بہتر عمل کا نتیجہ آپ کے لئے اس پوری سوسائٹی میں بہت تھوڑا یا صفر ہے توآپ ا س کا خیال کم ہی رکھیں گے۔ایک مشترکہ ملکیت میں (ذمہ داری) کا عنصر کمزور ہوجاتا ہے۔

مثال کے طور پر پورے پاکستان کی 20کروڑ عوام ایک کیمونسٹ معیشت میں رہتی ہے۔ ان میں نفع (Good doing) اورنقصان(Wrong doing) بیس کروڑ افراد میں تقسیم ہوگا تو مجھ میں نفع کے حصول کی تحریک و ترغیب کمزور ترین ہوگی کیونکہ مجھے معلوم ہوگا کہ بیس کروڑ میں نفع تقسیم ہو کر میرے لئے انتہائی قلیل رہ جائے گا۔ جبکہ نقصان کا خطرہ یا احساس بھی کم ہوگاجب مجھے محسوس ہوگا کہ اس کا نتیجہ بھی پورے ملک میں تقسیم ہوگا۔

میرا جو بھی اچھا عمل یا برا عمل ہے اس کے نتائج کا ذمہ دار میں ہوں۔نتائج کی یہ ذمہ داری جہاں مجھے برے عمل سے بچاتی ہے وہیں مجھے اچھے عمل کی بھی ترغیب دیتی ہے کیونکہ اس اچھے عمل کا سارا نتیجہ میرا ذاتی ہوگا۔جائیداد اور اس کے صحیح استعمال کی ذمہ داری (responsibility) کا یہ تعلق بہتر وسائل کی بہترین تفویض (Resource allocation) اور بہتر ترغیبات کو جنم دیتا ہے۔

حق ملکیت میں سب سے بڑی اخلاقیات

حق جائیداد میں سب سے بڑی اخلاقیات جو کہ بطور قانون بھی نافذ کی جاتی ہے وہ یہ کہ پراپرٹی کی منتقلی یعنی انتقال میں دونوں (خریدار و فروخت کنندہ) کی رضامندی شامل ہو اور یہ کہ تبادلہ جبر میں نہ ہورہا ہو۔ضروری ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے حقوق اور ذاتی صلاحیت و قابلیت برائے تعین اقدار (Value Judgment) کا احترام کریں۔دونوں کو معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے اور معاہدہ کرنے کی آزادی (Freedom to engage)حاصل ہو اور وہ انتقال ملکیت کی جن شرائط (Terms & Conditions) پر تکمیل معاىدہ کو ضروری سمجھیں، دونوں فریق اپنی باہمی رضامندی سے اس پر عمل کرنے میں آزاد ہیں۔

آزادی سے آخر کیا مراد ہے ؟

انفرادی آزادیوں پر شب خون ہمیشہ "نازک حالات" کے عنوان سے ہی مارا گیا ہے۔ (ہائیک)

ایک لبرل سے سب سے زیادہ جو سوال پوچھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آخر وہ آزادی کیا ہے جس کا آپ لوگ بار بار تقاضا کرتے ہیں۔

آزادی دراصل کسی ایک انسان پر کسی دوسرے انسان کے جبر کی غیر موجودگی کا نام ہے جس کی رو سے ہر انسان اپنی خودی کی شناخت (Self-Realization) میں آزاد ہے اور اس کی بنیاد پر اپنے علم و فہم یعنی ذاتی نظام اقدار اور اپنے اعمال کی مکمل ذمہ داری (Responsibility) کے ساتھ، اپنے ہر اس عمل میں آزاد ہے جس سے کسی دوسرے انسان کی آزادی مجروح نہ ہو۔

فریڈم کو ایف اے ہائیک ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ آزادی سے مراد یہ ہے کہ ؛

- ✓ ایک فرد کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی سرگرمیاں اپنے ذاتی منصوبوں اور فیصلوں کے مطابق سرانجام دے سکے۔یعنی اسے آزادی ارادہ و عمل حاصل ہو۔
- ✓ وہ کسی دوسرے فرد ادارے یا گروپ کی مرضی ،منصوبے یا فیصلے کے مطابق عمل کا پابند نہیں جو اس کے لیے طے کریں کہ کس خاص طریقے سے اسے ان روزمرہ کی سرگرمیوں کو سرانجام دینا ہے یا کس خاص طریقے سے سرانجام نہیں دے سکتا۔
- ✓ آزادی دراصل دوسروں کے جبر سے آزادی (Independence) کا نام ہے۔
- ✓ اسی طرح آزادی محض ایک فرد کے دوسرے فرد کے ساتھ تعلق سے متعلق (Relevent) ہے کہ ایک فرد پر کوئی دوسرا فرد جبر نہیں کرسکتا۔مطلب یہ کہ آزادی کا سوال معاشرتی ہے۔

اب سب سے اہم سوال یہ ہے کہ آخر جبر کیا ہے؟ اگر کوئی شخص میری انگلی گن کے ٹریگر پر رکھ کر اور اس پر قوت لگا کر گن سے فائر کرتا ہے تو کیا اس صورت میں اس گن سے نکلنے والی گولی کا ذمہ دار میں ہوں اور اس گولی سے اگر کوئی نشانہ بنتا ہے تو کیا مجرم میں ہوں؟ ہر گز نہیں کیونکہ اس عمل میں میری آزادی ارادہ و عمل شامل ہی نہیں تھی۔ یہ میرے ذاتی نظام اقدار (Value Judgement) کا

حاصل ہی نہیں تھا۔بلکہ اس عمل میں تو میں خود مظلوم ہوں۔ کیونکہ میں نے کچھ کیا ہی نہیں مگر اس کے نتائج کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی جارہی ہے۔

دوسری مثال سے بھی مدد لیتے ہیں ۔ایک شخص میری گردن پر پستول رکھ کر مجھے حکم دیتا ہے کہ اپنا بٹوا (Valet)اور موبائل مجھے دے دو اگر دے دیتا ہوں تو جان بچ جاتی ہے اور اگر نہیں دیتا تو ممکن ہے وہ مجھے قتل کردے۔ بظاہر تو اس عمل میں میرے پاس دوچوائسز (انتخابات) ہیں

1۔ جان بچاؤں

یا

2۔بٹوہ اور موبائل بچاؤں ۔

اس صورت میں میرے پاس جو حق انتخاب ہے تو کیا اسے آزادی کہا جائے گا؟ ہرگز نہیں یہ چوائسز (choices) میں حق انتخاب بھی آزادی نہیں بلکہ آمریت اور جبر ہے اور یہ میری آزادی فکر و عمل اور ذاتی نظام اقدار سے متصادم بھی ہے۔یوں جبر سے مراد یہ ہے کہ :

"ایسا نظام یا عمل جورضاکارانہ (voluntory) نہ ہو اور اس کی بنیاد آزادی ارادہ و عمل(Free Will) اور ذاتی نظام اقدار پر نہ ہو، اسے جبر کہیں گے "

جیسا کہ درج بالا دونوں مثالوں سے واضح ہے فریڈم آزادی ہے جبر سے ۔ خاص طور پر یہ کہ ایک انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی بھی جواز کے تحت دوسرے انسان پر جبر کرے۔

جب ہم نے 1947ء میں سلطنت برطانیہ سے آزادی حاصل کی تھی تو وہ بھی مکمل آزادی نہیں تھی بلکہ آزادی کی ایک اہم شرط تھی کہ ہماری شناخت ہماری اپنی ہو۔ہم اپنے قوانین جن کی پابندی ہم پر لازم ہے وہ ہم پر بذریعہ جبر و قوت نافذ نہ ہوں بلکہ ہمارے شہریوں کی مرضی (General will) اور ہمارے بنیادی انسانی حقوق کی بنیاد پر ہمارے ہی منتخب نمائندے اسے بنائیں ۔ہم اپنی گورنمنٹ خود منتخب کریں۔ہم ہی طے کریں کہ سماجی و سیاسی بندوبست کے لیے ہم سب کو کتنا کتنا حصہ (ٹیکس کی شکل) ڈالنا چاہیئے۔ہم آزاد ہوں کہ اپنے بہترین مستقبل کے امکانات کو انفرادی و اجتماعی شکل میں خود Pursueکرسکیں۔

ہم نے سمندر پار سے آئے غاصبوں سے تو اپنے ملک کو آزاد کروا لیا، مگر آزادی کے جملہ امور ہنوز زیرتکمیل ہیں ۔ کیا یہاں فرد جبر سے آزاد ہے؟کیا ہماری سوسائٹی آزاد ہے؟کیا ہماری سیاست ہماری عوام کی مرضی و منشا کی پابند ہے؟ کیا قانون کے حضور سب برابر ہیں؟ کیا ہمارا

معاشی بندوبست ہمیں بہترین مستقبل کے امکانات کو Pursue کرنے کی آزادی دیتا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو ثابت ہوا کہ ہم ہنوز آزادی کی منزل کی جستجو میں سرگرداں ہیں ۔

آزادی کا تعلق فرد سے ہے۔اگر ایک سماج میں بسنے والے تمام افراد آزاد ہیں ،تب ہی سوسائٹی آزاد ہوگی۔ ہر فرد کی آزادی کے بغیر معاشرے کو آزاد معاشرہ نہیں کہا جاسکتا ۔ مثال کے طور پر امریکیوں نے برطانوی راج سے آزادی تو حاصل کرلی تھی مگر اس کے تمام افراد (جیسا کہ افریقی نسل کے امریکی لوگ اور ایشیائی لوگ) آزاد نہیں تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ غلامی موجود تھی ۔تو کیا اس صورت میں امریکی سوسائٹی آزاد تھی؟ ہر گز نہیں جب تک تمام شہریوں کے درمیان بنیادی انسانی حقوق اور قانون کی حکمرانی کی مساوات نہیں قائم ہوئی امریکی معاشرہ آزاد نہیں ہوا تھا ۔

آزادی کے لئے لازمی شرط مواقع کی مساوات ہے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی لبرل تحریکیں آزادی اور مساوات میں امتیاز نہیں کرتی تھیں۔ امریکی معاشرہ تب آزاد ہوا جب غلامی کو بذریعہ قانون ختم کر دیا گیا اور سماجی و معاشی زندگی میں مواقع کی مساوات کا آغاز ہوا جس میں کسی ایک نسل کو دوسری نسل پر برتری حاصل نہیں تھی ۔ آزادی کی جدوجہد پھر بھی جاری رہی۔ سیاسی آزادی سیاست میں تمام شہریوں (مرد و زن) کے حق انتخاب کی صورت میں ملی اس شکل میں کہ کہ تمام شہریوں کے درمیان ایک سیاسی بندوبست میں شہریت یعنی شہریوں کی مساوات قائم ہوئی ۔

آزادہ معاشرے (Free society) کا یہ سوال ہماری سوسائٹی سے متعلق بھی ہے کہ کیا سندھ، کے پی کے ،جنوبی پنجاب اور فاٹا وغیرہ کے دیہی علاقوں میں (بلکہ پورے پاکستان کے دیہی علاقوں میں) ایک لڑکی آزاد ہے کہ اپنی تعلیم جہاں تک وہ چاہے حاصل کرسکے؟ کیا ایک جاگیر دارانہ جبر میں عام شہریوں کو سیاسی آزادی حاصل ہے؟ کیا ہمارے ملک کی تمام خواتین کو شریک حیات منتخب کرنے کی آزادی حاصل ہے اور کیا ایک خاتون اپنی شادی کے بعد اپنے میاں کے برابر حقوق و اختیارات رکھتی ہے؟ان سب کا تقریباً جواب نفی میں ہے ،تو کیا اس صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سماج آزاد ہے؟ ہرگز نہیں۔

"فرد تب آزاد ہوتا ہے جب اس کے پاس انتخاب کی آزادی(Freedom to choose) ہو، جب وہ اپنی آزادی ارادہ و عمل اور شخصی نظام اقدار کے تحت اپنی سرگرمیاں سر انجام دے سکے اور ان کے اچھے برے نتائج کا بھی وہ خود ذمہ دار ہو"

یوں اگر پوری بات کو نتیجہ خیز بنایا جائے توآزادی (فریڈم) سے مراد اپنی خودی کی شناخت (Self-realization) ، اس کی مخفی صلاحیتوں اور خوبیوں کے حصول کے لیے اپنی آزادی ارادہ و عمل) اور نظام اقدار پر بھروسہ اور آزاد انتخاب کی طاقت (Power to choose) ہے۔اس طرح آزادی کا ادراک کر کے ، یہ دیکھیں کہ تمام انسانوں میں:

- ✓ بہتر انتخاب کی صلاحیت و قابلیت موجود ہے۔
- ✓ آزادانہ عمل(Exercise)کی صلاحیت و قابلیت موجود ہے۔
- ✓ کسی بھی رائے اور عمل کے اقرار و انکار کی صلاحیت اور حق موجود ہے۔
- ✓ مشاہدہ کرنے(Observe) اور سیکھنے (Learning) کی صلاحیت و قابلیت موجود ہے۔
- ✓ نتائج کے تعین(Measurement) اور قدرپیمائی (evaluation) کی صلاحیت و قابلیت موجود ہے۔
- ✓ کسی بھی رائے ، آئیڈیا یا عمل کی جانچ پڑتال (test) کی صلاحیت وقابلیت موجود ہے۔
- ✓ حاصل یا موجود تمام مواقع و متبادلات(Alternatives)میں سب سے بہتر (Opportunities) کے انتخاب کی صلاحیت و قابلیت موجود ہے۔
- ✓ اس میں آزادی ارادہ و عمل (Free Will) پائی جاتی ہے۔
- ✓ اس کے پاس چیزوں کی اچھائی یا برائی جانچنے کے لئے ذاتی نظام اقدار (ویلیو Judgment)موجود ہے۔
- ✓ وہ اپنی صلاحیتوں، قابلیتوں، اور خوبیوں و خامیوں سمیت تمام شخصی خصوصیات میں منفرد اور یکتا ہے۔
- ✓ اس کے پاس حق ملکیت اور اس کے تخلیقی استعمال کی صلاحیت موجود ہے۔
- ✓ اگر وہ اپنے شخصی مفاد (سیلف انٹرسٹ) اور ذاتی رجحانات کو Pursue کرے تو اس میں اس کی آزادی، اور سماج کے لئے سوشل انٹرسٹ(سماجی مفاد) کی صورت میں بہتری موجود ہے۔
- ✓ ریاست اجتماعی بندوبست کا نام ہے شہری اس کی ملکیت یا رعایا نہیں۔

- ✓ تمام انسانوں میں مساوات لازم ہے۔
- ✓ ہر معاشی ، سماجی اور سیاسی نظام اس کی ضروریات و خواہشات (یعنی اس کی طلب) کی تسکین کے لئے بنایا جائے۔
- ✓ وہ اپنی ذاتی ترغیبات و رجحانات کو Pursue کرنے میں آزاد ہے۔
- ✓ اسے انتخاب کا حق (Freedom to choose) اور اس کی طاقت (Power to choose) حاصل ہے۔
- ✓ تمام افراد اپنے علم میں نامکمل اور کسی حد تک ناقص (Imperfect) سہی مگر ہر فرد اپنی زندگی اور نجی فیصلوں کے بارے میں روئے زمین کے دیگر تمام افراد سے زیادہ علم و تجربہ سنجیدگی اور اخلاص رکھتا ہے۔
- ✓ اسے حق حاصل ہے کہ وہ جس شخص،ادارے،گروپ یا کمپنی سے چاہے،سیاسی سماجی اور معاشی میدان میں رضاکارانہ تعاون و اشتراک کر سکتا ہے۔
- ✓ لازم ہے کہ قانون اس کے حقوق کا تحفظ کرے نہ کہ وہ قانون کے حضور اس کی غلامی میں سرنگوں جئے۔
- ✓ ۔اس سے وجود میں آنے والی سوسائٹی اس پر کوئی جبر قائم نہیں کرسکتی اور آزاد سوسائٹی دراصل اپنے مقیم تمام افراد کے باہمی تعاون و تبادلہ کا نام ہے۔
- ✓ اس میں ترقی و خوشحالی اور بہتر مستقبل کے امکانات کو Pursue کرنے کی صلاحیت و قابلیت موجود ہے۔
- ✓ وہ پیداواری عمل میں جس حیثیت میں بھی چاہے شرکت کرنے کا اہل ہے اور اس کی آزادی رکھتا ہے۔
- ✓ ریاست ٹیکسز کے نام پر اس کی کمائی پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتی ضروری ہے کہ شرح ٹیکس کم سے کم اور منصفانہ ہو۔

یہ اور بہت سارے دوسرے ضروری اجزاء ہیں جو کسی بھی سوسائٹی یا ملک کے شہریوں کی آزادی کا تعین کرتے ہیں کہ آیا وہاں کے شہری کتنے آزاد ہیں اور انہیں مزید کونسی آزادی کی درحقیقت ضرورت ہے۔

آزادی سے متعلق تین نکات انتہائی دلچسپ ہیں۔ضروری ہے کہ انہیں سنجیدہ غور وفکر کا موضوع بنایا جائے۔

1. غلطی کا امکان(Chance of error)

جب ہم کوئی عمل کرتے ہیں تو پہلے اس کے نتائج کو قیاس کرتے ہیں ان کی پیش گوئی (Predict) کرتے ہیں۔بہتر نتائج کی آرزو اور امکان ہمیں بہتر عمل کی ترغیب دیتے ہیں مگر یہ اچھا نتیجہ اچھے عمل سے پہلے محض قیاس، مفروضہ اور پیش گوئی (Prediction) ہے ۔ضروری نہیں کہ جونتیجہ ہم نے تصور (Predict) کیا تھا وہی سامنے آئے – اسی لئے ہم مستقبل کو حتمی طور پر Unpredictable کہتے ہیں کہ جب تک نتائج و واقعات رونما نہ ہوں اس وقت تک انہیں حتمی ، یقینی اور مکمل طور پر معلوم نہیں کیا جا سکتا اور ہم انسان اپنی ذاتی زندگی سے متعلق بھی جو Predict کرتے ہیں وہ بھی عموما غیر حتمی اور نامکمل ہوتا ہے ۔ہم بہتر نتیجہ کے حصول کے لئے بہتر اور بروقت عمل کرسکتے ہیں تمام دستیاب وسائل کو استعمال کرتے ہوئے ، مگر بہتر نتیجہ پر ہمارا مطلق کنٹرول ہرگز نہیں۔

ہماری نتائج پر اجارہ داری نہیں۔یوں ہمیں حق حاصل ہے کہ اگر ہمارے کسی عمل کے برے نتائج سامنے آتے ہیں تو ہمیں اس سے سیکھ کے اور اپنی خامیوں کوتاہیوں کا محاسبہ کر کے نئے سرے سے اسے دہرانے دیا جائے۔یادرہے کہ یہاں ان نتائج کا ذکر ہے جو ہمارے ذاتی ہیں جن کا تعلق محض ہماری ذات سے ہے۔وہ نتائج جو سوشل ہیں جن سے سماج کے دوسرے افراد کو نقصان پہنچتا ہے تو وہ غیر قانونی ہیں اور اس سے متعلق فرد سے معاشرہ بذریعہ قانون باز پرس کرنے کا حق رکھتا ہے۔

اگر ہم غلطی کے امکانات سے ماورا ہوجائیں تو فریڈم کا سوال بھی غیر متعلق ہو جاتا ہے۔

If we know how freedom would be used, the case for it would largely disappear.

اس کو ایف اے ہائیک اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

Freedom granted only when it is known beforehand that its effects will be beneficial is not freedom. (72)

(وہ آزادی، آزادی نہیں جو فائدہ مند نتائج کا علم ہو جانے کے بعد عطا کی جائے۔)

آزادی سے یہ مراد ہے کہ تمام امکانات کا در کھلا ہے چاہے ان میں سے کچھ کے نتائج ہمارے لیے ناگوار ہی کیوں نہ ہوں۔ہمارا آزادی پر یقین اس لیے نہیں کہ ہم محض کچھ مخصوص سرگرمیوں (Practices) کے مخصوص نتائج چاہتے ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مستقبل نامعلوم (unpredictable) ہے، نتائج اپنے وجود میں آنے سے پہلے غیر حتمی ہیں ۔بلکہ اس سے یہ بھی مراد ہے کہ ہمارے یا سوسائٹی کے تمام افراد کے انفرادی افعال جوآزادی ارادہ عمل اور ذاتی نظام اقدار کے تحت کئے جاتے ہیں ان کے مجموعی طور پر نتائج برے نہیں بلکہ اچھے ہوتے ہیں اور تمام افراد کے لئے ان میں ہی فائدہ سوشل انٹرسٹ کی صورت میں پایا جاتا ہے.

ہم نہیں جانتے کہ ایک فرد اپنے فریڈم کو کیسے استعمال کرے گا۔یہ نہ جاننا زیادہ اہم ہے۔اگر جاننا ممکن ہوتا تو آمریت انہیں پہلے سے ہی کنٹرول کرلیتی اور مستقبل کو ارتقاء کے امکانات سے محروم کردیتی۔اگر ہزاروں افراد میں سے ایک بھی فرد ایسا ہے جو سماج کے دھارے کو سماج کی خوشحالی کے لئے بدل سکتا ہے، اس میں انقلابی صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ دنیاکو مزید بہتر بنا سکتا ہے تو یہ بھی شخصی آزادی کو جواز دینے کے لیے کافی ہے باوجود اس کے کہ ہم جانتے ہیں کہ تمام انسان اپنے اپنے وقت اور مقام میں اپنے اپنے علم اور عمل سے مستقبل کو بہتر سے بہتر بنانے میں ہر وقت اور ہر عہد میں شریک رہے ہیں اور رہیں گے۔ اسے تقسیم محنت (ڈویژن آف لیبر) کہتے ہیں ۔

فریڈم میں غلطی(Trial & error) اور سیکھنا (Learning) بہت ضروری ہے۔اسی میں سوسائٹی کا ارتقاء ہے۔یہ جو آج ہم تہذیب و تمدن کا خزانہ رکھتے ہیں وہ زیادہ تر اسی Trial & error اور سیکھنے کی بدولت ہے۔رسوم و رواج بھی اسی سے رواج پاتے ہیں۔اسطور (myth) کا جنم بھی اسی سے ہے۔ہمارے ادب کو بھی اسی سے توانائی ملتی ہے۔سوسائٹی میں غلطیوں(Trial & error) اورسیکھنے (Learning) پر پابندی سماج کو محض منجمد نہیں کرتی بلکہ تنزلی کی طرف لے جاتی ہے۔

(2) آزادی سب کے لیے :

یہ محض میری شخصی آزادی نہیں جس کا میں فائدہ اٹھاتا ہوں۔بلکہ یہ ہم سب کی شخصی آزادی ہے جس کے مثبت نتائج سے ہم سب فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ ہم سب کا سیلف انٹرسٹ (شخصی مفاد)اپنے مثبت نتائج میں سوشل انٹرسٹ(سماجی مفاد) پیدا کرتا ہے جبکہ منفی نتائج کے عموما ہم خود ہی ذمہ دار ہوتے ہیں اور اس کا سماج کے لئے نقصان انتہائی کم ہوتا ہے ۔

یہاں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ فری مارکیٹ کیپیٹلزم کے مثبت نتائج سے پوری سوسائٹی فائدہ اٹھاتی ہے اور برے نتائج کا وہ فرد (Entrepreneur) جس سے وہ غلطی سرزد ہوئی وہی ذمہ دار ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر دور حاضر میں ٹیکنالوجی میں جو ترقی ہوئی ہے اس کا سبب سائنسدانوں اور کمرشل اداروں کا سیلف انٹرسٹ ہوتا ہے جو اس کامیابی کی طرف ان میں ترغیب پیدا کرتا ہے۔کتنے ہی سائنسدان ہوں گے جو لیبارٹری میں برسوں کی محنت مشقت کے باوجود ناکام ہوئے ہوں گے اور کتنے ہی کارجو (Entrepreneur) ہوں گے جنہیں اپنے سیلف انٹرسٹ کی جستجو (Pursuit) میں ناکامی ہوئی ہوگی مگر سوسائٹی تو ناکام لوگوں کو نہیں بلکہ کامیاب لوگوں کو یاد رکھتی ہے.

اس لئے صرف میری آزادی اہم نہیں بلکہ ہم سب کی آزادی اہم ہے۔اور ضروری ہے کہ ہم سب شخصی آزادیوں پر کوئی سمجھوتہ نہ کریں۔اور اسے ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر ہمہ وقت اپنے سیاسی سماجی اور معاشی بندوبست میں ترجیحی بنیادوں پر رکھیں۔

اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک کام جو میں نے سرانجام دیا ہے اور اس کے جونتائج برآمد ہوئے ہیں،وہ نتائج اب حتمی ہوگئے ہیں، اب کسی اور کو اجازت نہ دی جائے کہ وہ اس کام کو دہرائے۔ ممکن ہے کہ جب میں نے وہ کام سرانجام دیا تھا تو بہت سارے ظاہری اور پوشیدہ عناصر ناقابل شناخت (unnoticed) رہ گئے تھے ،اور دوسرا فرد جب انہیں دہرائے گا تو اس کو زیادہ بہتر اور زیادہ توجہ و انہماک سے دیکھ پائے گا اور اس بات کو یقینی بنائے گا کہ تمام عوامل باقاعدہ منظم اور حسن ترتیب و بندوبست سے سرانجام پائیں۔ غلطی کی درستگی اور درستگی میں مزید ویلیو کے اضافے کا عمل کوشش اور غلطی (Trial & Error) اور سیکھنے (learning) سے جاری رہتا ہے، تمام افراد کو آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنی سمجھ بوجھ اور بصیرت سے جاری رکھ سکیں۔ اور اس بامقصد، سنجیدہ اور ذہین جستجو میں کامیاب ہوں.

آزاد معاشروں سے آج مقید معاشرے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں،علم و فلسفہ اور سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی سے ہم سب فائدہ اٹھا رہے ہیں ۔وہ ممالک جہاں فری مارکیٹ کیپٹلزم رائج ہے ان کی خوشحالی اس دنیا میں نمایاں اور سب سے بڑھ کر ہے۔ جن ممالک میں فری مارکیٹ کیپٹلزم کے بجائے ریاست یا امراء یا سٹیٹس کو کی مقید معیشت ہے وہاں بھی خوشحالی صنعتی انقلاب سے پہلے کے عہد سے کئی گنا اس لئے زائد ہے کہ سٹیٹس کو کی اجارہ دارانہ معیشت میں مقید معاشرے علم و فلسفہ اور سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور اٹھا رہے ہیں ۔ آئیے اس پورے منظر کو زیر نظر مضمون " انسانی ترقی کے چند زاویے" میں دیکھتے ہیں۔

انسانی ترقی کے چند امید افروز زاویے (73)

ہم جس دور میں رہ رہے ہیں یہ مایوسی پھیلانے والے قنوطیت پسندوں کے لئے مثالی ہے - ایک طرف داعش کی خونخواری ، بوکوحرام ، شباب، القاعدہ وغیرہ کی شکل میں اسلامی شدت پسندی ...برما ، سری لنکا میں بدھسٹ دہشت گردی ...فلسطین میں یہودی شدت پسندی ... اور بھارت میں شیو سینا ، اور آر ایس ایس کی شکل میں ابھرتی ہوئی ہندو مذہبی رجعت پسندی .... ان سب کی لہریں ہمارے اخبارات کی شہ سرخی بنتی رہتی ہیں ، تو دوسری طرف یمن میں سعودی جارحیت ،شام و عراق کے تنازعہ میں مغربی ممالک اورروس کی بمباری میں سویلین ہلاکتیں ، یوکرین پر روسی جارحیت ، کشمیر کا عرصہ سے جاری بحران ، اور مسئلہ فلسطین کے کسی معقول حل سے اجتناب ہماری رجائیت پسندی پر ضرب لگا رہی ہے — مگر اکثر اوقات، جب ہم سات ارب (193 ممالک) سے زائد دنیا کی آبادی کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم پورا منظر دیکھنے کے بجائے محض چند قابل تشویش مسائل پر اٹک جاتے ہیں اور باقی تمام خوشنما حقائق ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہیں—

سابق امریکی صدر بل کلنٹن نے ایک بار کہا تھا ." ہیڈلائنز پر نہیں بلکہ ٹرینڈ لائن پر غور کرنا چاہیے" ہم عموماً دنیا کو میڈیا کی نظر سے دیکھتے ہیں ، اور میڈیا دنیا کو ہیڈ لائنز کی نظر سے دکھایا ہے- میڈیا کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک منظر میں نقائص نکالتا ہے-اور جب وہ نقائص دور ہو

جاتے ہیں تو حیران کن طور پر ان کی ہیڈ لائنز بھی سامنے نہیں آتی یا بلند آہنگ نشر نہیں کی جاتی- مثال کے طور پر اس چیز کی تو خبر بنتی ہے کہ دوران سیلاب فلاں بند ٹوٹنے سے اتنا نقصان ہوا جبکہ یہ خبر بنتی ہی نہیں کہ فلاں بند کو بچا کر اتنے نقصان سے لوگوں کو محفوظ کر لیا گیا - اس لئے کہتے ہیں کہ اخبار کے ساتھ ساتھ کتاب بھی ضروری ہے - اخبار ہیڈ لائنز دکھاتی ہے تو کتاب ٹرینڈ لائن کا پتا دیتی ہے، یوں ذہن کو متوازن رکھنے میں بہت آسانی ہوتی ہے-

میں رجائیت پسند اور ارتقاء پسند ہوں اور میں نے امید کی یہ دولت خود فریبی سے نہیں کمائی بلکہ تاریخ نے مجھے یہ سمجھایا ہے کہ ہم تاریخ کے سب سے بہتر دور میں رہ رہے ہیں- کیسے ؟ آیئے چند جھلکیاں ملاحضہ فرمائیں کہ گزشتہ تین صدیوں میں ہماری دنیا ایک مثبت اور انسان دوست سمت میں کتنی تیز رفتاری سے بدلی ہے - یاد رہے کہ دیئے گئے ہر چارٹ کے آخر میں اس کا حوالہ بھی دیا گیا ہے –

بچوں کی شرح اموات میں کمی...پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کی شرح اموات میں نمایاں کمی آئی ہے جیسا کہ شکل نمبر 1 سے ظاہر ہے - سنہ ۱۸۰۰ میں اموات کی یہ شرح تنتالیس عشاریہ تین فیصد تھی تو سنہ ۱۹۵۰ میں یہ شرح کم ہو کر انیس عشاریہ پانچ فیصد ہو گئی ہے ، سنہ ۱۹۹۰ میں سات عشاریہ چار فیصد تو آج سے دو سال قبل ۲۰۱۳ میں پوری دنیا کی بنیاد پر یہ شرح محض تین عشاریہ چار فیصد ریکارڈ کی گئی - اموات میں اس کمی کی بنیادی وجہ طب کی جدید سہولیات اور ادویات کی صنعت کا ترقی یافتہ ہونا ہے -
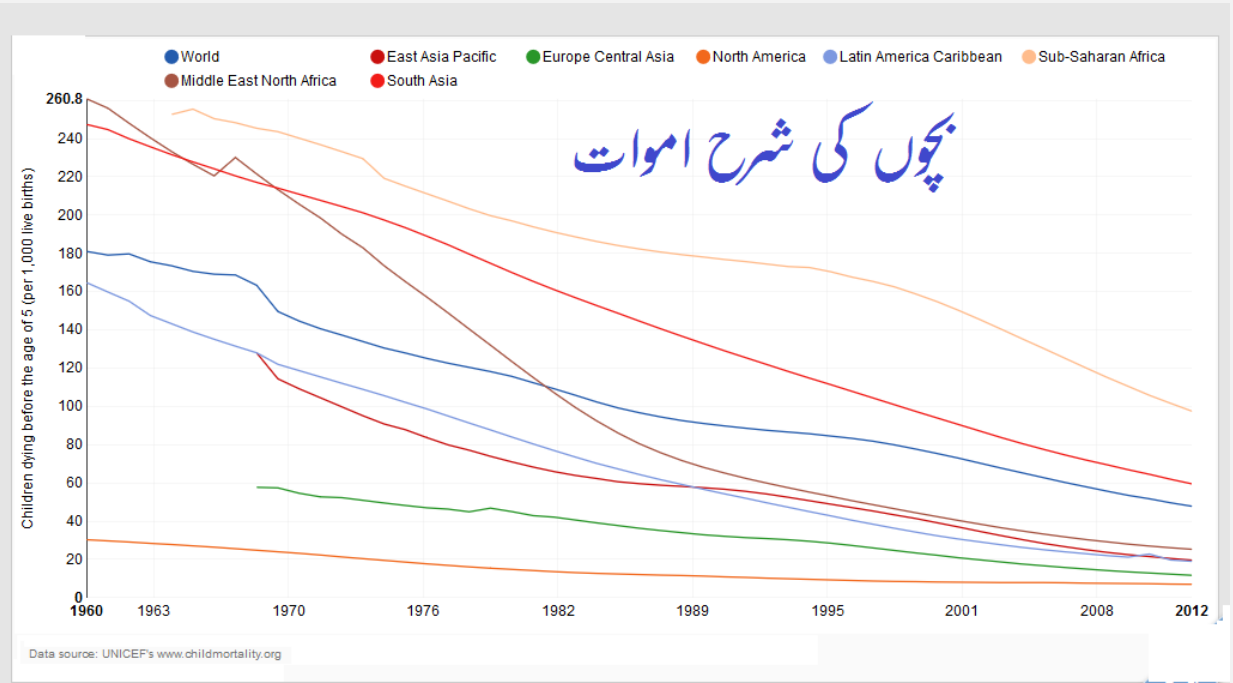
متوقع عمر ... اسی طرح پوری دنیا میں تمام افراد کی اوسط متوقع عمر میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے - سنہ 1820 میں یہ شرح محض 29 تھی ، 1900 میں یہ بڑھ کر 34 فیصد ہوئی تو 2001 میں یہ تیزی سے بڑھتے ہوئے چھیاسٹھ عشاریہ چھ فیصد تک پہنچ چکی ہے - چارٹ نمبر 02 سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس میں اب بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے- اس تبدیلی کی بنیادی وجوہات میں اہم ترین سائنس دانوں کی انتھک محنت ، طب کی جدید سہولیات اور ادویات کی صنعت کا ترقی یافتہ و اختراع پسند ہونا ہے-

	Africa	Americas	Asia	Europe	Former Soviet Union	Oceania	Global average (a)
Period when earliest health transition in region began	1920s	1820s or 1830s	1870s-1890s	1770s	1890s or 1900s	1860s or 1870s	
Life expectancy before health transition	26.4	34.8	27.5	34.3	29	22.5 (b)	
1800				33.3		excluded (c)	
1820				35.6		excluded (c)	29
1850		35.1		36.3			
1870		35.1		36.2		34.7	29.7
1900		41	28	42.7		47.6	
1913		45.1	28.1	46.8	34.2-38.6	51	34.1
1950	35.6	58.4	41.6	64.7	56.1	63.4	48
1973	46.9	66	57.5	70.9	68.9	68.2	60
1990	52.9	70.8	64.5	74.2	69.1	72.8	
2001	50.5	73.2	67.1	76.8	66.6	74.6	66.6

Reference: James C. Riley (2005) – Estimates of Regional and Global Life Expectancy, 1800–2001. Issue Population and Development Review. Population and Development Review. Volume 31, Issue 3, pages 537–543, September 2005.

دوران زچگی ماؤں کی اموات...دوران زچگی ماؤں کی اموات کی شرح میں بہت زیادہ کمی ہوئی ہے - اگر ہم پوری دنیا کے حاصل شدہ (available) اعدادوشمار کو ایک نظر دیکھیں تو ہمیں 1990 میں یہ شرح 400 اموات فی ایک لاکھ زچگی کے کیسز میں نظر آتی ہے جو 2012 میں کم ہو کر 210 ہو جاتی ہے اور ان میں مسلسل کمی آرہی ہے - اسی طرح پاکستان کے اعدادوشمار کو بھی دیکھا جائے جو ذیل میں شکل نمبر 03 میں دکھائے گئے ہیں، تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ سنہ 1990 میں کل ایک لاکھ زچگی کے کیسز میں اوسط 400 مائیں وفات پا گئی تھیں جن کی تعداد 2013 میں کم ہو کر 170 ہو جاتی ہے - اس کمی کی بنیادی وجہ بھی جدید ٹیکنالوجی کا پوری دنیا میں پھیلاؤ ہے جس سے مملکت پاکستان کی عوام بھی مستفیظ ہو رہے ہیں -
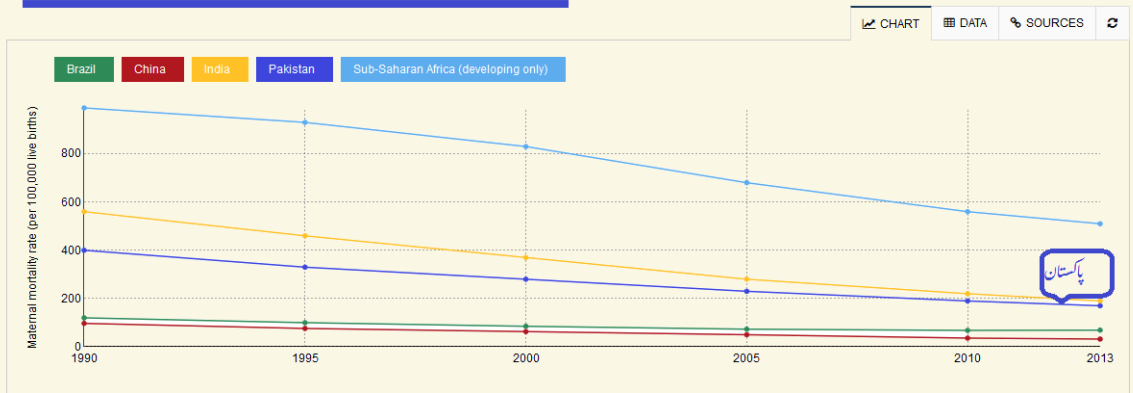
فی کس خوراک.. ہم اپنے بزرگوں سے زیادہ خوراک کھا رہے ہیں ،اور یہ اضافہ کسی ایک یا چند خاص ممالک میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں ریکارڈ کیا گیا ہے - سنہ 1960 میں پوری دنیا کی اوسط شرح خوراک فی کس 2150 Kcal تھی , جو 2010 میں بڑھ کر kcal 2798 ہو گئی ہے. اور اس میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے - یہ اضافہ صرف ترقی یافتہ ممالک میں نہیں دیکھا گیا بلکہ ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ سمیت تمام ممالک نے اس انسانی ترقی کا فائدہ اٹھایا ہے- شکل نمبر 04 اس ٹرینڈ لائن کو پوری دنیا ، ایشیا ، افریقہ ، امریکہ اور یورپ کے تناظر میں دکھایا گیا ہے-

شکل نمبر ٠٤
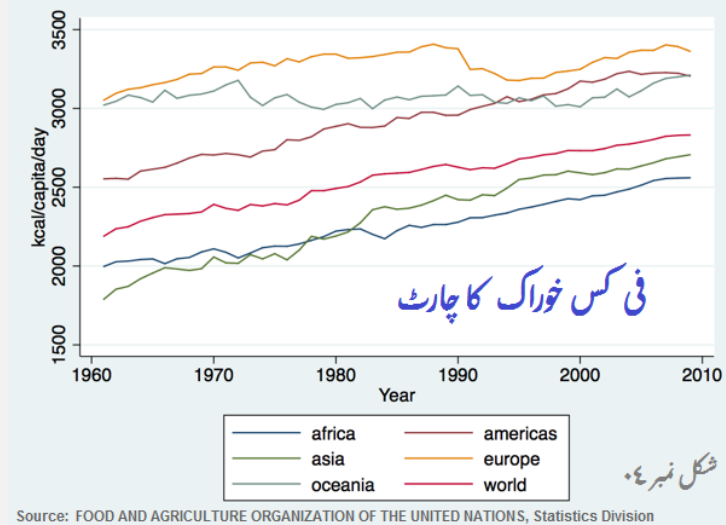
ہر شخص کے لئے روزانہ کی بنیاد پر ایک مخصوص مقدار میں کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے- 1991 میں پوری دنیا کے ایک ملین افراد میں سے 1025 افراد ایسے تھے جنھیں اپنی ضرورت سے کم کھانا ملتا تھا. جبکہ 2013 میں یہ تعداد کم ہو کر 805 رہ گئی ہے - اگر ایشیا میں مرتب کردہ اعدادوشمار کا تجزیہ کیا جائے تو تو ہمیں 1991 میں ایک ملین افراد میں سے اوسطا 743 ایسے افراد ملتے ہیں جو اپنی بنیادی ضرورت سے کم غذا حاصل کر رہے تھے جبکہ 2013 یہ تعداد کم ہو کر 526 رہ گئی ہے ، اور ہمیں مل کر اس تعداد کو صفر کرنا ہے-

آیئے اس حوالے سے پاکستان کا بھی جائزہ لیتے ہیں - سنہ 1990 میں 26.4 فیصد پاکستانی غذا کی کمی کا شکار تھے تو 2010 میں یہ تعداد کم ہو کر 19.9 فیصد رہ گئی ہے - یقیناً یہ 20 فیصد بھی بہت زیاد ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ہر 100 افراد میں سے 20 افراد ایسے ہیں جو اپنی بنیادی ضرورت سے کم غذا کھا رہے ہیں - ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم دنیا کی ان ترقی یافتہ اقوام سے بھی سیکھیں جنھوں نے اس مسئلہ کو تقریبا ختم یا انتہائی حد تک کم کر دیا ہے-

قحط کے باب میں بھی صنعتی انقلاب کے بعد نمایاں کمی آئی ہے ، واقعہ یہ ہے کہ وہ تمام معاشرے جہاں سیاست سماج اور معیشت میں لبرل تصورات رائج ہیں جیسے سیاست میں جمہوریت ، سماج میں میڈیا کی آزادی اور تنوع پسندی ،اور معیشت میں مارکیٹ کا غیر استحصالی نظام ، وہاں قحط کے خطرات معدوم ہو چکے ہیں – قحط جیسے مسائل اب صرف وہاں پائے جاتے ہیں جہاں یا تو قبائلی تمدن اور خانہ جنگی پائی جاتی ہے جیسے افریقہ کے بعض علاقے سوڈان، ایتھوپیا وغیرہ یا جہاں باقاعدہ سے جنگ چھڑی ہوئی ہے جیسے یمن شام و داعش کے زیر قبضہ عراق ، یا وہ بند سماج جہاں آزاد مارکیٹ کی پہنچ ہی نہیں جیسے شمالی کوریا جہاں اوسط ہر دس سال میں ایک قحط آتا ہے–

Osamu Saito (2010) – Climate and Famine in Historic Japan: A Very Long-Term Perspective. In Satomi Kurosu, Tommy Bengtsson and Cameron Campbell [Eds.] (2010) – Demographic Responses to Economic and Environmental Crises. Reitaku University.
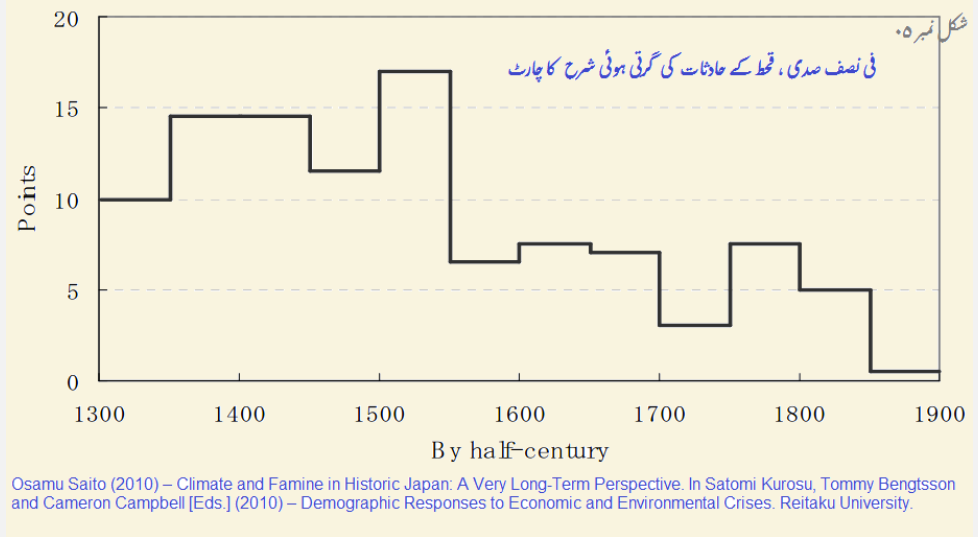
غربت... اگر ذیل میں دیئے گئے چارٹ نمبر چھ کو غور سے دیکھا جائے جس میں 1820 سے اب تک شرح غربت کی شماریات کو گراف کی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اٹھارہ سو بیس میں شرح غربت چوراسی فیصد تھی جو کم ہو کر آج دو ہزار پندرہ میں محض دس فیصد رہ گئی ہے - یاد رہے کہ یہ شماریاتی اعداد و شمار ایک عشاریہ دو پانچ ڈالر قوت خرید کے اعتبار سے ترتیب دیئے گئے ہیں جنکی

تفصیل چارٹ کے آخر میں دیئے گئے حوالہ سے سمجھی جا سکتی ہے
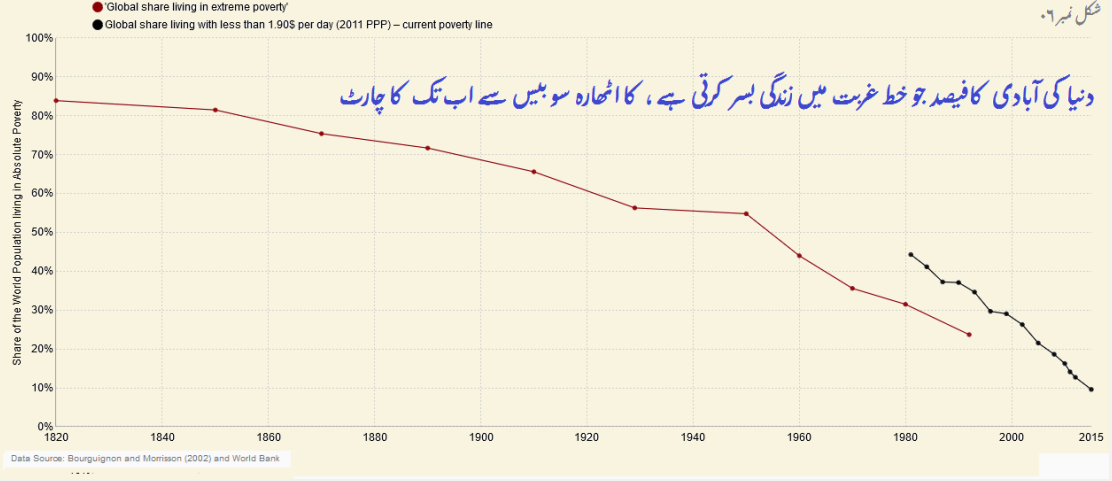
شرح خواندگی .. ایک وقت تھا جب تعلیم پر ایک خاص طبقہ کی اجارہ داری تھی اہل مغرب میں کلیسا تو اہل ہند میں برہمن - چونکہ ذرائع پیداوار کے استعمال میں تعلیم کا کوئی مصرف نہ تھا اس لئے عوام کا تعلیم سے متعلق رجحان انتہائی کم تھا - یہ صنعتی انقلاب کی برکت ہے جب ذرائع پیداوار کے استعمال میں تعلیم کو مرکزی اہمیت ملی اور علم پر مبنی معیشت کو فروغ ملا - یوں آج کا ترقی پسند فلسفہ یہ ہے کہ تعلیم کے بغیر سیاسی سماجی اور معاشی ترقی ناممکن ہے جبکہ زرعی عہد (یا اس سے بھی پہلے کے عہد) میں اس طرح کے باقاعدہ تصور کا کوئی سراغ نہیں ملتا-

اگر ہم ان اعدادوشمار کا بغور مطالعہ کریں جو شماریاتی اور معاشی سائنس کے مؤرخین نے ترتیب دیا ہے تو ہمیں اٹھارہ سو بیس میں پوری دنیا میں خواندگی کی اوسط شرح بارہ فیصد ملتی ہے جیسا کہ شکل نمبر 12 سے ظاہر ہے جبکہ دو ہزار دس میں یہ شرح پوری دنیا کے لئے 83 فیصد ہو جاتی ہے - اسی طرح جب ہم پاکستان کے تناظر میں ان اعدادوشمار کا مطالعہ کرتے ہیں تو انیس سو ستتر میں ہمیں سو میں سے 77 لوگ ایسے ملتے ہیں جو پرائمری تعلیم سے محروم تھے جبکہ آج دو ہزار دس میں 42 فیصد لوگ ایسے ہیں جنھوں نے پرائمری تعلیم حاصل نہیں کی - یہ بیالیس فیصد کا عدد یقینا غیر تسلی بخش ہے مگر انیس سو ستتر کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو نسبتا مثبت تبدیلی ہم دیکھ سکتے ہیں–
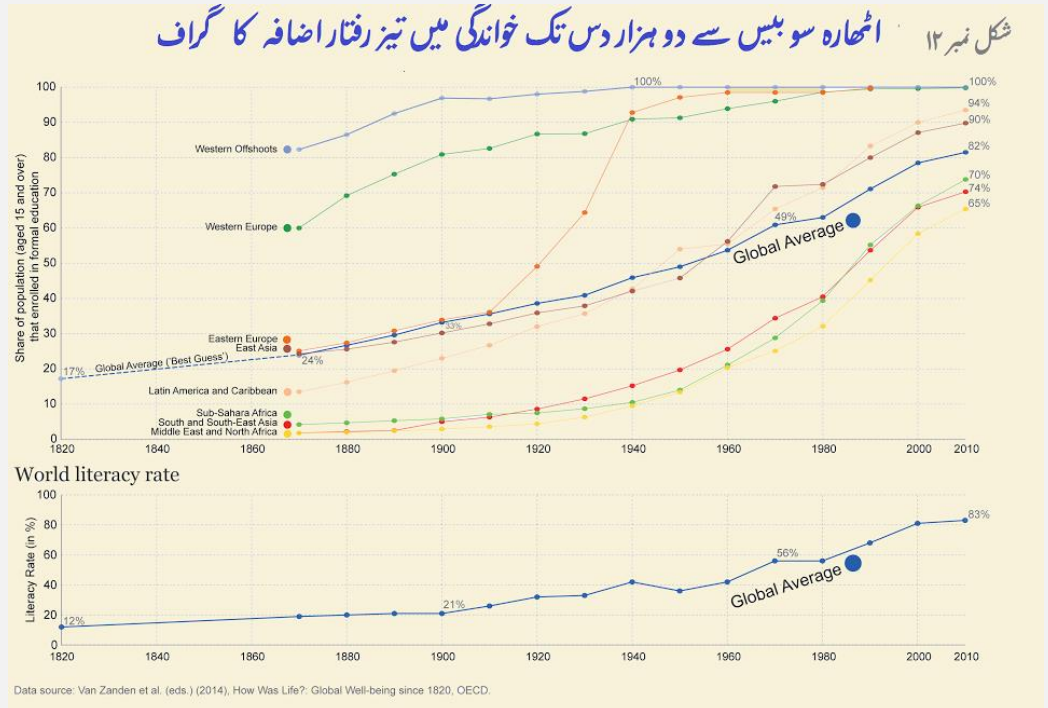
اسی طرح **انسانی صلاحیتوں میں ترقی** (ہیومن ڈویلپمنٹ انڈکس) کی شماریات کو ہم دیکھیں تو ترقی کا یہی رجحان ہمیں یہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے - ترقی یافتہ دنیا میں یہ انڈکس بلندی پر اس لئے ہے کہ وہاں ہر فرد کو تعلیمی سرگرمیوں کے بعد عملی زندگی میں بھی صلاحیتوں و قابلیتوں کے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے اس لئے ان میں مزید نشودنما ہوتی رہتی ہے - جبکہ غریب و ترقی پزیر معاشروں کے عملی میدانوں میں مواقع جہاں ایک طرف محدود ہیں تو دوسری طرف ان میں مواقع کی مساوات بھی نہیں پائی جاتی یوں انسانی ترقی میں نشودنما سست رفتار ضرور ہے مگر اس میں جمود یا تنزلی ہر گز نہیں - پاکستان کی مثال اگر لیں تو یہاں کا ہیومن ڈویلپمنٹ انڈکس 1980 میں زیرو عشاریہ تین پانچ چھ (0.356) تھا جو بڑھ کر دو ہزار بارہ میں زیرو عشاریہ پانچ تین پانچ (0.535) ہو گیا - یہ بھی یقینا تسلی بخش عدد ہر گز نہیں مگر انیس سو اسی کی نسبت حوصلہ افزا بہتری ہے- ضرورت اس بات کی ہے کہ انسانی ترقی کے بنیادی اسباب پر توجہ مرکوز کی جائے -

سوشل ویلفئیر یا سماجی بہبود پر سرکاری اخراجات ... جوں جوں ایک ملک معاشی ترقی کرتا جاتا ہے ،اس کے پاس اپنی عوام کی فلاح و بہبود کے لئے وسائل بھی بڑھتے جاتے ہیں جنھوں ریاست ٹیکس کی مد میں وصول کرتی ہے ،چارٹ نمبر سات میں ہم ترقی یافتہ ممالک کے اپنے شہریوں کی بہبود پر اخراجات کا ٹرینڈ دیکھ سکتے ہیں جس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے -یاد رہے کہ سماجی بہبود کے یہ وسائل اور ان کا بہترین انتظام ، اب تک کی تاریخ میں ، محض فری مارکیٹ یا دوسرے الفاظ میں سرمایہ دارانہ معیشت میں ہی ممکن ہو پایا ہے - اسی طرح کا ٹرینڈ مگر حجم میں کم ،ہمیں تمام ترقی پزیر معیشتوں میں بھی ملتا ہے جبکہ جدید لبرل جمہوری ریاست کے قیام سے پہلے آمریت اور سماجی بہبود کا کوئی باقاعدہ رشتہ ہمیں نہیں ملتا -

ترقی یافتہ ممالک اپنے ملک کے ضرورت مندوں کی کل قومی پیداوار کے حساب سے کتنی کیش کی شکل میں مدد کرتے ہیں... اٹھارہ سو اسی سے انیس سو پچانوے تک کا چارٹ... سوشل ویلفیئر ماڈل
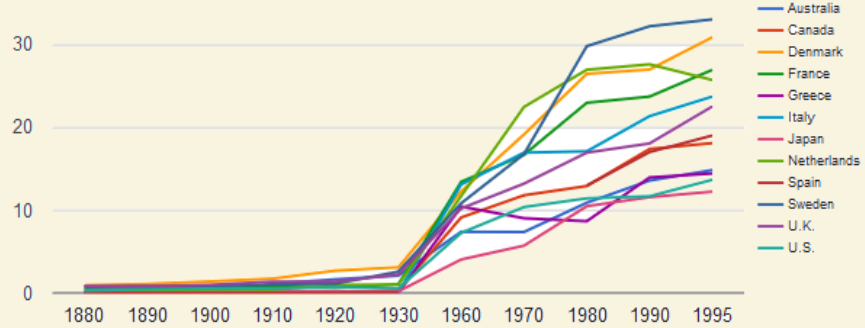
Reference: Lindert (2004) – Growing Public: Social Spending and Economic Growth since the Eighteenth Century: Vol. 1 – The Story. Cambridge University Press.

چارٹ نمبر ۰۷

سول وارز... ان میں کمی آئی ہے جیسا کہ شکل نمبر 10 سے ظاہر ہے ، چونکہ سول وارز میں کمی آئی ہے اسی حساب سے ان میں ہلاکتوں کی تعداد میں بھی نمایاں کمی آئی ہے - حقیقت یہ ہے کہ انسانی جان کے معاملہ میں دور جدید کا انسان اپنے آباؤاجداد کی نسبت زیادہ حساس ہے ، دوسری طرف ترقی یافتہ لبرل میڈیا کے باعث ہمیں دنیا کے کسی کونے میں بھی سویلین پر کوئی ظلم ہوتا نظر آتا ہے تو ہم فورا رسپانس کرتے ہیں (یہ اور بات کہ بعض لوگ رسپانس کرنے میں بھی اپنے پرائے کی تفریق کرتے ہیں مگر دنیا کا عمومی مزاج انسان دوست ہے)

شکل نمبر ۱۰

بیسویں صدی میں سول وار کے درمیان فی ایک لاکھ (۱۰۰،۰۰۰) ہلاکتیں

Reference: Acemoglu, Daron. The world our grandchildren will inherit: the rights revolution and beyond. No. w17994. National Bureau of Economic Research, 2012.
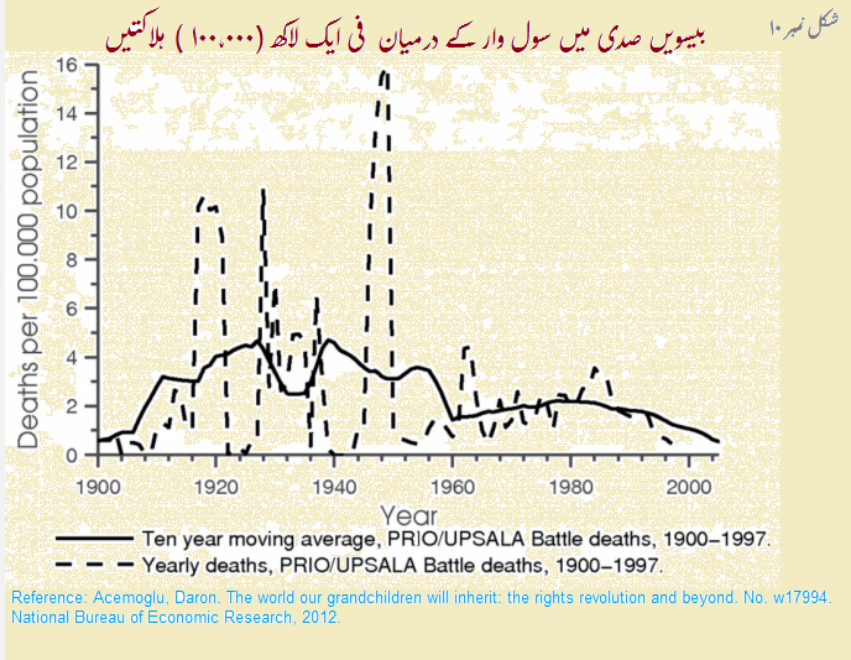
جنگوں میں شدید کمی ... شکل نمبر آٹھ انتہائی مفصل اور بہت زیادہ غور طلب ہے ، ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ جنگ کے دورانیہ ، اور جنگوں کی تعداد میں بہت زیادہ کمی آئی ہے - اور انسانی شعور میں مزید ترقی کے ساتھ ہم جنگ کے موزی مرض سے یقینا چھٹکارا پا لیں گے - خاص بات یہ ہے کہ جنگوں سے متعلق انسانی ضمیر بہت حساس ہوتا جا رہا ہے (اس تبدیلی کو صرف وہ لوگ محسوس کر سکتے ہیں جنہوں نے تاریخ کے گوشوں کی مفصل سیر کی ہو) جس کے باعث اگر دو ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے تو جدید و متمدن انسانی ضمیر کی حساسیت کے سبب ان میں جلد ہی جنگ بندی کروا دی جاتی ہے -

دوسری اہم بات معیشت میں گلوبلائزیشن کی ہے ، اب تمام ممالک کے مفادات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں - مثال کے طور پر اب چین و امریکہ میں باوجود مسابقت کے جنگ کے امکانات صفر ہیں جس کی بنیادی وجہ دونوں ممالک کے باہم منسلک معاشی مفاد ہیں جبکہ معاشی گلوبلائزیشن سے پہلے تاریخ میں دو بڑی طاقتوں کی باہم جنگ عام بات رہی ہے - امریکہ کی عالمی طاقت بننے سے پہلے یہ مقام برطانیہ کو حاصل تھا مگر امریکہ و برطانیہ باہم جڑے معاشی مفادات کے سبب تصادم سے محفوظ رہے ، یہی سب کچھ امریکہ و چین کی باہم مسابقت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے ، چین اپنا راستہ بنا رہا ہے بغیر کسی عالمی تصادم کے ، اور حالیہ آئی ایم ایف کی عالمی کرنسی میں چینی کرنسی کی شمولیت اس بات کا واضح اظہار ہے کہ اسے عالمی طاقتوں کی مدد بدستور حاصل ہے-

جنگوں میں انسانی ہلاکتوں کی شرح میں انتہائی کمی ... جیسا کہ شکل نمبر 9 سے ظاہر ہے کہ جنگوں میں فوجی و سول ہلاکتوں کی شرح میں انتہائی کمی آئی ہے - وہ دن دور نہیں جب یہ شرح صفر کو چھو جائے گی ، اس سلسلے میں ہمیں عالمی ضمیر کو زیادہ سے زیادہ باشعور اور حساس بنانا ہو گا -
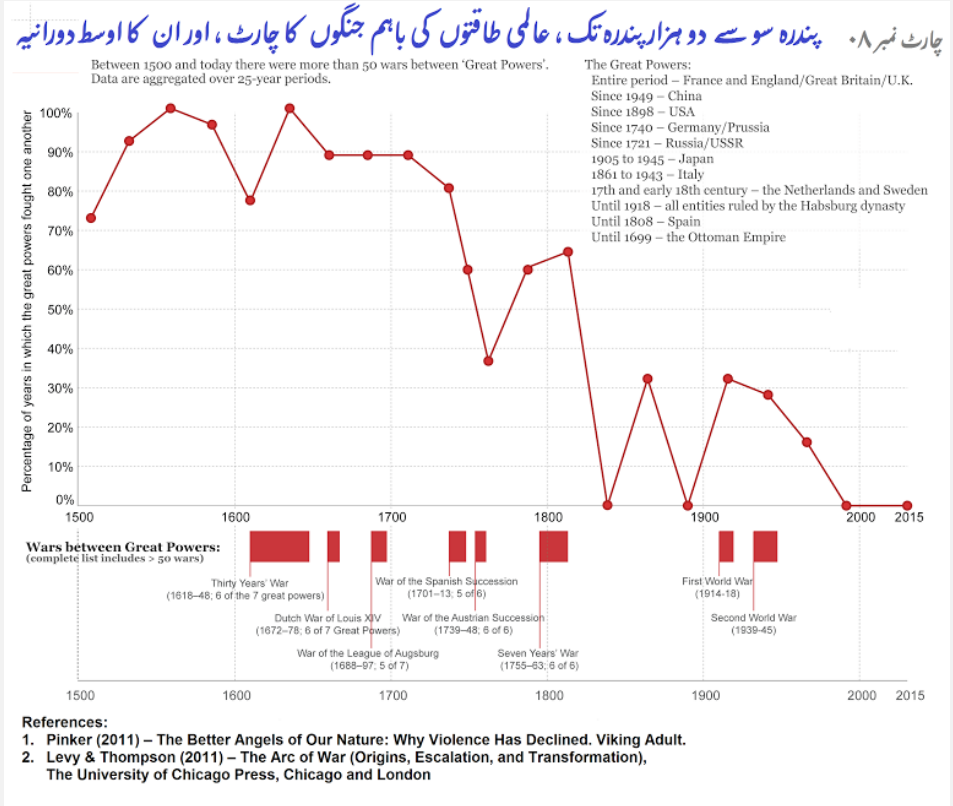
شکل نمبر ۹۔
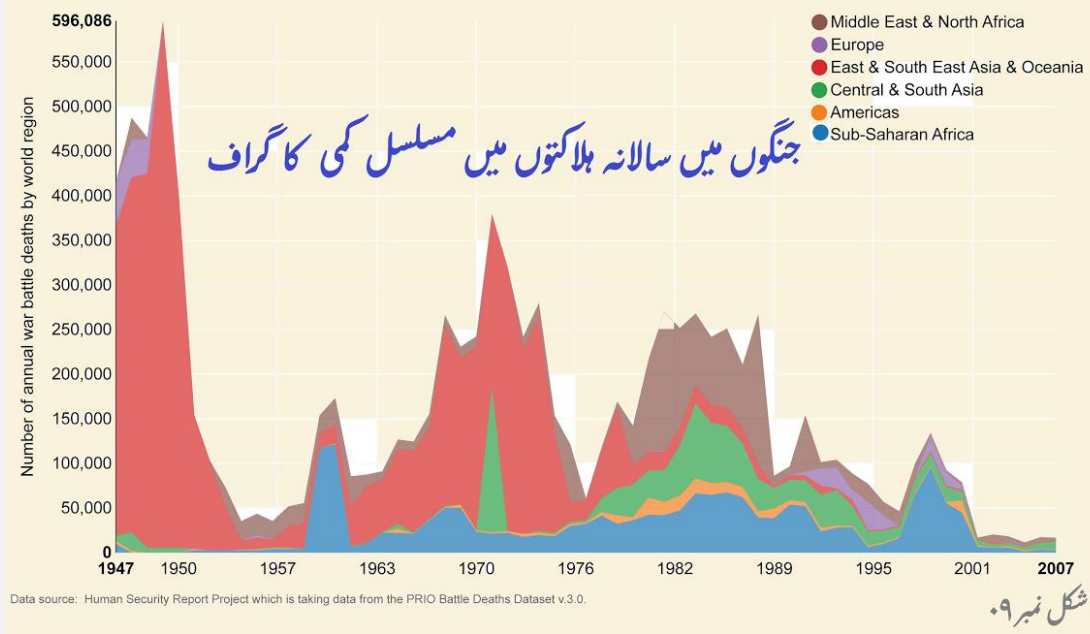
جمہوریتیں... جمہوریت عبارت ہے سول حکمرانی سے - عوام کو سیاسی انتظام میں واحد اور مرکزی اہمیت دینے کا نام جمہوریت ہے - اس سلسلے میں تاریخ ہمارے من کو خوشی و فخر سے سرشار کر دیتی ہے کہ دنیا میں جمہوریت کی ثقافت تیزی سے پھیل رہی ہے - سنہ اٹھارہ سو میں دنیا میں کوئی ایک ملک بھی جمہوریت کی رائج تعریف کی رو سے جمہوری نہیں تھا ، اٹھارہ سو دس سے چھیالیس کے درمیان یہ تعداد ایک ہی رہی - 1875 میں پانچ ممالک کی سیاست جمہوری ہوئی ، 1910 میں گیارہ ، 1947 میں 23 ، اور دو ہزار نو میں ان کی تعداد ستاسی ہو چکی ہے ، اس تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جو یقیناً آزادی پسندوں کی مسلسل اور انتھک جدوجہد کا ثمر ہے - اس وقت آمریتوں کی تعداد 47 سے کم ہے ، جبکہ باقی ممالک جمہوریت اور آمریت کے بیچ کے کسی بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں اور جلد ہی وہاں بھی شہریت کی مساوات تمام دنیا کے انسان دوستوں کا سر فخر سے بلند کر دے گی - اس سلسلے کا چارٹ ہم شکل نمبر گیارہ میں ٹرینڈ کی صورت میں ملاحظہ کر سکتے ہیں-

یہ صرف چند شعبوں کے اعداد و شمار اور گراف ہیں — ہم سیاست سماج اور معیشت کے مزید پہلوؤں میں بھی نکھرتا حسن دیکھ سکتے ہیں جیسا کہ سالانہ کتابوں اور ریسرچ پیپرز کی اشاعت میں بے حد اضافہ ،اور بچوں اور عورتوں کے خلاف تشدد کے واقعات میں جیسے موضوعات شامل ہیں ۔
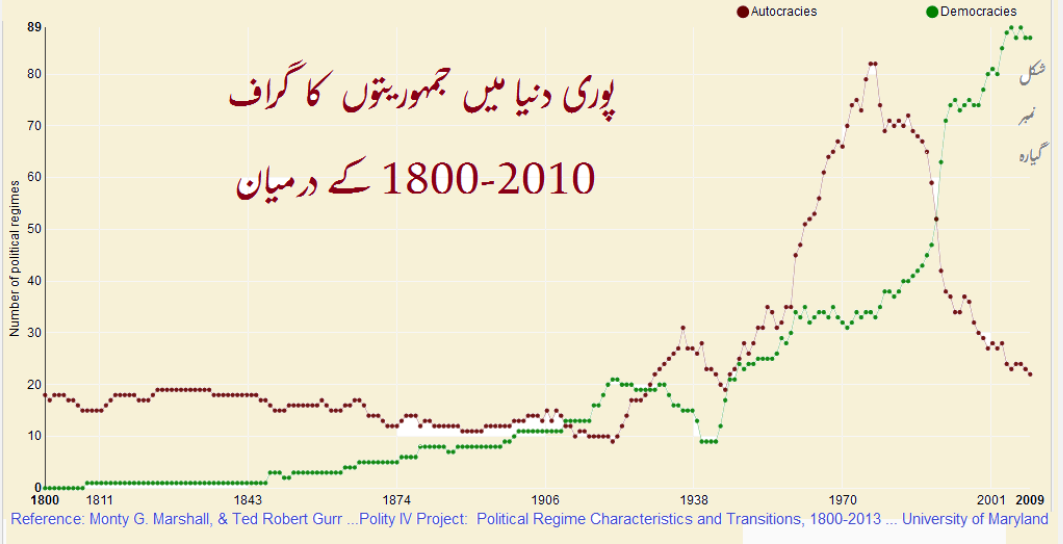
چونکہ ہم ان حقائق سے واقف نہیں - دنیا کی تاریخ ہمارا موضوع نہیں - ہم نے کبھی یہ سوچنا گوارا نہیں کیا کہ کن مسائل اور پیچیدگیوں سے گزر کر تاریخ آج اس عہد تک پہنچی ہے - اور چونکہ ہمارا دنیا کی اس ترقی اور جاری ارتقائی عمل میں کوئی حصہ نہیں ، اور ہمارے ہاں دانشورانہ سوچ کا مطلب "عہد کے فکری و عملی منظر میں کیڑے نکالنا ،ماضی کا رومان پیدا کرنا، اور مستقبل سے متعلق ناامیدی پیدا" کرنا ہے ، اس لئے ہم نے اپنی نسل کو ناامیدی اور دنیا کو شک اور سازش کی نظر سے دیکھنے کے ذہنی بخار میں مبتلا کر دیا ہے - ترقی کے عمل میں جو افراد یا اقوام اپنا حصہ ڈالتی ہیں وہ اس کی قدر بھی کرتی ہیں ، اور جنہیں سب بنا بنایا اور پکا پکایا مل جائے وہ اس کی قدر تو کجا اسے ڈھا دینے اور تباہ کرنے کے درپے ہو جاتی ہیں - ہمیں حقیقی معنوں میں باشعور بننا ہو گا-

ذرا تصور کریں کہ جب ہم سب اور دنیا کے تمام معاشرے آزاد ہو گئے تو نسل انسانی کے لئے کتنے معجزے برپا ہوں گے۔ہمارا مستقبل خوشحالی کے مواقع میں ہے۔ اور یہ خوشحالی آزادی پر جبر سے نہیں بلکہ جبر پر آزادی کی برتری سے آئے گی۔

اب یہ کہنا کہ جن ممالک میں اجارہ داری کی معیشت اور فری مارکیٹ کیپیٹل ازم نہیں وہاں کی غربت کی وجہ بھی فری مارکیٹ کیپیٹلزم ہے اسی طرح ہے جیسے یہ کہا جائے کہ جہاں آمریت کے سبب سیاسی جبر ہے وہاں اس جبر کی وجہ بھی جمہوری ممالک کی جمہوریت ہے۔جہاں

انسانی حقوق کی پاسداری نہیں اس کی وجہ بنیادی انسانی حقوق کا چارٹر ہے۔جہاں تنوع پسندی نہیں وہاں اس کی وجہ تنوع پسند معاشروں کی تنوع پسند اقدار ہیں۔ .... نہیں ..... سسٹم کی کامیابی و ناکامی کا نحصار اس سسٹم کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے میں ہے۔غریب ملکوں کے معاشی مسائل کی وجہ فری مارکیٹ نہیں بلکہ فری مارکیٹ کا نہ ہونا ہے۔(74) جہاں سیاسی آمریت ہے وہاں جمہوریت کی ضرورت ہے نہ کہ ترقی یافتہ ممالک کی جمہوریت کو اس کا الزام دیا جائے اور تنوع پسندی تنوع پسند اقدار کو قبول کرنے سے آئے گی۔

3۔آزادی جب تک عملی طور پر رواج نہ پائے ،اس وقت تک اس کا پوٹینشل (مخفی صلاحیت) کھل کر سامنے نہیں آتا۔

غلامی آقاوں کو عزیز ہوتی ہے۔اس میں ان کا محض معاشرتی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی آمریت کی تسکین بھی حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے انسانوں پر حکومت کرنا آمریت زدہ ذہنوں کے لئے مرغوب ہوتا ہے - اسی لئے ایک انسان کی آزادی کو خطرہ کسی اور چیز سے نہیں بلکہ دوسرے (شریر) انسانوں سے ہی ہوتا ہے۔مگر حیران کن بات یہ بھی ہے کہ غلاموں کی ایک بڑی تعداد کے لئے غلامی پرکشش بھی ہو سکتی ہے جب تک کہ وہ خود آزادی کے جوہر کو دریافت اور اس کی مخفی صلاحیتوں کا مفید استعمال نہیں دیکھ لیتے۔

مثال کے طور پر جب اٹھارہویں صدی کے آخر میں اور انیسویں صدی کے شروع میں لبرل ازم بطور معاشی،سیاسی اور سماجی تحریک کے مغربی ممالک میں انسانی آزادیوں اور مساوات وانصاف کی جدوجہد میں مصروف تھا اس نے غلامی کی ہر قسم (Serfdom) کی مذمت کی کسانوں پر ظلم کی مذمت کی۔اور انسان دوستی (humanism) کی تبلیغ کی تو افریقی نسل کے امریکی غلاموں کی ایک بڑی تعداد کو یہ تصور پسند نہ آیا۔جب غلامی کا خاتمہ ہو گیا اور غلام رکھنا ایک جرم قرار پایا تو غلاموں کی اکثریت اپنے آقاوں کو چھوڑ کر جانے پر تیار نہیں تھی۔انہوں نے یہ شکنجے (Bondage) توڑنا پسند نہ کئے وہ کہتے تھے کہ ہمارے آقاوں نے ہماری رہائش لباس اور خوراک کی ذمہ داری اٹھائی ہوئی ہے۔یہ سب ہمیں ہماری محنت کے بدلے مفت دستیاب ہیں۔آزاد ہوکر یہ سب ذمہ داریاں ہمیں ہی اٹھانی پڑیں گی ،ہم اپنی خوراک لباس اور گھر کا خود انتظام کیسے پائیں گے؟ یوں ہم تباہ و برباد ہوجائینگے۔مگر ہم نے دیکھا کہ ایسا نہیں ہوا۔معاشی آزادی نے ان کے معیار زندگی کو تباہ نہیں کیا بلکہ مزیدسے مزید بہتر بنایا ہے۔انہیں کم درجے کے معیار زندگی سے نکال کر کامیاب کارجو (Entrepreneur) اور بہترین کارپوریٹ مینجر بنادیا ہے۔(75)

خوراک لباس اور گھر کے بدلے غلامی کی کشش آج ہمارے معاشروں میں بھی پائی جاتی ہے۔فرق یہ ہے کہ ہم میں سے چند لوگ جاگیرداروں کی نہیں بیوروکریٹس کی غلامی پسند کرنے لگے ہیں۔اس کی بڑی وجہ آزادی کے پوٹینشل (مخفی قوت) کی دریافت اور اس کے نتائج کے حصول میں ناکامی ہے۔ یہ لوگ ریاستی جبر کو جاگیرداری پر ترجیح دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ شاید آزادی بہت مشکل ذمہ داری ہے۔یہ اپنی ذمہ داری اٹھانے سے ڈرتے ہیں اور اپنی بنیادی ضروریات کے بدلے خود کو گروی رکھنے پر تیار ہیں۔جس طرح جاگیرداری عہد کے آقا بدتر اور ظالم تھے وہی

نفسیات ریاست کے پاور سٹرکچر میں پائی جاتی ہے۔آقا کو حکم عدولی پسند نہیں تھی چاہے وہ غلط تھا یا درست،اسی طرح ریاست بھی حکم عدولی کو غداری سمجھتی ہے۔ریاست کی غلامی اور آقا کی غلامی میں کوئی زیادہ فرق نہیں ،ماسوائے اس کے کہ ریاست کی غلامی کو "غلامی (یا غلاموں) میں مساوات " سمجھ کر پوجا جاتا ہے اور اس پر حب الوطنی کی چادر چڑھی ہوتی ہے.

غلامی کو جو جواز عہدغلامی میں دیے جاتے تھے،وہی جواز اب امراء و بادشاہ کی بجائے ریاستی آمریت کے حق میں دیئیے جاتے ہیں۔ ان میں سے دو جواز آج بھی بہت مقبول ہیں اور عموماً رائے عامہ کا حصہ ہیں۔

1۔ صنعتی انقلاب اور لبرل اداروں کے قیام سے پہلے اعلی درجہ کے فلسفی حضرات،مختلف مذاہب کے بانی و مجددین اور سماجی علوم کے ماہرین جو اس وقت بھی لوگوں سے محبت اور ہمدردی کا دعوی کرتے تھے (اور آج فری مارکیٹ کیپیٹلزم سے نفرت کرتے ہیں) اس جواز پر تقریباً متفق تھے کہ غلامی ناگزیر ہے ۔ان کا خیال تھا کہ کچھ لوگ غلامی کی فطرت پر پیدا ہوتے ہیں،انہیں آزادی راس نہیں۔ان میں یہ صلاحیت و قابلیت ہی نہیں کہ اپنی آزادی کی خود نگہبانی کرسکیں۔اس لیے ضروری ہے کہ مراعات یافتہ طبقہ ان پر حکومت کرے۔انہیں راہ راست پر رکھنے کے لیے ان پر جبر کرے۔ان سے کام لے۔اور بدلے میں انکی بہتر خوراک،لباس اور رہائش کا بندوبست کرے۔ ان کا سارا زور اس اخلاقیات کی تبلیغ پر رہا کہ آخر کس طرح کم سے کم تشدد سے غلاموں سے کام لیا جائے ۔

آج بھی یہ طبقات ریاستی جبر کے حق میں یہی دلائل دیتے نظر اتے ہیں کہ جناب عوام کی اکثریت غیر ذمہ دار اور ناقابل اعتبار ہے۔آزادی میں یہ تباہی و فساد پیدا کرتے ہیں ۔ اس لیے ضروری ہے کہ ریاست کی طاقت ان پر جبر کرے اور انہیں راہ راست پر قائم رکھے ۔کیا یہ حیر ت کی بات نہیں کہ معاشی امور میں دانشوروں کا یہ طبقہ آج بھی اپنی اسی پرانی رائے پر قائم ہے اگرچہ وہ سیاسی و سماجی زندگی میں آزادی کا کسی حدتک قائل ہوگیا ہے ۔ اس دانشور طبقہ میں ایک بڑی تعداد کا یہ خیال بھی ہے کہ بقیہ انسان ان کے جیسے ذہین ، خودمختار ، قابل بھروسہ، خود داراور خود کفیل نہیں حالانکہ ریاستی بیانیہ سے جڑے ان دانشوروں کی اکثریت خود مقابلہ کی معیشت میں ناکام رہتی ہے اس لیے ریاست کی کاسہ لیسی کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کرتی ہے ۔

2۔دوسرا جواز یہ مہیا کیا جاتا تھا کہ جناب آزاد لیبر غلام لیبر(Slave labor)کی نسبت کم تخلیقی (Productive)ہوتی ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ لیبر کو پلان کیا جائے اور کنٹرول کیا جائے۔یہی دلیل آج کینزین معیشت (State led capitalism) میں بھی دی جاتی ہے کہ جب ریاست لیبر اور سرمایہ کوخود پلان (plan) کرتی ہے تو اس سے دونوں کی تخلیقی صلاحیتیں (Productivities) بڑھ جاتی ہیں۔ یاد رہے کہ جب برطانیہ میں غلامی کی خاتمے کی بحث چل رہی تھی تو غلامی کے حامی کہتے تھے کہ اگر غلامی ختم ہو گی تو ہماری قومی پیداوار (جی ڈی پی) میں ۲۵ فیصد کمی آجائے گی وہ ابتدا میں تو اس جواز کی بنیاد پر علمی و پارلیمانی بحث جیت گئے مگر کلاسیکل لبرلز نے

مکالمہ جاری رکھا- کچھ عرصہ بعد غلامی کا خاتمہ ہوا اور نتیجے میں پروڈکٹوٹی میں بجائے کمی کے ....، اس میں اضافہ ہوا، جی ڈی پی پھلی پھولی اور برطانیہ کی آزاد افرادی قوت نے اس کی ترقی و خوشحالی میں بڑھ چڑھ کر حصہ ڈالا-

حقیقت یہ ہے کہ یہ تصور پہلے بھی غلط تھا اور اب بھی غلط ہے۔غلام اس عہد میں صرف اتنا کام کرتا تھا جتنا اس کے سیلف انٹرسٹ (شخصی مفاد) کی ضرورت تھی۔اگر وہ زیادہ محنت کرتا تو کیا زیادہ محنت سے حاصل ہونے زائد ویلیو سے وہ مستفید ہو سکتا تھا؟ ہرگز نہیں،اس کی محنت محض بنیادی ضروریات کی تکمیل اور سزا (Punishment) سے بچنے تک محدود تھی۔جب اسی غلام کو آزادی حاصل ہوئی تو اس کی تخلیقی صلاحیت میں اضافہ ہوا۔کیوں؟ اس لئے کہ اب وہ اپنے سیلف انٹرسٹ کی جستجو میں آزاد اور خودمختار ہو گیا تھا - کیونکہ اب محنت سے حاصل ہونے والی زائد ویلیو اس کے سیلف انٹرسٹ (شخصی مفادات) کو مزید سے مزید محنت کی ترغیب دینے لگی۔اب وہ اس زائد ویلیو کو محفوظ (save) اور خرچ کرکے اپنے معیار زندگی کو بہتر بنا سکتا تھا۔اب وہ ذاتی یا دوسرے دوست احباب یا بنک میں جمع شدہ رقم (Saving)سے ایک کامیاب کارجو (Entrepreneur) بن سکتا تھا۔

سیلف انٹرسٹ، پروڈکٹوٹی اور غلامی وآزادی کا یہ تعلق محض زرعی عہد تک محدود نہیں تھا۔کیمونسٹ سوویت یونین اور کیمونسٹ چین میں لیبر کی پروڈکٹوٹی اس کی مثال ہے۔چین میں جب کیمونسٹ معیشت رائج تھی تو لیبر کی پروڈکٹوٹی انتہائی کم تھی اور جب چین میں مارکیٹ اکانومی قائم ہوئی تو لیبر کی پروڈکٹوٹی میں اضافہ ہوا۔اس کے اسباب کیمونسٹ معیشت میں بھی وہی تھے جو زرعی عہد کی غلامی (Serfdom) میں ہم نے برطانیہ میں دیکھے۔(76)

اس سوال پربھی غور کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ آخر غلامی سے کیا مراد ہے؟ غلامی سے مراد غیر رضاکارانہ خدمت گزاری () Involuntary Servitudeہے۔ایک غلام وہ ہے جو اپنے اعمال و افعال میں اپنے آزاد ارادے اور شخصی نظام اقدار کو pursue کرنے کے بجائے کسی دوسرے فرد یا ادارے یا مطلق العنان ریاست کی مرضی (will) اورآمرانہ (objective) نظام اقدار (جو کسی صاحب اقتدار یا مراعات یافتہ طبقہ یا سیاسدانوں کی متعین کردہ ویلیو) کاغیر رضاکارانہ بنیادوں پر پابند ہوتا ہے۔کسی سے وہ آزادانہ اشتراک کرسکتا ہے اور نہ ہی تعاون و تبادلہ ۔وہ جنرل ول یا سوسائٹی کی عام روش (Common will) کا پابند ہوتا ہے۔یا مطلق العنان طاقتوں کی مرضی (will) کا –

آزادی کا متضاد غلامی ہے۔جتنے دلائل آزادی کے حق میں دیے جاتے ہیں ان سے بالکل ہی متضاد جواز غلامی کے حق میں فراہم کئے جاتے ہیں۔ اپنی منزل و مقاصد کے تعین و حصول (Self Determination) کے حق کا نہ ہونا غلامی ہےاپنی زندگی کے اچھے برے اعمال کا ذمہ دار(Self-responsibility) کا نہ ہوناغلامی ہے۔

جس طرح ہم سب ایک دوسرے کی آزادیوں کے ثمرات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اسی طرح غلامی کے بھیانک نتائج بھی محض غلام کے لئے نہیں بلکہ پوری نسل انسانی کے لیے انتہائی تباہ کن ہوتے ہیں۔ اس سے معاشرے مستقبل کے بہترین امکانات سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اگر غلامی کا خاتمہ نہ ہوگیا ہوتا تو گزشتہ 150 سالوں کی ترقی ناممکن تھی۔

جس طرح علم میں ترقی کی اول و اہم ضرورت ذہنی آزادی اور اظہار رائے کی آزادی ہے۔اسی طرح زندگی کے ہر شعبے میں آزادی کی اہمیت مسلم ہے۔جسے ہم علم کی دنیا میں مکالمہ کہتے ہیں اسے معیشت کی دنیا میں مقابلہ(Competition) کہا جاتا ہے۔ جس طرح ہمیں یقین ہے کہ علم میں آزادی علم میں نت نئے آئیڈیاز سامنے لاتی ہے ویسے ہی مقابلہ کی معیشت ایک کارجو (Entrepreneur) کے لئے نت نئے تخلیقی میدان سامنے لاتی ہے۔جس طرح ہم اظہار رائے اور علم کی آزادی کے لئے خطرہ "سٹیٹس کو" کو سمجھتے ہیں اسی طرح ہم معاشی آزادی کے لیے بھی سب سے بڑا خطرہ سٹیٹس کو اور اجارہ دار طبقات کو سمجھتے ہیں۔جس طرح ہم کہتے ہیں کہ علم کی ثقافت کو ریاستی مفادات سے ماورا ہونا چاہیے ویسے ہی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ معاشی آزادی کی ثقافت کو ریاستی مفادات سے ماورا ہونا چاہیے۔جس طرح ہمیں مکالمہ کی ثقافت میں یہ یقین ہوتا ہے کہ اس سے بہتر خیال نظریہ اور فکر کو پزیرائی ملتی ہے اور غلطیاں وخامیاں دور ہوتی جاتی ہیں ویسے ہی ہمارا خیال مقابلہ کی مارکیٹ سے متعلق ہے کہ اس سے بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں۔اور اشیاء و خدمات میں خامیاں و خرابیاں دور ہوتی جاتی ہیں اور صارفین کے معیار زندگی میں اضافہ ہوتا جا جاتا ہے۔ جس طرح ہم کہتے ہیں کہ علم کی تخلیق اور سرگرمیوں میں ریاست کا کوئی کردار نہیں ، یہ اس کا میدان ہی نہیں ، اس لئے ریاست اس سے دور رہے ورنہ اس سے مسائل پیدا ہوں گے – یہی بات سوسائٹی اور معیشت کے بارے میں بھی درست اور حتمی ہے کہ باوجود صحیح نیت اور ارادے کے حکومتی سرگرمیاں ان دونوں شعبوں میں مسائل ہی پیدا کرتی ہیں -

حقیقت یہ ہے کہ مارکیٹ کی آزادی سے انکار کے تمام جواز آزادی کی جملہ اقسام کے انکار کے لیے بھی جواز ثابت ہوسکتے ہیں۔ شخصی آزادی اس چیز کا نام نہیں کہ سیاست و ثقافت میں تو ایک فرد کو آزادی کو تسلیم کیا جائے مگر معشیت میں اسے اس سے محروم کر دیا جائے -

فری مارکیٹ پر اعتراضات کا بڑا سبب آزادی پر یقین و اعتماد نہ ہونا ہے اور آزادی پر یقین و اعتبار نہ ہونے کی وجہ انسان کی ظاہری و مخفی صلاحیتوں و قابلیتوں پر یقین و اعتماد کا نہ ہونا ہے۔فری مارکیٹ کے مخالفین مساوات پر نہیں بلکہ مراعات یافتگی اور اجارہ دار طبقہ کی آمریت کو پسند کرتے ہیں تاکہ عام شہریوں کی نجی زندگی اور ان کی پسند و ناپسند (choices) کو پلان کیا جائے اور انہیں کنٹرول کیا جائے۔

سٹیٹس کو سے کیا مراد ہے ؟

"سٹیٹس کو" چند مخصوص طبقات کا اجارہ دارانہ اور مراعات یافتگی پر مبنی ایسا سیاسی ،سماجی ، اور معاشی نظام ہے جو یا تو تبدیلی (ارتقاء و انقلاب) کا منکر ہوتا ہے یا تبدیلی کو محض ایک مخصوص سانچہ ہی میں پسند کرتا ہے ...ایسا سانچہ جس میں ان طبقات کے مخصوص اجارہ دارانہ اور پیوستہ مفادات کو کوئی زد نہ پہنچے --- یاد رہے کہ سٹیٹس کو قوتیں تبدیلی کی دشمن نہیں ہوتیں جیسا کہ عام طور پر سوچا اور سمجھا جاتا ھے ، انکی پہلی ترجیح یقیناً جمود ہے جس میں ان کے پیوستہ مفاد محفوظ رہتے ہیں مگر جب تبدیلی ناگزیر ہو جائے تو یہ قوتیں اپنے مفاد کا خیال رکھتے ہوئے ایک مخصوص سانچہ میں ہی تبدیلی کو پسند کرتی اور اس میں معاون بھی ہوتی ہیں۔

پاکستان میں سٹیٹس کو کے نمائندہ پانچ طبقات ہیں

فوج (ملٹری اسٹیبلشمنٹ)

ملا

جاگیر دار

سیٹھ سرمایہ دار

بیورو کریسی

یہ سب قلعہ بند قوتیں ہیں جن کی پرورش ان تاریخی جرائم نے کی ہے جن میں ہمارے بعض رہنما بھی شریک تھے --- ان قلعہ بند قوتوں کی سرغنہ طاقت ملٹری اسٹیبلشمنٹ اور ملا ہیں جو ان کی حفاظت ایک فصیل کی طرح کرتے ہیں ... ملٹری اسٹیبلشمنٹ کے پاس جبر و قبضہ کی طاقت ھے جس کو اس نے سیاسی عدم استحکام کے لئے زیادہ سے زیادہ قائم کر رکھا ھے جب کہ ملا کے پاس سماجی و نفسیاتی ہتھیار ہیں، جب وہ لوگوں کو اپنا تعارف ان کے مذہب کے نمائندے اور خدائی ترجمان کے طور پر کروا کر "سٹیٹس کو" کو مذہبی جواز بھی فراہم کرتا ہے اور لوگوں کے اذہان کا استحصال کر کے پیوستہ مفاد کے نظام میں استحکام بھی لاتا ھے۔

پاکستان میں سرمایہ داروں کی دو اقسام ہیں ۔

(الف) وہ سرمایہ دار جن کا سرمایہ اور اس میں افزائش خالصتا مقابلہ پر مبنی مارکیٹ اور ٹیلنٹ و ذہانت پر ہے وہ سٹیٹس کو کا حصہ نہیں ، بلکہ تبدیلی پسند ہیں ---ان لوگوں کو آزاد مارکیٹ ، نمائندہ سیاست ، اور آزاد سماج سے کوئی خطرہ نہیں ۔ یہ چاہتے ہیں کہ معیشت پر بھی سیاست کا اثر و رسوخ کم ہو تاکہ وہ آزادانہ ، بغیر کسی غیر ضروری رکاوٹوں کے اپنے کاروبار کو وسعت دے سکیں جس سے لوگوں کو روزگار بھی حاصل ہو اور پاکستان میں علم و ٹیکنالوجی کی ثقافت پیدا ہو۔ سرمایہ داروں کی یہی وہ قسم ہے جس نے مغرب میں بھی سٹیٹس کو کا پھندا توڑنے میں مرکزی کردار ادا کیا ---کیوں کہ ان کی دولت اور اس میں افزائش مارکیٹ کے مواقع اور صحت مندانہ مقابلہ پر مبنی قابلیت و ذہانت کا نتیجہ تھی ، اور وہ چاہتے تھے کہ مارکیٹ و سماج پر سیاست کا غلبہ ختم ہو تاکہ ان کا کاروبار آگے بڑھے ، انہوں نے عوامی نمائندگی

پر مبنی سیاسی عمل (جمہوریت) کی بھرپور اور موثر حمایت کی تاکہ کاروباری عمل میں سیاست کا صحت مندانہ تعاون حاصل ہو اور ریاست کاروبار و روزگار کو سہولیات بہم پہنچائے ، نہ کہ اجارہ دار قوتوں کو سپورٹ کرے ---. یاد رہے کہ بادشاہت و آمریت میں بادشاہ و آمر اپنے دوستوں ، رشتہ داروں اور خوشامد پرست لوگوں میں کسی ایک ملک یا اس کے ایک حصہ کی مارکیٹ کی اجارہ داری تقسیم کرتے تھے ، جیسا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مثال ہے کہ اسے سلطنت برطانیہ نے ہندوستانی مارکیٹ پر اجارہ داری تفویض کی تھی

(ب) سرمایہ داروں کا وہ طبقہ جن کا نفع اور اس میں افزائش سیاسی مدد اور اجارہ داری سے قائم ہے وہ سٹیٹس کو کی معاشی طاقت ہیں ... ان کا مقصد یا تو یہ ہے کہ تبدیلی کا عمل رک جائے یا پھر یہ تبدیلی ایک مخصوص سانچہ میں ہو ، ایسا سانچہ جس میں ان کے پیوستہ مفادات کو نہ صرف تحفظ ملے بلکہ اس میں وسعت اور پھیلاؤ حاصل ہو --- پاکستان میں الیکشن کے دوران ہم عموماً دیکھتے ہیں کہ قومی و صوبائی اسمبلی کے امیدواروں کو مالی مدد ان کے حلقے کے کاروباری افراد اور جاگیر دار عناصر سے ملتی ہے ، جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کامیابی کے بعد ممبر اسمبلی ان کے مفادات کے تحفظ میں ان کا ساتھی و مددگار ہو

ایوب خان کا دور پاکستانی تاریخ میں وہ پہلا باقاعدہ دور ہے جس میں ریاست نے اپنے منظور نظر بزنس مین حضرات کو سماج سے منتخب کیا ، انہیں مارکیٹ کے ایک مخصوص حصہ کی نہ صرف اجارہ داری دی بلکہ معاشی عمل میں ان کی بھرپور مدد کی جس کی بدولت پاکستان میں سیاست و معیشت کے مابین براہ راست تعلق کی ایسی روایت پیدا ہوئی جو اب تک یہاں رائج ہے ---. اسی طرح ضیا اور مشرف کے ادوار میں بھی مارکیٹ کی صلاحیت و قابلیت پر توجہ نہیں دی گئی بلکہ بہترین معاشی کارکردگی کے نام پر مخصوص افراد اور سیکٹرز (Sectors) کو نوازا گیا

یہاں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ ہر مارشل لاء نے اجارہ داری کی معیشت کو نہ صرف مضبوط کیا بلکہ "سٹیٹس کو" کے مابین پیوستہ مفادات کا گٹھ جوڑ زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوا ہے --- اور اب بھی اگر پاکستان میں خدانخواستہ مارشل لاء نافذ ہوتا ھے تو ہم پاکستان کے ان سیٹھوں کو خوشیاں مناتے اور مٹھائیاں تقسیم کرتے پائیں گے ---. یہ بھی یاد رہے کہ جمہوری ادوار میں بھی سیاست کو معیشت سے آزاد کرانے میں کوئی خاص دلچسپی نظر نہیں آتی جس کی ایک وجہ ان کی حکومت کا محدود دورانیہ ھے تو دوسری طرف ہمیں ہر جمہوری دور "جمہوریت پسندوں اور سٹیٹس کو" کے محافظوں کے درمیان تصادم کی داستان سناتا ہے جس میں جمہوریت پسندوں کو یا تو وقت نہیں ملا یا انہوں نے بھی اپنے اقتدار کو استحکام دینے کی کوشش میں "سٹیٹس کو" سے مفاہمت کی پالیسی اختیار کی

جاگیردار مسلم عہد سلاطین اور نوآبادیاتی دور کی وراثتوں میں سے ایک ایسی وراثت ہیں جو عہد جدید کے صنعتی تمدن میں ہمیں پسماندہ رکھنے میں سب سے زیادہ شریک ہیں --- ان کا خمیر قدیم زرعی تمدن سے ہے ، اسی لئے ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ سماج اور اس کے ذریعہ پیداوار کو زیادہ سے زیادہ روایتی، پسماندہ اور زرعی رکھا جائے ---..سیاست ان کا سب سے موثر ہتھیار ہے جسے یہ عہد سلاطین سے اب تک

استعمال کرتے آرہے ہیں ، ان کی جاگیر انکی سیاسی طاقت ہے ، یہ پسماندہ ذہن اور قبضہ کی نفسیات کے حامل عناصر پاکستانی سیاست کو خوشامد پرست اور پسماندہ رکھنے کے بہت زیادہ ذمہ دار ہیں ۔ --- حیران کن بات یہ بھی ہے کہ ہر سماجی تبدیلی کی مخالفت ایک طرف ملا مذہب کی من پسند تشریحات سے کرتا ہے تو دوسری طرف زرعی ثقافت کے شعبدہ باز ، یہ جاگیردار ، اسے ثقافت دشمن قرار دے کر اس کے دشمن ہو جاتے ہیں

کیا ہمارے لئے اس میں سبق نہیں کہ جنگ عظیم دوم کے بعد جن ممالک نے (خاص طور پر مشرقی ایشیا) ترقی یافتہ ملک کا درجہ حاصل کیا ہے ، انہوں نے سب سے پہلے زرعی اصلاحات سے جاگیر داروں کو غیر موثر کیا اور پھر آگے بڑھے --- دوسری طرف یورپ میں بھی جاگیر داروں کو کمزور کرنے کے لئے دو ذرائع استعمال کئے گئے

ایک، زرعی اصلاحات کا راستہ ، دوم ، برطانیہ جیسے ممالک نے آزاد مارکیٹ کا نظام متعارف کروایا جس میں وہ لارڈز قائم رہے جنھوں نے بدلتے ہوئے سماج میں ترقی پسندانہ کردار ادا کیا، چاہے سیاست میں یا معیشت میں ---جبکہ باقی لارڈ حضرات کو ترقی پسند سرمایہ داروں نے صحت مند اور نفع بخش مقابلہ کے میدان میں شکست دے کر منظر سے ہٹا دیا یا وہ قرضوں کے بوجھ تلے ہی دم توڑ کر مر گئے ---.. پاکستان میں اگر ہم زرعی اصلاحات میں سیاسی و سماجی طور پر کامیاب نہیں ہو سکتے تو ہم دوسرا راستہ اختیار کر سکتے ہیں ، مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ مارکیٹ کو زیادہ سے زیادہ آزاد اور مؤثر بنایا جائے جو محنت ، صلاحیت ، قابلیت ، جدت ، اور تخلیقی صلاحیت (پروڈکٹوٹی) کو عام کرے ---.دوم معیشت پر سیاست کے غیر ضروری اثر و رسوخ کا خاتمہ کرنا ہو گا

پاکستان میں جب بھی مارشل لا آیا ہے تو ہم نے ہر فوجی آمر کے اردگرد جاگیر داروں ، اجارہ داری کے بھوکے سرمایہ داروں ، اور بیوروکریٹ و ٹیکنو کریٹس کا جمگھٹا پایا ہے ... یہ پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ ٹیکنو کریٹس بھی جمہوریت و لبرل ازم سے وفادار نہیں رہے ، انہوں نے بھی اعلیٰ عہدوں اور پرتعیش مراعات کے لئے ان اقدار سے منہ موڑا جو انہوں نے لبرل و سیکولر علوم کی تحصیل کے دوران سیکھے --- اسی طرح وہ بیورو کریٹ بھی آمریت کے مددگار کا کردار ادا کرنے میں نہیں ہچکچائے جنھوں نے سول سرونٹ (عوام کا خادم) کا حلف اٹھاتے ہوئے اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ وہ پاکستان کے آئین کے وفادار رہیں گے اور اس سے کبھی بھی انحراف نہیں کریں گے ---یہ بیورو کریٹس ہوں یا ٹیکنو کریٹس یہ لبرل و سیکولر علوم سے بہرہ مند ہوتے ہیں ، مگر پاکستان میں لبرل و سیکولر اقدار کے فروغ میں انہوں نے کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا

پاکستان "سٹیٹس کو" کے شکنجے میں بند ہے ، جب تک یہ شکنجہ موجود ہے روشن خیالی اور انسانی آزادیوں کے لئے معاون و مددگار سیاست ، معیشت ، اور سماجی اقدار کا پاکستان کا خواب تعبیر پانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا ---. جمہوریت دشمنی میں یہ قوتیں ایک دوسرے کا دست و بازو ہیں ، ہر آمر کے اردگرد انہی قوتوں کا جمگھٹا لگا ہوتا ہے ، اور ہمارے سماج کی خوشحالی و مسرت کے امکانات کے خلاف یہی

قوتیں سینہ سپر ہیں ۔ ۔۔۔ ان کو شکست دینے کے لئے ضروری ہے کہ جمہوریت میں تسلسل اور استحکام لایا جائے ، مقابلہ کی ثقافت پیدا کی جائے ، روشن خیال اور جستجو کو ابھارنے اور نکھار دینے والے علم کے لئے سرکاری بندوبست قائم کیا جائے اور دانشورانہ سطح پر مکالمہ کی فضا پیدا کی جائے۔

آزاد معاشرہ : آخر کیوں ضروری ہے ؟

سوسائٹی کوئی باقاعدہ نامیاتی وجود نہیں بلکہ انسانوں کا ایک ایسا مسکن ہے جو ان کے باہمی تعاون و تبادلہ (exchange and cooperation)، اعتماد (ٹرسٹ) ،سیلف انٹرسٹ (شخصی مفادات کی جستجو)، تقسیم محنت (ڈویژن آف لیبر)،مشترک اقدار ، روایات ، شناخت اور حفاظتی انتظام جیسی خوصیات کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے۔ آئیے اسے ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔

فرض کیا کہ ایک بستی ہے جس میں تقریباً 100افراد رہتے ہیں۔ یہ بستی دراصل ایک چھوٹا سا معاشرہ ہے،اگر اس بستی کے لوگ اپنے ارد گرد کی دوسری بستیوں سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق اور آمدورفت رکھتے ہیں تو اسے ہم اوپن سوسائٹی (کھلا معاشرہ) کہیں گے۔ جتنا باہمی تعلق زیادہ ہوگا اتنا ہی وہ سوسائٹی اوپن ہوگی۔ وہ سوسائٹی جو اپنے اردگرد کی دوسری بستیوں سے تعلق و آمدورفت نہیں رکھتی یا محدود رکھتی ہے اسے بند معاشرہ (closed society) کہتے ہیں۔

اس بستی کے قیام کی تین بڑی وجوہات درج ذیل ہیں۔

1۔ **تقسیم محنت (ڈویژن آف لیبر) یعنی محنت کی سوسائٹی میں مہارتوں اور رجحانات کی بنیاد پر رضاکارانہ اور فطری تقسیم** : ہم اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود نہیں پیدا کر سکتے۔انواع و اقسام کی خوراک،لباس،گھر اور ان گنت دوسری ضروریات و خواہشات کی بھرپور تکمیل کے لئے ہم سب کا باہمی انحصار لازمی ہے۔اس لیے اگر ایک فرد یا افراد کا ایک گروپ (کمپنی) کچھ پروڈیوس کرتا ہے تو وہ اپنی ذاتی ضرورت سے زائد ویلیو کو اپنی ضروریات و خواہشات کی دوسری اشیاء کے ساتھ تبادلہ کر لیتا ہے ۔بارٹر سسٹم میں اشیاء سے اشیاء یا اشیاء سے خدمات کا تبادلہ ہوتا ہے،جبکہ کرنسی سسٹم میں تبادلہ کی سہولت کے پیش نظر کرنسی کا استعمال ہوتا ہے۔

دونوں نظام چاہے وہ بارٹر سسٹم ہو یا کرنسی سسٹم ، آپ کی نجی پیداوار (یا گروپ میں پیداوار) کی ویلیو ہی سب سے اہم ہوتی ہے۔ جس چیز کی پیداوار لوگوں کی طلب کو زیادہ سے زیادہ سہولیات بہم پہنچائے یعنی راحت دے اس کی ویلیو زیادہ ہوگی۔اور جس چیز کی طلب کم ہوگی اس کی ویلیو بھی کم ہوگی کیونکہ اس کی لوگوں کو ضرورت بھی کم ہے ۔

تبادلے کی یہ ضرورت ہمیں مجبورکرتی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ایماندارانہ اور پر اعتماد تعاون کریں اور وہ چیز پیدا کریں ،جس کی دوسروں کو ضرورت ہے تاکہ اس کے بدلے ہم بھی اپنی ضروریات و خواہشات کی اشیاء و خدمات حاصل کرسکیں۔

2۔دفاع / حفاظت : ہمیں اندرونی و بیرونی دونوں قسم کے خطرات کا سامنا رہتا ہے یہ خطرات ہمیں اپنے معاشرے کے دوسرے افراد سے بھی ہوسکتے ہیں اور جنگلی جانوروں سے بھی۔ہمیں یہ بھی ڈر ہوتا ہے کہ کہیں کوئی بھی بیرونی قوت ہم پر حملہ نہ کردے اور ہم سے ہماری اشیاء یعنی جائیداد چھین نہ لے اور ہماری فیملی کے افراد کو ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنائے۔اس خطرہ کے سبب ہم سوسائٹی بناتے ہیں کہ مل کر ایک دوسرے کا تحفظ کریں گے۔اس سوسائٹی سے باہر کے افراد سے اپنے تحفظ کے لیے ہم فوج بناتے ہیں اور سوسائٹی کے اندر کے دیگر شر پسند افراد سے تحفظ کے لیے پولیس۔انصاف کی ضرورت میں عدالت کے لیے ہم عدالتی نظام قائم کرتے ہیں۔

ایک آزاد سوسائٹی میں تمام افراد کے حقوق برابر ہوتے ہیں۔کیونکہ سوسائٹی کی تشکیل میں سب کا حصہ برابر ہوتا ہے۔اس حقوق میں مساوات کو عموما طاقت کے ارتکاز سے خطرہ رہتا ہے سوسائٹی کا کوئی ایک فرد یا افراد کا ایک گروہ اگر دوسرے افراد سے طاقت ور ہوجائے تو اس میں دوسروں پر جبر و استحصال کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔سوسائٹی کے افراد کی آزادی و مساوات کو ایسی صورت میں طاقت (پاور) میں ارتکاز (Concentration of power) سے خطرہ ہوتا ہے۔اسی لیے ہم ایک قانونی نظام کی بنیاد رکھتے ہیں جو طاقت کے ارتکاز اور استحصال سے تمام افراد کا تحفظ کرے اور تنازعات کی صورت میں تمام فریقین کے حقوق کا تحفظ کرے اور اپنی عملداری میں سب پر نافذ ہو۔

سوسائٹی کے بہت سارے معاملات ایسے ہوتے ہیں جنہیں کوئی فرد اپنی انفرادی صلاحیت و قابلیت سے سرانجام نہیں دے سکتا جیسے سڑکوں کی تعمیر،پلوں کی تعمیر دوسرے ممالک سے بہتر تعلقات قائم رکھنا وغیرہ - ایک اور اہم کام اس بات کو یقینی بنانا بھی ہے کہ اجتماعی معاملات کو طے کرنے والے تمام سول و عسکری ادارے اپنا کام خوش اسلوبی سے سر انجام دے رہے ہیں یا نہیں اگر نہیں دے رہے تو ان میں احتساب کا نظام جاری رکھنا بھی اجتماعی ذمہ داری ہے — اس اجتماعی ذمہ داری کے لئے ہی ہم حکومت قائم کرتے ہیں جو عوام کے حق انتخاب سے قائم ہوتی اور عوام کے حضور جوابدہ ہوتی ہے۔

اسی طرح دوسرے معاشروں (societies) یا ممالک سے تعلقات قائم رکھنے کے لئے بھی ہم اسی سیاسی ادارے یعنی حکومت سے رجوع کرتے ہیں۔ جو اپنا ایک ذیلی ادارہ یعنی خارجہ امور کی وزارت قائم کرتی ہے جو اپنے اپنے فرائض کی بنیاد پر مزید ذیلی اداروں میں تحلیل ہو جاتی ہے

ہمیں انتظامیہ کی ضرورت ہوتی ہے جو حکومت اور عدلیہ کے فیصلوں پر عملدرآمد کروائے اور خود بھی اسی اخلاقیات (code of conduct) کی پابندی کرے جو عوام کے منتخب نمائندے عوام کے حق انتخاب کی نمائندگی میں ان کے لئے طے کریں.

یہ پولیس،فوج،عدلیہ،حکومت اور انتظامیہ وغیرہ سوسائٹی کے ادارے ہیں ان اداروں کو مجموعی طور ہم پر ریاست کا نام دیتے ہیں اور وہ تصورات جو مابعد الطبیعاتی (metaphysically) طور پر ان اداروں کے روز مرہ امور (Operations) میں بطور رہنما کام کرتے ہیں اسے ہم ریاستی بندوبست یا ریاستی بیانیہ کہتے ہیں۔لبرل ازم ایک ریاستی نظام یا بیانیہ (narrative) ہے جس کا دائرۂ کار انسان کی سیاسی سماجی اور معاشی زندگی میں شخصی آزادی ، حقوق اور مواقع میں مساوات ، اور انصاف پر مبنی رہنمائی فراہم کرنا ہے ۔

ان تمام اداروں کی متعین حدود ہیں- ان حدود سے باہر کی تمام سرگرمیاں افراد اور سوسائٹی کے باہمی تعلق سے وجود میں آتی ہیں۔تمام افراد آزاد ہیں کہ وہ رضاکارانہ بنیادوں پر ایک دوسرے سے تعاون و تبادلہ کریں جس کی بدولت ان کے درمیان گروپس یا کمیونٹیز (communities) یا تنظیمیں، جماعتیں اور کمپنیاں وغیرہ وجود میں آتی ہیں جنہیں مجموعی طور پر ہم سول سوسائٹی کہتے ہیں ۔ تمام شہری آزاد ہیں کہ وہ باہم انفرادی طور پر یا کسی گروپ کا ممبر بن کر اشیاء و خدمات کو پیدا کریں اور ان کا سوسائٹی کے اندر یا دیگر تمام سوسائٹیز سے تبادلہ کریں. وہ معاشی امور میں تمام انسانوں سے بلا تفریق تعاون و تبادلہ کی مد میں آزاد ہیں ، اسے فری مارکیٹ کیپیٹلزم کہتے ہیں — جو بالکل اسی طرح ہے جس طرح ہم کہتے ہیں کہ تمام افراد آزاد ہیں کہ وہ جو مذہب یا نظریہ یا طرز فکر و عمل قبول کریں اور اس کی پیروی کریں ،جسے ہم سیکولرازم کہتے ہیں۔

3۔ سوسائتی کے قیام میں تیسری اہم چیز **تفریح یعنی انٹرٹیمنٹ** ہے۔ادب،رقص موسیقی،کھیل، میلے ،تھیٹر،ڈرامے ،شادی بیاہ کی خوشیاں اور ان گنت ایسے اجتماعی پروگرام ہوتے ہیں، جو ہمیں مسرت دیتے ہیں۔ ہمارے باہمی تعلق کو وسیع اور خوشگوار بناتے ہیں۔اور ہمارے سماج کی رنگینی میں اضافہ لاتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ تفریح کے بغیر ایک سوسائٹی روکھی اور بے جان ہے۔ہر بڑی تہذیب اپنے جلو میں تفریح کے خوبصورت ومنفرد مظاہر رکھتی ہے۔یاد رہے کہ تفریح (Entertainment)کے یہ جملہ امکانات آزادی اور خوشحالی میں ہی پرورش پاتے ہیں۔

سوسائٹی شخصی اقدار پر قائم ہونی چاہئے ۔

لازم ہے کہ سوسائٹی کا بندوبست ایسا ہو کہ وہ ہر فرد کی انفرادیت اور شخصی حسن انتخاب (Personal Choices) کا احترام کرے۔ فرد اور معاشرے کا خوبصورت رشتہ اس وقت وجود میں آتا ہے جب معاشرہ افراد کے رضاکارانہ تعاون و اشتراک سے وجود میں آئے۔ جبر معاشرہ کے جوہر سے بغاوت کا نام ہے۔فرد اپنے انتخاب میں آزاد ہے اور اسے حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے آزاد تعاون (Cooperation) اور تعلق (Association) قائم کر سکے۔

اس صورت میں فرد کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرہ کی روایات کا احترام کرے۔اور معاشرے کے اداروں کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ فرد کے مفادات کو اپنی بنیادی ترجیح سمجھیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔فرد بغیر سوسائٹی کے کچھ نہیں تو سوسائٹی شہریوں کے بغیر بے نام و نشان ہے۔

ریاست عارضی ہوتی ہے مگر معاشرہ زیادہ مستقل ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر میرا شہر ملتان اپنے پہلے دن سے آج تک اپنی سماجی زندگی میں رواں دواں ہے مگر کتنی ہی قسم کی ریاستیں آئیں اور چلی گئیں۔فرد اور معاشرہ کا رشتہ دائمی ہے جبکہ ریاست اور فرد کے درمیان کمزور اور مجبوری کا رشتہ ہے۔ فرد اور معاشرے کا رشتہ مضبوط، رضاکارانہ اور win-win سچوئیشن یعنی باہمی مفادات پر مبنی ہوتا ہے جب کہ ریاست زیادہ تر جابرانہ یعنی فاشسٹ رجحانات کی مالک اور سٹیٹس کو کی نمائندگی کرتی ہے۔

ایک غیر متوازن سماج انسان دشمن ثابت ہوتا ہے -

جب سماج کا توازن بگڑ جاتا ہے تو نہ کسی کی آزادی محفوظ رہتی ہے نہ پراپرٹی،اور نہ ہی رائے،نہ فرد کی صلاحیتوں و قابلیتوں کے اظہار کے مواقع میسر آتے ہیں اور نہ ہی اسکی صحت مند اور بہترین صورت باقی رہتی ہے ۔اس لئے تمام افراد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی کی بقااور استحکام کے لئے سنجیدہ و مخلص رہیں اور خرابیوں کے خاتمہ کے لئے جدوجہد کریں.

لبرل سوسائٹی سے کیا مراد ہے ؟

ایسی سوسائٹی جو تمام افراد کے باہمی رضاکارانہ تعاون و تبادلہ سے وجود میں آئے اور اس میں خود تنظیمی کی صلاحیت پائی جاتی ہو اسے ہم لبرل یا فری سوسائٹی کہتے ہیں۔اس سوسائٹی کو صرف ایک ہی بڑا چیلنج درپیش ہوتا ہے وہ ہے طاقت کا ارتکاز (Concentration of – power)

طاقت کا ارتکاز سوسائٹی کو کیسے غیر متوازن کر دیتا ہے ؟

طاقت کی فطرت میں استحصال پایا جاتاہے۔طاقتور کے اندر عموما یہ رجحان ہوتا ہے کہ وہ اپنے سیلف انٹرسٹ (شخصی مفاد) کے حصول کے لئے تمام دیگر کم طاقتوروں یا کمزوروں پر جبر کرے تاکہ وہ اپنے سیلف انٹرسٹ (شخصی مفاد) کے حصول کی محنت و مشقت سے بھی بچ جائےاور

اپنی جابرانہ جبلت (instinct) کو بھی مسرت دے سکے۔ ایک کامیاب سوسائٹی وہی ہے جو طاقت کے اس ارتکاز کو منظم طور پر حل کرتی ہے۔طاقت کے اس ارتکاز کے دو اسباب ہیں۔

1. سیاسی
2. معاشی

1۔سیاسی سبب : جب ہم سوسائٹی میں ادارے قائم کرتے ہیں اور ان کی روز مرہ سرگرمیوں کے لئے ایک رہنما گائیڈ لائن (Procedure) طے کردیتے ہیں تو اپنی سماجی طاقت و اختیار یعنی آزادی کو قانون کی پیروی میں ان اداروں کے دائرہ کار میں ایک طرح سے سرنڈر کردیتے ہیں۔ مثال کے طور ایک فرد جو خود کو قانون کی پابندی میں دے دیتا ہے ۔جب اسے کسی دوسرے فرد سے کوئی خطرہ ہوتا ہے تو وہ باوجود خود ایکشن لینے کے پولیس سے رجوع کرتا ہے۔جب اس کے ساتھ کوئی نا انصافی کرتا ہے تو بجائے خود عدالت قائم کرنے کے وہ عدالتی نظام سے رجوع کرتا ہے۔

جب ہم اپنی ایک مخصوص و محدود آزادی کو اداروں کے دائرہ کار میں سرنڈر کردیتے ہیں تو وہ طاقت ان اداروں کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔اداروں کی طاقت اس کی بلڈنگ یا باغ یا باغیچے یا کھڑکی و دروازوں میں نہیں آتی بلکہ وہ طاقت براہ راست اس کی بیوروکریسی (اداروں کو چلانے والے اصحاب) اور ادارہ جاتی سرگرمیوں یعنی ثقافت میں منتقل ہو جاتی ہے۔

بیورو کریٹ بھی انسان ہوتے ہیں ان کا بھی سیلف انٹرسٹ(شخصی مفادات) اور جبلیاتی رجحانات ہوتے ہیں ۔جب وہ صاحب اختیار ہوتے ہیں تو ان میں بھی یہ تحریک پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے سیلف انٹرسٹ کو محنت و مشقت میں ڈالے بغیر زیادہ سے زیادہ حاصل کریں۔یہ سیلف انٹرسٹ دولت کا حصول بھی ہوسکتا ہے ، نمایاں ہونے کی خواہش بھی اور دوسروں پر حکومت کرنے کا شوق بھی۔

2۔معاشی سبب: دوسرا سبب معاشی ہے ۔ہم جانتے ہیں کہ روپیہ پیسہ (کرنسی) دراصل پیداواری عمل میں فریقین کے درمیان پیدارور کے تبادلہ کا ذریعہ ہے۔اصل قدر کیپٹلزم میں پیداوار ہے۔کرنسی میں قوت خرید پائی جاتی ہے۔اشیاء وخدمات جو مارکیٹ میں دستیاب ہیں وہ اس سے خریدی جا سکتی ہیں۔مگر بد قسمتی سے اسی کرنسی سے ہم سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کو بھی خرید سکتے ہیں تاکہ اپنے سیلف انٹرسٹ کو کم محنت یا بغیر محنت کے حاصل کرسکیں۔یوں ہمارا روپیہ پیسہ چاہے ہم بزنس مین ہیں یا عام شہری ہمیں قوانین اور سرکاری پالسیزمیں نقب لگانے کا راستہ بھی دیتے ہیں۔

جب ادارے اپنے دائرہ کار یعنی طاقت و اختیار کو بڑھانا شروع کردیتے ہیں تو وہ آخر کار طاقت کے بہت زیادہ ارتکاز کے سبب حسن انتظام (Management) کے قابل ہی نہیں رہتے۔یوں وہ فرد اور سوسائٹی پر حاوی جاتے ہیں اور مخلصانہ جوابدہی سے انکاری ہو جاتے ہیں ۔ یہ دوسرے کمزور اداروں کی آزادی (Independence) کے لئے بھی خطرے کا باعث بن جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر پاکستان میں اگر ہم اس زاویہ سے دیکھیں تو فوج کے کردار کو اس کے سیاسی سماجی اور معاشی منصوبوں پر اثرات کے حوالے سے مطالعہ کرسکتے ہیں اور دیکھیں گے کہ اس ادارے کی بے قابو طاقت ، جو پاکستان میں جوابدہی سے انکاری ہے ، نے پورے سیاسی انتظام اور سول اداروں کی آزادی (independenec) کو ہمیشہ سے خطرے میں ڈالے رکھا ہے۔

جب تک یہ کرپشن معمولی درجے پر رہتی ہے کم خطرناک ہوتی ہے مگر جب معاشی اور سیاسی طور پر طاقتور افراد آپس میں اتحاد کر لیتے ہیں یعنی اجارہ داری (monoply) قائم کر لیتے ہیں تو یہ صورتحال بہت زیادہ سنگین ہوجاتی ہے۔پھر نہ سیاست آزاد رہتی ہے اور نہ ہی معیشت۔ چونکہ ہم جانتے ہیں کہ سماج پر سب سے زیادہ اثر ان دونوں شعبوں (سیاست و معیشت) کا ہے۔ ان کی خرابی سوسائٹی میں دیگر خرابیوں کو جنم دیتی ہے اور سوسائٹی کی خرابی کا منفی اثر اس میں بسنے والے تمام افراد پر ہوتا ہے سوائے ان کے جو سیاسی و معاشی طور پر اس اجارہ داری سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں۔ اس طبقہ کو "سٹیٹس کو" کہتے ہیں۔

یہ طبقہ سیاست و معیشت کے جملہ ثمرات سمیٹنے میں مصروف ہوتا ہے ۔ سٹیٹس کو میں شامل بزنس مین افراد سوسائٹی کے ویلفئیر یا سوشل انٹرسٹ کا رخ عوام کی طرف جانے کے بجائے اپنی طرف موڑ لیتے ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ سیاست انہیں زیادہ سے زیادہ سہولیات بہم پہنچائے۔ایسے ویلفئیر کو کارپوریٹ ویلفئیر کہتے ہیں۔جبکہ ان سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کی بھی اپنی کوشش ہوتی ہے کہ تمام معاشی وسیاسی مفادات کو اپنی ذات یا طبقہ تک محدود رکھیں۔ایسے ویلفئیر کو پولیٹکل ویلفئیر یا بیوروکریٹک ویلفئیر کہتے ہیں۔

معیشت کو سیاست سے کیوں جدا رکھا جائے ؟

یہی سبب ہے کہ لبرل ازم کی خواہش ہے کہ معیشت کو سیاست سے علیحدہ رکھا جائے تاکہ خود بزنس مین افراد اپنی من پسند معاشی پالیسیوں سے اپنے مفادات (Incentive) یا سیلف انٹرسٹ کے حصول کی ترغیب نہ حاصل کرسکیں۔اسی طرح گورنمنٹ کا سائز بھی محدود ہونا چاہیئے کیونکہ گورنمنٹ اپنے دائرہ کار میں جتنی بڑی ہوگی اتنے زیادہ بیوروکریٹ اس کے سسٹم میں ہوں گے اور یہ بیوروکریٹ اپنے اپنے دائرہ کار کے معاشی منصوبوں میں کاروباری حضرات کو ترغیب دے رہے ہوں گے کہ وہ کرپشن سے ان منصوبوں اور ٹھیکوں کو کیسے حاصل کرسکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک سیاسی عمل کے لئے جس طرح بڑا خطرہ اس کے سیاستدان اور بیوروکریسی ہوتے ہیں اسی طرح فری مارکیٹ کیپٹلزم کے لئے بھی بڑا خطرہ اس کے کاروباری اور ورکرز یونین میں شامل حضرات بھی ہو سکتے ہیں جو اپنے اپنے سیلف انٹرسٹ کے حصول کے لئے شارٹ کٹ یا کم مشکل راستہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

صحت مند سیاسی نظام وہی ہے جو تمام شہریوں کو نمائندگی دے اور صحت مند فری مارکیٹ نظام وہی ہے جو محض کاروباری حضرات اور ٹریڈ یونینز پر نہیں بلکہ تمام افراد (پاکستان کے کیس میں بیس کروڑ) کی آزادی ارادہ و عمل، تعاون و تبادلہ اور باہمی اعتماد پر انحصار کرے۔فری مارکیٹ محض سیاست کی مداخلت سے مارکیٹ کو محفوظ رکھنے کا نام نہیں بلکہ کاروباری حضرات اور ٹریڈ یونینز کی اجارہ داری سے بھی محفوظ رکھنے کا نام ہے۔

پیچیدہ سوسائٹی کا بڑا مسئلہ توازن کی تلاش ہے ۔

اب آتے ہیں اسی مثال کی طرف کہ ایک بستی ہے جس میں رہائش پزیر افراد کی تعداد بڑھ کر اب ایک ہزار ہو گئی ہے اور یہ بستی جوں جوں اپنے سائز میں بڑھتی گئی ہے ویسے ویسے سیاسی سماجی اور معاشی طور پر پیچیدہ ہوتی گئی ہے۔اداروں کا کردار بھی بڑھ گیا ہے ۔ اگر ان اداروں کے درمیان اقتدار و اختیار کی محاذ آرائی جاری رہتی ہے تو سوسائٹی کی آزادی اور خود تنظیمی کی صلاحیت مجروح ہوتی ہے۔اب سوسائٹی کے لئے بڑا چیلنج یہی بن جاتا ہے کہ وہ اپنی پیچیدگی کو کس خوبصورتی سے سلجھاتی ہے ، اداروں کے درمیان اختیارات و حدود کا توازن کیسے قائم رکھتی ہے اور فرد و معاشرہ کو امن و سکون ،آزادی و مساوات ،عدل و انصاف ،علم و تخلیق،اور ترقی و خوشحالی پر کیسے گامزن رکھتی ہے ۔

سوسائٹی کو کیسے موت آتی ہے ؟

ہماری زیر مشاہدہ بستی جس میں ایک ہزار افراد رہتے ہیں فرض کیا کہ کسی وبا کا شکار ہوجاتی ہے اور وہاں کے افراد کو جان کے لالے پڑجاتے ہیں۔ یا فرض کیا کہ پاس کے دریا سے تباہ کن سیلاب آنے کا شدید خطرہ ہے۔یا فرض کہ کیا کسی ماحولیاتی تبدیلی کے سبب معاشی خوشحالی کے امکانات صفر ہو جاتے ہیں جیسے زمین بالکل ہی بنجر ہوجاتی ہے جبکہ افراد کا انحصار محض کھیتی باڑی پر ہے یا زلزلہ آجاتا ہے تو لوگ کسی بھی سنگین جان لیوا خطرہ کے سبب وہاں سے کوچ کر جائیں گے یا سب کے خدا نخواستہ سب ہلاک ہو جائیں گے اور ان کے کھنڈر باقی رہ جائیں گے۔جیسا کہ موہن جو داڑو ہڑپا،بابل،اہرام مصر کی تہذیب وغیرہ تو کیا ہم افراد سے خالی اس مسکن کو سوسائٹی کہہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ سوسائٹی انسانوں کے ایک مخصوص مسکن میں رہنے اور باہمی تعاون و تبادلہ اور دوستی و اعتماد سے بنتی ہے۔ اگر انسان اس مسکن سے کوچ کر جاتے ہیں تو وہ سوسائٹی بھی تباہ ہو جاتی ہے ۔سوسائٹی بذات خود کوئی زندہ وجود نہیں بلکہ زندگی ان انسانوں میں ہے جو اسے قائم کرتے ہیں – یہ ایسے ہی ہے جیسے دوستی جو بذات خود کوئی مادی وجود نہیں ہے – جب تک دو افراد کے احساسات میں ہے تو قائم ہے اور اگر دو دوست ایک دوسرے سے بدگمان ہو کر کہیں دور چلے جاتے ہیں اور اس جذبہ کو محسوس نہیں کرتے یہ ان دونوں کے درمیان فنا ہو جاتی ہے ۔فرد سوسائٹی کا معمار ہے نہ کہ سوسائٹی کا پروڈکٹ ہے ۔ ادارے سوسائٹی کا اپنے اپنے دائرۂ کار میں اجتماعی بندوبست ہیں، یہ بذات خود سوسائٹی بھی نہیں اور نہ ہی فرد پر حاوی و حکمران۔ حکمران وہ قوانین ہیں جو افراد سوسائٹی میں انصاف اور توازن قائم رکھنے کے لئے قائم کرتے ہیں۔ جیسے جمہوریت میں پارلیمان، سپریم کورٹ، پولیس، انتظامیہ وغیرہ۔

اب ہم ان بنیادی باتوں کی طرف آتے ہیں جو ہمارے سوسائٹی کے فہم کو مزید واضح کرتی ہیں :

1۔تبدیلی کی فطرت:

تبدیلی آزادی کی فطرت ہے ،یہ محض ایک اوپن (کھلی) اور تنوع پسند سوسائٹی میں ہی ممکن ہے ۔تبدیلی جبر میں ممکن نہیں۔ وہ تبدیلی جو جبر کی کوکھ سے جنم لیتی ہے وہ تبدیلی شہریوں کے مفادات سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ وہ تبدیلی سٹیٹس کو کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے کیونکہ "سٹیٹس کو" کی قوتیں ہرگز نہیں چاہتیں کہ ایک بند (Closed) اور شکنجے میں پھنسے ہوئے (Controlled) سماج میں کوئی بھی تبدیلی ان کے مفادات کو چیلنج کرے۔ اس لیے وہ تبدیلی جو تمام شہریوں کی خوشحالی کے امکانات کو وسعت اور ضمانت دے وہ محض ایک اوپن سوسائٹی کی صفت ہے ۔اور معیشت کے میدان میں اوپن سوسائٹی کی نمائندگی فری مارکیٹ معشیت کرتی ہے۔ جس میں آزاد تجارت ، امیگریشن کا حق ، عدم مداخلت (Non Interventionism) ، اور علم و ثقافت اور سرمایہ کا بین الاقوامی بہاؤ (movement) بنیادی خصوصیات ہیں ۔

سماجی تبدیلی کے ان گنت عوامل ہوتے ہیں کچھ کی شناخت آسان ہے تو کچھ Hidden (پس پردہ) رہتے اور اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گورنمنٹ یا چند مراعات یافتہ افراد یا کوئی گروہ یا ایک آمر تبدیلی کو روک نہیں سکتا۔ اس کی وجہ تبدیلی کے موجب تمام عوامل کی شناخت کا ممکن نہ ہونا ہے۔ایک آمر مکمل اور حتمی طور پر یہ نہیں جان سکتا کہ وہ کون کون سے عوامل ہیں جو حال سے مستقبل کی منظرکشی کر رہے ہیں۔ یہ کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ مگر جب آمریت یا سٹیٹس کو کی اجارہ دار قوتیں اپنے مفادات کے تحفظ میں ان عوامل کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو ان کے خیال میں تبدیلی کے رجحانات کو پیدا کررہے ہیں تو وہ تبدیلی کی مخفی قوتوں کے مفید امکانات پر کاری ضرب لگا رہی ہوتی ہیں ، انہیں اپنے بیج سے پھوٹنے اور نشوونما پانے کے مکمل امکانات سے محروم کر دیا جاتا ہے ۔

یوں تبدیلی کے عمل کو خراب (disturb) کر دیا جاتا ہے۔ ترقی و خوشحالی کے امکانات کو اپنے لیے بھی اور سوسائٹی کے لئے بھی محدود کردیا جاتا ہے۔ پھر جب تبدیلی جس شخص یا سوسائٹی میں برپا ہوتی ہے۔ وہ بے ہنگم اور ناقابل شناخت ہوتی ہے وہ سماج کی تاریخی و ثقافتی حقیقتوں میں جذب ہونے سے محروم رہ جاتی ہے اور اجنبی بن جاتی ہے تاوقتیکہ ایک عرصے بعد اسے باامر مجبوری قبول کر لیا جائے جیسا کہ ہم مغربی تہذیب سے متعلق اپنے رویے دیکھ سکتے ہیں ۔اس سے فائدہ اٹھانے کے پوٹینشل کو استعمال میں لانا آسان نہیں رہتا ۔اسی لیے کہتے ہیں کہ آمریت چاہے وہ شہنشاہ کی ہو یا ریاست و حکومت کی،اس سے وجود میں آنے والی تبدیلی بھی نئے مسائل پیدا کرتی ہے ۔

آج ہمارا پاکستانی معاشرہ بھی جن تبدیلیوں سے فائدہ اٹھارہا ہے ان کی بڑی وجہ دنیا کے دیگر اوپن معاشرے ہیں - ہمارے لئے تو یہ تبدیلیاں اتفاقی یا حادثاتی ہیں اور ہم تو محض ان کی پیروی کئے جا رہے ہیں (مگر یہ اب بھی ہمارے معاشرے میں اپنے بہترین پوٹینشل کے ساتھ جذب نہیں ہو سکیں) ۔مثال کے طور پر جمہوریت ہم نے پیدا نہیں کی بلکہ بادشاہت سے جمہوریت کی طرف سفر ہم نے مغربی اقدار سے متاثر ہوکر کیا ہے۔سائنس و ٹیکنالوجی کی جن اشیاء و خدمات سے جو آج ہم مستفید ہورہے ہیں اور جو آج ہماری ثقافت کا حصہ بن چکی ہیں یہ سب تبدیلیاں بھی مغرب سے درآمد شدہ ہیں۔اسی طرح وہ تمام جدید علوم و فنون جس سے ہمارے ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ خوب فائدہ اٹھا رہا ہے یہ کارنامے بھی درآمد شدہ ہیں۔

تبدیلی ہوا کی مانند نہیں کہ جب چلتی ہے تو ماحول ایک دم سے خوشگوار ہو جاتا ہے۔تبدیلی وقت اور مقام کے اعتبار سے ایک مرحلہ وار معاملہ (phenomenon) اور مسلسل عمل ہے۔تبدیلی دراصل سیڑھیاں چڑھنے جیسا ہے اور جمود محض رکنے کا نام نہیں بلکہ ترقی کی سیڑھیاں اترنے کے مترادف ہے – فرض کیا اگر آپ رک بھی جائیں گے تو آپ کے دوسرے مدمقابل جو ترقی کی سیڑھیاں مسلسل چڑھ رہے ہوں گے ان سے آپ دور بہت دور نیچے گرتے جائیں گے۔ یاد رہے کہ ترقی و عروج اپنے عہد ہی سے متعلق (relevant) ہوتے ہیں – میں ترقی یافتہ ہوں یا زوال پزیر اس کا فیصلہ میرے اپنے عہد کے ساتھ موازنہ سے کیا جائے گا – اگر میں اپنے عہد کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا ہوں تو ترقی کر رہا ہوں – اور اگر میں اپنے عہد سے پیچھے رہ گیا ہوں اور وقت کے ساتھ ساتھ اس سے دور ہوتا جا رہا ہوں تو یہ زوال پزیری ہے باوجود یہ کہ میں کہوں کہ میں اپنے عہد میں ممتاز نہ سہی مگر عہد ماضی کے کسی فرد کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ ہوں تو یہ غیر متعلق (Irrelevant) بات ہو گی ۔

تبدیلی وقت اور مقام کے ریفرنس میں رہتے ہوئے تبدیلی کے موجب عوامل کے بہتر رسپانسز (Responses) کا نام ہے۔ ان رسپانسز کو اپنے بہترین اظہار میں آزاد سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔اور یہ رسپانسز ایک خود کار و خود انتظامی کی صلاحیت سے بھر پور سوسائٹی میں تمام انسانوں کی سرگرمیوں سے جنم پانے والے محرکات (Incentive) کی بدولت ہی خود بخود وجود میں آجاتے ہیں۔ایک فری سوسائٹی وہی ہے

جہاں سوسائٹی کے تمام عوامل پر انسانی حقوق کی پاسداری کو تقدم حاصل ہوتا ہے اور وہ انسان کی مرکزیت پر قائم ہوتے ہیں نہ کہ ریاست یا کسی مذہبی یا سماجی تصور کی بنیاد پر ۔

سماجی تبدیلی علمی مکالمہ کی طرح ہے ۔

ہمارا یقین ہے کہ جس طرح ایک آزاد مکالمہ میں نئی فکر جنم لیتی اور پھلتی پھولتی ہے اور غلط فکر کو پزیرائی نہیں ملتی بلکہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ پس منظر میں چلی جاتی ہے اسی طرح عمل کی آزادی میں بھی نئی تخلیقی سرگرمیاں جنم لیتی ہیں۔اس لئے کہتے ہیں کہ فری سوسائٹی بھی آزاد مکالمہ کی طرح کام کرتی ہے۔اس میں بھی مختلف قسم کی مفید اور غیر مفید سرگرمیاں سامنے آتی ہیں ، صرف اسی عمل کو مقبولیت ملتی ہے جو تمام افراد کی طلب و تسکین کے عین مطابق ہو۔ آزادی عمل بھی آزادی فکر کی طرح آزاد ماحول میں پنپتی ہے۔

جس طرح ہم مکالمہ کا نتیجہ پہلے سے ہی معلوم (Predict) نہیں کرسکتے ۔اسی طرح سوسائٹی میں تبدیلی کی منزل (end results) بھی اس کے برپا ہونے سے پہلے معلوم (predict) نہیں کئے جا سکتے ۔

جس طرح ہم علم پر اجارہ داری کے قائل نہیں اسی طرح ہم سوسائٹی کی سرگرمیوں پر بھی اجارہ داری کی نفی کرتے ہیں۔

بعض لوگوں کو مکالمہ بظاہر بے ہنگم شور لگتا ہے جسے صرف مجھے اپنا کام کرنے دیں (Let me run) کی اجازت چاہئے ہوتی ہے۔ سوسائٹی کی سرگرمیاں بھی بعض لوگوں کو بظاہر بے ہنگم لگتی ہیں مگر جب انہیں انسانوں کی آزاد سرگرمیوں کے سپرد کردیا جاتا ہے تو یہ نفع بخش نتائج دیتی ہیں یعنی بہتر معیشت اور خوشحالی کو پرورش دینے والے نتائج - مکالمہ میں اچھے اور برے خیالات بھی سامنے آتے رہتے ہیں مگر ہم جانتے ہیں کہ مکالمہ میں آخر کار سب سے بہتر رائے کو ہی پذیرائی اور کامیابی ملے گی جبکہ بے جواز اور بے نتیجہ دلیل منہ کی کھائے گی ۔اسی طرح ہم آزاد سوسائٹی کے بارے میں بھی جانتے ہیں کہ بعض افراد کی شر انگیزی پوری سوسائٹی کی نمائندگی (represent) نہیں کرتی اور اگر سوسائٹی کو ان چند شریر افراد کی وجہ سے مقید (lock) کردیا جائے تو وہ سارے امکانات دم توڑ دیتے ہیں جنھوں نے شریف انسانوں کی آزاد ، ذمہ دار اور جوابدہ سرگرمیوں سے جنم لینا ہوتا ہے۔

علم اور معاشرہ معلوم سے غیر معلوم کی طرف بہتے چلے جاتے ہیں ۔

جس طرح ہم جانتے ہیں کہ علم پھیلا ہوا ہے یعنی کہ اپنے اجزاء میں تقسیم (dispersed) ہے کوئی بھی اس پر مکمل و حتمی دسترس نہیں رکھتا ۔ اگرچہ علم اپنے مظہر میں وقت اور مقام کے ریفرنس میں محدود ہے اسی طرح سوسائٹی کی سرگرمیاں بھی اپنے وقت اور مقام کے اعتبار سے تقسیم اور پھیلی ہوئی (dispersed) ہیں۔

جس طرح علم پر مکمل گرفت اور کنٹرول ممکن نہیں جس کا نتیجہ تباہی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے اسی طرح سوسائٹی کی سرگرمیوں کو بھی پہلے سے قیاس کر کے تمام افراد کی سرگرمیوں کو کنٹرول اور منصوبہ بند کرنے کی کوشش کا نتیجہ بھی تنزلی اور تباہی ہے۔

مکالمہ غیر معلوم کی طرف سفر (voyage to unknown) ہے سوسائٹی کا سفر بھی غیر معلوم (unknown) کی طرف ہوتا ہے۔ہم معلوم (known) سے (unknown) کی طرف بہتے چلے جا رہے ہیں۔ ہر عہد کا سماج اپنے ماقبل سے منفرد ہے۔

صنعتی انقلاب کے بعد جب سوسائٹی بدلی اور اس کے بعد جس سماجی منظر نے جنم لیا اس کی تصویر کشی ول ڈیورانٹ اس طرح کرتا ہے –

عہد خرد میں جب اقتصادی طاقت بے کار اور بے عمل رئیسوں کے ہاتھ سے زندہ دل تاجر طبقہ کے قبضہ میں آئی تو ہر راویت متزلزل ہو گئی ۔ ہر رسم ٹوٹ گئی ۔ ہر واہمہ نے انسان پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور انسانوں نے اپنے آپ کو پہلی مرتبہ آزاد محسوس کیا ۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہنگامی طور پر ماضی نے حال پر سے اپنا تسلط ہٹا لیا ہے. بوربون کا پیرانہ سال خاندان برائے نام حکومت کرتا تھا – کلیسا اس سماج میں جہاں تشکیک کا دور دورہ تھا اور جہاں پادری بھی خرد مندی کا مذاق اڑاتے تھے دیہات میں قوی لیکن شہروں میں بے بس تھے۔ ہر قانون کی گرفت میں لچک آگئی تھی ہر اصول پر تنقید ہوتی تھی ۔ کسی خوف یا ترمیم کے بغیر فن اور کردار کے ہر معیار کی خلاف ورزی ہوتی تھی. یہ وہ عہد تھا جس میں روسو نے ریاست کو ایک برائی قرار دیا تھا ۔ اور جیفر سن نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ حکومت بہترین ہے جو کم سے کم دائرہ کار میں حکومت کرتی ہے. یہ عہد خرد کا عہد تھا – (77)

مثبت تبدیلی جسے ہم ترقی کی طرف پیش قدمی یعنی پراگریس کہتے ہیں ، بہت سنجیدہ اور باوقار عمل ہے۔

پراگریس یعنی ترقی کی طرف پیش قدمی کے بارے میں ایک بڑی غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ یہ ساری کی ساری دانشورانہ (Intellectual) ہوتی ہے یا دانشورانہ (Intellectual) سرگرمیاں اس کا سبب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ترقی کا ایک بڑا سبب غیر دانشمند (non-intellectual) سرگرمیاں یا حصے (parts) بھی ہیں۔ جدتوں (Innovations) اور تخلیقی صلاحیتوں (Productivity) کے بہت سارے ذرائع (tools) محض دانشوارنہ سرگرمیوں کا سبب نہیں اور انہیں باقاعدہ دریافت (discover) یا ایجاد نہیں کیا گیا بلکہ یہ ثقافت میں ایک جیسی سرگرمیوں کے بار بار دہرائے جانے اور Trial & Error جیسے اسباب سے اور مسلسل تبدیلیوں سے وجود میں آتے ہیں۔ زبان (لینگویج) اور ثقافت اس سلسلے میں سب سے بڑی مثال ہیں۔

زبان (لینگویج) کسی ایک انسان یا دانشوروں یا ناقدین کے ایک گروپ نے جنم نہیں دی بلکہ یہ سماجی سرگرمیوں سے خود بخود وقت اور مقام کے ریفرنس میں وجود میں آتی ہے۔اس میں ارتقاء بھی شعوری منصوبہ بندیوں (planning) یا ریاستی بیورو کریٹس کے حسن انتظام کے سبب

نہیں بلکہ زبان وقت کے ساتھ ساتھ انسانوں کے باہمی تعلقات، سرگرمیوں، بدلتے ہوئے ثقافتی و مادی حقائق،علوم و فنون اور ٹیکنالوجی وغیرہ کے زیر اثر ترقی کرتی جاتی ہے - جب کسی زبان کو منجمند کر دیا جاتا ہے یا اس پر مذہبی و ثقافتی اجارہ داری قائم کر دی جاتی ہے تو وہ زبان آہستہ آہستہ مر جاتی ہے یا محض کتابوں میں ہی دفن ہو جاتی ہے. بقا ہر اس چیز کو ہے جو عوامی ہے اور لوگ اسے رضاکارانہ بنیادوں پر قبول کرتے ہیں – جس چیز یا عمل کو جبر سے نافذ کیا جائے تو اس سے مراد یہ ہے کہ عوام کی رضامندی اس میں شامل نہیں اور جب یہ جبر ہٹے گا تو وہ چیز بھی فنا ہو جائے گی -

یہ غیر شعوری(unconscious) خصوصیات جو ثقافت میں Trial & Error اور ایک جیسی سرگرمیوں کی بار بار دہرائی (repetition)سے وجودمیں آتی ہیں ان سے ہی غیر شعوری اقدار یا طور طریقے (unconscious manner) جنم لیتے ہیں۔مثال کے طور پر لباس کا نیا ڈیزائن،کھانے کے نت نئے انداز،گھر کی سجاوٹ کے نئے طور طریقے،بولنے ،لکھنے کے نئے ڈھنگ سمیت ان گنت ہماری ثقافتی تبدیلیاں غیر شعوری (unconscious) خصوصیات کی بدولت ہیں۔یہ غیر شعوری ہیں۔یہ پراگریس کا مظہر ہیں اوریہ بھی اپنے مکمل اظہار میں آزادی کی طلب گار ہیں۔

یہ تبدیلیاں اس وقت زیادہ خوبصورت اور جاندار ہوتی ہیں جب تمام افراد عمل کی آزادی (Freedom of action) سے مستفید ہورہے ہوں اسی طرح ہم کہہ سکتے ہے کہ معیشت بھی شعوری (conscious) اور غیر شعوری (unconscious) دونوں طرح کی معاشی سرگرمیوں کا مجموعہ ہے۔

3۔ہم سب انسانوں کے مقاصد مشترک ہیں۔

اچھائی اور خوبصورتی کے تصورات وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔جسے ہم آج اچھا یا مفید کہہ رہے ہیں کیا معلوم کل کے لئے وہ برا ہو۔مثال کے طور پر ایک دور میں غلامی کو ہرگز برا نہیں سمجھا جاتا تھا اور اس کے جواز میں دلائل دیئے جاتے تھے۔جبکہ آج کوئی بھی غلامی کا دفاع نہیں کرتا۔یہ اب مسلمہ حقیقت بن چکی ہے کہ غلامی بدترین ہے اور تمام انسان برابر ہیں۔ یہی خصوصیات خواتین کے حقوق کی بھی ہے -

اسی لئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان اپنی تہذیب کا ترجمان ہے - ہمارے ان گنت اچھائی و برائی کے تصورات ایسے ہیں جسے ہم نے اپنی شعوری محنت سے نہیں حاصل کیا بلکہ ہم نے سوسائٹی کی عام روش میں انہیں قبول کیا ہے اور سوسائٹی نے بھی جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ

ان متعدد سرگرمیوں کو ثقافت میں ارتقاء کی صورت میں شعوری و غیر شعوری تصورات و سرگرمیوں سے سیکھا ہے۔ جیسے لباس ،خوراک ،کھانا کھانے کے آداب،زبان اور گھر کی سجاوٹ وغیرہ کی مثالیں ہم زیر بحث لائے۔

ہم انسانوں میں تنوع ہے یہ سوسائٹی کروڑوں رشتوں اور رابطوں پر مشتمل ہوتی ہے ۔ ان رشتوں اور رابطوں کو نہ مکمل حتمی طور پر شناخت کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کنٹرول یا پلان ، یہ آزادانہ بنتے جڑتے اور ٹوٹتے ہیں ضروری ہے کہ انہیں آزادانہ اور رضاکارانہ بنیادوں پر اپنا کام کرنے دیا جائے اور تمام انسانوں پر اعتماد کیا جائے ۔

ہم مسلسل ارتقاء سے گزر رہے ہیں ۔اس ارتقاء میں ہم سب انسانوں کا کم و بیش حصہ ہے۔اس ارتقاء کو بھی کوئی انسان ، ادارہ یا طبقہ پلان (Plan) نہیں کر سکتا ۔کوئی فرد ،افراد کا گروہ یا سرکاری و انتظامی ادارہ ایسا نہیں جو یہ دعوی کرسکے کہ اس ارتقاء کی وجہ اس کی منصوبہ بندیاں ہیں یا کم سے کم یہ کہہ سکے کہ اسے ان کا علم پہلے سے تھا۔

زرعی عہد کے دانشور بھی موجودہ صنعتی عہد کو اس کے برپا ہونے سے پہلے معلوم (Predict) نہ کرسکےاور مالتھس تک سب کا دعوی تھا کہ نسل انسانی زیادہ آبادی کا بوجھ نہیں اٹھاسکتی اور عنقریب بھوک اور قحط سے اکثریتی آبادی ہلاک ہو جائے گی (78)۔اور جو آبادی کی آخری حد انہوں نے متعین کی تھی آج ہم اس سے کئی گنا زیادہ تعداد میں سیارہ زمین پر نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ہمارا معیار زندگی زرعی عہد سے کئی گنا بہتر ہے اور ہماری خوشحالی کے امکانات دن بدن وسیع تر ہوتے جا رہے ہیں بالکل اسی طرح وقت اور مقام کے لحاظ سے اپنے مستقبل کو حتمی طور پر معلوم کرنے سے بھی محروم ہیں مگر پرامید ہیں کہ ارتقائی قوتیں (جنہیں روئے زمین کے تمام انسان اپنے اپنے وقت اور مقام میں اور اپنے اپنے حصے کا کام کر کے ترتیب دے رہے ہیں) ہمارے مستقبل کو حال سے بھی زیادہ روشن اور خوشحال بنائیں گی ۔

ارتقاء جیسا کہ پہلے کہا گیا ایک معلوم سے نامعلوم کی طرف سفر (voyage to unknown) ہے۔ اس نامعلوم کی طرف ہمارا سفر محض آزادی کی ثقافت میں ہی ممکن ہے — مقید یا منصوبہ بند سفر کا جواز اس وقت ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے جب یہ کہا جائے کہ جناب ہمیں منزل بھی معلوم ہے اور راستہ بھی ،بس ہم نے اس کی طرف ایک رہنما کی ہدایت یا رہنمائی میں آگے بڑھنا ہے ۔ ایسا تو کچھ بھی نہیں اور ایسا دعوی بھی کوئی نہیں کر سکتا ۔

4۔کامیابی کا پیمانہ:

سوسائٹی کوبند (close) کرنے کا ایک جواز یہ بھی دیا جاسکتا ہے کہ جناب اب تک ہم نے جو کمانا (earn) اور سیکھنا (learn) تھا کما بھی لیا اور سیکھ بھی لیا، اب مزید تبدیلی کی ضرورت نہیں رہی۔اب اس سوسائٹی کو یہیں روک دینا چاہیے۔اس بحث سے قطع نظر کہ کیا سوسائٹی

کو واقعی میں روکا بھی جاسکتا ہے؟ اور سوال یہ بھی ہے کہ آخر وہ کیا معیار (criteria) ہے جس کی بنیاد پر ہم کہہ سکیں کہ جناب ہم نے جو منزل پانی تھی پالی۔وہ کیا معیار ہے جس کی بنیاد پر ہم اپنے عہد کے تصورات کی اچھائی اور برائی کو حتمی سمجھ لیں؟حقیقت یہ ہے کہ انسان کو ابھی منزل کا اطمینان(satisfaction) میسر ہی نہیں آیا (امکانات یہی ہیں کہ نہ کبھی آئے گا) اور امکانات کے در ابھی تک بند نہیں ہوئے۔ہم نے اپنے مسائل سے اب تک مکمل طور جان نہیں چھڑائی اور ہماری ترقی و خوشحالی پر سنگین قسم کے خطرات آج بھی منڈلا رہے ہیں۔

ہمارا آج ماضی کا مستقبل ہے اور اس کی مستحکم تبدیلی کا نتیجہ ہے۔اور ہمارا مستقبل ہمارے حال میں عملی تبدیلیوں کا نتیجہ ہو گا۔ہمیں آج بھی نئے خیالات اور جدت پسند سرگرمیوں کی ضرورت ہے۔جب یہ نئے خیالات اپنے عہد کی بھٹی میں ڈالے جائیں گے تو یہ اچھائی کو قائم رکھیں گے اور خرابی کو ٹھکرا دیں گے۔ہماری متنوع سرگرمیاں نئے اقدار کو جنم دے رہی ہیں - نئے ذرائع (tools) اور نئی صلاحیتوں (capabilities) کی ہمیں اشد ضرورت ہے۔ہمیں مستحکم ارتقاء کی ضرورت ہے جو محض آزاد اور کھلی سوسائٹی میں ہی ممکن ہے۔

۵۔ ثقافت اور قانون۔

سوسائٹی اور قانون کے معاملہ میں عموما یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ قانون طاقتور ہے یا ثقافت؟ میرا استدلال ہے کہ ثقافت زیادہ طاقتور ہے۔یہ فطری اور اقتصادی بنیادوں پر فرد میں اجتماعی عادتیں اور تصورات راسخ کرتی ہے۔اس کا اثر اتنا ہمہ گیر ہے کہ عموما سوسائٹی کے زیر اثر پیدا ہونے والی ہماری فطرت ثانیہ اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ یہ قانون سے بھی زیادہ پر اثر ہوجاتی ہے۔فرد قانون کی اس کے جبر کے تحت پیروی کرتا ہے جبکہ سوسائٹی اور ثقافت عموما اس کی نفسیات و فطرت میں گندھی ہوتی ہے – اسے ول ڈیورانٹ اپنی کتاب Pleasure of philosophyمیں کیا خوب لکھتے ہیں

دور جدید میں نظم و ضبط قانون کی وجہ سے نہیں بلکہ زندگی کے اجتماعی اصول اور منفرد انسانی فطرت کی وجہ سے ہے. حکومت کے وجود سے پہلے بھی نظم و ضبط موجود تھا اور حکومت کے ختم ہونے کے بعد بھی رہے گا - ایک انسان دوسرے انسان کا محتاج ہے. اسے تعاون کی ضرورت ہے اور یہ اس کی فطرت میں ہے- یہ ربط و رشتہ اور یہ یکجائی معاشرہ اپنے لئے کر رہا ہوتا ہے ، مگر بدقسمتی سے اسے حکومت سے منسوب کر دیا جاتا ہے. (79)

اس لیے لبرل ازم کی بھی یہی خواہش ہے کہ تمام افراد اپنی ثقافت سے جڑ کر رہیں اور اس کے اصولوں کا احترام کریں ۔بشرطیکہ وہ اصول وضوابط ان کے بنیادی انسانی حقوق،ان کے حق انتخاب،ان کی آزادی ارادہ و عمل، ان کی علم دوستی،اور ان کے ذاتی ویلیو سسٹم سے متصادم نہ

ہوں۔اس صورت میں فرد کو اپنی آزادی ثقافت کے حضور قربان نہیں کرنی چاہیے۔کیونکہ فرد پر جبر درحقیقت سوسائٹی کی آزاد قوتیں نہیں کر رہی ہوتیں جو انسان دوست ہوتے ہیں بلکہ اجارہ داری کے پیوستہ مفاد سے جڑے کردار ہی ثقافت کے نام پر ایسا کر رہے ہوتے ہیں جنہیں بنیادی انسانی حقوق اور انسان کی آزادی ارادہ و عمل سے اپنے مفادات کا خطرہ ہوتا ہے۔

سوسائٹی کو رضاکارانہ بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے اور اس کا فرد سے تعلق (association) بھی رضاکارانہ اور تعاون پر مبنی (cooperative) ہونا چاہئے۔اگر سوسائٹی جبر پر قائم ہوگی تو انسان اپنی آزاد و منفرد فطرت کے سبب سوسائٹی کی ثقافت سے انحراف کریں گے اور فرد و سوسائٹی میں تصادم پیدا ہوگا۔یہ تصادم انتہائی خطرناک اور سوسائٹی کے مستقبل کے لیے تباہ کن بھی ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ استحکام ہی سوسائٹی کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

ایک ایسے ارتقاء کی کہانی جسے کسی نے پلان نہیں کیا مگر اس نے سماج بدل ڈالا۔

ہم انسان اپنی فطرت اور معاشرت میں صدیوں سے جاری ارتقاء کا حاصل ہیں – ہم جہاں آج ہیں ماضی میں کسی نے اس کی ایسی تصویر کشی نہیں کی تھی اور نہ ہم آج مستقبل کی حتمی پیش گوئی اور منظر کشی کر سکتے ہیں – ہمارا وجود ، ذہن و ضمیر ، اور ہمارے اردگرد کی ساری دنیا ارتقا کے اس طویل آزاد اور خودکار نظم جسے انگریزی میں ہم self and spontaneous ordering یاself organizationکہتے ہیں ، سے گزر کر آئی ہے – حال کو ماضی کے کسی واحد کردار (یا ایک خاص گروہ) نے ڈیزائن نہیں کیا اور نہ ہم اپنے مستقبل کو ڈیزائن کرنے کے قابل ہیں – ہم اپنے علم اور استطاعت میں نامکمل ہیں ، وقت اور مقام کے پابند ہیں ، اسی لئے ہم سب اپنے اپنے نامکمل علم و استطاعت سے اپنے اپنے وقت اور مقام پر اپنا اپنا حصہ ڈال رہے ہیں (اپنا کردار ادا کر رہے ہیں) جو مجموعی طور پر ہمیں آگے بڑھا رہا ہے –ہمیں چاہئے کہ ارتقاء کا ساتھ دیں اور اپنے عہد سے ہم آہنگی اختیار کرتے ہوئے آگے بڑھیں – خاندان کا ادارہ بھی ایک ایسی کہانی سناتا ہے –آیئے اسے وقت اور مقام کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں–

زراعت کے آغاز سے پہلے معاشرت کی اکائی قبیلہ ہوتا تھا ، اس کے سب ارکان برابر تھے ، مشترکہ وراثت اور پیداوار کا تصور پایا جاتا تھا جسے ہم کمیون کہتے ہیں – یاد رہے کہ مشترکہ وراثت کا یہ تصور بھی صرف قبیلہ کے مابین تھا ، قبیلہ سے باہر کا آدمی قبیلہ کی جائیداد پر اپنا دعوی اس وقت تک نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ اس سے وہ جائیداد بزور طاقت چھین نہیں لیتا تھا – یہ معاملہ صرف جائیداد (زر زمین خوراک) تک محدود نہ تھا بلکہ خدا بھی قبیلہ کی ملکیت سمجھے جاتے تھے ،چونکہ ہر قبیلہ کا اپنا خدا ہوتا تھا (جو عموما اس قبیلہ کا جد امجد ہوتا تھا) جب کبھی کسی کو کسی سنگین غلطی پر سزا دینا ہوتی تو اسے بجائے قتل کے قبیلہ بدر کر دیا جاتا ، یوں وہ نہ صرف جائیداد سے بے دخل ہو جاتا تھا بلکہ اس خدا کی پرستش سے بھی محروم ہو جاتا تھا جس پر قبیلہ کی مشترکہ اجارہ داری قائم تھی – وہ دربدر بھٹکتا ، جائیداد سے

بھی محروم رہتا اور خدا سے بھی – جہاں بھی رہتا دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے رہتا – یہی طرز زندگی اور اسطور اس دور کا تصور اخلاقیات بھی تھی ، روایت بھی، مذہب بھی ،علم بھی اور اس عہد کے تناظر میں سچائی بھی–

اس معاشرہ میں عورت کی حیثیت یقینا ممتاز تھی جس کی وجہ بچوں کی پیدائش ہے – بچے خاص طور پر لڑکے مستقبل کے لئے قبیلہ کی طاقت تھے – یہ وقعت دراصل عورت کو نہیں بلکہ بچوں خاص طور پر لڑکوں کو حاصل تھی – اس پیداوار کو حاصل تھی جو عورت پیدا کرتی تھی تاکہ قبیلہ کے وقار اور طاقت میں اضافہ ہو- جو عورت جتنا بڑا کنبہ پیدا کرتی اتنی زیادہ عورت کی حیثیت ہوتی – اور جو عورت بانجھ رہ جاتی وہ کمترین سمجھی جاتی تھی – دوسری طرف جنگ کی صورت میں بھی وہ وبال جان تھی جس کے بارے میں خطرہ موجود رہتا تھا کہ دشمن اگر اسے اٹھا لے گا تو اس کا جسمانی استحصال کرے گا –طاقت کا ارتکاز مردوں کی طرف تھا ، جو حفاظت کرتے تھے ، لڑتے تھے ، چراگاہیں اور مال مویشی چھینتے تھے اور عورتوں سے بچے پیدا کرتے تھے -مخالف قبیلے کی عورتوں کو بستر پر لاتے اور مردوں کو غلام بناتے تھے-

زرعی عہد سینٹرل ایشیا خصوصا موجودہ ترک علاقوں کی دریافت ہے (80)– ہندوستان میں پہلا زرعی تمدن میر گڑھ بلوچستان میں پیدا ہوا(81)- زرعی عہد نے خوراک کا مسئلہ کافی حد تک حل کر دیا تھا کیونکہ اب خوراک کو تلاش کرنے کی نہیں بلکہ خودپیدا کرنے کی ضرورت تھی – انسان نے بڑی حد تک خودکفالت حاصل کر لی تھی – ہم اپنی بقا کی جدوجہد میں کامیاب ہوئے – اسی میر گڑھ کی بستی نے وادی سندھ کی تہذیب کو زندگی دی (82)–- وادی سندھ نے ایران سے آنے والے آریز کے ساتھ مل کر ہندوستان کو جنم دیا– (83)تہذیبوں کو جنم ہی زرعی عہد سے ملا-

جب سے زراعت کو آغاز ملا ہے اس وقت سے ہماری ترقی کی شرح میں تیزی آئی ہے –زمانہ ماقبل زرعی عہد لاکھوں سالوں پر محیط ہے مگر ہم اس دور کے کسی علمی و تہذیبی کارنامہ سے کم ہی واقف ہیں – جبکہ زرعی عہد اس کے مقابلہ میں انتہائی کم مدتی ہے مگر ہم انگنت ایسی چیزیں گنوا سکتے ہیں جس نے ہمارے علم اور ہماری تہذیب و ثقافت کو چار چاند لگا دیئے –آخر کیوں ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ زرعی عہد نے ایک طرح سے ہمیں بطور نسل انسانی خوراک کی کمی کے خطرہ سے نکال کر بقا سے روشناس کروایا . آبادی میں ایک دم بہت زیادہ اضافہ ہوا ، باہم جنگ پر مائل قبائل کے درمیان امن کی شروعات ہوئی اور شہری ریاستوں کا قیام ممکن ہو پایا (جن سے بڑی سلطنتیں یا ریاستیں وجود میں آئیں)- زراعت سے پیدا ہونے والی ضرورت سے زائد پیداوار نے غیر زرعی پیشوں کو جنم دیا ، شہروں کی ثقافت قائم ہوئی اور ہمارے قابل اذہان فطرت کی تسخیر کے کاموں میں مصروف ہوئے– یاد رہے کہ اگر انسان اپنی ضرورت سے زائد خوراک پیدا کرنے کے قابل نہ ہوتے جو مارکیٹ میں نہ بکتی تو کوئی بھی غیر زرعی شعبہ ، ادارہ اور طرز زندگی وجود میں نہ آتا -

زرعی عہد کے پیداواری عمل میں قبیلہ کی جگہ اب خاندان نے لے لی تھی – اب زمین کی ملکیت یا تو بادشاہ و امراء کے پاس تھی یا اگر نجی جائیداد کا تصور تھا بھی تو جائیداد اب خاندان کی مشترکہ ملکیت تھی – خاندان نے قبیلہ کی جگہ لے لی ،اور جوں جوں زرعی عہد میں جدت آتی

گئی خاندان بھی چھوٹا ہوتا گیا جس کی بڑی وجہ طریقہ پیداوار میں جدت تھی ۔ جس کام کو کرنے کے لئے پہلے بیس بندوں کی ضرورت تھی ہل ، پہیہ ، سدھائے ہوئے کھیتی باڑی کے جانوروں کے آنے سے ان کی جگہ کم بندوں کی ضرورت رہ گئی تھی ۔ یوں وسیع خاندان کا ایک دوسرے پر انحصار کم ہوا۔ اور دوسرا ملکیت جب زیادہ لوگوں میں تقسیم ہوتی تھی تو ایک شخص زیادہ محنت کی ترغیب کیسے حاصل کرے اور سیلف انٹرسٹ کی جستجو کیسے کرے تو بہتر یہی تھا کہ یا تو دوسروں کے برابر کام کیا جائے اور محنت کے انعام (یعنی ملکیت) کا بٹوارہ قبول کیا جائے یا محنت کی مشقت میں کم پڑے زیادہ فوائد حاصل کئے جائیں ۔

گھر کا سربراہ بچوں کا والد ہوتا تھا یا بچوں کا دادا، جو پورے خاندان کا منتظم اور نگران تھا ۔ گھر کی خواتین اور مرد مل کر کام کرتے تھے ۔ یہاں ایک اہم بات یاد رہے کہ عموما گھر میں بچوں کی نگہداشت ماں نہیں دادی کرتی تھی یا آیا کرتی تھی کیونکہ ماں تو اپنے شوہر اور دیگر بچوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کر رہی ہوتی تھی ۔ عورت بطور ''فل ٹائم ماں'' کا تصور اس وقت تک عام نہیں تھا۔

پہلے صنعتی انقلاب اور زرعی عہد کے درمیان ایک کم مدتی عہد ایسا بھی ہے جس میں زرعی عہد کی زرعی پیداوار اور پیشہ ورانہ (جیسے دستکاری وغیرہ) پیداوار میں اضافے ، اور مواصلات میں جدت کے سبب تجارتی عہد جنم پاتا ہے جسے مرچنٹ ازم کہتے ہیں (84)۔ اس عہد کے بڑے مسکن شہروں میں تھے ۔ یہ ایک دلچسپ عہد تھا جسے عموما ہمارے دیسی طلباء و دانشور نظرانداز کر جاتے ہیں ۔ اس عہد نے صنعتی عہد کی بنیاد رکھی کیونکہ فرد کو ملکیت رکھنے کا حق اقوام مغرب میں اسی عہد میں ملا اور صنعتوں کے قیام کے بنیادی اسباب بھی اسی عہد میں جنم پاتے ہیں(85) مگر فری مارکیٹ کیپیٹلزم اور مرچنٹائل ازم اس وقت سے اب تک ایک دوسرے سے متصادم ہیں جس کا ہم نے پہلے تفصیل سے ذکر کیا ۔ اسی عہد نے شہری ریاست میں جمہوریت اور بیوروکریسی کا تصور دیا جو زرعی عہد سے بہت مختلف تھا ۔ شہری ریاستوں کی جمہوریت نے نیشن اسٹیٹ کی جمہوریت کا تصور دیا ۔ جدید مغربی فلسفہ کے بانی اسی عہد کے لوگ ہیں ۔ سائنس نے پورے اعتماد اور حوصلہ سے اسی عہد میں سر اٹھایا ۔

اس عہد میں شہروں میں منڈیاں قائم ہوئیں ، بنک قائم ہوئے ، اور دولت کی ریل پیل شروع ہوئی ۔ شہروں میں وہ خاندان مزید سکڑ گئے جو غیر زرعی پیشے سے منسلک تھے کیونکہ وہ اپنی پیداوار میں ایک دوسرے پر کم انحصار رکھتے تھے ، اب خاندان نام تھا میاں بیوی بچے اور ان کے والدین ۔ ان باقاعدہ رشتوں سے باہر کے لوگ خاندان کا حصہ نہیں تھے ۔ ہر غیر زرعی پیشے کی گلڈز تھیں جو معاشی فیصلوں میں خود مختار تھیں ، آزاد تجارت کرتی تھیں ، شہری انتظام میں مددگار تھیں اور عموما شہری منتظم کے انتخاب میں ہر گلڈ کا سربراہ ووٹ دیتا تھا (گلڈ کے سربراہ کا انتخاب بھی گلڈ کے اراکین کے ووٹوں سے ہوتا تھا)۔

دیہات بھی بدلے ، ان میں یہ تبدیلی آئی کہ دیہاتی امراء جو شہروں میں جا کر دنیا بھر سے امپورٹ شدہ چیزیں خریدتے ، جب پیسوں کی کمی ہوتی تو شہری بنکوں سے ادھار لیتے ، اور مزید خرچ کرتے ۔پیسوں کی کمی کے سبب وہ دیہاتوں میں دو کام کرنے لگے ایک یہ کہ زمین بیچ

کر خرچے پورے کرنے لگے – اس وقت حق ملکیت ایک عام فرد کو (جس کا تعلق طبقہ امراء سے نہ تھا) دینا قانونی طور پر آسان نہ تھا – امراء نے اپنی فروختگی کو قابل عمل بنانے کے لئے خود ہی پارلیمان اور مقننہ کے دوسرے ذرائع سے یہ قانون پاس کروایا کہ کوئی بھی شہری زمین خرید کر جائیداد رکھنے کا اہل ہے – دوسرا اس دور میں انسانی حقوق کے کارکنوں اور فلاسفہ نے بھی بھرپور تحریک سے حق ملکیت کی حمایت کی – مغربی لبرل ازم کی تاریخ میں حق جائیداد کی تحریک کا یہ نقطہ آغاز ہے–

جوں جوں امراء اپنی فضول خرچیوں کے سبب زمین بیچتے گئے ویسے ویسے کسانوں میں یہ ترغیب و تحریک بڑھتی گئی کہ زیادہ سے زیادہ سرپلس پیدا کریں ، مقررہ مقدار میں پیداوار لارڈ کے حوالے کرنے کے بعد جو بچ جائے اسے شہری منڈیوں میں بیچ کر اپنے لئے زمین خرید لیں – یوں جیسے جیسے جائیداد کا اشتیاق بڑھا ،ویسے ہی خاندانی ادارے میں تبدیلی آئی – اب کوئی پسند نہیں کرتا تھا کہ وہ اپنی محنت و صلاحیت سے جائیداد خریدے مگر وہ زیادہ حصوں میں تقسیم ہو اس لئے شہروں کی طرح دیہات میں بھی خاندان سکڑ گئے–

دیہاتوں میں دوسری تبدیلی صرف مردوں سے متعلق بھی تھی – امراء نے اعلان کر دیا کہ جو غلام یا سرف اتنی رقم اگر ہمیں دے دے تو ہم اسے پروانہ آزادی دے دیں گے – اس سبب محنت کی ترغیب میں اضافہ ہوا ، لوگوں نے پیسے بچا کر پروانہ آزادی حاصل کیا اور مزید محنت کر کے جائیداد خریدی اور آزاد شہریت کا آغاز ہوا–

یہاں اہم بات یہ کہ ترغیبات و محرکات کے سبب دیہاتوں میں جتنا پیداواری عمل تیز ہوا ، اتنا ہی شہروں کی منڈیوں میں زیادہ سامان لایا گیا جس کی وجہ سے شہر مزید امیر ہوئے اور اسی شہری معیشت سے صنعتی انقلاب نے جنم لیا–

صنعتی انقلاب نے مرچنٹ ازم کی کوکھ سے جنم پایا مگر چار اہم عوامل کی مدد سے –

1. پراپرٹی رائٹس (حق ملکیت) کے سبب جس میں Patent رائٹس کو بھی بہت اہمیت ملی –
2. سائنسی انقلاب جس نے تخلیق و پیداوار کے عمل میں بھرپور مدد کی –
3. مارکیٹ کو ایک باقاعدہ اور بھرپور انداز میں قائم ہونا – مگر یہ بھی ہے کہ مارکیٹ ہنوز غیر پختہ تھی کیونکہ اس پر بادشاہ و امراء کا تصرف موجود تھا -
4. دیہات سے آنے والی سستی لیبر–

صنعتی انقلاب سے پہلے شہری معیشت میں پیداواری مراکز گھر ہوتے تھے جس میں پورا خاندان بچے بوڑھے عورت مرد سب مل کر کپڑے سازی اور دوسری چھوٹی صنعتوں میں کام کرتے تھے جن پر گلڈز کی اجارہ داری تھی – اسی طرح دیہات کی معیشت میں بھی پورا خاندان کھیتوں میں کام کرتا تھا اس دوران دو بڑی تبدیلیاں آئیں جس نے خاندان کی ساخت پر مزید اثر ڈالا–

ایک یہ کہ شہری معیشت کی پیداوار اب گھر سے فیکٹری اور مل میں منتقل ہو گئی – وہ تمام لوگ جو پہلے گھر میں کام کرتے تھے اب وہ وہاں سے فیکٹری میں کام کرنے جانے لگے – دوسری طرف یہ کہ جدید سائنسی ایجادات اور مشینوں کے سبب اب لارڈ (جاگیردار) خود ساری زمین کو کم کسانوں کی مدد سے کاشت کرنے کے قابل ہو گئے – تیسرا مارکیٹ میں کپاس کی بہت زیادہ طلب تھی جس سے کھڈیوں کی صنعت میں کپڑا بنتا تھا ، یوں زیادہ کپاس کی کاشت کے لئے فیوڈل لارڈ نے یہ کیا کہ وہ ساری زمین جس پر بے زمین کسان رہتے تھے اسے قابل کاشت بنانے کے لئے جو ضرورت سے زائد کسان لیبر تھی اسے کھیتوں سے بے دخل کر دیا – یہ لوگ روزگار اور سکونت کے لئے جگہ کی تلاش میں شہروں میں امڈ پڑے –

اس وقت شہروں میں صنعت محدود تھی مگر وہ سارے بے روزگار لوگ جو دیہات سے اور شہری گھرانوں سے اٹھ کر شہر آ گئے تھے ان کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی اس سے ایک سنگین انسانی بحران پیدا ہوا – شہر جو آزاد سیاسی انتظام پر چل رہے تھے ان کی انتظامیہ نے ایک بڑی تعداد کو شہروں میں داخل نہ ہونے دیا – وہ بے چارے نہ واپس دیہات جا سکتے تھے اور نہ شہروں میں داخل ہو سکتے تھے ...یوں بھوک اور بیماریوں کے سبب بہت زیادہ اموات ہوئیں اور لوگ بھکاری بنے سڑکوں پر پڑے ملتے – حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کسی کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا کہ آخر ہو کیا گیا ہے ؟ اور یہ انسانی بحران جنم کیسے پایا ہے ؟ –

پاؤل Mantoux اپنی کتاب میں ملکہ Elizabeth کے سفر کے بارے لکھتا ہے جو اس نے اپنی سلطنت کا جائزہ لینے کے لئے کیا ، وہ لکھتا ہے کہ ملک کی حالت دیکھ کر ملکہ چلائی۔

Paupers are everywhere, what has happened in the interim?

(ہر طرف بھکاری ہیں ، میرے گزشتہ اور اس سفر کے دوران آخر ایسا کیا ہو گیا ہے ؟)(86)

اس سے مزید دو تبدیلیاں رونما ہوئیں، ایک یہ کہ زیادہ رسد اور کم طلب کے سبب مزدوری یعنی اجرتیں (wages) گر گئیں جس کے سبب صنعتکاروں کو زیادہ نفع ہوا ، انہوں نے مزید انویسٹمنٹ کی اور مزید نفع کمایا – انڈسٹری میں اس پھیلاؤ میں کچھ مدت لگی اور جیسے ہی مزدوروں کی رسد اور طلب تقریبا برابر ہوئی مزدوروں کی اجرت میں اضافہ ہونا شروع ہوا – اجرتوں میں اضافہ جاری رہا اور جلد ہی وہ وقت آ گیا کہ ایک فرد اپنی محنت سے اتنا کما سکتا تھا کہ اس کے بچوں اور بیوی کو فیکٹریوں اور ملوں میں کام کرنے کی ضرورت نہ رہی – یہ تاریخ میں پہلی بار ہو رہا تھا کہ ایک ماں معاشی محنت سے آزاد ہو کر اپنے گھر میں خود کو گھریلو زندگی کے لئے وقف کر سکتی تھی – جب کہ اس سے پہلے اگر وہ گھر میں کھڈیوں پر کام کرتی تھی تب بھی وہ ایک مزدور تھی ، اور جب وہ کھیتوں میں کام کرتی تھی تب بھی وہ محنت کش تھی – مگر اب اس کا گھر میں کام کاج رضاکارانہ تھا جو خاندان کے لئے وقف تھا ، وہ منڈی کی معیشت سے ایک حد تک باہر نکل گئی – چونکہ اب دادی کی جگہ بچہ کی نگہداشت اور تربیت میں ماں کا کردار بڑھ گیا تو اس کا اثر یہ ہوا کہ دادی پوتا پوتی سے دور ہو گئی اور خاندان مزید سکڑ گیا۔

دوسرا اثر یہ ہوا کہ صنعتی ترقی نے خاص طور پر صنعتی انقلاب دوم کے بعد جب خام مزدور (Raw Labor) کی جگہ بڑی بڑی مشینوں نے لے لی اور افرادی قوت کی جسمانی طاقت کے بجائے ذہنی اور تخلیقی طاقت کی ضرورت مینوفیکچرنگ اور خدمات کی پھیلتی ہوئی مارکیٹ میں پڑی تو وہ بچے جو فیکٹری اور مل سے باہر ہو گئے تھے اور بچپن کے مزے لوٹ رہے تھے ، ان کے لئے ان کے والدین کو لازمی تعلیم کی ضرورت محسوس ہوئی وگرنہ وہ مارکیٹ میں اپنی روزگار حاصل کرنے میں ناکام رہ جاتے – جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم کی ترغیب پیدا ہوئی اور صرف دو نسلوں میں پورا صنعتی یورپ تعلیم یافتہ ہو گیا– تعلیم میں یہ پھیلاؤ مارکیٹ کی ڈیمانڈ کی وجہ سے ہے جب مشینوں نے جسمانی طاقت کی جگہ لے کر ذہنی طاقت یعنی علم و مہارت کی طلب پیدا کی – یہ بلند تر شرح خواندگی نہ گورنمنٹ کی کسی منصوبہ بندی کے سبب پیدا ہوئی اور نہ ہی کوئی سوشل تحریک اس کا سبب بنی ہے جب تعلیم گورنمنٹ کی نہیں بلکہ والدین کی ذمہ داری تھی ، تعلیم مکمل طور پر پرائیویٹ تھی اور ریاستی بیانیہ نصاب کی صورت میں بچوں کے ذہنوں پر ٹھونسا نہیں جاتا تھا–

تیسری طرف وہ خواتین جو گھروں میں کام کرتی تھیں ان کے لئے بجلی سے چلنے والے آلات نے روزمرہ کے گھریلو کام کو مزید آسان بنا دیا – وہ جب گھریلو کاموں کی مشقت سے نکلیں تو زیادہ سوشل ہو گئیں کیونکہ فالتو وقت اب انہیں میسر تھا، مگر انہوں نے مارکیٹ میں جانے کے بجائے سماجی کاموں میں شمولیت زیادہ پسند کی – چرچ کی تقریبات ہوں یا کمیونٹی پروگرام ، بچوں کے سکول میں کوئی تقریب ہو یا کوئی شادی بیاہ کی تقریب یا دکھ سکھ ان میں خواتین کی شرکت لازم ہو گئی – اس وقت ایک ترتیب مقبول تھی کہ والدین مارکیٹ میں ، ماں گھر اور کمیونٹی میں ، اور بچہ اسکول اور کھیل کے میدان میں–

چوتھی چیز یہ کہ گھر کا تصور ہی بدل گیا – صنعتی انقلاب سے قبل گھر پیداواری مرکز تھا ، انقلاب کے بعد یہ خرچ consumption) (کی جگہ بن گیا – گھر کا تصور رومانوی بن گیا – اب مرد مارکیٹ کی ان تھک محنت سے تھکا ہارا آتا تو گھر اور بیوی اسے راحت دیتی – بچہ ماسٹر کی سختیوں میں گھر کے رومانس میں کھو جاتا – گھر کا سارا انتظام ماں کے پاس تھا ، وہ اس کی مینجر تھی – باپ کے لئے گھر ایک ریلیف سنٹر تھا سارے دن کا تھکا ہارا وہ یہاں آ کر سکون پاتا –بچہ کی یہاں تربیت ہوتی کہ وہ مستقبل کا بہترین مینیجر یا انٹرپرینیور ()Entrepreneur بنے اور بدلتے سماج میں اپنا بہترین کردار ادا کرے–

پانچویں تبدیلی یہ آئی کہ فرد کی آمدن میں صنعتی انقلاب سے بہت زیادہ فائدہ ہوا – یہ اضافہ اس قدر تھا کہ ماہرین شماریات کے مطابق خود کارل مارکس کی وفات کے وقت جب اس کی عمر 65 برس تھی اس کی پیدائش کے دن سے اس وقت تک (ان 65 سالوں میں) عام ورکر کی آمدن میں تین گنا اضافہ ہوا تھا – (87)

فرد اتنی دولت کما رہا تھا کہ وہ اس میں سے کچھ حصہ اپنے بڑھاپے کے لئے محفوظ رکھ سکے – پرائیویٹ پنشن اور انویسٹمنٹ سکیمز کا اجراء ہوا جس میں باپ اپنی تنخواہ کے مطابق رقم محفوظ کرتا تاکہ زندگی میں کسی ناگہانی صورتحال اور بڑھاپے کے معاشی مسائل سے محفوظ رہے – انیسویں صدی بنکنگ اور فنانشل سیکٹر کے عروج کی صدی ہے ، اور دلچسپ بات یہ کہ بغیر حکومتی ضمانت اور نگرانی کے یہ صدی فنانشل بحرانوں سے تقریبا محفوظ ہے – معاشی منصوبہ بندی نے معاشی طور پر باپ کو اپنی بالغ اولاد پر انحصار سے ایک حد تک آزاد کر دیا – والدین بچہ کی تربیت کرتے ، جب وہ بالغ ہو کر اور تعلیم مکمل کر کے مارکیٹ میں روزگار حاصل کرتا اور شادی کرتا تو والدین سے خوشی خوشی علیحدہ ہو جاتا – معاشی فکر و اندوہ کی غیر موجودگی نے اخلاقیات کو بھی بدل دیا – اب بچہ دادی کا نہیں ماں کا تھا ، بچہ کی سماجی تربیت دادا نہیں باپ کرتا تھا ، یوں دادا اور دادی کا تعلق پرائمری نہیں بلکہ ثانوی اہمیت اختیار کر گیا–

یہ جس صدی کی ہم باتیں کر رہے ہیں یہ انیسویں صدی ہے – اب ہم بیسویں صدی میں داخل ہوتے ہیں جس میں مزید تبدیلیاں آتی ہیں مگر یہ انیسویں صدی کی تبدیلیوں کا تسلسل ہیں – انیسویں صدی میں پیداوار سرمایہ اور محنت پر انحصار کرتی تھی ، بیسوی صدی میں ان دونوں عوامل کی اہمیت کم ہوتی گئی اور ان کی جگہ آئیڈیاز اور کارجوئی (Entrepreneurship) کی اہمیت بڑھتی گئی – مارکیٹ کو اب نہ سرمایہ کی ضرورت تھی اور نہ خام محنت کی ، اسے تخلیقی صلاحیتوں ، پیداواری قابلیت ، دریافت ، ایجاد ، اور نئی چیز یا خدمت کی تلاش تھی اور اب اس کے سامنے مرد و عورت کی تقسیم نہیں بلکہ اسے ٹیلنٹ کی تلاش تھی–

یہاں ایک بات یاد رہے کہ انیسویں ، بیسویں اور جاری اکیسویں صدی کے صنعتی عہد نے خاندان کی بنیاد کو کسی جبر کا پابند نہیں رکھا بلکہ اس کی بنیاد رضاکارانہ بنا دی ہے- کیونکہ ایک عورت ہو یا مرد معاشی طور پر وہ آزاد ہیں ، وہ کہیں بھی جا کر روزگار حاصل کر کے اپنی زندگی جی سکتے ہیں – آج کی پیداوار نہ قبائلی ہے اور نہ خاندان اس کی اکائی ہے بلکہ یہ حیثیت فرد کو حاصل ہو گئی ہے اور مارکیٹ فرد کے انتخاب میں صنفی امتیاز کی قائل نہیں اسے تو پیداواری صلاحیت کی طلب ہے – اب میاں بیوی کا تعلق مجبوری نہیں بلکہ محبت اور انسیت کا آرزو مند ہے –

یہاں ایک پیچیدگی بھی در آئی ہے جس کا اظہار لازم ہے –کلاسیکل لبرل ازم کی خواہش ہے کہ خاندان کے ادارے کو بقا ملے کیونکہ بچوں کی پرورش میں والدین کا کوئی متبادل نہیں اور بچہ کی بہتر نشوونما سرکاری بیوروکریٹ نہیں بلکہ والدین ہی کر سکتے ہیں – دوسری طرف یہ اصول بھی قائم ہے کہ خاندان کی بنیاد محبت پیار اور رضاکارانہ اشتراک پر ہو ، اس میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا – یوں میاں بیوی کے مابین باہمی تعلق کے درمیان محبت و رضامندی کے تعلق کی لازمی شرط اور بچوں کی ناگزیر تربیت و نشوونما چیلنجز پیدا کرتی ہے جس سے انتہائی سنجیدگی اخلاص اور احتیاط سے نمٹنا لازمی ہے – یہ چیلنجز میاں بیوی کے رشتہ میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کا حل بھی صرف میاں بیوی کے پاس ہے ، رشتہ کے تحفظ کے نام پر ریاست یا سماج کوئی جبر ان پر نافذ نہیں کر سکتا–

شادی دراصل مرد و عورت کا ایک دوسرے کے عہد وپیمان میں آنے کا نام ہے ، اس کے لئے تمام مذاہب اپنا اپنا بندوبست قائم کرتے ہیں تو معاشرے اپنے رسم و رواج کی ریت نبھاتے ہیں ، اور قانون کا بھی اپنا منفرد انداز ہے – مگر ان سب کے ہاں بھی باہمی خوش دلانہ عہد وپیمان ہی شادی کی بنیاد ہے – صنعتی انقلاب جتنا جدید ہوتا جا رہا ہے اتنا ہی شادی کی یہ صورت کم رسمی اور کم مدتی ہوتی جا رہی ہے – قانونی شادی میں آنے کی ایک رکاوٹ بعد از طلاق جائیداد کی تقسیم بھی ہے تو مستقبل کی غیر یقینیت بھی کہ جانے شادی کب تک چلے – اسی طرح کیتھولک چرچ سے وابستہ لوگوں کے لئے بھی شادی ، طلاق اور پھر دوسری شادی سے متعلق پیچیدگیاں بھی موجود ہیں–

مارکیٹ کی معیشت میں یقینا خواتین کو مردوں کے مقابلے میں روزگار کے مسائل کا سامنا ہے جن میں سے پہلا مسئلہ کاروباری اداروں کی طرف سے یہ غیر یقینیت ہے کہ آیا جاب کے لئے امیدوار خاتون زیادہ مدت کے لئے جاب جاری رکھ پائے گی یا جلد ہی گھریلو زندگی کو ترجیح دے کر گھریلو بیوی بننا زیادہ پسند کرے گی یوں ٹریننگ اور طویل عرصہ کے لئے تجربہ دینے کی ترغیب میں کمی آجاتی ہے جب کہ یہ مسئلہ مردوں کے سلسلے میں نہیں ہوتا –اسی طرح بچہ کی پیدائش کے بعد میٹرنل چھٹیاں (Maternal Leaves) اور بعد از پیدائش خاتون کی بچے کے لئے توجہ میں اضافہ بھی ایک کمپنی کے لئے اس فیصلہ میں پیچیدگی کا یقینا سبب بنتا ہے کہ آیا جاب کے لئے امیدوار خاتون کو مرد امیدوار پر ترجیح دی جائے یا نہیں –ٹیکسز کے بھی مسائل ہیں جیسے ہاؤس ہولڈ لیول (گھرانہ کی بنیاد) پر انکم ٹیکس جو گھر کے دو افراد کے لئے جاب کی ترغیب میں کمی لاتا ہے – وغیرہ وغیرہ

ایسا ہر گز نہیں کہ وہ مغربی خواتین جو کسی روزگار سے منسلک نہیں وہ بالکل ہی گھریلو ہوتی ہیں بلکہ ان کی اکثریت فارغ اوقات میں یا تو مفت سماجی بہبود کے نجی اداروں میں کام کرتی ہے جیسے اولڈ ہاوسز میں نرسنگ یا پارٹ ٹائم ٹیچنگ یا کسی موضوع پر تحقیق یا کچھ اور-

یہ اور اس طرح کے دیگر بہت سارے اسباب ہیں جو ایک طویل تاریخی ارتقاء سے گزرے ہیں اور جنھوں نے دور حاضر کے فیملی سسٹم کو جنم دیا ہے – یہ سب سماج کی آزاد حرکت یعنی ارتقاء کے سبب ہے – راقم کی رائے میں جس سبب نے بنیادی کردار ادا کیا ہے وہ معیشت ہے ، طریقہ پیداوار ہی دراصل معاشرت کو نئے رنگ دیتا آیا ہے-

ہم اہل پاکستان ، ایک ایسے تمدن میں رہتے ہیں جو زرعی اور صنعتی عہد کے مابین لٹکا ہوا ہے – جب مادی حالات بدلیں گے اور سوسائٹی زیادہ سے زیادہ اوپن ہو گی تب اخلاقیات بھی یقینا نئی جہت سے روشناس ہو گی –مثال کے طور پر ایک خاتون جو معاشی طور پر خود کفیل ہو وہ زیادہ آزاد ، نڈر اور بااعتماد ہوتی ہے .... یہ ہماری نیم زرعی اور نیم صنعتی ثقافت کی بدولت ہی ہے کہ ہم خاندان کے ایک مخصوص تصور کو جبر و تشدد سے قائم رکھنا چاہتے ہیں –

ہر وہ چیز جسے اپنے قیام کے لئے جبر کی ضرورت ہو وہ جلد ہی معدوم ہو جاتی ہے ۔آیئے کہ ہم فرد کی شخصیت اور خاندان کے ادارے کو تجزیاتی سائنس سے سمجھنے کے ساتھ ساتھ انسان دوستی اور نفسیات کے حوالے سے بھی سمجھیں ، معاشرت کی بنیاد باہمی اعتماد اور رضاکارانہ تعاون پر رکھیں ، اور کسی بھی انسان پر (چاہے اس کا تعلق کسی بھی مذہب نسل زبان قومیت ثقافت اور صنف سے ہے) اگر ظلم ہو رہا ہے تو اس کے خاتمہ کو اپنا مقصود و منشور بنائیں نہ کہ کسی مفروضہ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انسانوں کی بھینٹ دینے کو ہی مشرقیت کا تقاضا سمجھ لیا جائے۔

6. خودانتظامی کی صلاحیت سے مالامال سوسائٹی ہی دراصل آزاد سوسائٹی ہے

جس سوسائٹی سے خود تنظیمی کی صلاحیت چھین لی جاتی ہے وہاں قانون کی افراط ہوتی ہے دور جدید کا المیہ یہ ہے کہ جوں جوں سماج میں پیچیدگی بڑھ رہی ہے ویسے ویسے ریاست اندرونی و بیرونی سیکورٹی اور ایمر جنسیز میں بطور محافظ (savior) کے سامنے آکر فرد اور سوسائٹی کی آزاد حیثیت کو کم کرتی جارہی ہے۔مثال کے طور پر جنگ عظیم اول،دوم، گریٹ ڈپریشن، سول رائٹس تحریک،ویت نام جنگ اور نائن الیون کے واقعات اگر غور سے مشاہدہ کئے جائیں تو امریکہ میں یہ سب ریاستی فاشزم کے نتیجے میں سامنے آئے ہیں مگر ریاست مسائل اور بحران کی بذات خود وجہ ہونے کے باوجود بھی ان مسائل کے حل میں فرد اور سوسائٹی سے ان کی آزادی چھین کر انہیں سزا دیتی ہے۔

پاکستان میں بھی جو مذہبی شدت پسندی ہے کیا ہم نہیں جانتے کہ یہ ریاست کی تکفیری گروہوں کی سرپرستی کی وجہ سے ہے ورنہ ہماری سوسائٹی تو صوفیانہ اقدار کی حامل تنوع پسند اور بھائی چارہ کی ثقافت کا نمونہ تھی۔یقینا اس میں بھی کچھ مسائل تھے مگر یہ اس درجہ کی شدت پسند ہرگز نہ تھی۔یہ شدت پسندی ریاست کی تکفیری گروپوں پر فارن پالیسی اثاثوں کے نام پر سرپرستی کی وجہ ہے۔ شدت پسندی کے اس مسئلہ کا حل یہ تھا کہ سوسائٹی کو ان گروہوں کے جبر سے آزاد کروایا جاتا اور فرد و سوسائٹی کے رضاکارانہ تعلق کو خوب پھلنے پھولنے دیا جاتا تاکہ بھائی چارہ اور باہمی محبت و اخلاص ہماری ثقافت کو رنگین سے رنگیں تر بنا دیتے ۔ مگر نیشنل ایکشن پلان قسم کی منصوبہ بندیوں سے ریاست کے شخصی آزادیوں پر تسلط اور سماج پر قانون کی آڑ میں مزید گرفت بڑھائی گئی ہے۔

ایک دیسی پاکستانی سوشل کنٹریکٹ کی ضرورت؟

سوشل کنٹریکٹ ایک سیاسی فلسفہ ہے جس میں ہم ریاست، سول سوسائٹی، اور فرد کے حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہیں۔ اس نظریہ کی سرگوشیاں یونانی سوفسطائیوں سے سنی جا سکتی ہیں مگر اسے بطور سیاسی فلسفہ تھامس ہابس نے متعارف کروایا۔ یہ سترھویں صدی کا ایسا سیاسی موضوع ہے جس نے جدید لبرل ازم کی بنیاد رکھی اور فرد کے حقوق و فرائض کو سیاست کا مرکزی موضوع بنایا۔ ریاست، سیاست اور معیشت کے تناظر میں فرد کا جائزہ لیا گیا اور دانشورانہ مکالمہ کو ایک سمت ملی۔

فلسفی تھامس ہابس نے علمی و فکری بنیادوں پر حقوق و فرائض میں تقسیم کی۔ اس کے مطابق آزادی فرد کا بنیادی حق ہے، اور قانون آزاد فرد کے فرائض مقرر کرتا ہے۔ اس نے فطری حقوق سے یہ مراد لیا کہ ہم سب کو یہ حق حاصل ہے کہ ہم جو چاہیں کریں، جبکہ اس کے نزدیک فطری قوانین سے مراد ہے کہ قوانین ہمیں یہ بتائیں کہ حقیقتا ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ لوگ حکومت اس لئے قائم کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کو تحفظ ملے یوں ریاست ان سے زندگی نہیں چھین سکتی۔ حکومت کا اختیار صرف اتنا ہے جتنا عوام اسے دیں۔ اس کا کہنا تھا کہ سماج افراد کے باہمی اعتماد، تعاون، اور اشتراک سے بنتا ہے اور یہی تین عوامل سوشل کنٹریکٹ کی بنیاد ہیں۔ (88)

ہابس کے کام کو جس نے جدت دی اور اسے مغربی سیاسی سماجی اور معاشی مکالمہ میں بلندیوں تک پہنچایا وہ جان لاک ہے۔ سوشل کنٹریکٹ کے اسی تصور کی وجہ سے لاک کو لبرل ازم کا بانی مانا جاتا ہے۔ اس کے کچھ خیالات درج ذیل ہیں۔(89)

- لوگ یہ فطری حق رکھتے ہیں کہ اپنی زندگی، آزادی، اور جائیداد کا دفاع کریں اور ریاست اس لئے قائم کی جاتی ہے کہ وہ فرد کے ان بنیادی حقوق کا تحفظ کرے۔ ریاست کے پاس صرف اتنی طاقت ہو کہ ان ذمہ داریوں کو سرانجام دے سکے۔ اگر کوئی حکومت ان تین بنیادی حقوق کا تحفظ نہیں کرتی تو ایسی حکومت کو تحلیل کر کے نئی حکومت قائم کی جائے۔ لاک فرد کے فطری حقوق اور فطری فرائض (یعنی قانون) میں امتیاز نہیں کرتا۔ اس کی رائے میں قانون فرد کے فطری حقوق کے تحفظ کے لئے ہی قائم کیا جاتا ہے۔

- جائیداد اس لئے ہر فرد کا بنیادی حق ہے کہ ہر فرد اپنی محنت، شوق،اور فطری استعداد کو استعمال کر کے اسے حاصل کرتا یا کماتا ہے۔ آپ کی محنت، آپ کا شوق، اور آپ کی ذہنی استعداد آپ کی ملکیت ہے اور یقینا ان تینوں سے حاصل شدہ نتیجہ بھی آپ کی ہی ملکیت ہے۔ اسی طرح محنت اپنے ساتھ سرمایہ، ٹیکنالوجی یا کوئی اور "ان پٹ" بھی اگر شامل کرتی ہے تو اس سے حاصل نتیجہ بھی آپ کی ذاتی ملکیت ہے اور اس پر آپ کا فطری حق مسلم ہے۔

- انصاف پر قائم حکومت اسے کہتے ہیں جو ان لوگوں کی مرضی کے تابع ہو جن پر حکومت کی جا رہی ہو۔ اگر کوئی بھی ایسی گورنمنٹ جو لوگوں کی مرضی کی تابع نہیں وہ ایک تخریبی ریاستی بندوبست ہے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ ایسی حکومت کی اطاعت چھوڑ دیں، اسے تحلیل کر دیں، بدل دیں، اور نئے آئین کی بنیاد ڈالیں جو زندگی، آزادی،اور ملکیت کا تحفظ کر سکے۔ یہی وہ نظریہ ہے جس نے سول نافرمانی کی

تحریک کو نظریاتی بنیاد دی۔ امریکی انقلاب و انقلاب فرانس میں اسی نظریہ کی گونج پورے امریکہ میں رہی تو لوتھر کی سول نافرمانی کی تحریک میں لوتھر بھی اسی نظریہ کو بار بار دہراتا رہا۔

لاک کی خوش قسمتی ہے کہ اسے جان سٹارٹ مل، بینتھم، اور والٹیر جیسے پیشرو ملے جنھوں نے اس کی فکر میں تضادات کو دور کیا اور اس کے کام کو بہترین انداز سے آگے بڑھایا۔

لاک کے بعد سوشل کنٹریکٹ کے نظریہ پر روسو نے کافی کام کیا۔ روسو کا کہنا تھا کہ ہم قوانین کی تشکیل و ترتیب کے وقت اپنی آزادی کو سرنڈر کرتے ہیں اور خود کو اس کی پابندی میں دے دیتے ہیں، اسی لئے حکومت کا بھی اخلاقی فرض ہے کہ لوگوں کی مرضی کی پابندی کرے۔ **(90)**

یاد رہے کہ روسو اور لاک کا سوشل کنٹریکٹ کا تصور کافی مختلف ہے،یہی سبب ہے کہ والٹیر اور روسو کا نظریاتی مکالمہ کافی تند و تیز رہا۔

سوشل کنٹریکٹ پر نظریاتی کام یقینا ان تین صاحبان کا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ سترھویں صدی سے اب تک کا سیاسی سماجی اور معاشی مکالمہ اس بنیادی بحث کے گرد گھومتا رہا ہے کہ ریاست کیا ہے اور اس کے فرائض کیا ہیں ؟ سول سوسائٹی کا کیا کردار ہے اور خاص طور پر افراد جن سے معاشرہ قائم ہوتا ہے ان کے حقوق کیا ہیں، حقوق اور فرائض کا باہمی تعلق کیا ہے، قوانین کیوں قائم کئے جاتے ہیں،ان قوانین کی بنیاد کیا ہے، اور انصاف پر مبنی قوانین کون کون سے ہیں اور کون کون سے نہیں ؟

جنگ عظیم دوم تک امریکہ و برطانیہ میں لاک کا تصور سوشل کنٹریکٹ زیادہ تر رائج رہا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد ریاست نے بہت سارے امور اپنے فرائض میں لے لئے جیسا کہ ہر فرد کا معاشی تحفظ۔ اداروں پر ادارے بنائے گئے، اور کلاسیکل لبرل ازم کا یہ تصور کہ "اچھی حکومت وہی ہے جو اپنے دائرۂ کار اور فرائض میں چھوٹی مگر مؤثر ترین ہو " کی جگہ اچھی گورنمنٹ کا ایسا تصور سامنے آیا ہے جو معیشت ثقافت اور سیاست سمیت تمام شعبہ جات میں آپ کی نگران مددگار اور محافظ ہو۔ مگر اس سے ان کا قدیم شہری ڈھانچہ کافی متاثر ہوا ہے اور شخصی آزادیاں کمزور ہوئی ہیں۔ مغرب کا دانشورانہ مکالمہ سوشل کنٹریکٹ کے نئے ڈھانچہ پر خوب غور و خوض کر رہا ہے اور یقینا یہ ایک جاری عمل ہے۔

راقم پاکستانی سیاسی تاریخ کے مطالعہ اور عصر حاضر کے چیلنجز کی سمجھ بوجھ سے اس نتیجے پر پہنچا جا سکتاہے کہ پاکستان میں جمہوریت اٹل ہے۔ اب نہ کوئی شب خون پاکستانی شہریوں سے زیادہ تر عرصہ تک ان کا بنیادی جمہوری حق چھین سکتا ہے اور نہ ہی کسی تھیوکریسی کا کوئی امکان ہے۔ سوال یہ ہے کہ

- کیا جمہوریت کی منزل کا حصول ہماری آخری منزل ہے ؟
- کیا سیاست سماج اور معیشت کی دیگر آزادیاں یہاں محفوظ ہیں ؟

ریاست کا کام یہاں بے لگام ہے، سول سوسائٹی کو ہی نہیں معلوم کہ وہ اپنی اصل میں کس اہمیت کی چیز ہے۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں کہ یہاں شہریوں کی اکثریت اپنی سول آزدیوں (یعنی سول سوسائٹی کے تصور) پر ہنستی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مؤثر سول سوسائٹی کے بغیر موثر جمہوریت بھی ناممکن ہے۔ فرد کیا ہے، اس کے بنیادی حقوق کیا ہیں، اور فرائض کا تعین کیسے ہو یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جن کے بغیر نہ لبرل ازم ممکن ہے اور نہ سوشل ازم۔ ہمیں سوشل سائنسز کے میدان میں مؤثر کام کرنا ہو گا، اصطلاحات کے لغوی معانی کی بحث نتیجہ خیز نہیں بلکہ تصورات پر بحث نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ ہمیں ڈکشنری لکھنے کے بجائے بنیادی تصورات پر محنت کرنی ہو گی۔ ہمیں اپنے سماج میں سوشل کنٹریکٹ کے سوال، معانی، تشریحات، اور مختلف تناظرات کو زندہ کرنا ہوگا تب ہی بہترین مستقبل کے امکانات کے در کھلیں گے۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنی جغرافیائی، علمی، اور مذہبی تاریخ سے بھی مدد لینی چاہیئے، اقوام مغرب سے بھی، مشرقی ایشیا خصوصاً جاپان اور دنیا کے باقی خطوں سے بھی۔ مثال کے طور پر جاپان جہاں فرد کو آزادی ملی، سیاست سماج اور معیشت میں لبرل ازم قائم کیا گیا۔ اہل مغرب کے علوم و فنون اور صنعت کاری کو اپنایا گیا،اس میں جدت لائی گئی مگر اپنی مقامی شناخت قائم رکھی گئی۔ اگر ہمارا سماج اپنی دیسی شناخت کو قائم رکھنا چاہتا ہے تو جاپان ایک اچھا کیس اسٹڈی ثابت ہو سکتا ہے کہ کس طرح آزادیوں کو بھی فروغ ملے، مادی ترقی بھی عروج پر پہنچے اور ثقافتی رنگ روپ اور اس کی روح بھی دیسی رہے۔ دیکھئے سو باتوں کی ایک بات یہ کہ سوشل کنٹریکٹ ایک جگہ سے کاپی کر کے دوسری جگہ نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا سوشل کنٹریکٹ ہماری اپنی تاریخ اور سماجی حقائق سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے اور اس کا آزادانہ و رضاکارانہ بنیادوں پر ہماری سوسائٹی میں جنم ہو ، نہ کہ کسی آمرانہ منصوبہ بندی سے اسے نافذ کیا جائے - وگرنہ مثبت نتائج کا حصول ناممکن ہے۔

پاکستان اور بھارت کی عوام کو تجارت ہی قریب لا سکتی ہے -

یونیورسٹی آف ٹیکساس کے پروفیسر پیٹرک جے میکڈونلڈ بین الملکی تنازعات کے مطالعہ میں ایک بڑا نام ہے۔ انھوں نے دنیا کے تمام ممالک کی خارجہ پالیسی کا ان کی گزشتہ چالیس برس کی تاریخ کے حوالے سے تجزیہ کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ آزاد تجارت اور امن میں مثبت تعلق

پایا جاتا ہے۔وہ دو ممالک جو تنازعات میں گھرے ہوئے ہوں اگر باہمی تجارت کا آغاز کرتے ہیں تو آہستہ آہستہ ان کے تعلقات دوستانہ ہوتے جاتے ہیں۔ وہ اس کے تین اسباب بتاتے ہیں:

ایک :مصنوعات کا تبادلہ ثقافتی رابطوں کی راہ ہموار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک عرصہ تک امریکی چینیوں کو پراسرار اجنبی اور بداندیش سمجھتے تھے، لیکن جب دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کا آغاز ہوا، لوگ ملنے جلنے لگے تو ان کے درمیان اجنبیت آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ اب دونوں ثقافتیں ایک دوسرے کو سمجھتی ہیں۔ ایک طرف امریکی اگر چینی ثقافت کو سمجھنے لگے ہیں تو دوسری طرف چینیوں کی نئی نسل جمہوریت اور مغربی اقدار کی زیادہ قدردان پائی گئی ہے۔ ان دونوں ثقافتوں کو باہم قریب لانے میں آزاد تجارت کا مرکزی کردار ہے۔

دوم : بین الملکی تجارت ترغیب و تحریک پیدا کرتی ہے کہ جنگ کو ہر صورت میں روکا جائے کیونکہ اس سے تجارت کا نقصان ہے۔ مثال کے طور پر چین امریکہ کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر ہے۔ اگر ان دونوں کے درمیان جنگ چھڑنے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے تو دونوں طرف کے تاجر اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرکے اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ حکومتوں کی کارکردگی میں اس ریونیو کا بڑا کردار ہے جو حکومتیں ٹیکسوں کی صورت میں اپنے شہریوں سے وصول کرتی ہیں۔ ترقی یافتہ معیشت میں یہ ٹیکس بزنس سیکٹر سے وصول کیا جاتا ہے۔ حکومتیں بھی نہیں چاہتیں کہ ان کے ملک میں کسی بھی غیر یقینی صورت حال کے سبب معاشی سرگرمیاں کم ہونکیونکہ اس صورت میں حکومت کو کم ریونیو اکٹھا ہوگا اور بے روزگاری میں اضافہ ہوگا۔

سوم : دو ملکوں کے درمیان تجارت ان کی حکومتوں میں باہمی تعاون اور اعتماد کی ضرورت پیدا کرتی ہے جس سے امن و دوستی کی طرف پیش قدمی آسان ہو جاتی ہے۔
مثال کے طور پر اگر پاکستان اپنے کسی تجارتی پارٹنر، فرض کیا بھارت کی مصنوعات کی امپورٹ پر ٹیرف لگاتا ہے تو وہ مصنوعات پاکستان میں آنا کم ہو جائینگی جس سے بھارتی ایکسپورٹرکا نقصان ہوگا۔ اس صورت میں بھارتی حکومت بھی پاکستانی مصنوعات پر ٹیرف لگانے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگے گی، جس سے پاکستانی ایکسپورٹر کو نقصان ہو گا۔ یوں دونوں ممالک اپنے اپنے ایکسپورٹرز کی تجارت کے تحفظ کے لئے حتی الامکان کوشش کریں گے کہ معاشی میدان میں باہمی تعاون اور اعتماد کی فضا قائم رہے۔(91)

تجارت امن و دوستی کی راہ ہموار کرتی ہے۔ اسی تناظر میں Frederic Bastiat کا مشہور قول ہے کہ اگر مصنوعات سرحدوں سے نہیں گزریں گی تو پھر سپاہی گزریں گے۔ پاکستان اور انڈیا دونوں کے مفاد میں ہے کہ وہ باہمی تجارت کو فروغ دیں اور اپنی سرحدیں اس کے لئے کھول دیں۔

دیکھیے جغرافیائی طور پر ہم ایک خوش قسمت ملک ہیں بشرطیہ کہ ہم اس کی اہمیت کو سمجھیں۔ ہمارے پڑوس میں دنیا کی ایک تہائی آبادی رہتی ہے، صارفین کی تعداد کے اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی ایک تہائی مارکیٹ سے ہم براہ راست جڑے ہوئے ہیں۔ افغانستان کی پوری کی پوری مارکیٹ ہنوز نئی ہے اور ہمارا تاجر وہاں اپنی مصنوعات کسی دوسرے ملک کی بہ نسبت آسانی سے بیچ سکتا ہے۔ ایران کی مارکیٹ عالمی پابندیوں کے خاتمے کے بعد سر اٹھا رہی ہے۔ ایران اور افغانستان سے ہم سنٹرل ایشیا میں داخل ہو سکتے ہیں۔ بھارت اور چین دونوں کی خواہش ہے کہ وہ پاکستانی جغرافیہ سے معاشی فائدہ اٹھائیں۔ ایک طرف اگر افغانستان، ایران اور سنٹرل ایشیا سے بذریعہ زمینی راستہ تجارت کرنا دونوں ممالک کی خارجہ پالیسی کی بنیادی ترجیحات میں شامل ہے تو دوسری طرف گوادرآپ کو گلف کے دروازے پر بٹھا دیتی ہے۔

اگر پاکستانی سرحدیں پڑوسی ممالک کے ساتھ تجارت کے لئے کھول دی جاتی ہیں تو اس کا پاکستانی معیشت کو پاک چین معاشی راہداری سے بھی کئی گنا زیادہ فائدہ ہو گا۔ مگر اس کے لئے اول ہمیں خارجہ پالیسی کی بنیادی ترجیحات سمجھنا ہوں گی۔ ہم پر عسکریت کا بھوت اتنا سوار ہے، ہم اس طرز کے تجزیے پر مجبور ہیں کہ اگر فلاں کی فلاں سے جنگ ہوگئی تو ہمیں کس کا ساتھ دینا ہو گا اور اگر ہماری کسی سے لڑائی ہوئی تو ہمارا کون ساتھ دے گا۔ ہم خارجہ پالیسی کے بنیادی رجحانات سے بے خبر ہیں۔ دنیا بھر کی خارجہ پالیسی پر معاشی مفادات کو ترجیح حاصل ہے اور پھر بین الاقوامی سیاست میں آپ کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ اس کا نمبر آتا ہے۔ دونوں عوامل کی بنیاد پر پاکستان دنیا میں پرکشش ملک نہیں۔

پوری دنیا کے ممالک بشمول چین و ایران و افغانستان بھارت سے اچھے تعلقات کے خواہش مند ہیں کیونکہ بھارت کی سوا ارب افراد کی ابھرتی ہوئی معیشت میں ان کے کاروباری مفادات ہیں۔ دوسرا بھارت وقت کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاست میں اپنا مقام و مرتبہ مستحکم کرتا جا رہا ہے۔ نہیں بھولنا چاہیے کہ بھارت اس وقت جی20 کا حصہ ہے اور انہی مفادات کے تحت دنیا کی اقوام چین سے دوستی کی خواہش مند ہیں۔کوئی بھی ملک بھارت سے پاکستان دشمنی میں دوستی نہیں کرتا اور نہ ہی پاکستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے والے ممالک بھارت سے دشمنی کرنا چاہتے ہیں، سب اپنے اپنے قومی مفادات کے اسیر ہیں۔ چین اور امریکہ کے حوالے سے بھی ہم بین الاقوامی سیاست کی بنیادی ترجیحات سے ناواقف ہیں۔ ان دونوں کی معیشت اور معاشرہ کے لئے خودکشی ہو گی اگر دونوں باہم جنگی تنازعات میں پڑتے ہیں۔ جیسے جیسے دونوں ممالک کے تجارتی تعلقات وسیع ہوئے ہیں ویسے ویسے ان کے سفارتی تعلقات میں بھی بہتری آئی ہے۔

موجودہ سیاسی اقتدار خواہش مند ہے کہ بھارت سے تجارتی تعلقات بحال ہوں اور دوستی و شراکت داری کے نئے امکانات سامنے آئیں جن سے فائدہ اٹھا کر دونوں ممالک اپنے شہریوں کی خوشحالی کو ممکن بنائیں، مگر ایک طرف اگر پاکستانی ہیئت مقتدرہ نہیں چاہتی کہ خارجہ پالیسی میں کوئی بنیادی تبدیلی لائی جائے تو دوسری طرف بھارت میں پروان چڑھتے ہندو قوم پرستانہ متشدد جذبات اس سلسلے میں مزید رکاوٹ بنتے جا رہے ہیں۔ موجودہ حالات کی سنگینی تجارت و تبادلہ کے امکانات کو مزید کمزور کر رہی ہے مگر تبدیلی ناگزیر ہے۔ آخر کب تک انسانوں کو

سرحدوں میں قید کیا جاتا رہے گا ؟ ہمیں اپنی خارجہ پالیسی کو عسکری بنیادوں پر نہیں بلکہ معاشی، سیاسی اور سماجی تعاون کی بنیاد پر استوار کرنا ہو گا۔ ہمیں اپنے شہریوں کو یہ حق دینا ہو گا کہ وہ اپنے پڑوسی ممالک سمیت دنیا کے ہر ملک سے اپنے معاشی و سماجی تعلقات قائم رکھنے میں آزاد ہوں۔ یاد رکھیے اچھی خارجہ پالیسی وہی ہے جس میں دوست بے شمار ہوں اور پڑوس کی طرف سے مکمل اطمینان ہو۔ کیا ہم اس معیار پر پورا اترتے ہیں ؟ ذرا سوچیے

ریاست و حکومت کو اپنے مخصوص دائرۃ کار میں نہ رکھنے کا انجام

تمام انسان ....، آزاد ہیں اور برابر برابر ہیں ... کوئی بھی شخص یا ادارہ، کسی دوسرے فرد کی زندگی، صحت، آزادی، اور ملکیت کو نقصان نہیں پہنچا سکتا: (جان لاک)

جیسا کہ سوسائٹی کے باب میں ہم نے اس بات پر غور کیا کہ بہت سارے ایسے اجتماعی معاملات ہیں جو ہم انفرادی طور پر سرانجام نہیں دے سکتے اس کے لیے ہمیں گورنمنٹ کی ضرورت ہے جو ان اجتماعی معاملات اور ریاستی اداروں کے درمیان صحت مند رابطوں و تعاون (Coordination) کو منظم کرے اور دوسرے معاشروں یا ممالک سے صحت مند رابطے ممکن بنائے جائیں۔

جس طرح اکنامکس کے لئے عملی طور پر سب سے بڑے چیلنجز و مسائل وسائل کی بہترین تفویض (allocation) اور معاشی آزادیوں کو قائم رکھتے ہوئے معاشی خوشحالی کی جستجو کرنا ہے ویسے ہی سیاست کا سب سے بڑا مسئلہ طاقت کے ارتکاز کو روکنا اور شہریوں کی سیاسی سماجی اور معاشی آزادیوں کو قائم رکھتے ہوئے بہترین اجتماعی بندوبست قائم کرنا ہے۔

طاقت کا ارتکاز آمریت کو جنم دیتا ہے۔ایک سیکولر جمہوریت میں اجتماعی طاقت عدم مرکزیت یا کم مرکزیت (decentralized) کے حامل پورے سیاسی نظام میں کم (یا عدم) مرکزیت اور افقی و عمودی سطح پر تحلیل (decentralized) ہوتی ہے۔جبکہ آمریت میں ساری طاقت یا تو کسی ایک فرد یا خاندان کے پاس ہوتی ہے یا کسی نظریہ و عقیدہ سے وابستہ اس کی نظریاتی قیادت کے پاس ہوتی ہے۔

سیاسی مسائل حل نہ ہوں اور سیاسی عدم استحکام قائم رہے تو فرد و معاشرہ اور ان کی معیشت و ثقافت بھی عدم استحکام کا شکار ہو جاتی ہے۔ایک بہترین آئیڈیالوجی وہی ہے جو فرد و معاشرہ اور معیشت و سیاست میں یوں توازن پیدا کرے کہ سب اپنے اپنے دائرہ کار اور طریقہ کار میں آزادانہ کام کر سکیں۔لبرل ازم کی اصطلاح میں اسے معاشرہ کی خود تنظیمی کی صلاحیت یا Spontaneous ordering کہتے ہیں جو ان معاشروں میں پائی جاتی ہو جو آزاد ہوتے ہیں اور جن میں ہر فرد کے بنیادی انسانی حقوق کو فوقیت حاصل ہوتی ہے اور ارتقاء کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

ریاست یا حکومت اپنے تشخص میں فطری نہیں ہوتے ۔فطری صرف انسان اور انسانوں سے وجود میں آنے والا آزاد معاشرہ ہے ۔ریاست طاقت کے کھیل میں مصروف رہتی ہے اس لیے یہ زیادہ قابل اعتبار بھی نہیں۔سٹیٹس کو اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے ریاست و حکومت کو بطور

آلہ کار استعمال کرتے ہیں اور اس نظام میں کمزوریاں پیدا کر کے اور رخنے ڈال کر اپنے طفیلیہ پن (Parasitism) کا بندوبست کرتے ہیں۔

ریاست اپنے اثر و رسوخ میں جتنی بڑی اور طاقت و اختیار میں جتنی وسیع ہوگی، سٹیٹس کو کا کام اتنا آسان ہوگا۔ اگر سٹیٹس کو اور ریاست میں باہمی تعاون جنم لے لے تو ریاست اجتماعی مفادات کے نام پر اجارہ دار طبقات کی پرورش شروع کردیتی ہے اور یہ اجارہ دار طبقات اس پر نظریاتی و عملی طور پر قابض ہوجاتے ہیں۔

عسکری حلقوں اور روشن خیال شہریوں میں مستقل عناد کیوں ؟

ایک سوال پاکستان میں عموما پوچھا جاتا ہے کہ "پاکستانی فوج کا طرز زندگی ماڈرن ہے، ادارہ جاتی تمدن سیکولر ہے، مذہبی فرقہ وارانہ تقسیم نہیں، فوج کے افسران بظاہر لبرل سے لگتے ہیں ، آخر کیا وجہ ہے کہ فوج اپنے ادارے سے باہر جن قوتوں کو سپورٹ کرتی آئی ہے ، وہ مذہبی فرقہ وارانہ تقسیم میں شدت پسند ہیں ،سیکولر و لبرل اقدار کو کفر سمجھتے ہیں ۔ فوج جدت پسند ہے تو فوج کے برعکس وہ حد درجہ رجعت پسند ہیں .... آخر یہ کیسا جوڑ ہے ؟ فوج کے ادارہ جاتی تمدن کو دیکھ کر تو یہی لگتا ہے کہ فوج کو فطری طور پر لبرل سیکولر طبقات سے زیادہ قریب ہونا چاہیئے ۔ مگر یہ مستقل عناد کیوں ؟

حقیقت یہی ہے کہ چاہے فوج ہو یا کوئی اور ادارہ ، اس کے استحکام اور کارکردگی کے لئے صرف لبرل اقدار ہی راہنما ہو سکتی ہیں جن کی بنیاد پیشہ ورانہ مہارت ، پیداواری صلاحیت اور کسی بھی مذہبی ، نسلی ، یا لسانی تعصبات سے بالاتر تمدن پر ہو۔ اس چیز کا فوج کو بطور ادارہ احساس ہے اور یہی وجہ ہے کہ فوج اپنے مخصوص پیشہ ورانہ عسکری فرائض اور صحت مند ادارہ جاتی تمدن کے قیام میں روشن خیال لبرل اقدار کو ہی عزیز رکھتی ہے۔ ضیائی آمریت کے عہد سے پورا ملک فرقہ واریت کے تاریک دور سے گزر رہا ہے مگر فوج مکمل طور پر اس سے محفوظ رہی ہے باوجود اس کے کہ شدت پسند تکفیری مذہبی تنظیموں کو اسی ریاستی ادارے کی تزویراتی گہرائی کی پالیسی کے تحت پشت پناہی حاصل رہی ۔

فوج بطور ادارہ اپنے ڈسپلن میں ایک مثالی ادارہ ہے مگر مسئلہ کی جڑ ان عزائم میں ہے جو فوج کے کچھ عناصر اپنی آئینی حیثیت سے بالاتر ہو کر سرانجام دیتے ہیں جیسا کہ سیاسی اداروں کے ارتقا میں رکاوٹیں کھڑی کرنا، خود کو ملک کا نظریاتی محافظ سمجھنا ، اپنے پیشہ ورانہ فرائض سے گریز کرتے ہوئے کاروباری سرگرمیوں میں حد درجہ ملوث ہونا اور ریاست کے خارجہ امور میں بالادست ادارے کا کردار ادا کرنا وغیرہ شامل ہیں ۔

جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ آخر فوج اپنے ادارے میں لبرل اقدار کی پاسدار ہے تو ادارے کے باہر رجعت پسندوں کی سرپرست اور سربراہ کیوں ہے ؟ تو اس کی بنیادی وجہ یہ سامنے آتی ہے کہ فوج کے کچھ طاقتور عناصر کے عزائم اور رجعت پسندوں کے عزائم میں یکسانیت ہے جبکہ ملکی سیاست ، معیشت، اور سماج میں لبرل خیالات و عزائم سے ان کا اپنے عزائم کی نسبت سے تصادم پایا جاتا ہے .... کیسے ؟ آیئے تین اہم مثالوں کی مدد سے اس کا جائزہ لیتے ہیں ۔

پہلی مثال ملٹری اسٹیبلشمنٹ کی جنگوں سے متعلق پالیسیوں سے متعلق ہے۔ 1965ءکی جنگ کو آپریشن جبرالٹر اور گرینڈ سلام کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے ، تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ یہ جنگ پاکستانی دراندازیوں کے سبب شروع ہوئی اور اس جنگ کے اختتام تک پاکستان اپنے اہداف (جیسے آپریشن جبرالٹر کے ذریعے کشمیر کی آزادی) کے حصول میں ناکام رہا۔ یوں یہ ایک کھلی ناکامی تھی اور پاکستانی لبرلز کی یہ آرزو ہے کہ مقتدر حلقے اپنا احتساب کریں اور ان عزائم سے باز آجائیں جو جنگ کے بنیادی اسباب بنے یا اب بھی بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ جنگ کا دھڑکا امن کی امید کو خوفزدہ کر دیتا ہے ۔ جب کہ پاکستان کے رجعت پسند حلقے اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ چونکہ ہم مسلمان ہیں، ہمیں ہرانا ممکن نہیں، ہندو مکار ہے، بھارت نے چالاکی و عیاری سے ہم پر رات کی تاریکی میں حملہ کیا اور بالآخر ہم نے انہیں بھگا دیا، یوں ہم فاتح ٹھہرے ۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان میں جنگ کی کونسی تعبیر ایسی ہے جو ملٹری اسٹیبلشمنٹ کو پسند ہو گی؟ یقیناً رجعت پسند سوچ و فکر ، جو اس کے عزائم میں ان کی مددگار بھی ہے اور مہم جو جذبات میں سہولت کنندہ بھی ۔ جنگوں میں فتح و شکست سے متعلق تاریخی تشریحات اور جہادی عزائم میں یکسانیت کی یہ واحد مثال نہیں ۔ 1971، کارگل اور دوسری فوجی مہموں میں رجعت پسند حلقے ملٹری اسٹیبلشمنٹ کے نظریاتی حلیف رہے ہیں ۔

دوسری مثال 1965ءکی ناکام مہم جوئی کے بعد ہیئت مقتدرہ نے بخوبی یہ سمجھ لیا کہ وہ باقاعدہ فوجی مہم جوئی سے کشمیر آزاد نہیں کروا سکتی اور نہ ہی افغان پالیسی کے اہداف اس طریقے سے ممکن ہیں اسی لئے پرائیویٹ لشکر ، جیش یا گروہ فوجی مقاصد کے حصول کا بہترین ذریعہ سمجھے گئے۔ اب اس صورت حال میں ہیئت مقتدرہ کا فطری تعلق رجعت پسندوں سے وجود میں آیا کیونکہ ہیئت مقتدرہ کو نجی جہادی گروہ یا لشکر انہوں نے ہی مہیا کئے ۔ مذہبی جہاد کی رجعت پسندانہ تشریح اور ہیئت مقتدرہ کے مہم جو عزائم میں یکسانیت پائی جاتی ہے ۔ جبکہ لبرلز کے ہاں دوسرے ملکوں میں، بغیر اقوام متحدہ کی صوابدید کے، دراندازی دراصل دہشتگردی کی ہی ایک شکل ہے کیونکہ لبرل ازم عدم مداخلت کی پالیسی (Non-Interventionism) کی پالیسی کو روزاول سے دہراتا ہے ۔ یوں ہیئت مقتدرہ اور روشن خیال و ترقی پسند نظریات میں بنیادی اختلاف پیدا ہوتا ہے جسے ہیئت مقتدرہ حب الوطنی سے متصادم سمجھتی ھے تو لبرل حلقے ہیئت مقتدرہ کے ان عزائم کو جنگی جنون اور قانون و انصاف سے روگردانی سمجھتے ہیں ۔

اسی طرح ملا ملٹری اتحاد اور ہیئت مقتدرہ و لبرلز میں عناد کے معاملہ میں جمہوریت اور سول اداروں کی بالادستی کا مقدمہ بھی اہم ترین ہے۔ ہیئت مقتدرہ میں اس بات کا ادراک بخوبی پایا جاتا ہے کہ ریاست پر اس کی گرفت اس وقت تک مضبوط ہے جب تک باقی تمام ریاستی ادارے

کمزور و بے بس ہیں۔ یوں ہیئت مقتدرہ کی ہر ممکن کوشش رہی ہے کہ باقی سب ادارے کمزور رہیں۔ ہیئت مقتدرہ کا سب سے بڑا نشانہ سیاسی و انتظامی ادارے ہیں ۔ یہ بات حیران کن ہے کہ سوائے ایک دو کے باقی سب سیاسی پارٹیوں کے قائدین ہیئت مقتدرہ کے پیداکردہ ہیں ۔ مضحکہ خیز بات یہ بھی ہے کہ ایک طرف ہیئت مقتدرہ اپنے لے پالک رہنماؤں پر بھی اعتبار نہیں کرتی کیونکہ اس صورت میں بھی سیاسی اداروں کے استحکام کا اندیشہ موجود ہے ، جبکہ دوسری طرف سیاسی عمل کو اتنا مستحکم نہیں ہونے دیا جاتا جس کی بدولت انتخابات کا مسلسل انعقاد نئی اور بھرپور عوامی قیادت پیدا کرے اور جمہوریت پختہ تر ہو۔

پاکستانی سیاست کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہیئت مقتدرہ جمہوریت سے مسلسل خائف رہی ہے اور اس نے جمہوری اقدار کے قیام ، تسلسل اور استحکام میں رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔ جمہوریت دشمنی کی اس روایت میں مذہبی رجعت پسند طبقہ اس کا نظریاتی مددگار بھی ہے اور عملی میدان میں دست و بازو بھی کیونکہ رجعت پسند مذہبی تشریحات جمہوریت کو کفر اور لادین مغربیت سمجھتی ہیں۔ یوں جمہوریت کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں روایت پرست اہل مذہب اور ہیئت مقتدرہ کے مابین یکساں مقاصد کا اتحاد پایا جاتا ہے جو مزید قربت کا سبب بنتا ہے جبکہ لبرلز جمہوریت سے غیر مشروط وابستگی رکھتے ہیں، لبرل نظریات و روایات ......، شہریت میں مساوات ، حق انتخاب اور آزادی اظہار رائے کے بغیر نامکمل ہیں۔ دنیا کے جس خطہ میں بھی لبرل آئیڈیالوجی کو سیاسی، سماجی، اور معاشی ترقی میں رہنما بنایا گیا ہے، وہاں جمہوریت کو مرکزی اہمیت ملی ہے۔ یوں سیاسی اداروں کی ترقی و استحکام کا ایجنڈا پاکستانی لبرلز کے لیے پاکستان میں ترقی کے لئے ناگزیر رہا ہے۔ اور یہی وہ سبب ہے جو ہماری قومی سیاسی زندگی میں ہیئت مقتدرہ اور لبرلز کے درمیان عناد کی ایک بڑی وجہ بن جاتا ہے۔

ملا ملٹری رفاقت کا ایک حیران کن مظاہرہ ہم حالیہ دنوں میں دیکھ رہے ہیں۔ آپریشن ضرب عضب سے پہلے پاکستانی لبرل حلقوں کا یہ پرجوش مطالبہ تھا کہ دہشت گرد عناصر کے خلاف فوجی آپریشن کیا جائے ، جب کہ رجعت پسند حلقے ایک طرف یہ کہتے تھے کہ طالبان سے ہر صورت میں مذاکرات کئے جائیں کیونکہ آپریشن سے کامیابی کی امید انتہائی کم ہے تو دوسری طرف اس بات کو ماننے سے بھی انکاری تھے کہ یہ شدت پسند دہشت گرد کارروائیاں پاکستانی جہادی عناصر کر رہے ہیں ۔ ہیئت مقتدرہ کا اپنا موقف بھی یہی تھا کہ آپریشن میں کامیابی کا چانس محض چالیس فیصد ہے۔ فوجی کمان کے بدلنے سے عسکری منصوبہ بندی میں تبدیلی کے ساتھ ہی رجعت پسندوں نے بھی اپنا نظریاتی محاذ بدلا اور فوجی کارروائی میں فوج کے ترجمان بن گئے۔ فوجی آپریشن کا آغاز ہوا، آپریشن ضرب عضب اب تک کے نتائج کی رو سے کسی حد تک کامیاب ہے، اب وہی عناصر جو کل تک طالبان کے ہمدرد و ہمنوا تھے اب 'شکریہ راحیل شریف' کی تشہیر میں مصروف ہیں ،فوجی آپریشن کی کامیابی پر ڈنکے بجا رہے ہیں اور حیران کن طور پر سول سیاسی اداروں کو بزدلی کا طعنہ دیتے ہوئے ہیئت مقتدرہ کی خوشامد کر رہے ہیں ۔ ظلم تو یہ ہے کہ اب لبرل حلقہ کے خلاف محاذ کا ایک اور میدان کھول دیا گیا ھے اور وہ ہے لبرلز کی غیر مشروط و ناگزیر جمہوریت دوستی کے خلاف محاذ ۔ جمہوریت دشمنی میں ہیئت مقتدرہ اور رجعت پسند حلقے پھر شیر و شکر ہیں ۔

آرمی پبلک سکول پشاور کا سانحہ ، اسی ہزار سے زائد افراد کی شہادتوں، اور کئی بلین ڈالرز کے اخراجات کے بعد بھی اسٹیبلشمنٹ کے عزائم میں کوئی جوہری فرق نہیں آیا- افغانستان میں دراندازی سے متعلق ریاستی پالیسی ہنوز مشکوک ھے تو کشمیری محاذ پر سرگرم نجی عسکری گروہ جیسے جماعت الدعوہ ، حزب المجاہدین ، اور جیش محمد ابھی تک فوجی چھتری تلے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں - اندرونی محاذ پر سپاہ صحابہ ابھی تک مستحکم ھے - دہشتگردی کے خلاف جنگ سول و سیاسی اداروں کو مزید و مسلسل کمزور کر کے لڑی جا رہی ھے اور اس میں بھی ملا و ملٹری اتحاد مضبوطی سے قائم ھے - اس بات کے فی الحال کوئی آثار نہیں کہ اسٹیبلشمنٹ و رجعت پسندوں کا عوام دشمن گٹھ جوڑ جلد ٹوٹ جائے گا-

یہی سبب ہے کہ مغرب کے کلاسیکل عہد میں ریاست سے متعلق تین جملے بہت مقبول تھے۔

1۔ریاست ایک لازمی برائی ہے ، یہ وہ مجبوری ہے جس میں خیر کا امکان کم ہے۔

2۔ریاست پر ہمیشہ شک کرو۔

3۔اچھی ریاست وہی ہے جو سائز میں چھوٹی مگر مؤثر بندوبست کی حامل ہو۔

کیا ریاست ماں جیسی ہو سکتی ہے ؟

ریاست کبھی ماں کا درجہ نہیں حاصل کر سکتی ۔انسان کے لئے ماں سے ملتا جلتا تعلق صرف سوسائٹی کا ہی ممکن ہے وہ بھی تب جب سوسائٹی اجارہ دار طبقات کے قبضہ کے بجائے آزاد، خود مختار اور انسان دوست ہو۔

تاریخ سے ہی ہم یہ سیکھتے ہیں کہ ریاست نے عموما سٹیٹس کو کی سرپرستی کی ہے اور یہ کہ فرد ،سوسائٹی اور معیشت پر ریاست کی آمریت بذات خود قومی ریاست کے لئے بھی تباہ کن ہے۔تاریخی ریکارڈ یہ بتاتا ہے کہ جب ریاست کا سائز وسیع اور وسعت پسند ہوتا ہے تو اس وقت ریاست معیشت میں اپنے منظور نظر افراد کو ہی نوازتی ہے۔وہ لوگ جو بیوروکریسی کی نظر میں پسندیدہ ہوتے ہیں۔ اور جب بھی گورنمنٹ اپنے سائز اور دائرہ کار میں چھوٹی اور محدودہوتی ہے اس سیاسی نظام میں امراء کو کم اہمیت ملتی ہے کیونکہ ریاست کے پاس ایسا کچھ عطا (Grants) کرنے کو ہوتا ہی نہیں کہ وہ غیر قانونی طریقے سے بالا دست طبقے کو عطیہ کرسکے یا وہ بالادست طبقات اس کے حصول کے لئے سازشیں یا لابنگ (lobbying) کرنے لگیں –

عہد حاضر میں سوشل سائنس کی سب سے بڑی غلط فہمی ریاست کو سوسائٹی کا ایک مخصوص و محدود دائرۂ کار کا ادارہ سمجھنے کے بجائے اسے سوسائٹی کا سربرہ نگران یا نمائندہ سمجھنا ہے – سوسائٹی اور فرد کا تعلق رضاکارانہ ہے اس میں جبر نہیں – مثال کے طور پر اگر ہم ثقافت کو دیکھیں – اس کا قیام ہی صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ لوگ اس کی رضاکارانہ بنیادوں پر اور اپنی خوشی سے پیروی کرتے ہیں – اس میں ارتقاء ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ثقافت لوگوں کے بدلتے رجحانات کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہے – زبان کی مثال دیکھ لیں لوگ اپنی خوشی سے بغیر کسی سرکاری ادارے کے جبر کے اسے بولتے ہیں – جوں جوں انسانی زندگی میں تبدیلیاں آتی جاتی ہیں ابلاغ کا یہ ذریعہ اپنے الفاظ و ذخیرہ اور یہاں تک کہ لہجے میں بھی بدلتا جاتا ہے – سوسائٹی کا ہر پہلو انسان دوست ہے بشرطیکہ اس پر بالادست طبقات حاوی نہ ہو جائیں جو اسے عدم توازن میں مبتلا کر دیتے ہیں –

مگر ریاست کا مزاج تو سوسائٹی کے بالکل الٹ ہے – اس میں جبر ہے – قوت طاقت اور اختیار کا استعمال ہے – جو اسے اس کے دائرے میں سپریم نہ تسلیم کرے یہ اس پر چڑھ دوڑتی ہے – ریاست کسی طرح سے بھی سوسائٹی کی نمائندگی نہیں کر سکتی – الٹا جیسا کہ ہم نے اس بات پر غور کیا کہ سوسائٹی کے لئے سب بڑا خطرہ طاقت و اختیار کا ارتکاز ہے اور بدقسمتی سے جبر و اختیار کی ساری طاقت ریاست میں ہی مرتکز ہو جاتی ہے – اس کے شر سے بچنا چاہئے نہ کہ اسے ماں یا بڑا بھائی سمجھ کر اس کی گود میں جا بیٹھنا چاہئے – ریاست کو اپنے دائرۂ کار اور اختیار میں محدود مگر موثر رکھنا ضروری ہے (محدود اس لئے کہ طاقت کا ارتکاز سوسائٹی کی آزادی اور پوٹینشل پر اثرانداز نہ ہو اور موثر اس لئے کہ جو ناگزیر کام ہم اس سے لینا چاہتے ہیں وہ لے سکیں) وگرنہ اس سے بدترین قسم کی آمریت پھوٹتی ہے جسے ہم مطلق العنانیت (Authoritarianism) کہتے ہیں -

ریاست کہتے کسے ہیں اور اس کی نوعیت و ساخت اپنی اصل میں کیا ہوتی ہے ؟

جدید قومی ریاست سماج کی ایک سیاسی تنظیم کا نام ہے - یہ ایک انتظامی ادارہ ہوتا ہے جو سوسائٹی کے افراد کے درمیان باہمی تعلق و اشتراک اور تعاون و اعتماد (Free Association) کی وجہ سے وجود میں آتا ہے -اس کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے،اس کے پاس تحفظ اور نظم و ضبط کے لئے ایک متعین طریقہ کار ،قانون اور اس کا اطلاق، مخصوص رقبہ، سرحدیں اور اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے – یہ اقتدار اعلیٰ سیکولر جمہوریت کے سیاسی بندوبست میں شہریوں کے پاس ہوتا ہے۔

ریاست سوشل کنٹریکٹ سے وجود میں آتی ہے جس کی رو سے اس کا بندوبست،اقتدار اعلیٰ اور طریقہ کار شہریوں کی اکثریتی رائے (جنرل یا کامن ول) پر انحصار کرتا ہے جب کہ قانون کی اساس بنیادی انسانی حقوق ہیں۔

ریاست جب ایک خیالی تصور (abstract) سے عملی صورت میں آتی ہے تو اس سے مراد وہ ریاستی ادارے ہوتے ہیں جن میں سے کچھ کی سربراہی منتخب سیاسی نمائندوں (جیسے پارلیمان) جبکہ اکثر کی سربراہی بیوروکریسی کے پاس ہوتی ہے۔ان اداروں کے انتظامی امور عموما بیوروکریٹس کے پاس ہوتے ہیں۔ ریاست دراصل ایک مخصوص گائیڈ لائن کی چھتری تلے بیوروکریٹک انتظام کا نام ہے جس پر منتخب حکومت ایک جمہوریہ میں نگران ہوتی ہے۔ مختصر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عملی طور پرریاست دراصل منتخب سیاستدانوں اور بیوروکریسی کے ارادہ و عمل کا نام ہے جس میں سیاستدان عوامی خواہشات یا جذبات کی ترجمانی کر رہے ہوتے ہیں.

یاد رہے کہ ریاست سوسائٹی کا ہی ایک ادارہ ہے جس کا کام اجتماعی بندوبست قائم کرنا ہے – ریاستی معاملات کی نگرانی اور انتظام کے لئے دو طریقہ کار دنیا میں معروف ہیں –

1) **نظریاتی و مذہبی آمریت اور شاہی سلطنت :** جس میں مراعات یافتہ ایک فرد ، خاندان ، نسل ، طبقہ ، گروہ یا ادارہ مذہبی یا نظریاتی بنیادوں پر یا نسلی اعتبار سے ریاستی انتظام پر اجارہ داری رکھتا ہے –

2) **جمہوریت :** لبرل جمہوریت دراصل عوامی حق انتخاب سے عبارت ہے – اس میں سیاسی جماعتیں عوام سے بذریعہ ووٹ عوامی حق ترجمانی حاصل کرتی ہیں – جو جماعت اکثریت حاصل کرے یعنی عوام کی اکثریت بقیہ جماعتوں کی نسبت زیادہ تعداد میں اس پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنا نمائندہ چنیں وہ جماعت حکومت بناتی ہے جبکہ دیگر جماعتیں پارلیمان میں حزب اختلاف کا کردار ادا کرتی ہیں –

یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاست دراصل ریاستی انتظام کا نام ہے – پارلیمانی نظام میں وزیراعظم اور صدارتی نظام میں صدر ایک ایسا عہدہ ہے جس میں ریاست و سیاست جمع ہو جاتی ہے اور ریاست کا چیف ایگزیکٹو عوامی حق انتخاب سے اعتماد کا ووٹ لینے والا صدر یا وزیراعظم ہوتا ہے -

جب ہم ریاست کو زیادہ مضبوط وسیع اور بااختیار بنا رہے ہوتے ہیں تو دراصل ہم شہریوں کے بالمقابل سیاستدانوں اور بیوروکریسی کو زیادہ مضبوط اور زیادہ بااختیار بنا رہے ہوتے ہیں۔

جوں جوں ریاست بڑی ہوتی جاتی ہے فرد اور سوسائٹی کا دائرہ کار اور آزادی سکڑتی جاتی ہے اور بیوروکریسی (سیاست دانوں سے بھی زیادہ) اپنے اثرورسوخ اور اختیار میں پھیلتی جاتی ہے۔یوں اپنی اصل میں جب ریاست اپنے اختیار و اثر ورسوخ میں بڑی ہورہی ہوتی ہے تو حقیقتا بیوروکریسی بڑی ہورہی ہوتی ہے۔

بیوروکریٹس ایک مخصوص طریقہ کار (Procedure) اور ثقافت کے تحت کام کرتے ہیں اور غیر منتخب ہوتے ہیں۔بیوروکریٹس عام افراد سے کسی بھی بنیاد پر یوں ممتاز نہیں ہوتے کہ انہیں سرکاری طور پر اتنی زیادہ طاقت و اختیار دے دیا جائے کہ وہ ہمیں پلان اور کنٹرول

کرسکیں۔ریاستی اداروں کے سائز و اختیار کے پھیلنے سے بیوروکریسی کی طاقت و اختیار سیاستدانوں کی نسبت اس لیے زیادہ پھیلتی ہے کیونکہ سیاستدان اپنے پارلیمانی سائز اور پارلیمانی دائرہ کار میں محدود رہتے ہیں۔یوں اداروں کے دائرہ کار میں وسعت اور ان کی طاقت و اختیار میں اضافہ کا زیادہ فائدہ بیوروکریٹس کو ہی ہو رہا ہوتا ہے۔

ریاست کے فرائض اور اس کا مخصوص دائرہ کار

ریاست کے چند بڑے فرائض مندرجہ ذیل ہیں۔

- ✓ ریاست تمام شہریوں کی زندگی کا تحفظ کرے یعنی امن و امان کو یقینی بنائے۔یہ ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے اور بد قسمتی سے پاکستان میں ریاست اس بنیادی ذمہ داری سے پہلو تہی کرتی آئی ہے ۔
- ✓ ان کی شخصی آزادی کا تحفظ کرے کہ وہ سیاست معیشت اورسماج کا مستقل اور بنیادی موضوع ہی رہیں ۔
- ✓ ان کی جائیداد کا تحفظ کرے۔
- ✓ ان کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرے۔
- ✓ ان کی زندگی میں سہولیات بہم پہنچانے کی جستجو کرے جیسے مقابلہ کی مارکیٹ کو قائم رکھنے کے لئے مقابلہ کی ثقافت میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا وغیرہ

ان حقوق کا مطلب یہ بھی نہیں کہ یہ حقوق گورنمنٹ مہیا کرے بلکہ ان سے مراد یہ ہے کہ ریاست فرد کے بنیادی حقوق کو تسلیم کرے اور گورنمنٹ ان کا تحفظ کرے — بنیادی انسانی حقوق پہلے ہی سے انسان کو انکی پیدائش کے ساتھ فطری طور پر ودیعت ہوتے ہیں۔حقوق انعام نہیں ہوتے بلکہ انسان کا بنیادی پیدائشی حق ہیں۔ گورنمنت کا بنیادی فرض یہ ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ یہ حقوق تمام شہریوں کو بنا کسی مذہبی لسانی صنفی و نسلی اور علاقائی امتیاز کے میسر ہیں۔اگر نہیں تو وہ قانونی اور انتظامی سقم دور کئے جائیں جو اس میں رکاوٹ ہیں اور ریاست اپنی انتظامی عملداری سے انہیں قائم کرے۔ یاد رہے کہ حقوق شہریوں کے ہوتے ہیں جبکہ ریاستی اداروں کے فرائض ہوتے ہیں جن کی بجاآوری کی ریاست پابند ہے —

آزادی مانگی نہیں جاتی بلکہ ہم آزاد پیدا ہوتے ہیں

بنیادی بات یہ ہے کہ آزادی مانگی نہیں جاتی، یہ کوئی چیز یا شے نہیں جو آپ کو کوئی اٹھا کر دے دے گا، جو آپ کے پاس پہلے نہیں تھی اور کوئی دے گا تب ہی آئے گی۔ ہم پیدا ہی آزاد ہوئے ہیں۔ ہمارے رویے بنیادی طور پر ہمارے آزاد ارادے کا نتیجہ ہیں، ہماری شخصیت کا جوہر ہی آزادی میں ہے۔ ہماری فطرت کسی ٹھوس چیز کی طرح جامد اور متعین نہیں بلکہ ہمارے رویے لچکدار غیر متعین متنوع اور غیر متوقع (unpredictable) ہیں جنہیں کنٹرول کرنا یا پلان کرنا ناممکن ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے سبب آمریت ہر میدان میں ناکام ٹھہرتی ہے۔

جب ہم کہتے ہیں ہمیں آزادی دو تو اس کا مطلب ہے کوئی اور ہے جس کے پاس آزادی کے خزانے ہیں اور وہ ہمیں اس میں سے کچھ اٹھا کر دے دے گا۔ اس کا آزادی پر اختیار ہے اور ہم اپنی آزادی کے لئے اس کے پابند و عاجز ہیں۔ ایسی کوئی مادی طاقت دنیا میں وجود نہیں رکھتی۔ جب ہندوستان پر سلطنت برطانیہ کی حکومت تھی اور ہم نے اس نو آبادیاتی تسلط سے نجات پائی تھی تو دراصل ہم نے اپنی آزادیوں پر ایک غیر قانونی غاصبانہ قبضہ ہٹایا تھا نہ کہ برطانوی یہاں سے جاتے جاتے آزادی نام کی کوئی چیز ہم میں مساوی طور پر بانٹ کر گئے تھے۔

بنیادی حقوق کو دراصل ہم حقوق (حق کی جمع) کہتے ہی اس لئے ہیں کہ یہ فطری طور پر ہماری ملکیت (possession) ہوتے ہیں، ہمارے ذاتی ہوتے ہیں، ہمارا حق ہوتے ہیں، اور ہم اس اپنے حق کا تقاضا کر رہے ہوتے ہیں کہ پلیز اس میں مزاحم نہ ہوں، اس کے مکمل اظہار میں رکاوٹ نہ بنیں۔ بنیادی حقوق کسی سے مانگے نہیں جاتے، بولنا سوچنا اور عمل کرنا ہمارا فطری حق ہے۔ اس دنیا میں ہمارے درمیان اپنی مادی شکل میں کوئی اتھارٹی اپنا وجود نہیں رکھتی جس سے ہم سوچتے ہوئے اجازت طلب کریں، بولتے ہوئے پوچھیں کہ کیا بولنا ہے، اور عمل کرنے سے پہلے یا بعد میں اس کی رضامندی چاہییں۔

-ریاست ہمارے سوشل کنٹریکٹ سے وجود میں آتی ہے، وہ ہم پر اتھارٹی نہیں۔ شہری ریاست پر حکمران ہیں، ریاست شہریوں پر نہیں۔

-قانون ہمارے شہریوں کی مرضی پر بدل جاتا ہے، اور اگر وہ ہماری مرضی پر نہیں بدلتا تو ہم اس سے انحراف کر کے اپنی راہیں خود منتخب کر لیتے ہیں یا اسے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ شہری مشین نہیں ہوتے جسے ہدایات دے کر آپریٹ کیا جائے۔ ہمارے رویے آزادی ارادہ اور آزادی عمل کا نام ہیں۔

-سماج ہم اپنے رضاکارانہ تعاون و تبادلہ سے قائم کرتے ہیں۔ جہاں یہ رضاکارانہ نہیں ہم اس سے بغاوت کرتے ہیں اور جہاں اس کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہم وہاں سے ہجرت کر جاتے ہیں۔

– حکومتیں ہمارے ووٹ سے بنتی اور بدلتی ہیں۔

– بیوروکریٹ شہریوں کے خدمت گزار (سول سرونٹ) ہیں۔انہیں شہریوں پر نگران یا حکمران نہیں بنایا جا سکتا ۔

جو اتھارٹی بھی ہم پر ہماری مرضی کے بغیر مسلط ہونے کی کوشش کرتی ہے دور جدید کی اخلاقیات اور دانشورانہ اتفاق رائے اسے ظلم جبر منافقت اورآمریت ڈکلئیر کر چکے ہیں۔

فرد کے لئے اس کی آزادی دراصل اس کی خود دریافتگی (self discovery) اور خود نگہبانی (self responsibility) کا نام ہے۔ آزاد معاشرہ وہ ہے جس میں فطری نظم (self and spontaneous ordering) پایا جاتا ہو۔ اور یہی صفت ایک مضبوط اور مستحکم سیاست اور معیشت میں ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر وہ بھی آزاد نہیں۔ ایک مسیحا یا مسیحاوں کا گروہ جو نیت میں جتنے بھی مخلص ہوں ایک متنوع پیچیدہ اور ہمہ جہت (ملٹی ڈائمنشنل) سوسائٹی اور اس کی سیاست و معیشت کو وقت اور مقام سے ماوراء ہو کر نہ منظم کر سکتے ہیں، نہ کنٹرول اور نہ ہی منصوبہ بند ۔

خلاصہ کلام یہ کہ پاکستانی لبرلز کی آرزو کسی سے آزادی کا مطالبہ نہیں، بلکہ ناجائز پابندیوں، رکاوٹوں، اور آمریت کی ہر شکل اور اس کے ہر جبر سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ یہ جبر چاہے وہ ریاست کا ہو، حکومت کا، بیورو کریسی کا، خاکی وردی کا،کسی خدائی فوجدار طبقہ کا، یاآئین کی کسی مخصوص شق کا، وہ باطل ہے اور وہ ظلم ہے۔ انسانوں کی زندگی اور ان کی معاشرت کی بنیاد رضاکارانہ بنیادوں پر ہو نہ کہ غاصبانہ جابرانہ یاآمرانہ بنیادوں پر، ہم ہر صورت میں اس سے بغاوت کا اعلان کرتے ہیں۔

- ✓ ضروری ہے کہ ریاست کی قوت نفاذ پر پابندیاں ہونی چاہیں تاکہ جو اس کی ذمہ داریاں اور فرائض ہیں ان سے ماوراکوئی بھی اقدام ظاہراً یا باطناً سر انجام نہ دے سکے.
- ✓ معذوروں (disables)اوریتیموں و بیواؤں کی کفالت کرنا – ضروری ہے کہ کفالت صرف ان کی کی جائے جو مقابلہ کی مارکیٹ میں حصہ لینے کے قابل نہیں – جو حصہ لینے کے قابل ہیں انہیں حوصلہ افزائی اور محنت کی ترغیب کی ضرورت ہے نہ کہ خیرات و صدقات – اگر سوسائٹی اپنی بنیاد محنت کی ثقافت پر رکھنا چاہتی ہے تو اسے محنت کی ترغیبات پر کوئی کمپرومائز نہیں چاہیئے ۔

- ✓ گورنمنٹ کم مرکزیت (decentralized) کی حامل ہو. ریاستی طاقت اداروں میں افقی طرز میں تحلیل ہو ، جبکہ وفاق سے صوبوں ، صوبوں سے بلدیات اور بلدیہ سے ہر شہری کی دسترس تک طاقت عمودی انداز سے تحلیل ہو – لازم ہے کہ یہ طاقت کسی فرد واحد ، مخصوص ادارے ، طبقے ، عقیدے اور شہر میں مرتکز نہ ہو ورنہ آمریت کا ہی راج ہو گا –

ریاستی طاقت و اختیار کیسے تحلیل ہو ؟

افقی سطح پر : وفاقی حکومت یا ادارے سے صوبائی ، صوبائی سے ضلعی ، ضلعی سے یونین کونسل اور یونین کونسل سے ہر ہر گلی محلہ تک – اسے عموماً تین سطحی نظام مملکت بھی کہتے ہیں جیسے وفاقی نظام سے صوبائی نظام اور آخر میں بلدیاتی نظام –

عمودی طور: طاقت و اختیار کا پھر ڈیپارٹمنٹس اور ڈیپارٹمنٹس سے مہارت علم اور ذمہ داری کی بنیاد پر متعلقہ امور کے عہدے تک تفویض۔

- ریاستی طاقت کسی فرد یا افراد کے گروہ کے بجائے آئین اور ایک مخصوص طریقہ کار (Procedure) کی پابند ہونی چاہئے اور کسی کو بھی کسی بھی جواز (جیسے اچھی نیت ، اچھا پلان وغیرہ) کی بنیاد پر اس میں نقب لگانے اور زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے –

- ✓ سیاسی استحکام کو یقینی بنایا جائے۔ جس کے بغیر نہ معاشی ترقی ممکن ہے اور نہ ثقافتی و شخصی آزادیوں کو تحفظ حاصل ہے۔
- ✓ سیاست کو معیشت سے علیحدہ رکھا جائے یہ مل گئیں تو بدترین قسم کی اجارہ داری کی ثقافت قائم ہو گی ۔

آزاد مارکیٹ کے بجائے بیورو کریسی پر بھروسے کا کیا مطلب ہے ؟

اگر آپ کو آزاد مارکیٹ پر بھروسہ نہیں اور آپ سمجھتے ہیں کہ خریدار اور بیچنے والا خریدوفروخت کے عمل میں سمجھدار نہیں اس لیے گورنمنٹ کو چاہیے کہ وہ اس عمل میں مداخلت کرے اور انہیں بتائے کہ انہیں کیا چیز کس دام پر اور کتنی خریدنی چاہئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو فریقین جن کے اس لین دین میں مفادات وابستہ ہیں، پر اعتماد نہیں بلکہ ان کی جگہ ان بیوروکریٹس پر بھروسہ ہے جو آپ کی طرح کے ہی انسان ہیں۔ آپ کی طرح ہی سوچتے سمجھتے اور عمل کرتے ہیں اور ان کا اس لین دین کے عمل میں کوئی براہ راست فائدہ

یا نقصان وابستہ نہیں کہ وہ جان سکیں کہ خریدار و فروخت کنندہ کے مفادات کس طرز کے معاہدے(agreement) میں ہیں ۔جن (بیورو کریٹس) کا کسی عمل کے اچھے نتائج یا برے نتائج سے کوئی سروکار نہیں مگر نفع کی امید ،نقصان کا ڈر ، ان کی بنیاد پر ذاتی ترجیحات اور دلچسپیاں محض آپ (خریدار و سیلر) کا ہی خاصہ ہیں ، تو پھر وہ آپ سے بہتر انتخاب کیسے کرسکتے ہیں؟

کیا مزدوروں نے مزدوروں کا تحفظ کیا ؟

سوویت یونین نے مزدوروں کے تحفظ کے لیے مزدوروں کی جمہوریت اور مزدوروں کی اشرافیہ قائم کی ، یہ سوچ کر کہ ایک مزدور ہی دوسرے مزدور کے حقوق کا تحفظ کرے گا۔جب مزدور لیڈرطاقت و اقتدار کے منصب پر بیٹھے تو انھوں نے مزدوروں کے نہیں بلکہ اپنے اپنے سیلف انٹرسٹ (شخصی مفادات اور رجحانات)کے مطابق فیصلے کیے۔ ان کی نفسیات طاقت کے حصول کے بعد اب ایک عام مزدور کی بجائے سٹیٹس کو کی نفسیات بن گئ تھی۔ساری سوشلسٹ ریاستیں سیاسی طور پر مزدور لیڈر ان اور انتظامی طور پر بیوروکریسی کے تسلط میں تھیں۔ان کا انجام کیا ہوا؟ وہ کون سی سائنس ہے جس کی رو سے مزدوروں کی اشرافیہ اور بیوروکریسی دیگر شہریوں سے بہتر بصیرت ،ذہانت، نظام اقدار ، اور حسن انتخاب رکھتی ہے؟

بہترین ریاستی بندوبست کیسے قائم ہو؟

- **ایک بہترین ریاستی بندوبست حسن انتظام اور ریاستی طاقت میں توازن کا نام ہے۔** یہ توازن اس وقت ختم ہوجاتا ہے جب ریاست اپنی حدود سے تجاوز کرکے فرد،سماج اور ان کی معیشت سمیت روزمرہ کے امور میں مداخلت شروع کردیتی ہے۔ایک بار جب کسی بھی سبب سے یہ مداخلت شروع ہو جاتی ہے تو پھراس کا کوئی آخر نہیں۔ایک کے بعد دوسرا قدم آگے کو بڑھتا جاتا ہے اور فرد و سماج کا دائرہ کار آہستہ آہستہ سمٹتا جاتا ہے جس کا انجام آخر کار فرد و سماج پر ہمہ گیر آمریت یا مطلق العنانیت (Totalitarianism) ہوتا ہے ۔ضروری ہے کہ ریاست کو اس کی حدود میں رکھتے ہوئے فرد و سماج کو طاقت ور بنایا جائے۔

- **گورنمنٹ کی منصوبہ بندیوں کے بڑھنے سے فرد و سوسائٹی کی منصوبہ بندیاں بیوروکریٹس کے اختیار میں آجاتی ہیں** یوں سوسائٹی آزاد نہیں رہتی بلکہ جکڑی جاتی ہے جو سٹیٹس کو کے مفادات کا حصول کا ایک آسان ذریعہ بن جاتی ہے۔

❖ **گورنمنٹ کی نفسیات عموماً آمرانہ اور ضدی ہوتی ہے**۔ یہ اپنی غلطیوں سے صرف یہ سیکھتی ہے کہ ان غلطیوں کو کسی دوسرے طریقے سے دہرایا جائے جیسے مثال کے طور پر ہمارے وزیر اعلیٰ پنجاب اگر دیکھیں کہ پولیس کا ادارہ خراب کارکردگی دکھا رہا ہے تو اس کے متبادل میں ایک اور ادارہ کھڑا کر دیتے ہیں جیسے عام پولیس اور ایلیٹ فورس کے بعد اب نئی ڈولفن فورس تیار کی گئی ہے ۔یوں انتظامی مسائل کو سلجھانے کے بجائے خامیوں کو جوں کا توں رکھا جاتا ہے اور ان پر و سائل کا خرچ دوگنا کر دیا جاتا ہے ۔ ریاست کی یہ عادت ہوتی ہے کہ اگر اس کا کوئی منصوبہ ناکام ہوتو وہ کوئی دوسرا منصوبہ جاری کردیتی ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتی۔ریاست مناپلی یعنی اجارہ داری کی بدترین شکل ہے کیونکہ اس کے مخصوص جغرافیہ میں نہ کوئی اس کا مقابل ہوتا ہے اور نہ ہی متبادل کہ خراب کارکردگی کی صورت میں شہری اس کے متبادل سے ہی رجوع کر سکیں ۔ اس مناپلی کے سبب بدعنوان ریاست بے خوف ہو کر عوام کا استحصال جاری رکھتی ہے۔

کرپشن کی پولیٹیکل اکانومی کیا ہے؟

ابتدا اس بنیادی سوال سے کرتے ہیں کہ آخر کرپشن کہتے کسے ہیں؟ کرپشن کہتے ہیں بے ضابطگی کو، بے اصولی کو، کوئی اصل چیز چھپا کر نقل کو بطور اصل پیش کرنے کو، جھوٹ کو، اور کسی بھی شے کو اس کی اصل قدر سے کمتر یا برتر ثابت کرنے کو کرپشن کہتے ہیں۔ استاد محترم وجاہت مسعود کے الفاظ میں کرپشن کا مطلب ایسی خرابی ہے جس سے پورا نظام اتھل پتھل ہو جائے۔ زیر نظر مضمون اس بنیادی موضوع سے متعلق ہے کہ آخر وہ کون سے اسباب ہیں جن سے کرپشن کے رجحان میں اضافہ ہوتا ہے، اس کا ہماری معیشت سے کیا تعلق ہے نیز آخر اس پیچیدہ مسئلہ کو کیسے حل کیا جائے؟

کرپشن کی دو بڑی اقسام ہیں ۔

اول: کرپشن کی وہ قسم جو ریاستی قانون ساز اداروں، عدلیہ، اور انتظامیہ سمیت تمام بیوروکریٹک اداروں میں پائی جاتی ہے، اسے پولیٹیکل اکانومی کی زبان میں سرکاری کرپشن کہتے ہیں جب کہ وہ کرپشن جو عوامی حلقوں، ہمارے سماج، ہمارے روزمرہ کے معاملات، ہمارے نجی کاروباری لین دین وغیرہ میں پائی جاتی ہے اسے "پرائیویٹ کرپشن" کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کسی سڑک کی تعمیر یا مرمت کا ٹھیکہ کسی بیوروکریٹ یا سیاستدان کو رشوت دے کر اپنے نام کروا لیتے ہیں تو یہ سرکاری کرپشن ہو گی۔ اسی طرح اگر آپ کسی سے کوئی چیز ادھار پر خریدتے ہیں اور ادائیگی کے وقت پیسے دینے سے انکار کر دیتے ہیں تو یہ پرائیویٹ کرپشن ہو گی۔

دیکھیں معیشت کو سمجھنے کا ایک آسان طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ کاروبار (بزنس) کو سمجھیں کہ کیسے کیا جاتا ہے، ایک سے زیادہ کاروبار ایک دوسرے سے کیسے معاملات طے کرتے ہیں۔ وہ کون سے عوامل ہیں جو کاروبار کو ترقی دیتے ہیں اور وہ کون سے عوامل ہیں جو

اس میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ کاروباری سرگرمیوں کو جب ہم ایک کل میں دیکھتے ہیں تو سامنے نظر آنے والی تصویر کو عموماً معیشت کہتے ہیں۔ کاروباری سرگرمیوں کا انحصار دو یا دو سے زیادہ کاروباری فریقین (بیچنے والا اور خریدنے والا) کے درمیان خرید و فروخت کے معاملات میں ایمانداری، اعتماد اور تعاون پر ہے۔ کسی بھی بے ایمان بد اعتماد اور تعاون سے عاری فریق سے کوئی کاروبار کرنا نہیں چاہے گا۔ پرائیویٹ کرپشن اس اعتماد، تعاون، اور ایمانداری کی اساس کو تباہ کر دیتی ہے، یوں مارکیٹ میں ڈیمانڈ (طلب) ہونے کے باوجود بھی پروڈیوسر پیداواری سرگرمیوں سے پرہیز کرتا ہے۔ مثال کے طور پر میں جانتا ہوں کہ اگر میں مارکیٹ میں کوئی چیز بیچنے جاؤں گا، وہ بک تو فوراً جائے گی مگر مجھے یہ ڈر ہے کہ خریدار چیز خرچ کر کے بھی پیسوں کی ادائیگی سے مکر جائے گا یوں اس پرائیویٹ کرپشن کے نتیجے میں، میں باوجود مارکیٹ میں طلب کے پیداواری سرگرمی سے دور رہوں گا، جس کا مجموعی نتیجہ یہ ہو گا کہ معاشی ترقی رک جائے گی۔ اگر میں کاروبار نہیں کروں گا تو یقیناً روزگارپیدا نہیں ہو گا جس کا نتیجہ غربت اور بھوک ہو گی۔ پولیٹیکل اکانومی کے ماہرین کا کہنا ہے کہ بعض اوقات پرائیویٹ کرپشن سرکاری کرپشن سے بھی عموماً زیادہ خطرناک ہوتی ہے کیونکہ یہ پیداواری سرگرمیوں کو کمزور کر دیتی ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ معاشی عمل کی اول اور اہم سرگرمی پیداوار ہے۔ مگر یہ بھی یاد رہے کہ پرائیویٹ کرپشن میں استحکام نہیں ۔ اگر ہم کسی کاروباری فریق کی طرف سے دھوکہ دہی اور خسارے کا سامنا کریں گے تو اگلی بار اس پر اعتماد نہیں کریں گے ۔اسے اپنے کاروباری معاملات سے نکال باہر پھینکیں گے اسی لئے کرپشن کی اس قسم کا ہمارے معاملات میں خطرہ کم ہوتا ہے ۔

اس اعتماد (ٹرسٹ) ایمانداری اور تعاون کا معیشت میں انتہائی اہم کردار ہے۔ مارکیٹ اس وقت عروج پر ہوتی ہے جب تمام کاروباری فریقین (خریدار و بیچنے والا) کا مارکیٹ پر اعتماد عروج پر ہوتا ہے اور وہ کاروبار کرتے جاتے ہیں۔ مارکیٹ میں بحران اس وقت آتا ہے جب تمام کاروباری فریقین کا مارکیٹ پر اعتماد اٹھ جاتا ہےاور وہ خرید و فروخت روک دیتے ہیں یا کم کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کسی بھی ملک کی مارکیٹ بحران سے اس وقت نکلتی ہے جب فریقین کا مارکیٹ پر اعتماد پھر سے بحال ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ عموما ایک فطری عمل ہے جو مارکیٹ میں جاری رہتا ہے۔

پرائیویٹ کرپشن کی ایک اور قسم جرائم ہیں جس کی بدترین مثالیں بھتہ، تاوان، چوری چکاری اور لوٹ مار وغیرہ ہیں۔ یہ ایک کاروبار کو خطرات میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر میں نے ایک چیز اپنی فیکٹری میں تیار کی ہے اور گاہک کا آرڈر موصول ہوتا ہے کہ میں اس تک سامان کی ڈلیوری پہنچاؤں، اگر بالفرض مجھے یہ ڈر ہو کہ راستہ میں کوئی ٹرک روک کر سامان چھین لے گا تو میں ہرگز بھی سامان نہیں بھیجوں گا۔ سامان نہیں بکے گا تو میں فیکٹری بند کر دوں گا جس کا ملک کی معیشت اور روزگار پر بدترین اثر پڑے گا۔ اگر معاملہ محض پیسے تک محدود ہے جیسے بھتہ، تو کاروبار ایسے نقصانات کو اپنے پیداواری اخراجات میں ڈال کر اس کے حساب سے قیمتیں طے کرتے ہیں۔ اگر صارف ان قیمتوں کو قبول کر لے تو کاروبار چلتے جاتے ہیں اور اگر صارف اس مخصوص چیز کو زیادہ قیمت کے سبب خریدنے سے انکار کر دے تو کاروباری سرگرمیاں رک جاتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں نقصان سوسائٹی کا ہے۔ مثال کے طور پر اگر میں نے ایک چیز سو روپے کی بنائی ہے، اور بھتہ مافیا مجھ سمیت تمام کاروباری افراد سے 30 روپے بھتہ مانگ رہا ہے تو نتیجہ میں مجھ سمیت تمام

کاروباری ادارے اس چیز کی قیمت 130 روپے کی لاگت سے طے کریں گے یوں بھتہ مافیا کی بدمعاشی پر خاموش عوام بھی اس کی قیمت ادا کرنے پر مجبور ہو گی۔

اگر ریاست اپنی بنیادی ذمہ داری یعنی امن و امان کا قیام ممکن نہیں بنائے گی تو پرائیویٹ کرپشن کی یہ قسم بھی اتنی زیادہ ہو گی۔ یاد رہے کہ ریاست کی کمزوری سے مراد یہاں تمام ریاستی اداروں کی اپنے اپنے دائرہ کار میں پروفیشنل مہارتوں میں کمی اور غیر سنجیدگی ہے۔ اگر مجھے مال کی ڈیلوری دیتے ہوئے ٹرک چھن جانے کا خطرہ ہے تو سڑکوں کو پرامن بنانا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اگر کوئی باوجود ایک لیگل کنٹریکٹ کے مجھے ادائیگی نہیں کر رہا تو قانونی معاہدوں کی پابندی کروانا عدلیہ و انتظامیہ کی ذمہ داری ہے۔

سرکاری کرپشن

سرکاری کرپشن کی آگے مزید دو اقسام ہیں

ایک: یہ کرپشن کی وہ قسم ہے جس میں سیاستدان اور سرکاری ملازمین یا بیوروکریسی کسی قانونی کام کو سست رفتاری کے بجائے تیز رفتاری سے سرانجام دینے کے لئے رشوت لیتے یا سفارش کا اثر لیتے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں معمولی درجے کی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث افراد سے رشوت لے کر یا سفارش سن کر جو رعایت دی جاتی ہے، یا پھر کوئی ناجائز فائدہ پہنچایا جاتا ہے۔ اس قسم کی کرپشن کے اخراجات کو بھی عموماً ہر کاروبار اپنے پیداواری اخراجات میں ڈال کر صارف سے وصول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر مارکیٹ میں مقابلہ کی ثقافت ہے تو وہ اس کوشش میں ناکام رہتے ہیں کیونکہ وہ کمپنی جس نے رشوت دیئے بغیر قانونی طور پر تمام سرگرمیاں سرانجام دی ہوتی ہیں ان کی پیداواری لاگت چونکہ کم ہو گی اور وہ صارف کو اشیاء یا خدمات بھی کم قیمت پر پیش کریں گے یوں زیادہ قیمت وصول کرنے والا کاروبار مارکیٹ سے باہر ہو جائے گا یا پھر وہ کوئی اور حربہ سوچنے کی کوشش کرے گا۔ اگر میرے گھر کی گلی میں دو دکانیں ہیں اور دونوں میں کسی شے کی قیمت میں فرق ہے تو میں کم قیمت وصول کرنے والی دکان پر جاؤں گا۔ اسی طرح اگر پورے محلے میں صرف ایک ہی دکان ہے تو میں مجبور ہوں گا کہ اپنی ضرورت کے لئے منہ مانگے دام ادا کروں۔ اس قسم کی کرپشن سے دنیا کا کوئی ملک محفوظ نہیں۔ وہ ممالک جہاں مارکیٹ میں مقابلہ کی ثقافت پائی جاتی ہے وہاں اس کے اثرات بھی معاشی سرگرمیوں پر محدود ہیں جنہیں عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

سرکاری کرپشن کی دوسری خطرناک قسم وہ ہے جس میں سیاستدان یا بیوروکریسی کسی کاروباری کمپنی سے پیسے لے کر اسے یا تو مارکیٹ میں اجارہ داری (مناپلی) قائم کرنے میں مدد دیتے ہیں یا کوئی نیا قانون اسمبلیوں سے پاس کروا کے یا کسی نئی ادارہ جاتی پالیسی کی مدد سے کسی کمپنی کو قانوناً رعایت یا سہولت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان میں ٹیکسٹائل ملز مالکان کی یونین گورنمنٹ پر دباؤ ڈال کر ان سے ٹیکس میں مکمل چھوٹ لیتی ہے اور ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ فنڈ الٹا گورنمنٹ سے وصول کرتی ہے۔

اس طرح کی کرپشن پاکستان میں عام ہے اور یہ کرپشن کی بدترین قسم ہے۔ اس کرپشن کی وجہ سے پاکستان میں کسی ایک کمپنی یا کچھ کمپنیوں کی یونین کی کسی ایک سیکٹر یا انڈسٹری پر اجارہ داری قائم ہوتی ہے۔ اجارہ داری چاہے سیاست میں ہو سماج میں یا معیشت میں ظلم کی بدترین قسم ہے۔ اس میں مقابلہ اور کارکردگی کی بجائے قبضے اور استحصال کی نفسیات کا غلبہ ہوتا ہے۔

پولیٹیکل اکانومی کا اصول ہے کہ ریاست معاشی سرگرمیوں میں جتنا ملوث ہوتی جائے گی اتنا ہی کرپشن کی اس قسم کو فروغ حاصل ہو گا۔ جب کسی ادارے کے بڑے افسر کو (جیسا کہ پاکستان میں فیڈرل بورڈ آف ریونیو) کو معلوم ہو گا کہ ٹیکس قانون کی کسی شق میں تھوڑی سی تبدیلی کسی کمپنی کو کروڑوں کا فائدہ دے سکتی ہے تو اس میں کرپشن کی تحریک کے پیدا ہونے کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ ایک اور دلچسپ مثال آپ کے سامنے ہے، پوری دنیا میں ترقی یافتہ ممالک کے ہاں آزاد تجارت کا چال چلن ہے، پاکستان کی معاشی پالیسی میں یہ ثقافت انتہائی کمزور ہے۔ اب پاکستان میں ٹماٹر کی امپورٹ پر پابندی ہے مگر دلچسپ بات یہ کہ processed ٹماٹر جیسا کہ اس کا "کیچ اپ" وغیرہ اس کی امپورٹ پر ڈیوٹی انتہائی کم ہے۔ امپورٹ پالیسی میں ایک چھوٹی سی تبدیلی میکڈونلڈ اور کے ایف سی جیسے اداروں کو کتنا فائدہ دے سکتی ہے آپ جانتے ہیں۔ اس طرح کی کرپشن عموما نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب تجارت پر پابندیاں لگتی ہیں تو پورٹ افسران کو پیسے دے کر اپنے تجارتی مال کے لیے پرمٹ حاصل کرنے کا رواج بڑھ جاتا ہے، اور جب تجارت آزاد ہوتی ہے تو یہ امکان انتہائی کم ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے آپ دنیا کی تمام بندرگاہوں میں کرپشن کے اعدادوشمار اٹھا لیں۔ جہاں بیرونی تجارت پر سختیاں ہیں وہاں کرپشن زیادہ ہے اور جہاں صرف کوالٹی اور انتظامی امور پر توجہ دی جاتی ہے وہاں آپ کو کرپشن کی شرح بھی کم ملے گی۔ آپ مثال کے طور پر دبئی کی بندرگاہ جبل علی اور ایران کی بندرگاہ بندر عباس پر تجارتی سامان کی نقل و حرکت کی رفتار اور کرپشن کی شرح دیکھ سکتے ہیں۔

کیا کرپشن معاشی ترقی میں رکاوٹ ہے ؟ اس کا جواب ہاں میں ہے۔ غریب ممالک کی غربت کا سبب یہ نہیں کہ وہاں مارکیٹ کام نہیں کر سکتی یا امدادی ادارے امداد نہیں دے رہے یا وہاں قدرت ان سے دشمنی کر رہی ہے ؟ ایسا ہر گز نہیں ہے۔ غریب ممالک کا اصل مسئلہ چاہے وہ سماجی ہے یا معاشی ، اس کی جڑیں اصل میں سیاسی ہیں جو اجارہ داری کی ثقافت کا تحفظ کرتی ہیں۔ ہمارے پاس افریقہ سے لے کر لاطینی امریکہ سنٹرل ایشیاء جنوبی ایشیاء سمیت ان ممالک کی ان گنت مثالیں ہیں۔ پاکستان میں بھی ہمیں دلچسپ شماریاتی ثبوت حاصل ہیں کہ جب سیاسی استحکام قائم ہوتا ہے تو معاشی ترقی کو راستہ ملتا ہے اور جب سیاست ڈانواں ڈول ہوتی ہے تو سیاسی عدم استحکام کے نتیجے میں معیشت بھی مضطرب ہو جاتی ہے۔ غریب ممالک کی سیاست پر یا تو فوج کا قبضہ ہے یا بادشاہ کا یا قبائلی سرداروں کا یا بیوروکریسی ہٹ دھرم ہے یا سیاسی استحکام حاصل نہیں اور یا پھر اداروں کو پنپنے کے مواقع محدود و مقید ہیں۔ ایک بھی ایسا ملک دکھا دیجئے جہاں جمہوری استحکام ہو اور مارکیٹ کو اس کی سرگرمیوں میں آزادی حاصل ہو مگر وہ ملک معاشی طور پر غریب ہو ؟ آپ کو ایسا کوئی ملک نہیں ملے گا۔

ذیل میں کرپشن کی چند دیگر وجوہات کا ہم مختصرا ذکر کریں گے۔

جب اداروں کی سرگرمیاں زیادہ سے زیادہ آن لائن ہوں گی اور متعلقہ سرکاری ملازمین سے فریقین کا ملنا کم ہو گا تو اتنا ہی کرپشن کے امکانات کم ہو جائیں گے ...مینوئل (maneul) سرکاری سرگرمیوں میں سرکاری ملازمین کی یا تو مٹھی گرم کی جاتی ہے اور یا پھر سفارش کر دی جاتی ہے تب جا کر سرکاری سہولیات جلد سے جلد حاصل کی جاتی ہیں۔

۔ ایک معاشرہ جتنا متنوع ہو گا اتنی ہی کرپشن زیادہ ہو گی۔ ایک ذات، زبان، مذہب یا علاقے کا فرد اس آدمی کو زیادہ رعایت یا آسانی دے گا جس کا تعلق اس کی مشترک ذات زبان مذہب یا علاقے سے ہو گا۔

۔ جن جن سرکاری یا نجی ملکیت کے اداروں کو بیرونی ذرائع سے خیراتی فنڈ ملتے ہیں ان میں کرپشن کی شرح بہت زیادہ ہے چاہے وہ مذہبی مدرسے ہوں یا این جی اوز۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو پیسے دے رہا ہوتا ہے وہ کارکردگی کا عینی شاہد نہیں ہوتا، اسے آپ ایک ہنستی مسکراتی رپورٹ دکھا کر مطمئن کر سکتے ہیں۔ کاروباری ادارے اپنی کارکردگی کو مالی نفع و نقصان سے جانچتے ہیں، اس میں کارکردگی کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں ہوتا۔ سرکاری ادارے عموماً اپنی کارکردگی کا جائزہ رپورٹس سے لیتے ہیں، اچھی لفاظی خزاں کو بھی بہار دکھا سکتی ہے۔

۔ ادارے جتنے کمزور ہوں گے اتنا ہی کرپشن زیادہ اور آسان ہو گی۔ یہاں اہم نکتہ یہ ہے کہ ادارے سیمنٹ و سریے سے مضبوط نہیں ہوتے اور نہ ہی محض قانون لاگو کرنے سے وہ مستحکم ہو جاتے ہیں۔ قانون اور ثقافت میں اگر فرق دیکھا جائے تو چاہے اصولی طور پر قانون کا پلڑا بھاری ہوتا ہے مگر عملاً رواج ثقافت کا ہوتا ہے۔ ثقافت روایات کا تسلسل ہوتی ہے، اس کی جڑیں تاریخ اور اقدار میں اتری ہوئی ہوتی ہیں۔ محض قانون کی شق بدلنے سے ثقافت کا رجحان بدلنا آسان نہیں۔ اسی لئے دنیا میں جہاں بھی ادارے مضبوط ہیں وہاں انہیں ارتقائی قوتوں کی خاص مدد حاصل رہی ہے جو محض ایک دن یا چند سالوں کا واقعہ نہیں بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بہتری کی منظم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ پاکستان میں جب تک اداروں کو وقت نہیں ملتا اس وقت تک ان میں بہتری کا امکان انتہائی کم ہے۔ یہاں فوج اور بیوروکریسی اس لئے بھی مضبوط ہے کہ یہ دو ادارے برطانوی راج میں بھی مضبوط تھے اور مغلوں کے اقتدار میں بھی یہ اپنی قدیم شکل میں موجود تھے۔ سیاسی اداروں کی یہاں تاریخ مختصر اور کمزور ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ سیاسی و سول ادارے وقت کی بھٹی میں پکے بغیر مضبوط ہو جائیں۔

۔ ایک اہم نقطہ انسانی نفسیات کا بھی ہے جو ترغیبات (Incentives) کو رسپانس کرتی ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ فائدہ کی طرف تیزی سے بڑھتا ہے اور نقصان سے دور ہٹتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہم سے قرض لے کر واپس نہیں کر رہا تو ہم اسے دوبارہ قرض نہیں دیں گے۔ اسی طرح اگر ایک شخص ہزار روپے کماتا ہے اور نتیجے میں اسے تین سو ستر سے چار سو کا ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ دوسرا شخص ہزار روپے کماتا ہے مگر سو روپے ٹیکس آفیسر کو دے کر اپنے دو سو ستر سے تین سو روپے بچا لیتا ہے تو ہو گا یہی کہ باقاعدگی

سے ٹیکس دینے والے کے اندر بھی ٹیکس سے بچنے کی تحریک پیدا ہو گی، یوں بدعنوانی آگے فرد سے فرد پھیلتی جائے گا تب تک کہ ریاست ٹیکس کی ثقافت کو ٹیکس ادائیگی کے مثبت محرکات (incentive) سے نہیں جوڑ دیتی جن میں سے ایک یہ ہے کہ فرد کو یقین ہو جو ٹیکس اس سے وصول کیا جا رہا ہے وہ اس پر ہی خرچ ہو گا۔

انسانی فطرت ہے کہ ہم جبر کے خلاف مدافعت کرتے ہیں۔ آزادی ہماری فطرت کا جوہر ہے۔ قانون جبر کی ہی ایک قسم ہیں، اگر قوانین فرد کی فطرت سے ہم آہنگ نہیں تو یقینا عوام ان سے انحراف کی ہر ممکن کوشش کریں گے یوں اس سے مالی اخلاقی اور سماجی کرپشن کو راستہ ملے گا۔ اسی طرح اگر قوانین مثبت محرکات اور ترغیبات کو پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں تو ہم خود ان کی طرف بڑھیں گے۔ یوں حاصل یہی ہے کہ جب تک قانون سازی و انتظامی اداروں کی ثقافت لوگوں کی آرزوؤں کے عین مطابق نہیں ہو گی اس وقت تک کرپشن کی مختلف اقسام ہمیں نقصان پہنچاتی رہیں گی۔

۔ جتنا زیادہ نظام بیوروکریٹک ہوتا جائے گا اتنا ہی کرپشن بڑھتی جائے گی۔

۔ قانون کی حکمرانی سماج کو مہذب بناتی ہے۔ کوئی بھی ادارہ اگر قانون توڑ کر قانون کی حکمرانی قائم کرنا چاہتا ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے شیطان کو دنیا میں بھلائی پھیلانے کے لئے اقتدار دے دیا جائے۔ قانون کی حکمرانی قانون کی پابندی میں ہی ہے۔ وہ معاشرے جہاں قانون کی عملداری کمزور ہے وہاں کرپشن کا راج ہے۔

جب گورنمنٹ اپنے دائرہ کار میں زیادہ وسیع ہوتی جاتی ہے تو درج ذیل مسائل سے دوچار ہوتی ہے

- **اپنی کارکردگی (efficiency and effectiveness) کھو بیٹھتی ہے۔** زیادہ سے زیادہ دائرہ کار پھیلنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ بنیادی ذمہ داریاں جن کی تکمیل کے لئے ریاست کا ادارہ قائم کیا جاتا ہے ، وہ ذمہ داریاں تشنہ تکمیل رہ جاتی ہیں اور ریاست ذیلی امور میں اپنی توانائیاں کھو بیٹھتی ہے ۔ریاست کی بنیادی ذمہ داریاں جیسا کہ بتایا گیا ہے امن وامان جس میں تمام شہریوں کی زندگی کا تحفظ، انکی آزادیوں یعنی بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ، انکی پراپرٹی کا تحفظ، اور ان کے درمیان اگر تنازعات جنم لیں تو انہیں مساوات و انصاف سے حل کرنے کے لئے بہترین بندوبست قائم کرنا، انتہائی اہم ہیں ۔ہماری سماجی زندگی جوں جوں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ ہوتی جارہی ہے اتنا ہی یہ ذمہ داری بھی زیادہ اہم اور پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان بنیادی امور کو مکمل توجہ اور سنجیدگی سے سرانجام دیاجائے ،متعلقہ مسائل حل کئے جائیں، اور ریاست اپنی توانائیاں اردگرد کے دیگر مسائل اور مہم جوئیوں پر خرچ کرنے کے بجائے شہریوں کی زندگی میں سہولیات کی فراہمی کے بنیادی امور پر خود کو وقف کرے ۔

- **ریاستی اثر و رسوخ اور دائرہ کار جتنا زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اتنا ہی بیوروکریٹس اور سیاستدانوں کی طرف سے بدعنوانیاں بڑھتی جاتی ہیں** اور اتنا ہی مشکل ہوتا جاتا ہے کہ ان بدعنوانیوں سے محفوظ رہا جائے۔کرپشن ایک بیوروکریٹک سیاسی انتظام میں معمول کی بات ہے جتنا بیوروکریٹک انتظام بااختیار اور وسیع ہوگا ، اتنا ہی کرپشن کا مسئلہ زیادہ جنم لے گا۔

- ہمارے پاس قومی مقاصد کے حصول کے دو ذرائع ہیں جو سیلف انٹرسٹ کی جستجو پر انحصار کرتے ہیں۔

ایک تمام افراد اپنی صلاحیت و قابلیت اور مہارت و ذہانت کو مقابلہ کی ثقافت میں لائیں۔جتنا تعمیری کام (contribute) کریں گے اتنا ہی صلہ پائیں گے - دوسرا طریقہ یہ ہے کہ گورنمنٹ لوگوں کی محنت کے نتائج کو سوسائٹی سے اکھٹا کرے اور تقسیم آمدن کی پالیسی کے تحت اسے شہریوں میں تقسیم کردے۔ اس صورت میں تعمیری محنت کا نتیجہ یعنی انعام یا بدلہ یا نفع کو خود سے کمانے کے رجحان اورسیلف انٹرسٹ کی نفی ہوگی اور لوگ چاہیں گے کہ گورنمنٹ ہمیں بغیر محنت اور تعمیری حصے کے ہمارا حصہ دوسروں کے مساوی بانٹ دے۔

ایسا گورنمنٹ کے لئے ہر گز ممکن نہیں کہ وہ لوگوں کو ان کا کوئی متعین حصہ طے کرتی اور تقسیم کرتی پھرے کیونکہ نہ اتنے وسائل ہوتے ہیں اور نہ ہی اتنی زیادہ پیداوار۔اس لیے اپنا حصہ لازمی طور پر وصول کرنے کے لیے مزدور لیبر گروپ بناتے ہیں تاکہ حکومت پر دباؤ بڑھا کر ہر صورت میں اپنا خود سے طے شدہ حصہ حکومت سے وصول کیا جائے – کاروباری طبقہ اپنی یونین بناتے ہیں کہ حکومت سے مدد یعنی فیور لی جائے یوں اجارہ دار طبقات حکومت پر ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں کہ جتنا خون چوس سکتے ہیں ریاست کے زیر قبضہ وسائل سے چوسیں –

حکومتی سوشل ویلفئیر ماڈل کا ایک اور نقصان یہ بھی ہے کہ لوگ خود انحصاری اور محنت سے صلہ کمانے کے بجائے گورنمنٹ کی امداد کے حصول کی طرف زیادہ رجوع کرنے لگ جاتے ہیں۔یوں کام چوری بڑھتی ہے - حکومتی ویلفئیر فنڈ کے آسان حصول کے لئے نت نئی ترکیبیں سوچی جاتی ہیں اور لوگوں میں گورنمنٹ کی امداد کے لیے طفیلیہ پن بڑھ جاتا ہے۔مغربی ممالک میں بھی جہاں سوشل ویلفئیر حکومت کی طرف سے مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں کام چوری اور مستقل خیراتی امداد پر انحصار بڑھا ہے۔

وسائل کی یہ جنگ پھر بیانیہ (narrative) کی جنگ بن جاتی ہے۔جسے حصہ مل جاتا ہے وہ مزید حصے کی جستجو کرتا ہے اور جسے نہیں ملتا وہ ناکامی ،مایوسی اور محرومی کی شکایت کرتا پھرتا ہے اور خود کو اس اجتماعی اکائی یعنی قومی وجود سے باہر سمجھنے لگتا ہے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ دوسروں نے اس سے اس کا حصہ چھین لیا ہے۔یوں تمام پریشر گروپ ایک دوسرے سے نفرت کرتے، وسائل وحصہ کی کشمکش میں ایک دوسرے سے لڑنے لگتے ہیں اور یوں سماج کی تنوع پسندی، نمایاں صلاحیت و قابلیت،امن و امان اور بہتر مستقبل کے امکانات کمزور پڑجاتے ہیں۔ جسے ہم مقبولیت پسندی کی سیاست یعنی (Populism) کہتے ہیں اس کا جنم بھی اسی طرح سے ہوتا ہے ۔

یہی کچھ پاکستان میں ہے یہاں بھی ہر فریق یا طبقہ یا شناخت یہ سمجھتی ہے کہ مجھے میرا حصہ نہیں ملا اور دوسروں نے میرے حصے کو دبا رکھا ہے ۔ حکومت بھی مجھے میرا حصہ نہیں دے رہی اور نہ ہی میرے حصے کی وصولی میں میری مدد کر رہی ہے۔ یہ الزامات اس سبب سے بھی ہیں کہ پاکستان میں مقابلہ کی ثقافت کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا –

- **ریاست کی وسیع ذمہ داریاں ریاست کی مالیاتی پوزیشن تباہ کر دیتی ہیں**-جب ریاست کی ذمہ داریاں وسیع ہوجاتی ہیں تو ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے جو ان ذمہ داریوں کی تکمیل پر اٹھ رہے ہوتے ہیں ، ایک طرف ٹیکسز کو بڑھا دیا جاتا ہے (زیادہ ٹیکسز انویسٹمنٹ یعنی مزید سرمایہ کاری و کاروبار کے بھیلاؤ کے رجحان اور ریوارڈ یعنی نفع کو کم کردیتے ہیں یوں طویل مدتی پیمانے پر اس سے ملکی پیداوار کا نقصان ہوتا ہے) تو دوسری طرف حکومت زیادہ اخراجات اور کم آمدن کے سبب بجٹ خسارے میں چلی جاتی ہے۔جسے پورا کرنے کے لئے قرضوں کا پہاڑ اکھٹا ہو جاتا ہے ۔اسی حساب سے ملکی کرنسی کی بین الاقوامی مارکیٹ میں ویلیو بھی کمزور ہوتی چلی جاتی ہے اور عالمی رینکنگ میں اس ملک کی مالیات کی مستحکم پوزیشن بھی قائم نہیں رہتی ۔اس سے انویسٹمنٹ (Investment) اور سیونگ مزید متاثر ہوتی ہے ۔ اور یہ سلسلہ رکنے کا نام نہیں لیتا جسے ایک اور رجحان سے بھی مزید تحریک ملتی ہے –

- **قرضوں کا بوجھ اکٹھا ہو جاتا ہے :** جب ایک حکومت کے جانے کے بعد دوسری حکومت آتی ہے اور اسے قرضوں کا بوجھ ورثہ میں ملتا ہے تو وہ اپنے ووٹر کھونے سے ڈرتی ہے اسی لیے وہ بھی (ترقیاتی منصوبوں اور دوسرے ذیلی امور جن میں دکھاوے یعنی عوامی مقبولیت کا عنصر بھی موجود ہو) کھل کر خرچ کرتی ہے اور ان پرانے اور نئے لئے گئے قرضوں کو نئی آنے والی حکومت کےلیے چھوڑ جاتی ہے ۔ نئی حکومت بھی مقبولیت پسندی کے سبب اپنے پیشرو حکومتوں کی پیروی کرتی ہے یوں ملک سنگین ترین بحران میں چلا جاتا ہے ۔یہی سبب تھا کہ زیادہ تر سوشلسٹ معیشتیں قرضوں کے بوجھ تلے دم توڑ گئیں اور دیوالیہ ہوگئیں۔

اسی لئے لبرل کیپیٹلزم کی معیشت میں فری مارکیٹ اکنامکس بجٹ خسارے کی پالیسی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی ۔

- **ریاست حاوی مگر فرد و سوسائٹی کمزور اور بے پرواہ ہو جاتے ہیں :** جیسا کہ پہلے لکھا گیا کہ جب ریاست حاوی ہو جاتی ہے اور ہر چیز کو اپنے دائرہ کار میں لے لیتی ہے تو فرد اور سوسائٹی کمزور ہوجاتے ہیں - اب وہ آزاد (Independent) نہیں رہتے،یوں اس طرح کی نفسیات کو تحریک ملتی ہے کہ "سب کچھ حکومت پر چھوڑ دیں (Let the Government do)".... اجتماعی ذمہ داری کا یہ کام ہم کیوں کریں ؟ ..... گورنمنٹ کو یہ کرنے دو اور وہی کرے گی۔یوں سماجی تعاون متاثر ہوتا ہے اور سماجی سرگرمیوں کا رجحان اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں کمزور پڑ جاتی ہے۔جب ایک مرتبہ یہ سلسلہ شروع ہوجاتا ہے تو ہم سوسائٹی میں جب کوئی مسئلہ دیکھتے ہیں تو اس پر حکومت کو مورد الزام ٹھہرانا شروع کردیتے ہیں کہ گورنمنٹ یہ کیوں نہیں کر رہی وہ کیوں نہیں کر رہی۔چونکہ گورنمنٹ اجتماعی ذمہ داری کا ہر کام نہیں کرسکتی ، اس میں سماج کی شمولیت بھی لازم ہوتی ہے یوں گورنمنٹ کی credibility بھی بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔

امریکہ میں ریاستی سطح پر سوشل ویلفیئر پالیسیز سے پہلے امریکی پوری دنیا میں سب سے زیادہ خیرات و عطیات کرنے والے لوگ تھے اور اب وہ اپنے ملک میں بے سہارا اور غریب لوگوں کی مدد کے بجائے دوسرے ممالک کے غرباء کی بزریعہ فارن ایڈ مدد کرتے ہیں – اپنے اردگرد کے لوگوں کے بارے میں تو اکثریت کا کہنا ہے کہ انہیں تو ریاست دیتی ہے ہم کیوں دیں ؟ ریاستی سطح پر ویلفیئر پالیسی سے سماجی سطح پر ویلفئیر و تعاون بری طرح متاثر ہوتا ہے -

پھر چونکہ وسیع و عریض اختیارات کی حامل ریاست سوسائٹی کے امور میں گھستی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ آپ کے گھر کے دروازے پر آکر آپ کی سیکورٹی کے نام پر آپ کی پرائیویسی(نجی زندگی کی رازداری) اور آزادی پر بھی آ حملہ آور ہوتی ہے۔ پھر ہم جاگیرداروں اور بادشاہوں کی طرح ریاست کے بھی غلام بن جاتے ہیں۔جو وہ چاہتی ہے وہی دیکھتے ہیں جو وہ بہتر سمجھتی ہے وہی سنتے اور بولتے ہیں۔ ریاست کو اپنے گھر کے دروازے سے دور اپنے ادارہ کی حدود میں رکھنا فرد و سوسائٹی کی آزادی اور تخلیقی صلاحیتوں کے لئے از حد ضروری ہے ورنہ بیوروکریٹس کی غلامی (Serfdom)ہی مقدر ہو گی ۔

جمہوریت اور اقتصادی منصوبہ بندی

جمہوریتوں میں اقتصادی سرگرمی کی مرکزی تنظیم کا مطالبہ کرنے والے احباب کی اکثریت بلاشبہ آج بھی اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ سوشلزم اور شخصی آزادی کا ملاپ ممکن ہے۔ اگرچہ بہت سے مفکرین ابتدا میں ہی سوشلزم کو آزادی کے خلاف سنجیدہ ترین خطرے کے طور

پر پہچان گئے تھے، آج خال ہی یاد رکھا جاتا ہے کہ سوشلزم اپنے آغاز میں صاف طور پر آمرانہ نظام تھا۔ سوشلزم کی ابتدا فرانسیسی انقلاب کے لبرل ازم کے خلاف واضح رد عمل کے طور پر ہوئی۔ فرانسیسی مصنفین جنہوں نے سوشلزم کی بنیاد رکھی خوب جانتے تھے کہ ان کے افکار ایک مضبوط آمرانہ حکومت ہی عمل میں لا سکتی ہے۔ سینٹ سائمن، جو پہلا جدید ریاستی منصوبہ ساز تھا، نے پیشین گوئی کی تھی کہ جو لوگ اس کے منصوبہ ساز اداروں کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے ان سے مویشیوں کا سا سلوک ہو گا۔ جمہوریت اور سوشلزم میں ناقابل تطبیق تضاد کو عظیم سیاسی مفکر ڈی ٹاکیوائلی سے بہتر کسی نے نہیں سمجھایا۔ اس کا کہنا تھا کہ

'' جمہوریت شخصی آزادی کو فروغ دیتی ہے''۔

اس نے 1848 میں کہہ دیا تھا کہ ''جمہوریت ایک ایک فرد کو ہر ممکن حد تک قیمتی سمجھتی ہے جبکہ سوشلزم فرد کو محض ایک ایجنٹ یا ایک عدد کے طور پر دیکھتا ہے۔ سوشلزم اور جمہوریت میں محض ایک لفظ کا اتفاق ہے، مساوات۔ مگر ذرا فرق جان لیجیے۔ جمہوریت آزادی میں مساوات کا نام ہے جبکہ سوشلزم جبر اور محکومی میں مساوات کا۔''

جمہوری مجالس شوری یعنی پارلیمان ، ریاستی منصوبہ ساز ایجنسیز کی مانند کام نہیں کر سکتیں۔ کسی قوم کے تمام وسائل کی تنظیم و ترتیب کے ممکنہ حل بے شمار ہیں سو مجالس شوری ہر بات پر اتفاق رائے نہیں پیدا کر سکتیں۔ اگر کوئی پارلیمان ہر قدم پر سمجھوتہ کرتے اور مرحلہ وار چلتے ہوئے کسی منصوبے پر اتفاق کر بھی لے تو آخر میں کوئی بھی ایسے منصوبے سے مطمئن نہیں ہوگا جس کے نتائج برے نکلیں ۔

جمہوری عمل کے ذریعے اقتصادی منصوبہ بندی کرنا، جمہوری عمل کے ذریعے فوجی مہم کی کامیاب منصوبہ بندی سے بھی زیادہ مشکل ہے کیونکہ لامحالہ یہ کام ماہرین کو ہی تفویض کرنا پڑے گا۔ اور اگر جمہوریت اس عمل انگیز کے ذریعے اقتصادی سرگرمی کے تمام شعبہ جات کے لیے منصوبہ بندی کر لیتی ہے تو پھر بھی ان متعدد جداگانہ منصوبوں کو ایک لڑی میں پرونے کی مشکل درپیش رہے گی۔ یہ مطالبہ زور پکڑتا جائے گا کہ کسی بورڈ یا فرد کو اپنی صوابدیدی ذمہ داری پر کام کرنے کا اختیار دے دیا جائے۔ منصوبہ بندی کے عمل میں اقتصادی آمر کا مطالبہ ایک مانوس مرحلہ ہے۔ یوں قانون ساز ادارے کا مقصد محض مطلق العنان اختیارات والے افراد کو چننا ہی رہ جائے گا۔ نظام حکومت ایک ایسی آمریت کی طرح ہوجائے گا جس میں حکومتی سربراہ اگرچہ وقتاً فوقتاً عوامی ووٹ کے ذریعے تائید حاصل کرتا ہے مگروہ ووٹ کو اپنے حق میں موڑنے کی بھرپور طاقت بھی رکھتا ہے۔ منصوبہ بندی آمریت کی راہ لے جاتی ہے کیونکہ آمریت جبر کا بہترین وسیلہ ہے اور بڑے پیمانے پر مرکزی منصوبہ بندی جبر کے بغیر ممکن نہیں۔

اس مقبول عام خیال میں کوئی صداقت نہیں کہ جب تک طاقت کا منبع جمہوری طریقے سے طے ہوگا، اختیارات میں من مانی نہیں ہو سکتی۔ طاقت کی منہ زوری کو طاقت کا منبع نہیں روک پاتا بلکہ طاقت کو محدود کر دینا ہی طاقت کو آمرانہ مزاج سے محفوظ رکھتا ہے۔ مزدوروں کی

سچی آمریت، چاہے وہ اپنے لباس میں جمہوری ہی ہو، اگر اقتصادی نظام کی مرکزی تنظیم کا بیڑہ اٹھا لے تو شخصی آزادیوں کو اسی طرح کامل طور پر ختم کر دے گی جتنا کبھی شہنشاہیت نے کیا ہوگا۔
(فریڈرک اے ہائیک) 92

ریاست کا رجحان عموما فاسشٹ ہوتا ہے۔

اسے شخصی آزادیوں سے چڑ ہوتی ہے کیونکہ وہ اسے چیلنج کرتی ہیں ،سوال اٹھاتی ہیں،جوابدہی کے کٹہرے میں بلاتی ہیں اور احتساب کرتی ہیں۔اس لیے ریاست اپنے دفاع میں شخصی آزادیوں کے بالمقابل سماجی بہبود کا مفروضہ بیانیہ سامنے لے آتی ہے۔وہ فرد کے خلاف جب بنیادی انسانی حقوق سے متصادم کوئی قدم اٹھاتی ہے تو اسے سماجی تحفظ یا قومی مفاد کی ضرورت قرار دے کراپنے لئے جواز مہیا کرتی ہے۔مساوات کے نام پر غلامی کی مساوات رائج کرتی ہے ۔ شخصی آزادیوں کو سماجی آزادیوں کے مفروضہ بیانیہ کے آڑ میں مسلسل کمزور کرتی جاتی ہے اور ویسا ہی پروپیگنڈہ کرتی ہے۔ انصاف پر جبر کا رجحان غالب آنے لگتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ شہریوں اور ریاست کا تعلق فرد و سماج کی نسبت کم فطری اور کم امن پسند ہے —

ریاست کا عمومی مزاج شاہانہ ہوتا ہے -

آپ حکومت کے تمام سوشل بہبود کے پروجیکٹ اٹھا لیں آپ کو بھی بلند عزائم ہی پڑھنے کو ملیں گے۔ ۔اقدامات میں بھی شاہانہ مزاج ہوگا مگر نتیجہ صفر اور عوام کے ٹیکسز سے حاصل شدہ خطیر رقم بھی ضائع۔

دلچسپ بات یہ بھی کہ کسی سرکاری ادارے کی ناکام پالیسی کا جائزہ وہی ریاستی ادارہ یا کوئی دوسرا سرکاری ادارہ لیتا ہے۔ پولیس اگر فرضی جھڑپ میں قیدی مار دے تو اس واقعہ کی تحقیقات بھی پولیس کرتی ہے۔

ایسے ادارہ جاتی تمدن میں سیکھنے کے امکانات انتہائی کم ہوتے ہیں جہاں غلطیوں کی سزا نہ ملے اور بہتر کارکردگی کی ترغیبات نہ موجود ہوں. ایک پرائیویٹ ادارہ اگر خراب کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ دیوالیہ ہو کر منظر سے ہٹ جاتا ہے. ریاستی اداروں کی خراب کار کردگی ملکی خزانے پر بوجھ ہوتی ہے اور عام لوگوں کے پاس اسی ادارے کو برداشت کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہوتا کہ کسی دوسرے متبادل ادارے سے ہی رجوع کر سکیں —

ریاست کا مزاج عموما کنٹرول پسند ہوتا ہے۔

وہ اگر کوئی بے قاعدگی دیکھتی ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ میدان جس میں بے قاعدگی ہوئی اسے مستقل ہی بند کردے۔ مثال کے طور پر یہاں شراب کی مثال لیے ہیں۔شراب کو محض اس لیے ممنوع کردینا کہ اس سے چند لوگ بدمست ہوکر بدعنوان ہوجاتے ہیں حکومت کی بے بضاعتی کا کھلا اظہار ہے۔جب حکومت چند احمقوں کو قابو میں نہیں لا سکتی تو وہ سب کو احمق سمجھ کر سب کے لیے احمقوں کی طرح قانون بناتی ہے - تہذیب شراب کے بغیر ناممکن ہے اسی طرح تہذیب شہریوں کے ضبط نفس کے بغیر قائم ہی نہیں ہوسکتی ۔وہ حکومت جو شہریوں کی خود اعتمادی اور خود انحصاری کو قابل اعتماد نہیں سمجھتی وہ تہذیب دشمنی کر رہی ہوتی ہے۔

یاد رہے کہ جہاں آزادیاں نہیں وہاں نہ ضبط نفسی ہے اور نہ تہذیب۔مگر یہ وہ بنیادی سبق ہیں جنہیں فرد اور معاشرہ تو سمجھ سکتا ہے ریاست کی عمومی ثقافت نہیں ۔

ریاست کی نہ ختم ہونے والی ڈیمانڈ:

Give up a little of your freedom and I will give you a little more security.

اپنی کچھ آزادی سے دستبردار ہو جاؤ اور میں تمہیں اس کے بدلے میں کچھ مزید تحفظ دوں گی۔

بہتر سوسائٹی کی خصوصیات

بہتر سوسائٹی وہ ہے جس میں فرد خودداری، خودانحصاری، خود نگہبانی،اور اپنی سرگرمیوں کی ذمہ داریوں کے تحت اپنے مقاصد کی جستجو کرتا ہے - اس سوسائٹی کی طاقت اس میں خود تنظیمی و خود انحصاری کی صلاحیت وآزادی میں موجود ہوتی ہے ۔جب گورنمنٹ سوسائٹی کے فطری عمل پر اثر انداز ہوتی ہے تو خود تنظیمی کی یہ صلاحیت متاثر ہوتی ہے. یوں ایسا بگاڑ پیدا ہوتا ہے جو نہ سیاست دانوں سے سلجھ پاتا ہے اور نہ بیوروکریسی سے کہ جب تک یہ سوسائٹی اپنے فطری discourse یعنی حالت توازن میں نہ چلی جائے ، جس کی رو سے کوئی سرکاری اتھارٹی نہیں بلکہ سوسائٹی کے تمام انسانوں کا رضاکارانہ تعاون و تبادلہ ،آزادی ارادہ و عمل، انفرادی ویلیو سسٹم اور دلیل پسندی ہی مجموعی طور پر سوسائٹی کو بہتر سمت دیتے اور منظم کرتے ہیں۔ریاست کے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہوتی جو بیس کروڑ افراد کے سماج کو منظم و ترقی پر گامزن رکھ سکے۔ریاست دراصل اپنی منصوبہ بندیوں کے نام پر سماج کو کنٹرول کررہی ہوتی ہے۔

مہم جو ریاست

گورنمنٹ جب اپنی حدود سے تجاوز کرتی ہے تو اس طرح حدود سے تجاوز کرنا ایک معمول بن جاتا ہے پھر گورنمنٹ اکثریت کے دباوء میں بھی آجاتی ہے کہ وہ کام بھی کرے جو اس کے دائرہ کار میں نہیں آتے یا اس کے افسران کا ایڈوینچر ازم یعنی مہم جویانہ شوق بھی انہیں ان سرگرمیوں

کی طرف شوق دلاتا ہے جو ان کے دائرہ کار میں نہیں آتیں۔اکثریت کے مطالبہ اور اعلی افسران کی جھم جوئی کو اس وقت تک اس کی حدود میں نہیں رکھا جاسکتا جب تک کہ تجاوز کے ہر رجحان کو ہی روک دیا جائے۔

کچھ دیگر میدان بہر حال ایسے ہیں جن میں حکومت کی کسی نہ کسی حد تک ضرورت ہوتی ہے۔

جیسا کہ

- ✓ صحت
- ✓ تعلیم
- ✓ حادثات میں مدد
- ✓ انفراسٹرکچر وغیرہ

ان میں بھی ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ پرائیویٹ سیکٹر کو شامل کیا جائے جیسا کہ تعلیم کے میدان میں ووچر سسٹم اس کی ایک بہترین مثال ہے۔

دیکھئے آج ہم صحت کی جن سہولیات،ادویات کی تحقیق وایجادات، اور صحت سے متعلق جس بے نظیر ٹیکنالوجی سے واقف ہیں اور اس کے فیضان عام سے مستفید ہو رہے ہیں ، وہ سب کس کی ایجاد و محنت ہے؟ پرائیویٹ سیکٹر کی۔وہ پرائیویٹ سیکٹر جو اس شعبہ کو اتنی جدت دے سکتا ہے ، کیا اس شعبہ میں بہتر خدمات فراہم نہیں کرسکتا؟ اور حکومت جس کا اس شعبہ کی جدت میں کوئی بھی بڑا کارنامہ نہیں ، وہ خدمات کی فراہمی میں پرائیویٹ سیکٹر سے زیادہ قابل اعتماد کیسے ہوسکتا ہے؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ریاست جس کی بیورو کریٹک ثقافت میں اتنی اہلیت و قابلیت بھی نہیں ہوتی کہ کوئی ایک کمرشل ادارہ ہی نفع پر چلا سکے وہ پوری معیشت کے بہترین انتظام کا دعوی کرتی ہے ۔

اسی طرح تعلیم کا میدان ہے۔علم آزاد انسانوں کی آزاد ذہنی و عملی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔علم اپنی اصل میں ہے ہی پرائیویٹ (نجی،عوامی) ۔ اسے انسانوں کا شوق ،رجحان اور سیلف انٹرسٹ تخیل سے لفظی و عملی اظہار اور اظہار سے مادی شکل میں لاتا ہے۔جب ایک فرد کی علمی سرگرمیوں کا نتیجہ سامنے آتا ہے تو یہ اس فرد کی محض ذاتی جستجو سے سوشل انٹرسٹ بن جاتا ہے۔

وہ علم جو آزادی میں فروغ پاتا ہے۔اپنی بنیاد و ترقی میں تو پرائیویٹ ہے مگر اپنے پھیلاؤ اور کارکردگی میں اسے گورنمنٹ کی ضرورت ہے؟یہ کیسی دقیا نوسیت ہے؟علم اپنی بنیاد میں بھی پرائیویٹ ہے اور اس کی ترقی بھی پرائیویٹ رہنے میں ہے ورنہ حکومتیں تو نصاب کی شکل میں اپنا بیانیہ نافذ کرتی ہیں ، وہ تو علم و عمل کو دراصل کنٹرول کرنے کا رجحان رکھتی ہیں۔

ریاست کا جبر اپنی فطرت میں علم دشمنی پر مبنی ہوتا ہے ،علم اسے چیلنج کرتا اور جوابدہی کے کٹہرے میں لاتا ہے.........بہتر حکومت وہ ہے جو علم کی مدد حاصل کرتی ہے نہ کہ وہ جو اپنی سرگرمیوں سے علم کو منصوبہ بند یا کنٹرول کرنا چاہتی ہے۔

دور جدید کا یہ بڑا مسئلہ ہے کہ ہم سوسائٹی اور ثقافت کو کمتر سمجھنے لگے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس قانون کی زیادہ اہمیت ہے جو ریاست نافذ کرتی ہے مگر اس اخلاق کی نہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ سوسائٹی میں ارتقاء کی جانب گامزن رہتا ہے۔مغرب کو ریاست نے نہیں کامیاب کیا بلکہ فرد اور سوسائٹی کے مضبوط بندھن نے اسے مستحکم کیا ہے اس پرول ڈیورانٹ کیا خوب لکھتے ہیں۔

"ہمارے آباوء اجداد جنہوں نے ہماری تہذیب کو ترقی کے راستے پر لگایا گویا اخلاق کے معاملے میں سختی سے روایتی انداز کے پابند تھے لیکن سیاست میں آزاد رو تھے۔وہ اخلاق کا احترام کرتے تھے لیکن ریاست سے دست و گریباں ہوجاتے تھے اور ہم ریاست کو خدا سمجھتے ہیں لیکن سماجی اخلاق کو قطعاً اہمیت نہیں دیتے "(93)

دیکھئے سیاست دان ہوں یا بیوروکریٹ ، یہ انسان ہیں ویسے انسان جیسے انسانوں پر یہ اجتماعی بندوبست کے نام پر مسلط ہونا چاہتے ہیں۔اس پر پرودھون کیا خوب لکھتا ہے۔

"انسان کی انسان پر حکومت خواہ اس کی کوئی بھی صورت ہو،غلامی ہے ،سماج کا کمال اور نظم و ضبط محض آزادیوں کے امتزاج سے حاصل ہوتا ہے۔(94)

اسی طرح ول ڈیورانٹ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"حیاتیاتی وراثت کی بنا پر ہم اپنے حیوانی ماضی سے وابستہ ہیں۔اجتماعی وراثت کی بنیاد پر اور اپنے گروہ کے اخلاق اور روایات کو اپنا لینے کی عادت کی بنا پر ہم اپنے انسانی ماضی سے وابستہ ہیں اور استحکام کی قوتیں ہماری جبلتوں میں اس قدر رچی ہوئی ہیں کہ ہمیں ریاست کے مصنوعی اخلاق کی ضرورت ہی نہیں"۔(95)

اس پر گوڈون کا ذکر نہ کرنا شدید ناانصافی ہوگی۔وہ کہتا ہے کہ

"انسانی فطرت قانون کے بغیر نظم و نسق قائم رکھ سکتی ہے ۔سب قوانین منسوخ کردیئے جائیں تب بھی انسانی ذہن اور کردار وہ ترقی کر پائے گا جو اس سے پہلے ممکن نہ ہوسکی تھی"۔(96)

گوڈون کے خیال میں ریاست قانون کی آڑ میں اپنا جبر قائم کرتی اور ترقی کے امکانات کو قید کرتی ہے ۔یہی سبب ہے کہ رزتشت کہتا ہے کہ

"دنیا میں جتنی بندشیں ہیں ریاست ان میں سب سے سرد مہر ہے – ریاستیں سردمہری سے جھوٹ بولتی ہیں اور یہ جھوٹ مسلسل ان کے ذہن سے نکلتا رہتا ہے۔(97)

گوڈون اور زرتشت کی مراد وہ حکومتیں ہیں جو اپنی حدود سے تجاوز کرتی ہیں اور فرد و سماج کو اپنے زیر اثر رکھنا چاہتی ہیں ۔جو قانون کے بھیس میں اپنی آمریت نافذ کرنا چاہتی ہیں اور منصوبہ بندیوں (planning) اور کنٹرول سے فرد و سماج کو اس کی آزادی سے محروم کر دیتی ہیں.

کینیزین معیشت دراصل ریاستی اجارہ داری کا راستہ ہے ۔

یہاں کینیزین اکنامکس کے بارے میں سرسری سا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جو معاشی تنظیم میں گورنمنٹ کے فعال اور بطور منصوبہ ساز بڑے کردار کی حامی ہے کہ گورنمنٹ ترقی کے عمل میں نہ صرف بڑے بھائی کا کردار ادا کرے بلکہ بحران کے دوران چھاتہ بردار محافظ بن کر بھی اترے ۔معاشی عروج کے دوران نرم مزاج بردبار بزرگ اور منافع کی تقسیم میں رابن ہڈ جیسا کردار بھی ادا کرے۔

کینزین معیشت دراصل ابتدائی درجے کا سوشلزم ہے۔ جب معاشی عمل میں گورنمنٹ کی مداخلت کی ابتداء ہوتی ہے تو یہ سلسلہ کہاں جاکر رکے اورکتنا وسیع ہو اس کا کوئی اندازہ ابتدا میں نہیں لگا سکتا۔ گورنمنٹ جب ایک بار معاشی عمل میں گھستی ہے تو گھستی چلی جاتی ہے۔

اس سلسلے میں مغرب خصوصا امریکہ کی مثال لے لیجئے۔ورلڈ وار سے پہلے جب گورنمنٹ کا جی ڈی پی میں حصہ محض 3سے4 فیصد تھا،اس وقت گورنمنٹ کچھ ضروری اقدامات یا دوسرے لفظوں میں کچھ معاشی عمل کو تحفظ دینے والے (protectionist) اقدامات کے لئے مارکیٹ میں داخل ہوئی تھی مگر یہ سلسلہ پھیلتا چلا گیا۔ہر بحران بالخصوص گریٹ ڈپریشن جو دراصل گورنمنٹ کے اقدامات کی وجہ سے ہی پیدا ہوئے تھے۔گورنمنٹ بطور کیپٹن امریکہ آگے بڑھی اور مارکیٹ کے تحفظ کے نام پر اپنادائرہ کار وسیع کرتی گئی۔

آج امریکی جی ڈی پی کا 38 سے 40فیصد گورنمنٹ کے اخراجات کے سبب ہے (98) مگر گورنمنٹ کی بھوک ہے کہ مٹتی ہی نہیں۔اسی لئے کہتے ہیں کہ تھوڑی سی سنٹرل پلاننگ مزید پلاننگ کو جنم دیتی ہے اور آخر کار انجام مطلق العنانیت (Totalitarianism) کی صورت میں ہی ظاہر ہوتا ہے، جس نے تمام سوشلسٹ ممالک کو ناکامی کی خاک چٹائی۔

کینز کا کہنا تھا کہ معاشی شرح نمو کے لیے مالیاتی مہنگائی (Monetray Inflation) پیدا کی جائے اور گورنمنٹ اپنے بجٹ اخراجات کی شکل میں معیشت کو جست (boost) دے۔ہائیک کا کہنا تھا کہ اس طرح کچھ عرصے کے لیے یقینا معیشت کو جست (boost)

ملے گی مگر اس کے نتیجہ میں جلد ہی اکنامک سسٹم کمزور ہو جائے گا کیونکہ پروڈیوسر اور کنزیومر کے درمیان معلوماتی اشاروں (Information signol) کی کمیونیکیشن بری طرح متاثر ہو جائے گی یعنی مارکیٹ میں کو آر ڈی پنشن ختم ہوجائے گی۔

جب معاشی نظام پرائیویٹ رجحانات کے بجائے گورنمنٹ اخراجات کی طرف راغب ہوجاتا ہے تو سرمایہ کاروں (investors) کی معاشی پلاننگ ، مارکیٹ سے سگنل یا معلومات لینے کے بجائے گورنمنٹ کے بجٹ عزائم و رجحانات کی طرف متوجہ ہوجاتی ہے اور سرمایہ کاری کا رخ کنزیومر انڈسٹری کی بجائے حکومتی منصوبوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔چونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب حکومتی اخراجات ایک حد تک پہنچتے ہیں تو اس سے آگے قرضوں کے بوجھ اورمزید اخراجات میں بد انتظامی جو کہ معمول کا حصہ بن چکی ہوتی ہے کے سبب یہ عمل مجبورا روکنا پڑتا ہے ۔یوں یہ پالیسی طویل مدتی پیمانے پر غلط نتائج پیدا کرتی ہے اور حد سے زیادہ گورنمنٹ اخراجات اور ان کے نتائج سوسائٹی کے وسائل کو ضائع کرتے ہیں اور پوری معشیت کو بحران میں بھی دھکیل دیتے ہیں۔

ریاست کے پیداکردہ ویلفیئر سے سوسائٹی کا پیداکردہ ویلفیئر کمزور ہو جاتا ہے –

مثال کے طور پر میں اپنے محلہ میں کسی فرد کو ضرورت مند دیکھتا ہوں تو اس کی مدد کرتا ہوں – ایک بار جب اس کی مدد کرتا ہوں تو مسلسل اس پر نگاہ بھی رکھتا ہوں اور ایک طرح سے محاسبہ بھی کہ آیا وہ شخص اس امداد کو کہاں اور کیسے خرچ کرتا ہے ؟ اگر وہ اس رقم کو بامقصد انداز میں خرچ کرتا ہے تو سوسائٹی کے دیگر افراد بھی اس کی مدد کرتے ہیں یہ سوچ کر بھی کہ کل کو یہ کامیاب ہو کر ہماری بھی کسی مشکل میں مدد کرے گا – امداد دینے والا امداد مانگنے والے کی خبر رکھتا ہے – وہ جانتا ہوتا ہے کہ آیا فلاں ضرورت مند واقعی میں ضرورت مند ہے یا اسے کام چوری یا فضول خرچی یا عیاشی کی عادت ہے – امداد کی رقم لینے والے میں بھی یہ احساس ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ جلد سے جلد ان مالی مسائل سے نکلے اور امداد مانگنے کی شرمندگی سے بچ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو –

دوست احباب ، اہل محلہ اور سوسائٹی کی امداد میں خبرگیری ، مشاہدہ ، محاسبہ ، احساس ذمہ داری اور تربیت ہوتی ہے، یہ تعمیری ہے ، اس میں کام چوری کی ترغیب نہیں اور اس سے سماج کے وسائل ضائع نہیں ہوتے –سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے سوسائٹی میں باہمی تعاون ، بھائی چارہ اور ایک دوسرے کی ضرورت کا احساس پیدا ہوتا ہے –

ریاستی ویلفئیر اس کے برعکس ہے – امداد وصول کرنے والا اس احساس ذمہ داری اور شرمندگی سے محفوظ ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے وسائل کو صحیح استعمال کر رہا ہے یا ضائع کر رہا ہے ؟ امداد دینے والی حکومت کی بیورو کریسی بھی ویلفیئر پر پلنے والوں کو نہ ذاتی طور پر جانتی ہے کہ آیا ضرورت مند واقعی ضرورت مند ہے بھی یا محنت سے بیزار ایک کام چور فرد ہے ؟ (کیونکہ بیورو کریٹ ضرورت مند کو نہیں اس کے صرف

ڈاکومنٹس کو دیکھتا ہے) - دوسرا بیورو کریٹ کے وہ پیسے کون سے اپنے ہوتے ہیں کہ ان پیسوں کے استعمال میں وہ بہت زیادہ احتیاط برتے اور یہ دیکھے کہ امداد کی رقم لینے والا واقعی اس رقم سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا ہے یا شراب نوشی یا جوئے میں اس رقم کو ضائع کر رہا ہے ؟ امداد کے پیکجز کا اعلان کرنے والے سیاست دان کو بھی ووٹ سے غرض ہوتی ہے اور یہ بھی کہ اگر پلان ناکام ہوا تو اس کا خسارہ آنے والی گورنمنٹ ہی ادا کرتی پھرے گی – سوسائٹی کے افراد بھی لاعلم ہوتے ہیں کہ ان کے ٹیکسز کی رقم کس کس فرد کو "کام نہ کرنے کی ترغیب" میں استعمال ہو رہی ہے اور انہیں مستقل طور پر طفیلیہ بنا رہی ہے- یوں سماج میں خود کفالت و خودداری و خودانحصاری کی ثقافت پیدا نہیں ہوتی اور اس رجحان کی نفی ہوتی ہے – اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ریاستی خزانہ جو کہ اربوں ڈالرز پر مشتمل ہوتا ہے اور وہ کسی کی پراپرٹی نہیں ہوتا بلکہ اس سوسائٹی کے نام پر اکٹھا کیا جاتا ہے ، اس لئے وہ حقیقتاً کسی کا بھی نہیں ہوتا – ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ اس چشمہ سے وہ سیراب ہو جائے –سوسائٹی کے وسائل میں سب سے برے استعمال ہونے والے وسائل وہ ہیں جو حکومتی خزانہ میں ہیں –

ضروری ہے کہ "سوسائٹی کے ویلفیئر ماڈل" کو مضبوط کیا جائے نہ کہ ریاست کے ویلفیئر ماڈل کو جو کہ وسائل کے ضیاع کا سب سے بڑا سبب ہے – مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ غربت مستقل طور پر امداد یا ویلفیئر سے ختم نہیں ہوتی بلکہ معاشی ترقی اور صنعتی تمدن سے ختم ہوتی ہے – یہ فقط روزگار اور کاروبار کے ذرائع سے ختم ہوتی ہے – سوسائٹی کی امداد محض وقتی امداد ہے کہ کوئی اگر گر گیا ہے تو جلدی سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو اور دوبارہ سے خوشحال زندگی کے امکانات کی تلاش و جستجو میں لگ جائے –

دور جدید میں بے روزگاری کی انشورنس ایک بہترین اور کارآمد طریقہ ہے کہ آپ جب روزگار رکھتے ہیں تو اس انشورنس پیکج میں اپنا حصہ ڈالتے رہیں اور جب آپ بے روزگار ہو جائیں تو بجائے اس کے کہ ریاست یا سماج کے آگے ہاتھ پھیلائیں انشورنس کمپنی سے اپنا بے روزگاری الاؤنس وصول کریں – اس میں خود اعتمادی خودداری اور خود انحصاری بھی ہے اور سوسائٹی کے وسائل کا ضیاع بھی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ریاست کی غلامی سے بچنے کے امکانات بھی فرد و سوسائٹی کے لئے بڑھ جاتے ہیں –

ایدھی سوشل ویلفیئر کا بہترین نمونہ ہیں

عبدالستار ایدھی رخصت ہو گئے۔ اس خبر نے پوری قوم کو آبدیدہ کر دیا ہے۔ ان سے محبت تمام پاکستانیوں نے کی بغیر کسی مذہبی اور لسانی امتیاز کے، اور اس کا بدلہ بھی ایدھی مرحوم نے یوں دیا کہ اپنی خدمات میں بھی کسی قسم کے تعصب کو حائل نہ ہونے دیا۔ جب ایدھی صاحب حیات تھے، ان کے بارے میں استاد محترم وجاہت مسعود نے آٹھ جولائی کے کالم میں کیا ہی خوب لکھا تھا۔ لکھتے ہیں۔

'''یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا ہمارے عہد میں دنیا کے کسی خطے میں کوئی اور ایسا شخص بھی موجود ہے جس نے بغیر کسی امتیاز کے انسانوں کی خدمت کو اس رنگ میں ایمان کا درجہ دیا ہو اور اس پر عمل میں ایسی استواری دکھائی ہو۔ سوچ اور عمل میں ایسی یک رنگی پہلے دھن کی صورت اختیار کرتی ہے اور پھر یہ لگن زندگی کا طور بن جاتی ہے۔ تنویر جہاں نے کہا کہ شاید ایدھی صاحب کو اس برس نوبل انعام مل جائے۔ اس پر کسی نے کہا کہ اب ایدھی صاحب نوبل انعام سے ماورا ہوگئے ہیں۔ اب ایدھی صاحب خود ایک انعام ہیں۔ وہ لگن کے اس درجے کو پہنچ گئے ہیں جہاں سانس میں سُر پیدا ہوجاتا ہے اور سُر میں خوشبو اترتی ہے۔ اس سُر کی خوشی ارد گرد رہنے والے انسانوں میں اتر جاتی ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ ایدھی صاحب ہماری تعریف و توصیف سے بھی ماوراء ہیں۔ The Huffington Post نے دو ہزار تیرہ میں انہیں تمام زندہ افراد میں سب سے عظیم انسان دوست شخصیت قرار دیا تھا ۔ محض انسانیت، محبت اور اخلاص کا نمونہ ہی نہیں وہ مجسم انسانیت تھے۔ انسانیت کی جملہ خصائص ان کی ذات میں ایک خوبصورت اظہار تھیں ۔ ان کی وفات پر محترم رؤف کلاسرا کی ٹویٹ تھی۔

'ساری زندگی ایدھی صاحب نے چندہ کے لئے بھیک مانگی، مگر کبھی بھی اپنے احترام کے لئے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ محبت اور احترام کمایا جاتا ہے (بھیک میں نہیں ملتا) اور ایدھی صاحب نے اسے کمال سچائی سے کمایا'۔میری اس تحریر کا موضوع ایدھی صاحب کی زندگی کے وہ چند اہم اسباق ہیں جو ہر اس شہری کے لئے غور و فکر کا سامان رکھتے ہیں جو انسانی مسرت، خدمت، اور ویلفئیر کو زندگی کا اہم ترین مقصد سمجھتا ہے۔

ا) ہمارے ہاں عوامی خدمت اور ویلفئیر کے لئے ایک ہی راستہ عموما سمجھا جاتا ہے وہ ہے انقلاب یا سیاست و ریاست۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو سماجی خدمت کے جذبے سے سرشار ہے اسے سیاست اور اقتدار میں آ کر یہ کام کرنا چاہئے۔ ایدھی صاحب نے عملی طور پر اس تصور کو رد کر دیا۔ انہوں نے اس قوم کی ایسی خدمت کی کہ جس کی نظیر پوری پاکستانی تاریخ میں مشکل ہے۔ ایک انقلاب پسند دوست شمعون سلیم صاحب ان کی وفات پر لکھتے ہیں۔

''ضیا نے بھٹو کو پھانسی لگا دیا تھا۔ میں لاہور میں شاہی قلعہ کاٹ کر نکلا تو زندگی بالکل اکھڑ چکی تھی۔ کراچی میں مزدور رہنما اکرم دھریجہ نے مجھے ایدھی صاحب کے ہاں نوکری کے لئے بھیج دیا۔ میٹھادر میں میرا انٹرویو ستار ایدھی اور بلقیس ایدھی نے کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے فائنل ایر کا امتحان دینے کے بعد پنجاب سوشل سیکورٹی میں چند مہینے انڈر سٹڈی میڈیکل آفیسر کے طور پر کام کیا تھا اور ابھی ابھی لاہور کے شاہی قلعہ میں قید بھگت کے نکلا تھا۔ اور کہا کہ میں انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے انہوں نے کہا تھا کہ آپ پہلے امتحان صاف کر لو پھر آنا۔ میں اس وقت پرولتاری انقلاب کے چکر میں بہت زیادہ تھا۔ میرے لئے فلاحی کام انقلاب کے لئے ذریعہ تھا اور ان کے لئے بذاتِ خود ایک مقصد۔ ہم دونوں اڑیل نسل کے تھے۔ زندگی کے تھپیڑے ٹھوڑے کھاتا کھاتا میں ہالینڈ میں بیٹھا ہوں۔ اپنی دانست میں مقدور بھر سماجی سیاسی حصہ ڈالتے ہوئے میں بھی ایک نیم درویشی زندگی گذار رہا ہوں۔ مجھے بھی یاد نہیں کہ میں نے آخری بار کب جوتے

اور کپڑے خریدے تھے۔ لیکن اپنے دو جوڑے شلوار قمیض اور گھسے ہوئے جوتوں کے جوڑے کے ساتھ جو ایدھی صاحب نے کیا وہ صحیح تھا۔ انہوں نے مجھے صحیح رد کیا۔ جو انہوں نے کیا، کرنے کا کام تو وہ تھا۔ ایدھی صاحب صحیح تھے۔"

(ب) ہمارے ہاں سماجی خدمت کے دو ماڈل ہیں۔ ایک ماڈل ہے فارن ایڈ سے چلنے والی این جی اوز جو فارن فنڈنگ سے کام کرتی ہیں اور اپنے غیر ملکی ڈونرز کو جواب دہ ہوتی ہیں۔ دوسرا ماڈل جس کے روح رواں ایدھی صاحب تھے اس کے مطابق اپنی عوام سے ان کی استطاعت کے مطابق مالی امداد لی جائے اور اپنی کارکردگی کے ساتھ عوام کے حضور جوابدہ رہا جائے۔ فارن ایڈ کو میرے استاد معیشت دان ولیم ایسٹرلی Dead Aidکہتے ہیں کیونکہ یہ وسائل کا ضیاع ہے، پوری دنیا میں کھربوں ڈالر کی یہ امداد ضائع ہو رہی ہے کیونکہ فنڈ دینے والا کارکردگی کو صرف رپورٹس میں دیکھتا ہے اور فنڈ حاصل کرنے والا اسے محض رپورٹس میں دکھاتا ہے۔ ذمہ داری ، شفافیت اور وسائل کا بہتر استعمال اس میں اس لئے نہیں کہ ڈونرز کا سیلف انٹرسٹ اس کا نگران نہیں۔ ویلفئیر کے بیورو کریٹک ماڈل کی طرح فارن ایڈ ماڈل مسائل کے حل کے بجائے بذات خود مسائل کی ایک بڑی وجہ بھی ہے۔

ایدھی ماڈل پاکستان سمیت دنیا بھر میں کامیاب ہے۔ اس کی بنیاد رپورٹنگ پر نہیں بلکہ کارکردگی پر ہے۔ ڈونرز کارکردگی کا خود مشاہدہ کرتے ہیں، اگر مطمئن ہوتے ہیں تو مالی امداد جاری رکھتے ہیں ورنہ مایوس ہو کر کسی اور قابل بھروسہ خیراتی ادارے کو امداد دینا شروع کر دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ اصول وہاں پنپ رہا ہے جہاں اس دنیا کی مادی ویلفیئر مطلوب ہے۔ میری ناقص رائے میں محض آخرت کی سرخروئی کے وعدہ پر قائم ادارے بھی فارن ایڈ کی قسم ہیں، کیونکہ عوام کو حتمی طور پر معلوم ہی نہیں کہ ان کا فنڈ واقعی ان کے لئے جنت کے حصول کا ذریعہ بن رہا ہے یا دوزخ کے حصول کا۔

(ج) ویلفئیر کے مزید دو ماڈل ہیں۔ ریاست کا بیورو کریٹک ماڈل اور سماج کا پرائیویٹ ماڈل۔ ریاست اس ویلفئیر کے لئے زبردستی ٹیکسز لیتی ہے جبکہ سماج کا نجی بنیادوں پر قائم ماڈل رضاکارانہ تعاون کا مطلوب ہے۔ ریاست کی ویلفیر کے لئے قائم خدمات سے اگر آپ مطمئن نہیں تب بھی وہ آپ سے ٹیکسز لے گی وگرنہ وہ آپ کو جیل میں ڈال کر معاشی سرگرمیوں سے نکال پھینکے گی۔ نجی بنیادوں پر قائم فلاحی اداروں کی اگر آپ کارکردگی سے مطمئن نہیں تو آپ دوسرے اداروں سے رجوع کر سکتے ہیں۔ کسی پر بھی بھروسہ نہیں تو بذات خود اپنے اردگرد کے لوگوں میں ضرورت مندوں کو تلاش کر کے ان کی مدد بھی کر سکتے ہیں اور اس کی نگرانی بھی کہ آیا ضرورت مند مالی امداد پر تکیہ کئے کاہلی کام چوری اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ تو نہیں کر رہا۔ سماج اپنی امداد میں فرد کو ذمہ دار بناتی ہے اور اسے محنت و خودداری کی ترغیب دیتی ہے ، جبکہ ریاست اپنے ویلفئیر ماڈل میں کام چور، غیر ذمہ دار اور مستقل بھکاری بناتی ہے۔ آپ اس کی کیس اسٹڈی میں دنیا کی تمام ویلفئیر ریاستوں کی کارکردگی ملاحضہ کر سکتے ہیں کہ آیا ایک ضروری حد سے آگے ریاستی ویلفیئر ماڈل ،محنت کی ترغیب (Incentive to work)کو کمزور کرنے کا سبب بنتا ہے کہ نہیں ؟

اس وقت ایدھی فاؤنڈیشن درج ذیل خدمات سرانجام دے رہی ہے۔

- پاکستان کی سب سے بڑی ایمبولنس سروس
- یتیم خانے
- مفت ڈسپنسریاں اور کلینک
- خواتین کے لئے محفوظ پناہ گاہیں
- (Rehabilitation بحالی) کے مراکز
- بے سہارہ بچوں کی کفالت اور دیگر خدمات
- دیگر قسم کی امدادی خدمات کے لئے ہیلپ لائن
- لاوارث و بے سہارا افراد کی تجہیز و تکفین
- گمشدہ افراد (Missing Persons) کے لئے خدمات
- تارکین وطن کے لئے خدمات
- شادی مرکز
- لنگر ہاؤس
- خیراتی دکانیں
- جانوروں کے لئے ہسپتال
- ایدھی رکشہ روزگار
- ان ہاؤس بیکری
- فری کچن
- روٹی پلانٹ
- ورکشاپ
- ایدھی) Morgue لاوارث غیر شناخت شدہ میتوں کے لئے مردہ خانہ (
- ایدھی بلڈ بنک
- خصوصی افراد (disadvantage) کے لئے فنی تعلیم
- سٹریٹ چلڈرنز کے لئے مذہبی تعلیم
- فیملی پلاننگ اور زچہ کے لئے مشورہ گاہیں
- مفت قانونی امداد
- قیدیوں اور معذور افراد کی مالی و طبی امداد

ان سب سماجی سرگرمیوں کے لئے ایدھی فاؤنڈیشن کا کل سالانہ بجٹ ساڑھے دو ارب کے لگ بھگ ہے جبکہ ریاست کا بجٹ کئی سو کھربوں میں ہوتا ہے مگر اس کے باوجود ایدھی فاؤنڈیشن کی سوشل ویلفیئر میں کارکردگی ریاست سے ہزار گنا بہتر ہے ۔ لگ بھگ آٹھ ہزار رضاکار ان تمام خدمات کو ایک معمولی تنخواہ پر عاجزی و انکساری سے سرانجام دے رہے ہیں جبکہ ریاست کے لاکھوں بیورو کریٹس مراعات شدہ رتبہ کے باوجود بھی ویسی کارکردگی دکھانے میں ناکام ہیں۔ آخر کارکردگی کے اس فرق کی کیا وجہ ہے ؟ نجی سیکٹر میں وسائل کا بہتر استعمال کیسے اور کیونکر ممکن ہوتا ہے جبکہ ریاستی نظام برائے سماجی بہبود کیوں ناکام ہیں ؟ سوشل سائنس کے طلباء کے لئے اس کیس سٹڈی میں بہت کچھ سمجھنے کے اسباق ہیں۔

)د) سوشل سائنس میں کلاسیکل لبرل ازم کا مقدمہ ہے کہ جتنا ریاستی سرگرمیاں اپنے حجم میں بڑھتی جاتی ہیں سوسائٹی اتنی کمزور ہوتی جاتی ہے۔ کارکردگی میں ریاست ، فرد اور معاشرہ سے کم تر ہے۔ ریاست اپنی سرگرمیاں زور، جبر، اور استحصال سے سرانجام دیتی ہے جبکہ فرد اور سماج اپنی سرگرمیاں باہمی رضاکارانہ تعاون و اشتراک سے سرانجام دیتے ہیں۔ پاکستان میں سماج اپنے پوٹینشل سے ناواقف ہے۔ ہماری گلی محلے میں کوئی ضرورت مند ہے تو اس کی مدد کرنا اور اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی ترغیب و مدد دینا ہماری ذمہ داری ہے نہ کہ اس ریاست کی جس کا دماغ و دل بیورو کریٹ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر شاکر شجاع آبادی جنوبی پنجاب کی عوام کا شاعر ہے اگر وہ کسی ضرورت میں ہے تو اس کی مدد کرنا جنوبی پنجاب کی عوام کا کام ہے۔ یہ کام جب آپ ریاست کے ذمہ لگاتے ہیں تو اقتدار اور بیورو کریٹک اداروں کو راستہ ملتا ہے کہ وہ اپنے من پسند دانشوروں کو مالی مدد دے کر رائے عامہ پر سوار کریں اور آزاد علم و مکالمہ کی ثقافت کو تباہ کرتے ہوئے اجارہ دار طبقات کے مفادات کے تابع کرنے کے لئے نت نئی نقب لگائیں۔

ایدھی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ سو سائٹی ہی قابل بھروسہ ہے۔ انہوں نے سوسائٹی سے رجوع کیا اور سیاست و اقتدار سے دور رہے۔ ایدھی صاحب جو مثال چھوڑ گئے ہیں اور ایدھی فاؤنڈیشن جو ماڈل ہمارے سامنے پیش کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم سب اپنے سماج کی نجی طور پر خود ذمہ داری لیں۔ ہم ریاست سے مطالبات کرنے کے بجائے سماجی بہبود کے مسائل خود حل کریں۔ ایدھی ایک روشن مثال چھوڑ گئے ہیں۔ آیئے ایدھی کے نقش قدم پر چلیں، ہمارے شہر اور محلے ایدھی فاؤنڈیشن طرز کی فاؤنڈیشنز کی مدد سے اپنے ویلفیئر کے مسائل خود حل کریں۔ایدھی صاحب سے محبت و عقیدت کا اظہار محض ان کے نقش قدم پر چلنے میں ہے۔ ایدھی صاحب بطور ایک بہترین نمونہ ہمارے درمیان ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ہمارا حقیقی اثاثہ ہمارے شہری ہیں

انسانوں سے معاشرے وجود میں آتے ہیں۔ انسان ، معاشرے کی ایک بنیادی اکائی ہے۔ انسان کو معاشرے کی ضرورت ہے اور معاشروں کو انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ آزادانہ ارتقا پاتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔آزاد معاشروں کی بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ انسان دوست ہوتے ہیں۔ آزاد معاشرے متعصب نہیں ہوتے بلکہ ان کا حسن تنوع پسندی میں ہوتا ہے۔ معاشرے متوازن رہیں تو ان سے ان گنت امکانات پھوٹتے ہیں جن سے ترقی و خوشحالی کا سفر روشن رہتا ہے۔ توازن کھو جائے تو معاشرے ویران ہونے لگتے ہیں۔ جس طرح فرد کا حسن اس کی آزادی و خوشحالی میں ہے بالکل اسی طرح انسانوں سے وجود میں آنے والے معاشروں کا حسن بھی آزادی و خوشحالی میں ہی ہے۔

ہر معاشرے میں دو شعبے ایسے ہیں جن پر اس کی ترقی و استحکام کا دارومدار ہے----سیاست اور معیشت۔ سیاست کا مقدمہ طاقت میں تعمیری توازن ہے اور معیشت کا مقدمہ وسائل کی منصفانہ اور فائدہ مند تفویض (allocation) ہے۔ سیاست میں اگر طاقت کا تعمیری توازن قائم نہ ہو تو اقتدار و اختیار کی رسہ کشی معاشرے کے استحکام کو برباد کر دیتی ہے۔ اسی طرح اگر معیشت میں وسائل اجارہ داری کی نذر ہو جائیں توپیداواری صلاحیتیں پسماندہ رہ جاتی ہیں۔ کامیاب معاشرے وہی ہیں جو ان دونوں میں توازن کا مقدمہ طے کر کے چلتے ہیں۔ معیشت خود رَو سبزے کی طرح ہوتی ہے کیونکہ یہ شہریوں کے درمیان اشیا و خدمات کے آزادانہ تعاون و تبادلے سے وجود میں آتی ہے۔ معیشت ایک ناگزیر عمل ہے کیونکہ اس پر انسان کی مادی بقا کا انحصار ہے۔ جہاں بھی بہتر ماحول ملا اس کے بیج امکانات کی شکل میں پھوٹتے جاتے ہیں مگر جہاں سیاست کے گھوڑے میدان ہی روند رہے ہوں وہاں اس کی خوشنما افزائش ناممکن ہے۔

سیاست میں توازن کے لئے انسانی سماجی ارتقا نے اب تک ہمیں جو بہترین متبادل دیے ہیں
ان میں ایک جمہوریت ہے یعنی شہریوں کا حقِ انتخاب۔
دوم: سیکولرازم ہے یعنی ریاست ایک انتظامی بندوبست ہے، نظریاتی یا مذہبی اجارہ داری نہیں۔
سوم: تنوع پسندی ہے یعنی تمام شناختوں کا معاشرے میں احترام مقدم ہے اور ریاست تمام شناختوں کی نمائندہ ہے۔
کامیاب سیاست کو متحرک اور ہوشیار سول سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے جو شخصی آزادیوں، مساوات اور انصاف کے مقدمہ میں حساس اور ذہین ہو۔ جب سیاست و معیشت اپنے اپنے دائرۂ کار میں موثر انداز سے کام کرتی ہیں تو معاشرے انسان دوستی، ترقی، خوشحالی اور تہذیب و تمدن کی طرف بڑھتے ہیں۔

پاکستان کا آئین بھی سیاست میں توازن اور اعتدال پسندی کی راہ دکھاتا ہے۔ شہریوں کے حق انتخاب کی اساس پر قائم پارلیمان، ریاست میں عوام کے اقتدار اعلیٰ کی نمائندہ ہے۔ عدلیہ انسانی حقوق اور انصاف کی ضامن ہے۔ تمام ادارے آئینی طور پر اپنے اپنے دائرۂ کار کے پابند ہیں۔ شہریوں کی نمائندگی کا سیاسی حق سوائے پارلیمان کے کسی اور ریاستی ادارے کے پاس نہیں۔ بیوروکریسی ہو یا مسلح افواج، سیاسی قیادت کے ماتحت ہیں اور سیاسی قیادت عوام کے سامنے جوابدہ ہے۔ اس سلسلے میں آئین واضح ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ آئین کی بالادستی قائم ہوتی، سیاسی استحکام و توازن کو فوقیت ملتی اور معیشت و ثقافت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا مگر بد قسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ ملک کی ساری

تاریخ اقتدار و اختیار کے لیے سیاسی رسہ کشی کی داستان سناتی ہے۔ ہنوز اجتماعیت کی ساری توانائیاں اس میں ضائع ہو رہی ہیں۔ اس کا نقصان کون اٹھا رہا ہے؟ اس ملک کے شہری، ان سے وجود میں آنے والا معاشرہ ، ہماری معیشت ، ثقافتی اقدار اور محفوظ مستقبل کے امکانات (جنہیں پنپنے کا موقع ہی نہیں مل رہا۔)

اس وقت ملک کی آبادی ساڑھے انیس کروڑ ہے۔ ایک تہائی آبادی غربت کی چکی میں پس رہی ہے۔ اوسط پندرہ افراد روزانہ کی بنیاد پر ٹریفک حادثات میں ہلاک ہو رہے ہیں۔ تعلیم و صحت کے اشاریے ہمیں غمزدہ کر دیتے ہیں۔ پاکستانی پاسپورٹ دنیا میں اپنا وقار کھو رہا ہے۔ بین الاقوامی برادری میں ہم ایک طرز کی تنہائی میں چلے گئے ہیں۔ دو طرف کی سرحدیں غیر محفوظ ہیں۔ بلوچستان و فاٹا لہولہان ہیں۔ انسانی حقوق، مساوات اور انصاف کی حالت دگرگوں ہے۔ مایوسی اور ڈپریشن کے سبب شہری نفسیاتی طور پر بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ بچوں کے اغوا کی افواہوں نے شہریوں کو اپنے گھر کی چاردیواری میں بھی بے آرام کر رکھا ہے۔ امن و امان کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ہماری تنوع پسندی فرقہ وارانہ فسادات کے سبب مرجھائی ہوئی ہے مگر ہنوز سیاسی اجتماعیت بے سمتی کا شکار ہے۔ رجحانات اور ترجیحات میں شہریوں کی مسرت اور خوشحالی کا عنصر مفقود ہے۔ ایک ادارہ چاہتا ہے کہ داخلہ و خارجہ پالیسی کے فیصلے وہ کرے، عوامی اقتدار چاہتا ہے کہ اگر عوام کے سامنے وہ جوابدہ ہیں تو اختیارات بھی اسی کے پاس ہوں۔ اسی حکومت کو دیکھ لیں، تھوڑی سی مستحکم ہوتی ہے تو پھر کوئی شکاری گھات لگائے حملہ آور ہوتا ہے۔ عوامی نمائندگی پر قائم حکومت کی کوشش اس صورت میں محض یہ رہ جاتی ہے کہ کسی طرح اپنا تحفظ کرے چاہے بہت سارے غیر آئینی مطالبات بھی ماننے پڑ جائیں۔

سیاستدان بھی ہنوز اقتدار پسندی کے اسیر ہیں۔ ایک سیاستدان چاہتا ہے کہ ہر قیمت پر اسے اقتدار ملے، چاہے جمہوری اصول قربان ہوتے ہوں ہو جائیں۔ ایک سیاسی پارٹی عشروں کے تجربے کار سیاسی کارکنوں کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک نوآموز نوجوان کو بطور پارٹی لیڈر سامنے لائی ہے، جس کا استحقاق محض ایک بڑے سیاسی خاندان میں جنم لینا ہے۔ مسلم لیگ (ن) ایک طرف مریم نواز کو جبکہ دوسری طرف حمزہ شہباز کو مستقبل کی سیاسی قیادت کے لئے تیار کر رہی ہے۔ ان مرکزی دھارے کی تمام پارٹیوں میں جمہوری ثقافت کا شدید فقدان ہے۔ یوں استحکام اور ترقی پسند سیاست کے امکانات محدود ہیں۔

ہمیں اپنی تاریخ سے سبق سیکھنا ہو گا۔ سیاسی استحکام اور سیاسی قوتوں میں توازن اور اعتدال ہماری کامیابی کے لئے ازحد ضروری ہے تاکہ ہماری معیشت پھلے پھولے، سماج کے رنگوں میں نکھار آئے، معاشرت غیر متمدن اقدار کی گرفت سے نکلے اور ہم تہذیب و تمدن کی طرف کامیابی سے بڑھیں۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قومی ریاست کا مطلب شہریوں کی خوشحالی اور ترقی کے امکانات میں ایک مددگار کا کردار ادا کرنا ہے تو سیاست کو جلد سے جلد سنجیدہ ہونا ہوگا، شہریوں کو بطور سول سوسائٹی متحرک اور ہوشیار کردار ادا کرنا ہو گا اور اپنے حق انتخاب کی حفاظت کرنی ہو گی۔ عوامی نمائندونکو عوامی نمائندگی کی پاسداری کرنی ہو گی جن کے بغیر وہ اقتدار کی راہداریوں میں آئینی طریقے سے نہیں جا سکتے۔ جب تک سیاسی پارٹیاں جمہوری اقدار سے اپنی پارٹی کو نہیں سینچیں گی اس وقت تک مثالی جمہوریت کی طرف سفر ناممکن ہے۔ ہمیں سمجھنا ہو

گا کہ قومیں نہ راہداریوں سے کامیاب ہوتی ہیں اور نہ موٹروے یا میٹرو پروجیکٹس سے جب تک کہ ترقی و خوشحالی کے امکانات اس کی سیاست، ثقافت اور معیشت سے نہ پھوٹیں۔ ہمارا حقیقی اثاثہ ہمارے شہری ہیں، کامیابی کی منزل سوائے شہرت کے راستے کے کسی اور راستے سے ممکن نہیں۔ ہمیں ترقی یافتہ دنیا سے سیکھنا ہوگا، ہمیں یقینا آگے بڑھنا ہو گا۔

آمریت کا نیا حربہ: معاشی ترقی کا فریب

جب پاکستان میں ایوب مارشل لا مسلط تھا اس وقت آمریت کے خدمت گزار دانشور آمریت کے لئے جس جواز کو بار بار تراش خراش کر عوام کے سامنے پیش کرتے تھے وہ تھا کہ جناب جمہوریت مغربی تصور ہے یہ ایشیا سے میل ہی نہیں کھاتا۔۔۔ ایشیا کی اپنی اقدار ہیں، اور ہمارا سیاسی بندوبست انہی اقدار کے مطابق ہونا چاہئے۔۔۔ یہ اس ملک میں ہو رہا تھا جو مسلم لیگ کی جمہوریت پسند اور پرامن سیاسی تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔۔۔

جب ضیا الحق نے مارشل لاء لگایا تو آمریت کے خدمت گزار آمر کے قدموں میں یوں جا گرے جیسے یہی ان کی منتہائے مقصود ہو اور درخواست کی کہ حضور جب تک کرپشن کا خاتمہ نہ ہو جائے اس وقت تک اقتدار نہ چھوڑیں، چلو جمہوریت کا مقدمہ مان لیتے ہیں مگر جمہوریت اس وقت تک یہاں کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک سیاست کو کرپشن سے پاک نہیں کر لیا جاتا۔ ضیاء الحق گیارہ سال اقتدار میں رہا، طیارہ حادثہ میں ہلاک ہوا، اور اپنے پیچھے جو سیاسی سماجی معاشی اور مذہبی ثقافت چھوڑ کر گیا وہ کرپشن میں بری طرح لتھڑی ہوئی تھی۔ کرپشن مکاؤ تحریک کا انجام کرپشن ہی کیوں؟ اس سوال پر ہمارے ہاں کم ہی سوچا گیا ہے۔ جنرل مشرف بھی "پہلے کرپشن مکاؤ پھر جمہوریت لاؤ" تحریک کا مائی باپ بن کر اس ملک پر مسلط ہوا، نو سال نیب مشرف کی کاسہ لیسی کرتی رہی اور کرپشن نام کا دیو خوب پھلتا پھولتا رہا۔ وہ کہتے ہیں ناں محافظوں کو متاثرین کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے -

اب پاکستان سمیت پوری دنیا بالخصوص افریقہ و لاطینی امریکہ میں آمریت ایک نئے بیانیہ کی سرپرستی کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے معاشی ترقی کر لی جائے پھر آہستہ آہستہ جمہوریت و سول آزدیوں کی طرف رجوع کر لیا جائے گا۔ اس کے لئے مشرقی ایشیائی ممالک جیسے چین، سنگاپور اور جنوبی کوریا کی مثال دی جا رہی ہے۔ کچھ حلقوں کے حلق سے یہ آوازیں بھی آ رہی ہیں کہ مغربی تصور مارکیٹ اس وقت تک ناکام ہے جب تک ریاست اپنی جابرانہ معاشی پالیسیوں کے نتیجہ میں تمام شہریوں کے لئے معاشی خوشحالی کا بندوبست نہ کر لے۔ جب سب معاشی خوشحالی حاصل کر لیں گے تو پھر مارکیٹ کا نظام بھی کام کرنے کے قابل ہو گا، یہ ایک انتہائی مضحکہ خیز دلیل ہے۔ اگر آمرانہ معاشی بندوبست سے معاشی ترقی ممکن ہوتی تو تمام سوشلسٹ ممالک کی نیا کیوں ڈوبتی؟ اگر بغیر سرمایہ دارانہ نظام کے معاشی ترقی اور سیاسی، سماجی

اور شخصی آزادیاں حاصل ہو سکتیں تو ان دو تین صدیوں میں کوئی ایک کامیاب معیشت سیاست ثقافت یا شخصی آزادیوں کی جنت قائم نہ کی جا چکی ہوتی؟؟؟ وہم و خیال یا خیالی جنتوں کی پرستش و پیروی سوشل سائنس نہیں کہلاتی۔ سوشل سائنس کا موضوع ہی یہ ہے کہ مادی فلاح کے لئے کون کون سے مادی اور قابل عمل متبادل ہمیں حاصل ہیں اور کس کا انتخاب کرنا عقل و فہم اور تجزیاتی سائنس کی رو سے زیادہ بہتر ہے -

امرتیا سین نوبل انعام یافتہ معیشت دان فلسفی ہیں، انہوں نے اپنی مشہور ترین کتاب Development as freedom میں مشرقی ایشیائی معاشی ترقی اور مطلق العنانیت کے باہمی تعلق کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ آیئے اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

"کیا مطلق العنانیت واقعی بہتر کام کرتی ہے؟ یہ درست ہے کہ کچھ زیادہ مطلق العنان ریاستیں (جیسا کہ جنوبی کوریا، لی کا سنگا پور، اور بعد از اصلاحات کا چین) کم مطلق العنان ریاستوں (جیسا کہ انڈیا، کوسٹاریکا، اور جمیکا) سے زیادہ معاشی شرح نمو رکھتی ہیں – لیکن "لی نظریہ" درحقیقت کم معلومات اور ان میں بھی من پسند معلومات پر مبنی ہے، حالانکہ جتنے مفصل اعدادوشمار اور ان کی شماریاتی جانچ پڑتال ہمیں حاصل ہے "لی نظریہ" سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ایشیا میں چین یا جنوبی کوریا کی تیز رفتار معاشی ترقی کو ایک باقاعدہ ثبوت کے طور پر تسلیم نہیں کر سکتے کہ آمریت معاشی ترقی فراہم کرنے میں زیادہ بہتر ہے – اسی طرح اس سے متضاد نتیجہ بھی اہم اس بنیاد پر نہیں اخذ کر سکتے کہ افریقہ کی تیزی سے نمو پاتی معشیت بوٹسوانا (Botswana) دنیا کی بھی تیز رفتار معشیتوں میں ایک ہے اور مشکلات میں گھرے افریقہ میں محض جمہوریت کا نخلستان ہے۔

درحقیقت بہت ہی کم ایسے ثبوت موجود ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ آمرانہ طرز حکمرانی اور سیاسی و سماجی جبر معاشی ترقی کی حوصلہ افزائی کے لئے ضروری ہے۔ شماریاتی حقیقت بہت پیچیدہ ہے۔ منظم تجزیاتی مطالعہ ایسے کسی دعوی کو سپورٹ نہیں کرتا کہ سیاسی آزادی (یعنی جمہوریت) اور معاشی ترقی کے درمیان کوئی تنازعہ موجود ہے۔

اس سیاق و سباق میں یہ اہم ہے کہ زیادہ بنیادی تحقیقاتی طریقہ کار کا مسئلہ اٹھایا جائے – ہم نہ صرف شماریات کی مدد سے کسی باہمی تعلق کا سراغ لگانے کی کوشش کریں بلکہ اسباب کے طریقوں کا بھی جائزہ لیں اور ان کی جانچ پڑتال کریں کہ آیا وہ کون کون سے عناصر ہیں جو معاشی نمو اور ترقی کا سبب ہیں۔ وہ معاشی منصوبہ بندیاں اور ماحول جو مشرقی ایشیائی معشیتوں کی ترقی کی وجہ بنے ہم اب ان کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ حالانکہ مختلف اسباب کی بنیادی اہمیت پر اتفاق نہیں مگر اس کے باوجود معاشی ترقی کے لئے مدد گار منصوبہ بندیوں کی اس لسٹ (درج ذیل) پر تقریبا سب کا اتفاق موجود ہے–

_مقابلہ کے لئے کھلا میدان

_بین الاقوامی مارکیٹ کا استعمال

_خواندگی اور اسکول کی تعلیم کی بہت زیادہ شرح

_کامیاب زرعی اصلاحات

_سرمایہ کاری کے لئے عوام کو ترغیبات و سہولیات

_صنعت کاری اور ایکسپورٹ

ان میں سے کوئی بھی ایسی منصوبہ بندی نہیں جو بلند تر جمہوریت سے متضاد ہو، اور ان پر عمل کرنے کے لئے کسی آمرانہ نظام حکومت کی ضرورت ہو جو جنوبی کوریا سنگاپور یا چین میں عمل میں لایا گیا"(99)

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشی مسائل کی وجہ بھی یہی آمریت ہے۔ تقسیم پاکستان (جس میں مشرقی پاکستان ہم سے علیحدہ ہوا) کی بنیادی وجہ ایوب خان کی معاشی پالیسیاں تھیں، آج پاکستانی معیشت پر جن کاروباری سیٹھوں کا قبضہ ہے ان کا جنم معیشت پر ریاستی اجارہ داری کے تحت اسی ایوب دور میں ہوا تھا۔ بھٹو اور ضیاء معاشی پالیسیوں نے کرپشن کی معیشت کی ثقافت کو پروان چڑھایا، ضیا کی پاکستانی معیشت میں جو وراثتیں ہیں ان میں قرض، مالی امداد (فارن ایڈ) اور بجٹ خسارہ کی معاشی پالیسیوں کا غلبہ ہے اس کے پھندے میں ہم پھنس چکے ہیں جس سے نکلنا لازم ہے ۔

مشرقی ایشیا کا معاشی ماڈل یہاں اگر نافذ کیا گیا تو ہمارا تنوع بکھر جائے گا۔ مشرقی ایشیائی ممالک میں نہ زبان کی بنیاد پر اختلاف ہے نہ نسل پر، نہ تاریخ پر، اور نہ ہی ثقافت پر۔ ایک ہی جیسی شناخت پر آمریت آسان ہے، ہمارے مختلف خطوں کی مختلف شناختیں ہیں، یہ تنوع یہاں کی خوبصورتی بھی ہے اور یہاں کا سب سے بڑا چیلنج بھی۔ مشرقی پاکستان کے لوگ اپنی بنگالی شناخت پر فخر نہیں کرتے تھے اور کیا بنگالی شناخت کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہم نے نہیں دیکھا؟ بلوچستان میں بلوچ کے ریاست سے جھگڑے میں بلوچ شناخت کا کردار نظرانداز کیا جا سکتا ہے ؟ جمہوریت میں تمام شناختوں کو نمائندگی دی جاتی ہے جبکہ آمریت کسی ایک منظور نظر شناخت یا اس میں بھی چند افراد کی مدد سے پورے سماج پر اپنی اجارہ داری نافذ کرتی ہے، یوں کمزور شناختوں میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں سماج کے تانے بانے بکھر جاتے ہیں، اتحاد و قومیت ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے، تہذیب بدحال ہو جاتی ہے اور ریاست کا استحکام ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ باتیں ہماری تاریخ کے لئے نئی نہیں، ہم ان تجربات سے گزر چکے ہیں اور گزر رہے ہیں۔ کیا ضیاء الحق کی بھٹو صاحب کو دی جانے والی پھانسی سندھی قوم پرستی کے تناظر میں نہیں دیکھی گئی؟

سیاسی سماجی اور معاشی آزادی جس کی بنیاد شخصی آزادیوں پر ہو ہمارے لئے ناگزیر ہے، ہمیں اسے مضبوط کرنا ہے اور ترقی کے امکانات اسی در سے ہی وا ہوتے ہیں اور ہوں گے۔ اس کے علاوہ موجود تمام متبادلات میں خسارہ اور تباہی ہے۔

سیکولرازم اور ریاست ، ایک متبادل بیانیہ

مملکت پاکستان کی داخلہ و خارجہ پالیسی اول دن سے تضادات کا شکار ہے ، ہم نے نیشن اسٹیٹ بنا لی مگر قومیت کی ایسی تعریف نہ کر سکے جو مملکت پاکستان کی شہریت کو نہ صرف متعین کرے بلکہ شہریوں کی مسرت اور انکی خوشحال زندگی کے لئے ایک ایسا ریاستی ڈھانچہ بھی تشکیل دے سکے جس کا بنیادی مقصد شہریوں کی زندگی میں سہولیت بہم پہچانا ہو ..... آرمی پبلک اسکول پشاور کے سانحہ کے بعد ہماری حکومت کو یہ احساس ہوا ہے کہ اسکی پالیسی میں انگنت تضادات ہیں- **ان** تضادات کا جنم ایک قومی ریاست اور ایک دینیاتی تصور ریاست کے بنیادی فرق کی وجہ سے ہے ... اب ان تضادات سے کیسے نکلا جائے ، ریاست اس کے بارے میں گو مگو کا شکار ہے—

ہمارے اہل علم احباب نے پاکستان میں دہشتگردی اور مذہبی شدت پسندی کے خلاف ایک واضح اور متبادل بیانیہ کی ضرورت اور اس کے بنیادی تصورات کو موضوع بحث بنایا ہے ، یہ ایک قابل تعریف قدم ہے اور یہی ایک جمہوریت اور تنوع پسند سماج کی راہ ہے کہ اس میں ریاستی معاملات کو علم و فکر کی مدد سے سلجھایا جاتا ہے ، رائے عامہ کو مخاطب کیا جاتا ہے ، اور شہریوں کی مرضی کو ہی ریاست کی مرضی سمجھا جاتا ہے .....

میرے خیال میں ، ہمارے لئے اول یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ریاست کیا ہے اور ہم اسے کیوں قائم کرتے ہیں ؟......ہمارے سماج کی بنیادی اکائی فرد ہے ، فرد جو اپنی ذات میں ایک مکمل اور تنہا شناخت رکھتا ہے ... فرد کی فطرت آزادی پر قائم ہے اور جب بھی فرد سے اسکی آزادی چھینی جاتی ہے فرد انحراف کرتا ہے ، یوں سماج منتشر ہو جاتا ہے ....تنوع مختلف خیالات ، عقائد ، رجحانات ، اور شناختوں کا ایک خوبصورت اور منصفانہ اظہار ہے ، جب کہ انتشار ایک بدصورت اور ظالمانہ اظہار ہے .... فرد اپنی ذات کے بنیادی تشخص میں مکمل ہے مگر اپنی ضروریات و خواہشات کی تکمیل کے لئے اسے دوسرے انسانوں کے ساتھ تعاون و تبادلہ کی اساس پر ایک منصفانہ اشتراک قائم کرنا ہوتا ہے ..... شہریوں سے معاشرہ (سوسائٹی) وجود میں آتا ہے ... ریاست ایک مادی تصور ہے ، اسکا قیام مادی ہے ، اس سے منسوب آرزوئیں مادی ہیں ، اور اسکا انتظام بھی خالصتا مادی ہے ،،،،یہ کسی بھی سبب سے مذہب کا نہ بنیادی موضوع ہو سکتی ہے اور نہ مقصد -

ہمارے جو دوست یہ خواہش رکھتے ہیں کہ پاکستان میں جمہوریت ہو مگر سیکولر ازم نہ ہو ، وہ نہ صرف جمہوریت کے مقصد سے لاعلم ہیں ، بلکہ جمہوریت کی روح کو بھی نہیں سمجھتے ، جس کا مدعا یہ ہے کہ میں (جمہوریت) کسی دینیاتی نظریہ کی پابند نہیں ، بلکہ شہریوں کے حق انتخاب کی مدد سے انسانوں کی ترقی ، خوشحالی اور مسرت کے امکانات کی نہ ختم ہونے والی جستجو کا ایک منظم و پرامن راستہ ہوں-

ذیل میں سیکولرازم کے کچھ بنیادی نکات دیئے گئے ہیں۔

سیکولرازم ریاستی انتظام کا ایک ایسا اصول ہے جس کی بنیاد شہریوں کی مسرت اور مادی خوشحالی کے لئے بہتر امکانات کی جستجو اور اس کے لئے مادی سہولیات بہم پہنچانا ہے.....یہ مذہب کی نہیں ، بلکہ مذہبی اداروں کی پاپائیت یا اجارہ داری کی نفی کرتا ہے اور اس اصول پر یقین رکھتا ہے کہ آئینی طور پر تمام شہری مذہب اور عقائد کی تفریق سے ماوراء، برابر کے شہری ہیں۔

جب ایک ایسی ریاست قائم کی جائے گی جو شہریت کی تعریف اور قانون سازی کے لئے دینیاتی اصولوں کی محتاج ہو گی تو اس صورت میں تین مسائل سامنے آئیں گے ۔

۱ .شہریت کی تعریف کفر و ایمان کی تعریف سے منسوب ہو گی .....یا دوسری صورت میں شہریوں میں اول اور دوم درجہ کی شہریت کی تقسیم پائی جائے گی ....ریاست کے مذہب سے جڑے لوگ نہ صرف قانون سازی میں اول درجہ کے شہری ہوں گے بلکہ ریاست انکی ہی نمائندگی کرے گی ،جبکہ اقلیتیں دوسرے درجہ کی شہریت کی حامل ہو جائیں گی ۔

۲ .اس خاص دینیات کے شارحین کی شرح ہی قانون سازی کے لئے اول معیار بنے گی یوں جمہوریت کا کردار محض نمائشی ہو گا، اگر ان کے درمیان اختلاف ہوتا ہے تو اس کو حل کرنے کا کوئی باقاعدہ ضابطہ نہیں .....دینیاتی ریاست اپنے اصول و ضوابط دینیات کے ایک خاص متن سے اخذ کرتی ہے ، ،متن کی تشریح میں اختلاف اول دن سے چلا آ رہا ہے اور اس کے پرامن حل کی کوئی صورت نہیں جب تک کہ ریاستی جبر اختلاف کو دبا نہ دے .....جہاں تک اجماع کا تعلق ہے ، ہم نے ضیاء دور حکومت میں اسکا عملی نمونہ یہ دیکھا تھا کہ جب تک ریاست کا جبر قائم رہا ، ضیاء کی مذہبی تشریحات کو اجماع (اختلاف ایک قلیل تعداد نے کیا) کی حمایت حاصل رہی اور جب ریاستی جبر ٹوٹا تو آہستہ آہستہ اجماع بھی تحلیل ہوتا گیا -....اس چیز کا قوی امکان پایا جاتا ہے کہ ایک دینیاتی ریاست کے مخصوص تصور کی پابند ریاست میں قانون کی تشکیل و تشریح میں دینیات کے شارحین اور پارلیمان میں ایک مستقل نزاع پائی جائے گی ، اور یوں ریاست اپنے بنیادی مقصد (عوام کی منفعت اور مسرت) سے ہٹ کر متن کے معانی و مفہوم کو سلجھانے اور نفاذ کے بعد اسکے اچھے و برے نتیجہ میں تسلسل کی ضد میں جکڑی رہے گی کیونکہ ایک دینیاتی ریاست دین کے ایک مخصوص تصور اور دائرے سے باہر نہیں جا سکتی ، اب یہ تصور اور دائرہ متن کے شارحین کی شرح ہی متعین کرے گی۔

۳. ایک دینیاتی ریاست میں ریاستی انتظام اور منصوبہ بندی کا اول اور بنیادی مقصد عوام کی مسرت اورخوشحالی نہیں بلکہ دینیاتی اصولوں کی اتباع ہو گی ....ہم جانتے ہیں کہ لوگ آزادی پسند فطرت رکھتے ہیں -جب لوگوں کی ضروریات اور خواہشات ایک دینیاتی نظام میں مطمئن نہیں ہوں گی تو لوگ اس مخصوص دینیاتی فکر و عمل سے انحراف کریں گے ،جس کے نتیجے میں ریاست اپنے دینیاتی تشخص اور دینیاتی اصولوں کی پاسداری میں انحراف کو بغاوت سے تعبیر دیتے ہوئے نظریاتی و عملی آمریت قائم کرے گی...

مگر سیکولر ازم کسی دینیاتی اصول کا پابند نہیں ، اسکا مقصد شہریت کی مساوات قائم کرنا ، شہریوں کی مسرت اور خوشحالی کے لئے فکری و عملی آزادی کے ساتھ مواقع کی تلاش میں مدد فراہم کرنا اور انہیں بہتر نتیجہ کی بنیاد و ضمانت پر لاگو کرنا ہے -اگر کوئی پالیسی عوام کو فائدہ نہیں دے رہی تو سیکولر ریاست بغیر کسی کشش وپنج یا حلال و حرام کی بحث کے ،اسے ممنوع قرار دے کر شہریوں کی فلاح کے لئے نئے امکانات تلاش کرتی ہے ،انہیں نافذ کرتی ہے اور یوں سماج کا روشن سفر جاری رہتا ہے-

سیکولر ریاست میں تمام مذاہب کے لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے اور ریاستی انتظام و انصرام تمام مذہب کے ماننے والوں کی نہ صرف برابر حفاظت کرتا ہے بلکہ ان کے حق تبلیغ کی بھی حمایت کرتا ہے-

جمہوریت کا تصور ہی شہریت کی مساوات اور شہریوں کی خواہش کی اولیت سے متعلق ہے ،تمام شہری برابر ہیں ، اور ان میں سے کسی کو بھی رنگ ،نسل ،مذہب یا نظریہ کی بنیاد پر امتیاز کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا ....اگر ہم پاکستان میں فرقہ واریت اور مذہب کے نام پر ظلم و بربریت سے چھٹکارا چاہتے ہیں ،تو ہمارے پاس سیکولر ازم کے علاوہ کوئی راستہ نہیں

چونکہ تمام شہری برابر ہیں اس لئے تمام شہریوں کو سرکاری سہولیات سے مستفید ہونے کا برابر حق حاصل ہوتا ہے اور اس سلسلے میں کوئی بھی امتیاز قابل قبول نہیں-

سیکولر ازم الحاد نہیں ، بلکہ یہ تمام مذاہب کا احترام کرتا ہے اور ان کے ماننے والوں کو سماج میں باوقار اور پرامن رہنے کا انتظام کرتا ہے ، یہ ایک فریم ورک ہے جو سیاست ، تعلیم ، قانون نیز ہر شعبہ میں مساوات کو یقینی بناتا ہے –

سیکولر ازم اختلاف رائے کو کفر یا بغاوت نہیں سمجھتا ، بلکہ یہ مکالمہ اور آزادی اظہار رائے کو بہتر مستقبل کے بہترین امکانات کی تلاش اور ان کو پانے کا ایک اہم ذریعہ سمجھتا ہے ، اس لئے ان کی قدر کرتا ہے ، اسے سہولیات بہم پہنچاتا ہے تاکہ خیالات میں افزائش اور ان میں باہم مقابلہ پیدا ہو اور بہترین چیز ابھر کر سامنے آئے ....اس کا ماننا ہے کہ حقوق لوگوں کے ہوتے ہیں ، نظریات کے نہیں (100)-

معاشی آزادی کے بغیر غربت و غلامی کا راج ، اور وسائل کا ضیاع ہے

ایک ایسے ملک میں جہاں تنہا آجر (Employer) ریاست ہے، اس کی مخالفت کا مطلب آہستہ آہستہ فاقوں سے ہلاکت ہے - قدیم اصول؛ جو کام نہیں کرے گا اسے کھانا نہیں ملے گا، کی جگہ اس ریاست میں یہ اصول نافذ ہوتا ہے : جو اطاعت نہیں کرے گا بھوکا مرے گا-

-لیون تروٹسکی

اب جبکہ ہم فرد سے متعلق لبرل تصورات کا مختصر جائزہ لے چکے ہیں کہ فرد کی شناخت اصل میں اس کی انفرادیت میں ہی ہے اور یہ کہ ہر فرد اپنی فطرت میں لاثانی ہے – آزاد سماج کی بنیادیں بھی ہم جان چکے ہیں۔اس میں حکومت اور قانون کا کردار بھی ہم قدرے تفصیل سے سمجھ چکے ہیں اور یہ بھی کہ حق ملکیت ہی دراصل آزادی کی پہلی منزل ہے۔اب ہم ذرا اپنی بحث کو سمیٹ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکنامک فریڈم یعنی معاشی آزادی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اکنامک فریڈم یعنی معاشی آزادی سے مراد ایسا معاشی نظام ہے جس میں ہر فرد کو اپنے ذاتی حق انتخاب،تعاون و تبادلے، مارکیٹ میں اپنی شمولیت اور کردار (یعنی Contribution) اور آمدن و ملکیت کے استعمال کی آزادی حاصل ہے،اگر اس تعریف کو ذرا کھولا جائے تو ہم درج ذیل نکات کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ

1۔فرد اپنی معاشی زندگی میں بھی اپنے حق انتخاب کی بنیاد پر آزاد ہے۔ اپنے معاشی فیصلوں اور معاشی ترجیحات کی جستجو میں اپنی آزادی ارادہ و عمل ، پسند و ناپسند (choices)، صلاحیتوں و قابلیتوں اور ذاتی نظام اقدار کے تحت زندگی گزارنے کا حق رکھتا ہے۔

2۔معاشی عمل میں انسانوں کے درمیان تبادلہ و تعاون صرف رضاکارانہ بنیادوں پر ہوگا۔کوئی کسی پر جبر نہیں کر سکتا کہ اسے لازمی کوئی دوکاندار مطلوبہ شے بیچے، یا کوئی گاہک لازمی اسی دکاندار سے ہی خریدے - سب آزاد ہیں کہ کسی سے تعاون و تبادلہ کریں یا نہ کریں،ان پر کوئی جبر نہیں.

3۔مارکیٹ میں فرد یا افراد کی کوئی تنظیم (کمپنی وغیرہ) آزاد ہیں کہ وہ مارکیٹ میں جو کردار (role) بھی پسند کریں اسی کی رو سے Contribute کرسکتے ہیں چاہے وہ بطور پروڈیوسر (کاروبار) اپنی سرگرمی سر انجام دیں یا بطور صارف و ملازم (Employee) اپنے معاشی مقاصد کی جستجو کریں۔وہ آزاد ہیں۔

4۔فرد اور اس کی ملکیت کا تحفظ ایک اجتماعی بندوبست میں لازم ہے۔اور فرد کی ملکیت پر ریاست یا کوئی اور سماجی ادارہ یا دوسرا فرد کسی بھی شکل میں کسی بھی جواز کے تحت کوئی ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔

5۔ہر فرد کو اپنی مہارت ،وقت اور دستیاب وسائل کے تصرف میں پوری آزادی حاصل ہے۔مگر اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں سے یہ آزادی چھین لے یا انہیں مجبور کرے کہ وہ اس کی مرضی کے پابند ہوں یا انہیں روک دے کہ وہ اپنی مہارت، وقت اور وسائل کو اپنی مرضی سے استعمال نہیں کرسکتے۔

6۔فری مارکیٹ میں مقابلہ کی ثقافت پائی جاتی ہے۔اور ہر تخلیقی Contribution پر نفع یا آمدن کی صورت میں ریوارڈ موجودہے۔آپ کی معاشی سرگرمیوں کی اتنی ہی ویلیو ہے جتنا سوسائٹی کو اس کی طلب یا ضرورت ہے۔آپ کسی بھی شے یا خدمت کی ویلیو کے کسی مستقل و جامد تصور کو دوسرے شہریوں پر نافذ نہیں کرسکتے۔

7۔ حکومت اور قانون کے فرائض میں یہ شامل ہے کہ شہریوں کی زندگی ،آزادیوں اور حق ملکیت کا تحفظ کریں ، اپنی حدود میں رہ کر کام کریں ، اور مقابلہ کی ثقافت کے قیام میں اپنا تعمیری کردار سرانجام دیں کہ کوئی مارکیٹ کے نظام پر اپنی اجارہ داری قائم نہ کر سکے ۔

سیاست کے باب میں جیسا کہ کہا گیا ہے کہ سیاست کا سب سے اہم مقدمہ اقتدار و اختیار کی طاقت ہے اور بہترین نظام وہی ہے جو اس طاقت کو کسی ایک جگہ مرتکز نہ ہونے دے یعنی اصل چیلنج سیاست میں طاقت کے مسائل کو حل کرنا اور اس سے نفع بخشی کا کام لینا ہے۔ اسی طرح معیشت کا سب سے اہم مسئلہ وسائل کی کمیابی (Scarcity) اور ان کی بہترین تفویض (allocation) ہے۔معاشی وسائل کسی ایک جگہ مرتکز نہ ہوں۔معاشی خوشحالی آئے اور یہ خوشحالی فری مارکیٹ کیپیٹلزم کی رو سے محض معاشی آزادیوں یعنی فری مارکیٹ معیشت سے ہی ممکن ہے۔

8 . پراپرٹی چاہے وہ فزیکل ہے یا دانشورانہ (Intellectual) نجی ملکیت میں ہونی چاہئے۔ نجی بندوبست میں ہی اسے بہتر و موثر بندوبست (Management and control) میں رکھا جا سکتا ہے، جبکہ وہ نظام جو اس سے متصادم ہے سوشلزم کہلاتا ہے جس میں پراپرٹی کی مکمل ملکیت ریاست کے پاس ہوتی ہے اور وہی اس کا بندوبست قائم کرتی اور کنٹرول کرتی ہے۔

9 . چونکہ معاشی سرگرمیوں میں آپ اپنی تمام تر توانائیوں سے سرگرم حصہ لیتے ہیں ، اس لئے اس سے حاصل شدہ ریوارڈ (انعام یعنی نفع ، اجرت ، کمیشن وغیرہ) بھی آپ کی ملکیت ہے ۔ اس ملکیت سے اگر کوئی اجتماعی و ریاستی بندوبست آپ کو محروم کرتا ہے تو یہ ظلم و ناانصافی ہے اور حقیقت میں یہ مساوات بھی نہیں۔اس سلسلے میں ایک دلچسپ مثال دیکھتے ہیں۔

فرض کیا کہ آپ ایک صحرا میں جاتے ہیں۔ایک کنواں کھودتے ہیں ، اس میں سے پانی نکل آتا ہے اور آپ وہاں رہنا شروع کردیتے ہیں۔کچھ دن گزرتے ہیں کہ ایک دوسرا خاندان وہاں آجاتا ہے ،وہ بھی آپ کی دیکھا دیکھی ایک کنواں کھودتا ہے ۔ اسے بھی پانی حاصل ہوجاتا ہے وہ بھی اپنا بسیرا وہیں قائم کرتا ہے اور رہنا شروع کردیتا ہے ۔کچھ عرصہ کے بعد اس کے کنویں کا پانی ختم ہوجاتا ہے یا کم ہوجاتا ہے ۔وہ آپ سے کہتا ہے مجھے بھی اپنے کنویں سے پانی دو ،مجھے بھی اور میرے خاندان کو بھی۔آپ رضاکارانہ طور پر انسان دوستی میں کچھ دنوں کے لیے اسے پانی دیتے ہیں اور اسے مشورہ بھی دیتے ہیں کہ بھائی یہاں یا کسی اور جگہ پانی تلاش کرو اور اپنا بندوبست کرو ۔مگر وہ کہتا ہے کہ نہیں جو کنواں تم نے کھودا ہوا ہے اس میں سے مجھے بھی پانی چاہئے ورنہ یہ مساوات نہیں۔آپ کہتے ہیں کہ بھائی اگر ہم دونوں نے اس کنویں کو استعمال کرنا شروع کر دیا تو تو یہ بھی سوکھ جائے گا۔دوسرا یہ کہ یہ کنواں میں نے اپنی محنت و صلاحیت سے کھودا ہے اور اس کی نگرانی و مرمت (maintenance) پر بڑی مشقت اٹھائی ہے اگر تم بھی اپنے کنویں کا خیال رکھتے اور اس کے پانی کو احتیاط سے استعمال کرتے تو یہ دن تمہیں نہ دیکھنے پڑتے ۔

آپ کے خیال میں اس مخصوص موقع یا بحران کو کیسے حل کیا جائے اور وہ کون سی اخلاقیات ہیں جنہیں زیر غور لانا چاہیے ؟ کیا کنواں جو آپ کی محنت سے وجود میں آیا تھا آپ کی ملکیت نہیں ؟ اور کیا اس دوسرے خاندان کو کوئی اور کنواں نہیں تلاش کرنا چاہیے ؟ اگر دونوں مل کر کوئی حل نکالتے ہیں تو کیا اس پر عملدرآمد رضاکارانہ ہوگا یا اس پر کوئی بیرونی جبر بھی شامل ہونا چاہئے ؟

1. فری مارکیٹ کیپیٹلزم کا اصرار ہے کہ معاشی آزادی کے بغیر سیاسی و سماجی آزادی بالخصوص شخصی آزادی بھی ناممکن ہے ۔

دیکھیے آزادی ، مساوات اور انصاف مقدم ہیں۔ ہم نے اب تک جاری بحث میں شخصی آزادی کا مقدمہ کھول کھول کر بیان کیا ہے ۔ یہ مقدمہ محض فرد کی سیاسی اور سماجی زندگی تک مخصوص نہیں بلکہ معاشی زندگی میں بھی یہی انسان ہے جو اپنی فری ول یعنی آزادی ارادہ و عمل اور نظام اقدار سے اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو ایک مخصوص سمت میں رہنمائی دیتا ہے ۔

جب آپ آزادی کی بنیادی اہمیت کو زندگی کے کسی بھی شعبے جیسے سیاست یا ثقافت یا معیشت وغیرہ میں نظر انداز کرتے ہیں تو زندگی کے باقی تمام شعبوں میں بھی یہ خود بخود نظر انداز ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ جن دلائل سے فری مارکیٹ معشیت کا مقدمہ قائم ہوتا ہے وہی دلائل جمہوریت سیکولرازم اور تنوع پسندی یعنی مکمل و مربوط لبرل ازم کو قائم کرتے ہیں۔

اگر فرد اپنی معاشی زندگی میں ذمہ دار (Responsible) اور ذہین نہیں تو وہ سیاسی زندگی میں کیسے ذمہ دار ہوسکتا ہے۔اگر وہ مارکیٹ میں صحیح انتخاب کی صلاحیت نہیں رکھتا تو جمہوریت میں صحیح گورنمنٹ کو کیسے منتخب کرسکتا ہے؟ اگر معاشی زندگی میں حق انتخاب سے مراد اس کی پسند و ناپسند کا ذاتی (Personal) ہونا ہے تو یہی دلیل ہم سماج میں تنوع پسندی کے لیے بھی دیتے ہیں کہ سچائی کی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی اور اسے مسلط (imposed) نہیں کیا جاسکتا۔

لبرل ازم کی منزل بھی آزادی ہے اور ذریعہ (mean) بھی آزادی ہے۔ایسا نہیں کہ آپ آزادی کی منزل حاصل کرنے کی جدوجہد میں تمام انسانوں کو زندگی کے کسی شعبہ میں ریاست کا غلام بنا دیں۔ فوجی یا سول آمریت نافذ کرکے مثالی جمہوریت کا خواب دیکھنا دیوانگی اور پاگل پن ہی ہے۔جس طرح بہتر سے بہتر جمہوریت کا طریقہ کار بھی جمہوریت ہی میں تسلسل ہے، اسی طرح فری مارکیٹ کی خامیاں بھی مارکیٹ کے نظام میں تسلسل سے ہی دور ہوتی ہیں اور سماج کے جملہ مسائل بھی سماجی آزادی سے حل ہوتے ہیں ۔طریقہ کار (mean) اور نتیجہ(End Results) میں تضاد دونوں کو ایک دوسرے سے متصادم کر دیتا ہے۔

معاشی آزادی ، سیاسی آزادی اور سماجی آزادی یہ تینوں ایک دوسرے کے مددگار اور لازمی و بنیادی اجزاء ہیں اور ایک دوسرے کا جواز بھی یہی ہیں۔بہت سارے ممالک نے سیاسی و سماجی آزادی کی منزل معاشی آزادی سے ہی حاصل کی ہے۔اس کے لیے سب سے بڑی مثال خود امریکہ وبرطانیہ ہیں- اسی طرح عہد حاضر کا چین ماؤ مارکیٹ اصلاحات سے اب زیادہ سیاسی و سماجی طور پر آزاد و مظبوط ہوا ہے کیونکہ معاشی آزادی نے امراءو مڈل کلاس کی ابھرتی ہوئی آبادی کو سیاسی و سماجی آزادیوں کی طرف راغب کیاہے۔

اگر ہم بہترین دستیاب شماریاتی تحقیق کے نتائج کو دیکھیں تو ہم جمہوریت اور مارکیٹ میں معاشی اصلاحات کے درمیان براہ راست تعلق دیکھتے ہیں۔ (101) یاد رہے کہ سیکنڈے نیوین (Scandinavia) ممالک لبرلائزیشن کی جدوجہد میں اس وقت صف اول کے ریفارمر ہیں۔اور انکی مارکیٹ اور سیاست و ثقافت وقت کے ساتھ ساتھ مزید آزادی پسند بنتی جارہی ہیں۔

سیاسی استحکام کی بدولت صنعتی انقلاب نے جنم لیا۔

مشہور نوبل انعام یافتہ دانشور Douglass North معیشت اور سیاسی آزادی کا تعلق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 1688 سے پہلے برطانوی انفراسٹرکچر انتہائی کمزور تھا۔ریاست چلانے کے لیے بادشاہ کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے۔وہ ملک میں امراء سے قرض لیتا اور واپسی سے انکار کردیتا تھا۔عدالتی نظام انتہائی بوسیدہ تھااور رشوت کا دور دورہ تھا۔انھی اسباب کے سبب انگلش سول وار 1644میں شروع ہوئی اور پھر 1688میں Glorious انقلاب آیا۔یہ سیاسی تبدیلیاں صنعتی انقلاب سے تقریبا نصف صدی قبل برپا ہو رہی تھیں۔اس انقلاب کے بعد بادشاہ و امراء اور ریاست و شہری کے درمیان کچھ لو اور کچھ دو کی سودے بازی (Bargaining) شروع ہوئی۔ امراء نے ٹیکس کو پارلیمنٹ کی رکنیت اور آزادی اظہار رائے سے مشروط کردیا جبکہ بادشاہ نے اس کے بدلے نئے تاجر طبقہ کی نجی جائیداد کو تحفظ،سیاسی طاقت کی جوابدہی اور لوگوں کے لیے بہتر قانون سازی کی پیشکش رکھی۔ جمہوریت کو فروغ ملا، سیاسی استحکام نے صنعتی انقلاب کی آبیاری کی اور انگلینڈ کو جمہوریت اور صنعتکاری کے لیےایک ماڈل ملک بنا دیا ۔اس مثال میں ہم دیکھ سکتے (102) ہیں کہ سیاسی و معاشی طاقت ایک دوسرے کے لئے وسیع امکانات پیدا کر رہی ہیں ۔ اور پھر دونوں باہم مل کر ایک ملک کو عظیم بناتی ہیں۔یاد رہے کہ یہ وہ برطانیہ ہے جہاں بیک وقت جمہوریت اور کیپٹلزم دونوں کو آغاز ملتا ہے۔

صنعتی انقلاب نے ہی سیاسی و ثقافتی انقلاب پیدا کیا۔

اس سلسلے میں ول ڈیورانٹ لکھتا ہے

"عہد خرد میں جب اقتصادی طاقت بے کار اور بے عمل رئیسوں کے ہاتھ سے زندہ دل تاجر طبقہ کے قبضہ میں آئی تو ہر راویت متزلزل ہو گئی ۔ ہر رسم ٹوٹ گئی ۔ ہر واہمہ نے انسان پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور انسانوں نے اپنے آپ کو پہلی مرتبہ آزاد محسوس کیا ۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہنگامی طور پر ماضی نے حال پر سے اپنا تسلط ہٹا لیا ہے. بوربون کا پیرانہ سال خاندان برائے نام حکومت کرتا تھا — کلیسا اس سماج میں جہاں تشکیک کا دور دورہ تھا اور جہاں پادری بھی خرد مندی کا مذاق اڑاتے تھے دیہات میں قوی لیکن شہروں میں بے بس تھے۔ ہر قانون کی گرفت میں لچک آگئی تھی ہر اصول پر تنقید ہوتی تھی ۔ کسی خوف یا ترمیم کے بغیر فن اور کردار کے ہر معیار کی خلاف ورزی ہوتی تھی. یہ وہ عہد تھا جس میں روسو نے ریاست کو ایک برائی قرار دیا تھا ۔ اور جیفر سن نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ حکومت بہترین ہے جو کم سے کم دائرہ کار میں حکومت کرتی ہے. یہ عہد خرد کا عہد تھا " (103)

دور جدید کے مفکرین سیاسی سماجی اور معاشی آزادیوں میں فرق نہیں کرتے تھے ۔

یہ دراصل تاجر طبقہ کا نصب العین تھا جس نے آزادی کی طلب پیدا کی ۔جس نے انفردیت پسندی کو دل آویز سیاسی فلسفہ بنادیا جسے آج ہم جمہوریت اور سیکولرازم کہتے ہیں ۔ کیا یہ بات دلچسپ نہیں کہ فرد کی آزادی کے بڑے بڑے مفکرین سیاسی سماجی اور معاشی آزادیوں میں تفریق نہیں کرتے تھے ۔ایڈم سمتھ نے لکھا کہ قوموں کی دولت کا انحصار فرد کی آزادی پر ہے (104) ۔''میرا بوا'' اور دوسرے مفکرین کے خیال میں فطرت کو تجارت اور صنعت کے نظم و نسق کی آزادی ہونی چاہیے۔سپنسر نے بینتھم اور جان سٹوارٹ مل کی آزاد روایت کی پیروی میں ریاست کو تحلیل کر کے فقط ایک نقطہ پر فوکس کردیا کہ وہ محض نجی جائیداد کی محافظ ہے۔ (105)

اسی فلسفہ روایت نے آگے چل کر اس فکر کو جنم دیا کہ اگر صنعت و تجارت کی آزادی مفید ہے تو سیاست و اخلاق میں یہ آزادی کیوں نہیں دی جاسکتی یوں تنوع پسندی کو بنیاد ملی۔(106)

جاپان اور آسٹریلیا : معاشی آزادی سے سیاسی و سماجی آزادی کی طرف سفر

جاپان اور آسٹریلیا کی مثال دیکھتے ہیں جو 200 سال پہلے قدامت پسند معاشرے تھے ۔ جتنی سیاسی سماجی اور معاشی آزادی وہاں آج ہے دوسو سال پہلے ہر گز ممکن نہ تھی۔ شخصی آزادیوں کی اس جنت کی تخلیق میں معاشی آزادیوں کو مرکزی اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ معاشرے معاشی طور پر پہلے بدلے، ان معاشی آزادیوں نے ہی سیاسی و سماجی آزادیوں کی طرف رہنمائی کی اور ان کے لئے راستے آہستہ آہستہ کھول دیئے. آج ان معاشروں میں ایک خاموش و پرامن انقلاب کے نتیجے میں سماجی انصاف اور مساوات اپنے ماضی سے کئی گنا بہتر اور مثالی ہے۔

مڈل کلاس اور سیاسی انقلاب

معاشی ترقی مڈل کلاس اور کارجوؤں (entrepreneurs) کی نئی کلاس کو جنم دیتی ہے۔جنہیں ایک طرف اپنی صلاحیتوں وقابلیتوں پر اعتماد ہوتا ہے تو وہیں وہ اپنے لیے بنیادی حقوق اور سیاسی و سماجی زندگی میں نمایاں مقام کا تقاضا کرتے ہیں۔مڈل کلاس صرف مادی ضروریات و خواہشات کی تسکین نہیں بلکہ اپنے لئے بنیادی سہولیات بھی مانگتی ہے۔اسی تناظر میں مشہور معیشت دان رگو رام راجن کہتے ہیں کہ جدید دور کی برطانوی جمہوریت صنعتی انقلاب اور صنعتی تمدن کا کارنامہ ہے۔وہ کہتے ہیں کہ برطانیہ کو معاشی ترقی اور صنعتی تمدن کے قیام میں دو صدیاں لگیں اور جدید سیاسی تمدن کو نمودار ہونے میں محض ایک صدی جو کہ دراصل معاشی ترقیوں کا ہی ثمر ہے۔(107)

ایک آزاد سوسائٹی کو آئیڈیاز کی ضرورت ہوتی ہے، سیاسی زندگی میں بھی اور سماجی و معاشی زندگی میں بھی۔معاشی زندگی کا وہ نظام جو آئیڈیاز کے آزاد اظہار، اس کے اطلاق (Implementation) اور نتائج کو اہمیت دیتا ہے اور انہیں مادی طور پر ممکن العمل بناتا ہے وہ فری مارکیٹ کیپیٹلزم ہی ہے جس کی اساس بھی آزادی ..... شہریت ، مواقع ، اور حقوق میں مساوات ...... اور انسانی حقوق کی بنیادپر انصاف میں

ہے۔سائنس کو ٹیکنالوجی کے روپ میں ڈھلنے کے لئے انڈسٹری کی ضرورت ہے اور انڈسٹری کو صارفین کی - یہ چاروں عوامل (سائنس و ٹیکنالوجی اور انڈسٹری و کنزیومر) مل کر ہی نیچرل و اطلاقی سائنس کو ترقی دیتے ہیں -

یہ صرف فری مارکیٹ کیپیٹلزم اوراس کی جمہوریت میں ہی ممکن ہے کہ آپ اس میں کسی بھی نظریہ بشمول سوشلزم کے لیے بھی پر امن جدوجہد کر سکتے ہیں۔

اس میں فرد آزاد ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی مرضی سے اکٹھا کرے اور ان کے سامنے پرامن رہ کر اپنی رائے کا اظہار کرے۔وہ اس میں فنڈ اکٹھے کر سکتا ہے۔اور اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کر سکتا ہے۔فاسشٹ و سوشلسٹ سوسائٹی میں یہ ممکن نہیں کیونکہ وسائل جو سارے کے سارے ریاست کے قبضہ میں ہوتے ہیں چونکہ سیاسی کمپین اور سیاسی جدوجہد کے لیے مادی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے آپ کی یہ جدوجہد بغیر وسائل کے ادھوری اور کمزور رہتی ہے۔جب وسائل نجی ملکیت میں ہوں گے تو سیاسی جدوجہد کی قیادت عوام سے اپیل کر کے نہ صرف وسائل اکٹھا کر سکے گی بلکہ اس کے صحیح استعمال سے وہ کمپین (compaign) کھل کر اور بھرپور طریقے سے سر انجام دے سکے گی۔خیال رہے کہ صرف وہ کمپین یا سیاسی و سماجی جدوجہد ایک لبرل سماج میں اخلاقی جواز رکھتی ہے جس کی بنیاد نفرت اور تشدد پسندی پر نہ ہو۔

وہ ممالک جو معاشی طور پر آزاد نہیں وہاں سیاسی و سماجی آزادیاں بھی نہیں پنپ سکیں۔

جب آپ وسائل کو ریاست کی تحویل میں دے دیں گے اور خود کو اس کی منصوبہ بندیوں کے حضور سپرد کردیں گے تو سیاسی و سماجی آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے گا ، نہ کہ ان میں وسعت آئے گی۔بغیر نجی ملکیت میں وسائل کے سیاسی و سماجی آزادیاں نئے امکانات سے روشناس نہیں ہوسکتیں۔اور ریاست جو کہ عموما بے لچک طریقہ کار رکھتی ہے اپنی اجارہ داری اور طاقت و اختیار میں توازن کے لیے ہر تبدیلی کو اپنے لیے خطرہ بھی سمجھے گی اور وسائل سے محروم شہریوں کی تبدیلی کی ہر کوشش کو بے اثر بھی کردے گی۔

امن و امان ، بنیادی انسانی حقوق، اور حق ملکیت یہ سب فرد کے ایک ہی حق سے جنم لیتے ہیں

کہ فرد اپنی زندگی کا خود ہی معیار اور خود ہی ذمہ دار ہے۔ ایک شخص کو اگر آپ زندگی کا حق تو دے دیں مگر اس سے اس چیز کا حق چھین لیں کہ وہ اپنے پسندیدہ معیار زندگی کا خود فیصلہ کر سکے اور اس کی جستجو کرسکے تو آپ نے دراصل اسے غلام ہی رکھا۔ اگر آپ نے زندگی اور معیار زندگی کی جستجو کا حق بھی تسلیم کر لیا مگر تمام وسائل اپنے قبضہ میں رکھے اور فرد کو اس کے استعمال سے محروم رکھا تو حقیقت میں دونوں حقوق (یعنی

جینے کا اور اپنی پسند کے معیار زندگی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق) آپ نے اس سے چھین لیے۔ یہ حق انتخاب ہی ہے جو آزادی اور غلامی کے درمیان تفریق کرتا ہے۔

منصوبہ بندی اور طاقت:

اپنے مقاصد کی آبیاری کی خاطر منصوبہ ساز حضرات کے لیے وہم و گماں سے بھی زیادہ طاقت، یعنی لوگوں کا لوگوں پر تحکم، تخلیق کرنا لازم ہے۔ ان حضرات کی اپنے عزائم میں کامیابی ان کو حاصل کردہ طاقت کے حجم پر منحصر ہوتی ہے۔ دوسری جانب جمہوریت اس رکاوٹ کا نام ہے جو "اقتصادی سرگرمی کی مرکزی تنظیم کے جواز میں آزادیوں کو کچلنے کی راہ " میں حائل ہے۔ بس یہیں سے " منصوبہ بند نظم و بندوبست" اور جمہوریت میں لڑائی کا آغاز ہوتا ہے۔

المیہ ہے کہ اکثر سوشلسٹس اس فریب کا شکار ہیں کہ انفرادیت پسندی کے نظام میں فرد کی اس طاقت کو چھین کر سماج کو دینے سے وہ طاقت کا خاتمہ بالخیر کر دیتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ اپنے بڑے منصوبے کی تکمیل کے لیے طاقت کا ارتکاز کر کے وہ طاقت کی محض شکل ہی نہیں بدلتے بلکہ اسے بڑھا بھی دیتے ہیں۔ وہ سماج میں بکھری ہوئی (Dispersed & decentralized) طاقت ایک ادارے کو تھما دیتے ہیں ، یوں اس قدر وسیع و عریض قوت وجود میں آتی ہے جس کی پہلی طاقت سے کوئی مماثلت ہی نہیں رہتی۔

یہ کہنا مکمل طور پر غیر منطقی ہے کہ ریاست کے ایک مرکزی پلاننگ بورڈ کو وہی طاقت ملے گی جو نجی سطح پر ایک کمپنی کے متعدد بورڈ آف ڈائریکٹرز کی ہوتی ہے۔ مسابقت کے اصول پر قائم ایک سماج میں کوئی فردسوچ بھی نہیں سکتا کہ اسے سوشلسٹ پلاننگ بورڈ کو حاصل طاقت کی ایک اکائی بھی حاصل ہو۔ طاقت کا ارتکاز ختم کرنے کے لیے طاقت کا حجم کم کرنا ہوگا اور مسابقتی نظام ہی فرد کی فرد پر قائم طاقت کم از کم سطح پر لے جا سکتا ہے۔ کس کو شک ہے کہ ایک لکھ پتی آدمی، چاہے وہ میرا سیٹھ ہی ہو، کو اس بیورو کریٹ کے مقابلے میں مجھ پر بہت کم طاقت حاصل ہے جسے میرے طرز زندگی اور کاروبار سے متعلق جبری فیصلوں کا اختیار ہو۔

ہمارے ملک میں بد ترین تنخواہ پر گزارہ کرنے والے مزدور کو بھی اپنی زندگی کے متعلق فیصلوں میں وہ آزادیاں حاصل ہیں جو جرمنی کے کسی سیٹھ یا روس کے کسی اعلی تنخواہ یافتہ انجینیر یا مینیجر کو دستیاب نہیں۔ اگر ہمارا مزدور اپنی ملازمت یا رہائش بدلنا چاہے، اپنی مرضی کے خیالات اپنانا چاہے یا فارغ وقت اپنی خوشی سے گذارنا چاہے تو اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں۔ ہمارے مزدور کی جسمانی حفاظت اور آزادی کو کسی نام نہاد برتر کی جانب سے نافذ کردہ مخصوص ملازمت یا مخصوص علاقے تک محدود ہوجانے کا کوئی خطرہ نہیں۔

ہماری نسل کو یاد نہیں رہا کہ حق ملکیت اہم ترین آزادی ہے۔ ذرائع پیداوار کی مختلف لوگوں میں آزادانہ تقسیم ہی سے یہ ممکن ہوتا ہے ہم افراد اپنے متعلق خود فیصلہ کر پائیں۔ جب تمام تر ذرائع پیداوار ایک ہاتھ میں آ جائیں، چاہے اس ایک ہاتھ کو آپ ''سماج'' کا خوشنما عنوان دیں یا آمر کا، ذرائع پیداوار پر ہر مطلق العنان قابض کو افراد پر مطلق طاقت حاصل ہوگی۔ دوسری جانب، انفرادی سطح پر افراد کے ہاتھوں میں اقتصادی طاقت اگر کبھی جبر کا وسیلہ بن بھی جائے تو ایسا جبر فرد کی مکمل زندگی تک بڑھ نہیں پاتا۔ تاہم اقتصادی طاقت جب سیاسی طاقت کی شاخ بن کر مرکز و محور بن جائے تو اس سے وہ محکومی جنم لیتی ہے جس کا غلامی سے فرق باقی نہیں رہتا۔ یہ بات سولہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ ''جس ملک میں آجر صرف ریاست ہو وہاں اختلاف کا مطلب فاقوں کی موت مرنا ہوتا ہے۔''

(**فریڈرک اے ہائیک**) 108

2. فری مارکیٹ باہمی اعتماد (Mutual Trust) کا نظام ہے۔

فری مارکیٹ کی ایک بڑی خوبی اس پر انسانوں کا اعتماد ٹرسٹ ہے،جو کہ فاشسٹ اور سوشلسٹ ممالک حاصل نہیں کرسکے۔اگر اس نظام پر لوگوں کا ٹرسٹ نہ ہوتا تو یہ نظام کب کا تباہ ہو چکا ہوتا۔ لوگ آزادنہ بنیادوں پر باہمی تعاون و تبادلہ نہ کر رہے ہوتے ۔اور یقینا انکی آزادی ارادہ و عمل اور ان کا ذاتی نظام اقدار انہیں کسی دوسری سمت میں رہنمائی کر کے لے جاتا۔

جن ممالک میں نظام کو شہریوں کی آزادی ارادہ و عمل اور شخصی نظام اقدار کا اعتماد حاصل نہیں ہوسکا۔وہاں جبر اور آمریت نے ہی اپنا ایجنڈا نافذ کیا ہے۔فری مارکیٹ نے تمام سیاسی سماجی اور معاشی آزادیوں کو اس طرح سے facilitate کیا ہے کہ آزادیوں کا پورا نظام اسے facilitate کرتا ہے۔آج سرمایہ دار معاشرے دنیا کے تمام معاشروں کی نسبت زیادہ آزاد اور رضاکارانہ ہیں ۔

تاریخ میں سوشلزم اور کیپیٹلزم کے درمیان ایک دلچسپ تجربہ ہوا۔ برلن میں ایک دیوار اٹھائی گئی تھی مشرقی جرمنی میں سوشلزم رائج تھا جبکہ مغربی جرمنی میں کیپیٹلزم ۔ لوگ مشرقی جرمنی سے مغربی جرمنی کی طرف جانے کے لئے جان کا خطرہ مول لے لیتے تھے۔ لیکن ایسا کیوں ہے کہ کسی نے اشتراکی برلن میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی ؟؟؟؟؟؟؟

آمریت میں بھی مارکیٹ آزاد نہیں رہ سکتی۔فری مارکیٹ پر اعتماد کے بغیر مارکیٹ ،سوسائٹی اور سیاست کا آزاد نظام قائم نہیں ہوسکتا جو سرمایہ دار معاشروں میں تین صدیوں سے مستحکم اور مائل بہ ارتقاء ہےاور اس عرصے میں کوئی دوسرا نظام نہ اسے ہٹا سکا ہے ، نہ ہی اس سے بہتر کارکردگی دکھا سکا ہے اور نہ ہی عوام کا رضاکارانہ تعاون اسے حاصل ہو سکا ہے –

سادہ سی بات یہ ہے کہ فری مارکیٹ کیپٹلزم دراصل تمام افراد کے ذہنی رجحان ، عملی دنیا میں ان کے شخصی مفادات کی جستجو اور آزادی ارادہ و عمل کا مظہر ہے یوں اسے اعتماد بھی حاصل ہے اور اسے جبر کی ضرورت بھی نہیں ۔

3. فری مارکیٹ کی بڑی صفت خود تنظیمی (spontaneous ordering) ہے ۔

اس نظریہ کو معاشی و سماجی فلسفہ میں سب سے پہلے ایڈم سمتھ نے پیش کیا تھا کہ سوسائٹی کا نظم (order) کسی باقاعدہ انسانی منصوبے (will،plan) ، ارادے یا کسی باشعور انسانی کوشش کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ فطری ہے یہ اس میں پنہاں صفت ہے ۔ اس لئے یہ خود بخود قائم بھی اور مستحکم بھی رہتا ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ ارتقاء کی خوبی بھی اس میں فطری ہے ۔

جب آپ کے پاس بہترین قسم کے ادارے، قانون کی حکمرانی اور آزادی و مقابلہ کی ثقافت پائی جاتی ہے تو ترقی و بہتری خود بخود آتی جاتی ہے ، اسے کسی فرد واحد یا ادارے کی طرف سے ڈیزائن کر کے پیدا نہیں کرنا پڑتا کیونکہ ہر فرد کو امن و امان اور جان و مال کے تحفظ کے ماحول میں ہی اپنی ضروریات و خواہشات کی جستجو کے لیے ایک وسیع و پراخلاق میدان میسر آجاتا ہے ، یوں وہ اپنی آزادی ارادہ و عمل اور نظام اقدار کو pursue کرتے ہوئے بہتر سے بہتر امکانات کو تلاش کرتا جاتا ہے۔اسی طرح پوری سوسائٹی خوددار و خود انحصار ہوتی ہے، اور ترقی و خوشحالی کی طرف یہ سفر جاری رہتا ہے، اس میں خود احتسابی کی صلاحیت بھی موجود ہوتی ہے اور مسائل سے نبردآزما ہو کر اس میں توازن قائم کرنے کا پوٹینشل بھی سرگرم رہتا ہے ۔ یہ کسی دیوتاتی طاقت کے زیر اثر نہیں ہوتا بلکہ تمام انسانوں کی آزادی ارادہ و عمل ، شخصی نظام اقدار اور خاص طور پر رجحانات و ترغیبات کو بہتر رسپانس دینے والے کے نظام کے تحت سوسائٹی میں ایسی کوآرڈی نیشن قائم ہوتی ہے کہ خود تنظیمی کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ اس میں ہمارا اجتماعی طور پر اور ریاستی سطح پر کرنے کا کام محض یہ ہے کہ شخصی آزادیوں ، مواقع و آزادی میں مساوات اور انصاف کی ثقافت پر کمپرومائز نہ کریں اور ایسے ماحول کے قیام کو یقینی بنائیں جو محنت و تخلیقی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کرے ۔

سوسائٹی میں خود تنظیمی کا یہ تصور ایک اعتبار سے جدید تصور ہے جسے کلاسیکل لبرل ازم نے پیش کیا ۔ اس تصور کے مطابق سوسائٹی اور پوری دنیاکو سمجھنے اور بہتر بنانے کے لیے عمل و فکر اور دلیل (reason) کی ضرورت ہے نہ کہ اتھارٹی، پاور یا جبر کی ۔ سوسائٹی کیسے کام کرتی ہے، اس کے لیے ہمیں تجزیاتی طریقہ تحقیق (Empirical investigation)، حقیقت پسندی، مکالمہ اور مطالعہ کی ضرورت ہے اور یہ کہ ہم علم پر مکمل گرفت نہیں رکھتے ۔

اس تصور کی رو سے اگر کوئی فرد یا ادارہ سو سائٹی کے نظم یعنی آرڈر کو اپنے کسی ذاتی منصوبے،ارادے اور باشعور ڈیزائن سے قائم کرنا چاہتا ہے تو اسے سماج کے ہر ہر فرد کے سیاسی ،سماجی اور معاشی پہلوؤں کا پرفیکٹ علم ہونا ضروری ہے۔مثال کے طور پر پاکستان کی آبادی بیس کروڑ ہے۔ایک ادارہ یا افراد کا ایک گروہ اگر پاکستانی سیاست،معیشت اور سماج کو پلان یا ڈیزائن کرنا چاہتا ہے تو اسے معلوم ہوکہ ان بیس کروڑ لوگوں میں کون کیا اور کتنی ضروریات و خواہشات رکھتا ہے اور ان ضروریات و خواہشات کی تکمیل کیسے ممکن ہوپائے گی ؟ ہر ہر فرد سیاسی سماجی اور معاشی زندگی میں کیا کیا رجحانات ،فیصلے اور منصوبے رکھتا ہے اور یوں ان سب کا ہر اگلا اقدام کیا ہوگا؟ فرد اپنی ثقافتی زندگی میں کن رسم و رواج ،مذہب اور کھیل و تفریح میں دلچسپی رکھتا اور ان کی پیروی کرتا ہے ؟ یہ اور اس جیسے ہزاروں عوامل ہیں جن کا مکمل علم ضروری ہے تاکہ انہیں پلان (Plan) کیا جا سکے کیونکہ سیاسی سماجی اور معاشی نظم انہی سے ہی قائم ہوتا ہے – یہ عوامل ہی ہر فرد کی سیاسی ،سماجی اور معاشی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کو منصوبہ بند اور کنٹرول کئے بغیر فرد کی سیاسی سماجی اور معاشی زندگی کو منصوبہ بند اور کنٹرول کرنا ناممکن ہے. یہی سبب ہے کہ جبر کے دن تھوڑے ہوتے ہیں اور نافذ کردہ تصورات و اعمال سے انحراف جلد ہی معمول بن جاتا ہے، لوگ اس سے عاجز و بیزار ہو جاتے ہیں اور انحراف و خفیہ سرگرمیوں سے اپنی ترغیبات و رجحانات کو پورا کرنے لگتے ہیں -

اس تصورکے مطابق ایسا کوئی ادارہ یا افراد کا گروہ عملی طور پر ممکن ہی نہیں کہ ان بیس کروڑ افراد کے بارے میں مکمل و حتمی معلومات رکھ سکے - انسانی سرگرمیاں اپنے برپا ہونے سے پہلے غیر یقینی ہوتی ہیں ، انہیں حتمی طور پر predict کرنا ناممکن ہے یوں انہیں پہلے سے منصوبہ بند اور ڈیزائن کرنا بھی ناممکن ہے۔

اس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں موجود ہے کہ ہم سوسائٹی کے آزاد ارتقاء یعنی خود انتظامی کی خوبی کی سبب یہاں تک پہنچے ہیں ۔ہمیں پتھروں کے عہد (stone age) سے زراعت تک کوئی سرکاری ادارہ یا مطلق المنان گروہ منصوبہ بندی سے یا ڈیزائن کر کے نہیں لے آیا ۔ درحقیقت ارتقاء کے اس عمل پر کسی کی اجارہ داری نہیں رہی اور جس طرح انسانی قسمت (fate) کے بارے میں ہائیک کا کہنا ہے کہ ہر آئندہ مرحلہ غیر معلوم (Unknown) اور اپنے وقت سے پہلے ناقابل مشاہدہ (Unforseen) ہے اور ہم اپنی قسمت پر مکمل اختیار نہیں رکھتے اسی طرح انسانی تہذیب بھی مسلسل غیر معلوم اور ناقابل مشاہدہ کی طرف سفر کر رہی ہے اور ہم مسلسل نئی چیزیں سیکھتے اور علم حاصل کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں -

یہ سوسائٹی کا خود تنظیمی پر منحصر ارتقاء ہی تھا جس نے ہمیں ترقی دلائی ۔ اسی طرح زرعی عہد کی پختگی (Maturity)،زرعی عہد سے تجارتی عہد کی طرف مختصر دورانیہ کا سفر اور وہاں سے صنعتی عہد اور اب جن تین صنعتی انقلابوں سے ہم گزر چکے ہیں یہ سب کسی ایک فرد، افراد کے ایک گروہ یا کسی مخصوص ادارے بشمول ریاست کے سبب نہیں بلکہ یہ سوسائٹی کی خود تنظیمی اور ارتقائی صلاحیت کے سبب ہے ۔سوسائٹی

آزاد ہوتو یہ ارتقاء زیادہ تیز رفتار اور زیادہ موثر ہوتا ہے اور اس کا پوٹینشل کھل کر سامنے آتا ہے ورنہ سوسائٹی سست روی اور مسائل و مصائب میں گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتی ہے۔

ارتقاء پر مائل سوسائٹی اور اس کا نظم (order) ایک لبرل سوسائٹی کی باطنی صفت ہے یہ باہر سے نافذ (Imposed نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے ضروری ہے کہ سوسائٹی پر نہ باہر سے نظم نافذ کیا جائے اور نہ ہی بندش - سوسائٹی کے اس باطنی نظم کو سوسائٹی کی خود تنظیمی کی صلاحیت یعنی Self and spontaneous ordering کہتے ہیں۔

سوسائٹی کے نظم (ordering)کے لیے جس نالج کی ضرورت ہوتی ہے اسے ہم پہلے نالج کے مضمون میں تفصیل سے زیر بحث لاچکے ہیں۔اگر ہم اس کا خلاصہ ایک بار پھر ملاحظہ کریں تو یہ اس طرح بنتا ہے.

ہائیک کے مطابق سوسائٹی ، وقت اور مقام کے ریفرنس میں اپنا سفر طے کرتی ہے۔ وقت اور مقام کا مکمل اور حتمی (perfect) نالج کسی کے پاس نہیں بلکہ یہ تمام افراد کے درمیان منتشر (dispersed) ہے جس کی بنیاد پر سوسائٹی کے تمام افراد اپنی اپنی سیاسی ،سماجی اور معاشی زندگی کے فیصلے کرتے اور مستقبل کے لئے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔

گو ایک فرد کے پاس مکمل اور پرفیکٹ علم نہیں مگر اپنی ذات سے متعلق ہر فرد دوسرے تمام افراد سے زیادہ بہتر علم اور فیصلے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

جب ہر فرد اپنے علم ،آزادی ارادہ و عمل اور شخصی نظام اقدار سے سیاسی ،ثقافتی اور معاشی فیصلے کرتا ہے اگر نتائج حوصلہ افزا ءہوں تو وہ اس عمل کو دہراتا ہے اور اس میں مزید ویلیو شامل کرتا ہے اور اگر نتائج منفی برآمد ہوں تو وہ اپنے سیکھنے کے نظام کی بدولت اپنی خامیوں و کوتاہیوں کو دور کر کے انہیں مزید بہتر بنانے کی دوبارہ کوشش کرتا ہے۔انسانی عمل میں یہ صلاحیت فطری طور پر موجود ہے۔

انسان چونکہ باہمی تعاون و تبادلہ (cooperation & exchange) کی بنیاد پر سوسائٹی قائم کرتے ہیں تو وہ اپنے اپنے علم کو انفارمیشن کی صورت میں سوسائٹی میں Communicate اور منتقل (Transmit) کرتے ہیں۔ اس طرح علم پورے معاشرے میں پھیل جاتا ہے – یوں ہماری زبان ،رسم و رواج ،اقدار اور تہذیب کو وجود ملتا ہے۔

معیشت میں قیمتوں کا نظام بھی اسی نظم میں کام کرتا ہے اس میں بھی خریدار و سیلر اپنے اپنے نالج کو communicate اور منتقل (Transmit) کرتے ہیں اور ان کی کوآر ڈی نیشن کے سبب ہی سے معاشی نظام مائل بہ ارتقاء رہتا ہے –

اگر سوسائٹی کا نظم (order) فطری اور آزادانہ نہ ہوتو جلد ہی سٹیٹس کو یا اجارہ دار طبقات کے قبضہ میں آجاتا ہے جس سے وہ اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں اور اس سے عام شہریوں پر اقدار، روایات، مذہب،سماجی بہبود، دفاع اور تحفظ کے نام پر جبر نافذ کردیا جاتا ہے۔یوں عام شہریوں کے سیلف انٹرسٹ کے نتائج سوشل انٹرسٹ کی صورت میں ظاہر ہونے سے قاصر رہتے ہیں جو مفید ماحول کے تعاون و تبادلہ سے جنم پاتے ہیں۔کیونکہ آمریت اس آزادانہ تعاون و تبادلہ پر گھات لگائے بیٹھی ہوتی ہے ، وہ آزاد ماحول فراہم نہیں کرتی اور نظم (order) کے نام پر سماج کو کنٹرول و منصوبہ بند کرنے کی کوشش میں سوسائٹی اور معشیت کے علم کی کو آر ڈی نیشن اور کمیونیکیشن میں مسائل پیدا کرتی ہے۔ اس سلسلے میں Hilaire Belloc معاشی جبر کے بارے میں کیا ہی خوب کہتا ہے:

"The control of the production of wealth is the control of human life itself"

کہ جب معاشی سرگرمیوں یعنی پیداواری عمل کو کنٹرول کیا جارہا ہوتا ہے تو دراصل انسانی سماج کے معیار زندگی اور ترقی و خوشحالی کے تمام امکانات کو کنٹرول کیا جارہا ہوتاہے یوں انسانی زندگی دراصل غلامی کا شکار ہوجاتی ہے۔(109)

یہ معاملہ جو معیشت کے ساتھ ہے بالکل اسی طرح کا معاملہ سیاست و ثقافت کے ساتھ بھی ہے جسے کنٹرول کرنے کی کوشش دراصل سیاسی و ثقافتی ارتقاء کو محدود کردیتی ہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبے پر جبر و تسلط حاوی ہو جاتا ہے۔

4. فری مارکیٹ کی بڑی صفت تقسیم محنت یعنی ڈویژن آف لیبر ہے –

تقسیم محنت (ڈویژن آف لیبر) سے یہ مراد ہے کہ آپ ایک مکمل کام کو ایک سے زیادہ سرگرمیوں میں یوں تقسیم کر دیتے ہیں کہ ہر ممبر یا ممبران کا ایک گروپ (جیسے ایک کمپنی میں ڈیپارٹمنٹ) اپنی اپنی مخصوص ذمہ داری کی سرگرمی سرانجام دیتا ہے –

مثال کے طور پر ایک اسکول ہے جس کا مقصد طلباء کو تعلیم و تربیت دینا ہے - ہم کیا کرتے ہیں کہ طلباء کو ان کی جماعتوں میں تقسیم کرتے ہیں ، جماعت میں پھر مضامین کی تقسیم ہوتی ہے اور ہر مضمون کے لئے اس ایک استاد کو ذمہ داری دیتے ہیں جو اس کام یعنی مضمون کو پڑھانے کا عالم و ماہر ہوتا ہے – یوں ہم ایک کام (تعلیم) کو ذیلی کاموں یا سرگرمیوں میں تقسیم کر کے ایک بڑا مقصد یعنی تعلیم کو آسانی سے اور بھرپور تخلیقی صلاحیت کے ساتھ سرانجام دے رہے ہوتے ہیں – کیا یہ ممکن ہے کہ طلباء کو جماعتوں میں ، جماعت کو مضامین میں اور ہر مضمون کو اس کے ماہر اساتذہ میں تقسیم کئے بغیر بہترین تخلیقی صلاحیت اور کارکردگی کے ساتھ پڑھائیں ؟ ایسا ہر گز ممکن نہیں –

اسی سکول کو لیتے ہیں – اس میں مختلف شعبے اپنی خاص مہارت اور علم کی بنیاد پر کام کرتے ہیں – اساتذہ کا ایک شعبہ ہے ، کلرک حضرات کا علیحدہ سے شعبہ ہے – سیکورٹی کے امور کے لئے چوکیدار ہیں – سکول کی صفائی اور خوبصورت ماحول کو قائم رکھنے کے لئے مالی ہیں – کھیلوں

کا انتظام کروانے کے لئے علیحدہ سے شعبہ ہے – لائبریری اور لیبارٹری کے منتظم علیحدہ سے ہیں – نیز ایک مکمل کام (تعلیم مہیا کرنا) مختلف ذیلی کاموں میں ، اور یہ ذیلی کام مزید ذیلی کاموں میں تقسیم ہیں– ہر کام کے لئے ہمیں مخصوص علم و مہارت (specialization) کی ضرورت ہے تب جا کر ہی وہ کام خیر و خوبی سے سرانجام پاتے ہیں – چوکیدار استاد کا کام سرانجام نہیں دے سکتا ، استاد اگر مالی کا کام کرے گا تو سکول اس علم و مہارت کے فوائد سمیٹنے سے محروم رہ جائے گا جو استاد کے پاس ہے –

صرف سکول نہیں ہر ادارہ محنت کی مہارتوں اور رجحانات کی بنیاد پر تقسیم سے قائم ہوتا ہے – کوئی کمرشل ادارہ یعنی کمپنی ہی لے لیں – اس میں پروڈکشن کا اپنا ڈیپارٹمنٹ ہے جس میں ہر کارکن اپنی اپنی مہارت اور علم و تجربہ کی بنیاد پر اپنا اپنا کام کر رہا ہوتا ہے - یہ سب سرگرمیاں مل کر ایک ڈیپارٹمنٹ کے کام مکمل کرتی ہیں – پھر مارکیٹنگ اور sale کا ڈیپارٹمنٹ ہے جس میں ہر ورکر اپنا کام کرتا ہے – اکاؤنٹنگ کا ڈیپارٹمنٹ دیکھ لیں کوئی خریداری کا حساب رکھ رہا ہے تو کوئی sale کا ، کسی کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس حساب کتاب کو دیکھے کہ کمپنی نے کتنے پیسے کس کس کو دینے ہیں اور کس کس سے لینے ہیں – کوئی ورکرز کی روزانہ یا ماہانہ بنیادوں پر اجرت کو دیکھ رہا ہے – کوئی ٹیکسز کے حساب کتاب دیکھ رہا ہوتا ہے تو کوئی نفع و نقصان کا تخمینہ لگا رہا ہوتا ہے – یہ سب کام مہارتوں اور تعلیم و تجربہ کی بنیاد پر تقسیم ہوتے ہیں – اسی طرح اس کمپنی کے اگر ڈسٹری بیوشن کے ڈیپارٹمنٹ کو دیکھا جائے تو اس میں بھی گاہک سے آرڈر وصول کرنے سے لے کر گاہک تک اس سامان کی منتقلی تک ہر ہر ٹاسک (سرگرمی) کو ورکرز کے درمیان ان کی مہارت ،تعلیم و تجربہ اور صلاحیتوں کی بنیاد پر تقسیم کیا جاتا ہے – کمپنی کے یہ اور باقی سارے ڈیپارٹمنٹ مل کر کمپنی کے اس بنیادی کام کو سرانجام دے رہے ہوتے ہیں کہ جس شے کی صارفین کو طلب ہے انہیں وہ مہیا کی جائے اور اس سے نفع کمایا جائے –

معیشت میں تقسیم محنت کے اصول کو مقبول کرنے میں ایڈم سمتھ ایک بڑا نام ہے – وہ یقینا علم معیشت کا بانی ہے – وہ لکھتاہے کہ لیبر کی تخلیقی صلاحیتوں میں بہت زیادہ بہتری تقسیم محنت کے سبب ہی آتی ہے جب وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنی مخصوص ذمہ داری سے متعلق علم و مہارت میں مسلسل اضافہ کرتے جاتے ہیں – اس سلسلے میں وہ سپیشلائزیشن کی اصطلاح بطور خاص بیان کرتا ہے اور پن فیکٹری کی مثال دیتا ہے جس میں پن کی پیداوار کا عمل شروع سے لے کر آخر تک مخصوص سرگرمیوں میں تقسیم و تحلیل ہے - وہ کہتا ہے کہ اس طرح ورکرز کی مہارتوں میں اضافہ ہوتا ہے ، وہ مشینوں پر زیادہ گرفت کے قابل ہوتے ہیں اور ان کا وقت ضائع نہیں ہوتا – سمتھ کے مطابق اگر دس ورکر ہوں اور وہ باہمی طور پر تقسیم محنت کے بجائے شروع سے لے کر آخر تک خود ہی پن بنائیں تو ایک دن میں فی کس بیس پن ہی بنا سکیں گے جن کا کل دو سو بنتا ہے – اور اگر تقسیم محنت کا اصول لاگو ہو تو وہ دس ورکرز ایک دن میں 48,000 پن بآسانی بنا سکتے ہیں (110) –

تقسیم محنت کی اس اصطلاح کو سب سے پہلے فرانسیسی دانشور Émile Durkheim نے بیان کیا تھا جس کا کہنا تھا کہ تقسیم محنت کے سبب ہی انسانوں کو دوسرے انسانوں کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے تعاون و تبادلہ کریں اور سوسائٹی کی صورت میں جڑ کر رہیں ۔ اگر تقسیم محنت کی ناگزیر ضرورت نہ ہوتی تو ہر شخص اپنی ضروریات و خواہشات میں خودکفیل ہوتا اور اسے کسی دوسرے شخص سے تبادلہ (exchange) اور تعاون (cooperation) کی ضرورت نہ ہوتی - (111)

تقسیم محنت کا اصول صرف معیشت میں کارگر نہیں بلکہ ہماری سوسائٹی بھی اسی طرح علم و مہارت اور رجحانات کی بنیاد پر تقسیم ہے کہ ہر فرد یا افراد کا ایک گروپ (تنظیم) اپنی مخصوص ذمہ داریوں کو یوں سرانجام دے رہے ہیں کہ آزادی تعاون و تبادلہ کی مدد سے سوسائٹی کے مجموعی کام مکمل ہوتے ہیں ۔ خود ریاست تقسیم محنت کے اصول کے تحت مختلف اداروں اور ذیلی اداروں میں تحلیل ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم محنت کے بغیر نہ سوسائٹی قائم ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی ادارہ -

میزز (Mises) تقسیم محنت کو تہذیبوں کے وجود کا بنیادی سبب سمجھتا ہے ۔ وہ لکھتا ہے

"تقسیم محنت کا نظام پوری معیشت کے لئے فائدہ مند نتائج پیدا کرتا ہے ۔ ایک مکمل کو سرانجام دینے کے لئے ، وہ فرد جو بہت زیادہ ماہر ہے اور باصلاحیت و قابل ہے ، اس دوسرے فرد سے اپنے علم و ہنر کے اشتراک پر مجبور ہے جو کم ماہر ، کم قابل اور کم باصلاحیت ہے ۔ یوں "کم صلاحیت، کم ماہر اور کم علم " فرد "زیادہ ماہر ، عالم اور باصلاحیت فرد " سے سیکھتا ہے ۔ اس طرح علم و مہارت کا نفوذ پوری سوسائٹی میں ہوتا ہے اور پوری سوسائٹی اس سے فائدہ اٹھاتی ہے ۔ یوں سوسائٹی کے لوگوں کے درمیان باہمی تعلقات (ایسوسی ایشنز) وجود میں آتے ہیں اور اعتماد و تعاون کی فضا پیدا ہوتی ہے " (112)

اگر اس مثال کو ہم پوری معیشت میں پھیلائیں تو یہ مزید دلچسپ صورتحال اختیار کر لیتی ہے ۔ذیل میں ایک مثال دی گئی ہے جس میں ایک پنسل کی کہانی ہے جو ایک سے زائد مختلف کمپنیوں اور سیکٹرز کے درمیان تقسیم محنت کے ایک لمبے سلسلے سے گزر کر آپ کے پاس پہنچتی ہے ۔ اسے پڑھئے اور غور کیجئے کہ درحقیقت ایک معیشت میں تقسیم محنت کا نظام کتنا فطری ہوتا ہے اور اس کی آزادی کتنی اہم ہے -

میں پنسل ہوں

زیر نظر مضمون جسے Leonard E Read نے لکھا ہے اس میں ایک پنسل اپنی اور دوسرے پروڈکٹس کی کہانی سناتی ہے اور بتاتی ہے کہ کس طرح محنت کی درجہ بدرجہ علم و مہارتوں اور وسائل کی بنیاد پر تقسیم کی بدولت ایک پنسل وجود میں آتی ہے -

....

میں عام سی لکڑی سے بنی ہوئی ایک لیڈ پنسل ہوں. لڑکے لڑکیاں اور بالغ افراد جنہیں لکھنا پڑھنا آتا ہے مجھے اچھی طرح جانتے ہیں....لکھنا میرا پیشہ ہے اور مشغلہ بھی.

آپ شاید سوچ رہے ہوں کہ مجھے اپنا شجرہ نسب بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے. اس سوال کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ میری داستان دلچسپ ہے اور پراسرار بھی. سچ تو یہ ہے کہ میری کہانی جنگل کی ہیبت، غروب آفتاب کے سحر انگیز منظر، یا بجلی کی چمک کڑک سے بھی زیادہ پراسرار ہے. لیکن المیہ یہ ہے کہ میں ان لوگوں کی نظروں میں بھی ایک حقیر یا بے وقعت شئے ہوں جو مجھے ہر دم استعمال کرتے ہیں. گویا میرا وجود بس اتفاقی ہے اور میرا کوئی پس منظر نہیں. ان کے اس حقارت آمیز رویے سے ظاہر ہے کہ وہ مجھے نہایت ہی حقیر چیز سمجھتے ہیں. یہ انسانوں کی ایک فاش غلطی ہے اور اس پر اصرار کا نتیجہ ہرگز خوشگوار نہیں نکلے گا. عقلمندوں کے لیے جی. کے. چیسٹرٹون کا یہ بیان کافی ہے.

''ہم کسی ایک عجوبے کی تلاش میں ہلکان ہو رہے ہیں اور اس حقیقت سے بے خبر کہ بیشمار عجائبات ہمارے آس پاس موجود ہیں''.

بظاہر سادہ نظر آنے کے باوجود میں ایک عجوبہ ہوں. حتیٰ کہ میرا وجود کسی معجزے سے کم نہیں. اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے میرے پاس ثبوت موجود ہیں. لہذا میں بجا طور پر آپ کے احترام کی مستحق ہوں. میرے معجزاتی وجود سے آگاہی آپ کو اس قابل بنا دے گی کہ آپ نوع انسان کی آزادی، جسے وہ اپنی مرضی کے بغیر کھو رہے ہیں، کا تحفظ کر سکیں .میرے پاس آپ کو سکھانے کے لئے بیش قیمت سبق ہے. نیز میں یہ سبق آپ کو گاڑی یا جہاز یا کپڑے دھونے کی برقی مشین سے بھی بہتر پڑھا سکتی ہوں. کیوں؟ دیکھو! میں کس قدر سادہ اور معصوم ہوں.

سادہ؟ اس قدر سادہ اور آسان نظر آنے کے باوجود اس زمین پر بسنے والا شائد ہی کوئی فرد جانتا ہو کہ میری تخلیق کیسے ہوتی ہے. کیا یہ بات عجیب نہیں؟ خیال رہے صرف امریکہ میں مجھے ہر سال ڈیڑھ ارب کی تعداد میں پیدا کیا جاتا ہے.

مجھے ہاتھ میں پکڑ کر بغور دیکھو. آپ کو کیا نظر آتا ہے ؟ کچھ زیادہ نہیں. بس لکڑی، روغن، لیبل، گریفائٹ لیڈ، کچھ دھات، اور ربڑ کی کھرچنی.

جس طرح آپ اپنے خاندان کے شجرہ نسب کی تلاش میں ماضی میں زیادہ دور نہیں جا سکتے کچھ ایسا ہی معاملہ میرا ہے .میرے لیے اپنے شجرہ نسب میں موجود ہر فرد کا تعارف ممکن نہیں. بہرحال میرے چند قریبی آباؤاجداد کا تعارف ہی میرے خاندان کی دھاک بٹھانے کے لیے کافی ہے.

میرے شجرہ نسب کا آغاز صنوبر کے درخت سے ہوتا ہے جو کہ شمالی کیلی فورنیا اور ارگن میں بکثرت پایا جاتا ہے. اب ان ہزاروں لاکھومزدروں، کاریگروں، ڈرائیوروں، کلہاڑیوں، آریوں، رسیوں، ٹرکوں، اور دیگر سازوسامان کو چشم تصور میں لائیں جو ان درختوں کو کاٹ کر شہتیر بنانے اور انہیں ریلوے سٹیشن پہنچانے کا فریضہ ادا کرتے ہیں. اسی طرح ان بیشمار ہنرمندوں کو بھی ذہن میں رکھیں جو کانوں سے خام دھاتیں نکالنے، ان سے فولاد تیار کرنے، اور پھر اس فولاد سے کلہاڑیاں، آریاں، اور موٹریں تیار کرتے ہیں. ان ہزاروں لاکھوں کسانوں کو نہ بھولیں جو پٹ سن اگاتے ہیں. پھر کارخانوں میں کاریگر اس پٹ سن کو مختلف مراحل سے گزار کر مضبوط رسیاں تیار کرتے ہیں. صنوبر کے جنگلوں میں بنائے گئے شہتیروں کے کیمپوں کو بھی نگاہ میں رکھیں جہاں مزدور سوتے اور کھانا کھاتے ہیں. اور ان ہزاروں باورچیوں اور خدمت گزاروں کو بھی دیکھیں جو ان مزدروں اور کاریگروں کے لیے کھانے، کافی، چائے، اور دوسرے مشروب تیار کرتے ہیں.

شہتیروں کو کیلی فورنیا کے شہر سان لینڈرو کے کارخانے بھیجا جاتا ہے. کیا آپ کو معلوم ہے کہ شہتیروں کو کارخانے پہنچانے کے لیے جو سپاٹ فرش والے ٹرک، ریلوے بوگیاں، اور انجن استعمال ہوتے ہیں ان کو بنانے اور مواصلات کا نظام نصب کرنے میں کتنے ماہرین کا ہاتھ ہے؟ یہ بیشمار کاریگر اور ماہرین بھی میرے اجداد ہی ہیں.

اب ہم سان لینڈرو کے کارخانے کا رخ کرتے ہیں. وہاں صنوبر کے ان شہتیروں کو ایک چوتھائی انچ سے بھی کم موٹائی کے پنسل سائز کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ دیا جاتا ہے. پھر ان ٹکڑوں کو بھٹی یا تندور میں تاپ کر ان پر ہلکا رنگ چڑھا دیا جاتا ہے. یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے عورتیں خوبصورتی کے لیے اپنے چہروں پر غازہ ملتی ہیں. یوں بھی لوگ چاہتے ہیں کہ میں دلکش نظر آؤں ناکہ پیلی زرد. پھر لکڑی کی ان پتریوں پر موم چڑھا کر انھیں دوبارہ بھٹی میں تپایا جاتا ہے. کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ہلکا رنگ یا غازہ اور بھٹیوں یا تندوروں کو بنانے اور کارخانے کے لیے حرارت، روشنی، توانائی، انجن، پیٹیاں، اور دیگر سازوسامان کا بندوبست کرنے کے لیے کتنے ماہرین اور ہنرمندوں نے اپنے خون پسینہ صرف کیا؟ نیز ان ماہرین یا ہنر مندوں کو نہ بھول جائیں جنھوں نے پیسیفک گیس اور الیکٹرک کمپنی، جو کہ کارخانے کو توانائی فراہم کرتی ہے، کے لیے کنکریٹ کا ڈیم تیار کیا. یہ سب ہنرمند بھی میرے اجداد میں شمار ہوتے ہیں.

مزید براں میرے ان قریبی اور دور کے رشتہ داروں کو بھی یاد رکھیں جو کہ مجھے بوگیوں میں لاد کر ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں پہنچاتے ہیں.

جس کارخانے میں میں جنم لیتی ہوں اس کی عمارت اور مشینری پر چار ملین ڈالر لاگت آئی . یہ کثیر سرمایہ میرے والدین نے اپنی بچت سے جمع کیا اور لگایا. لکڑی کی ہر پتری میں ایک پیچیدہ مشین کے ذریعے آٹھ نالیاں بنائی جاتی ہیں. پھر ایک اور مشین ان پتریوں کی نالیوں میں لیڈ یعنی گریفائٹ بھرتی اور انھیں گوند سے چپکا دیتی ہے. گویا پتریوں اور لیڈ کا ایک سینڈوچ سا بن جاتا ہے. آخر میں لکڑی اور لیڈ کے اس سینڈوچ سے میں اور میرے سات بھائی بہن جنم لیتے ہیں.

عجیب بات یہ ہے کہ میرے اندر جو لیڈ ہے وہ سیسہ ہرگز نہیں. یہ لیڈ اصل میں گریفائٹ ہے جو کہ سیلون (سری لنکا) کی کانوں سے نکالا جاتا ہے. اب تصور کریں ان کان کنوں کا جو گریفائٹ کانوں سے نکالتے اور کاغذ کے تھیلوں میں بھرتے ہیں، کاغذ کے تھیلے بنانے والوں کا، کاغذ کے تھیلوں کو باندھنے کے لیے ڈوریں بنانے والوں کا، ان تھیلوں کو بحری جہازوں پر لادنے والوں کا، بحری جہاز بنانے والوں کا، اور ان بحری جہازوں کو چلانے والوں کا. یہ سب افراد حتیٰ کہ لائٹ ہاؤس پر کام کرنے والے بھی میرے اجداد ہی ہیں یعنی یہ سب کسی نہ کسی شکل میں میری پیدائش میں اپنے حصہ ڈالتے ہیں.

گریفائٹ کو مسسپی (Mississippi) کی چکنی مٹی میں ملا کر ایک آمیزہ تیار کیا جاتا ہے اور پھر اس آمیزے کو امونیم ہائیڈرواکسائیڈ کے محلول کے ذریعے پاک و صاف کیا جاتا ہے. پھر اس آمیزے میں نمی پیدا کرنے کے لیے اس میں حیوانی چربی اور گندھک کے تیزاب کا آمیزہ ملا دیتے ہیں. اس آمیزے کو بہت سی مشینوں سے گزارا جاتا ہے. بالآخر یہ آمیزہ مشین سے یوں برآمد ہوتا ہے جیسے گرنڈر یا چکی سے قیمہ بھری آنت .اسے مخصوص سائز میں کاٹ کر خشک کرتے اور 1,850 ڈگری فارن ہائیٹ میں پکاتے ہیں. آخر میں اس آمیزے یا لیڈ کو میکسیکو سے درآمد کردہ کنڈلیو پودے کے موم (candelilla wax)، مٹی کے تیل، اور ہائیڈ روجن سے مرکب قدرتی تیل یا چکنائی سے غسل دے کر اسے مضبوط کرنے کے ساتھ اس میں نرمی یا چکنا پن پیدا کرتے ہیں.

ادھر میری صنوبر کی لکڑی پر روغن کی چھ تہیں چڑھائی جاتی ہیں. کیا آپ روغن (lacquer) کے تمام اجزا سے وقف ہیں؟ کون جانتا ہے کہ ارنڈ (castor) کی کاشت کرنے والے اور ارنڈ کے تیل کی ریفائنری والے بھی میری پیدائش کے عمل میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں؟ اس روغن کو خوبصورت زرد رنگ دینے کے لیے جن کاریگروں کی مہارت کام آئی آپ شائد ان کی تعداد کا شمار نہ کر سکیں.

اب ایک نظر میرے لیبل پر بھی ڈالیں. یہ ایک فلم ہے جو کہ کاربن بلیک یا کاجل کو گوند میں ملا کر بنائی جاتی ہے .کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ گوند کیسے بنتا ہے؟ نیز یہ کاربن بلیک کیا شئے ہے؟

میرا دھاتی چھلا یا ٹوپی پیتل سے بنایا جاتا ہے. اب ان کان کنوں کو چشم تصور میں لائیں جو جست اور تانبے کو کانوں سے نکالتے ہیں. ان ماہرین کو بھی ذہن میں رکھیں جو ان قدرتی عناصر کو ملا کر پیتل کی چمکدار چادریں تیار کرتے ہیں. میری ٹوپی پر سیاہ دائرے سیاہ نکل سے بنے ہیں. یہ سیاہ نکل کیا ہوتا ہے اور اسے پیتل کی ٹوپی پر کیسے چسپاں کیا جاتا ہے؟ نیز میری ٹوپی کے وسط سے سیاہ نکل کے دائرے کیوں غائب ہیں؟ ان سوالات کا جواب دینے کے لیے مجھے کئی صفحے سیاہ کرنے پڑیں گے.

اب آتے ہیں میرے جسم کے سب سے نمایاں حصے یعنی تاج کی طرف جسے آدمی اپنی غلطیوں کو مٹانے کے لیے استعمال کرتے ہیں. معلوم نہیں کیوں وہ اسے پلگ کہتے ہیں جو کہ میرے نزدیک ایک بھونڈا یا ناشائستہ نام ہے. میرے تاج کا جو جزو غلطیاں مٹانے کا فریضہ

ادا کرتا ہے اسے فیکٹس (factice) کہتے ہیں. یہ ربڑ میں تورلیے یا تلی کا تیل، جو کہ انڈونیشیا سے آتا ہے، اور سلفر کلورائڈ ملا کر تیار کیا جاتا ہے. نیز اسے سخت کرنے اور اس میں سرعت پیدا کرنے کے لیے اس میں کچھ اور اجزا مثلا" ہلکی مسام دار آتِش فِشانی چٹان اور کیڈمیم سلفائڈ بھی شامل کئے جاتے ہیں. اول الذکر اٹلی سے آتی ہے اور موخر الذکر تاج یا پلگ کو رنگ دیتی ہے.

کوئی نہیں جانتا

کیا کوئی میرے اس دعوے کو چیلنج کر سکتا ہے کہ دنیا میں ایک بھی فرد ایسا نہیں جسے علم ہو کہ میری پیدائش یا تخلیق کیسے ہوتی ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ میری تخلیق میں لاکھوں افراد کا ہاتھ ہے. لیکن ان لاکھوں افراد میں صرف گنتی کے چند افراد ہی ایک دوسرے کو جانتے ہیں .جب میں اپنا سلسلہ نسب برازیل کے دور افتادہ علاقوں میں کافی بیری چننے والوں اور کئی دوسرے ملکوں میں غذائی اجناس اگانے والوں سے جوڑتی ہوں تو شائد آپ اسے دور کی کوڑی لانا سمجھیں. بہرحال مجھے اپنے دعوے کی صداقت پر یقین ہے. یہ ایک حقیقت ہے کہ میری تخلیق میں شریک لاکھوں افراد جن میں پنسل کمپنی کا سربراہ بھی شامل ہے میری تخلیق کے عمل کے ایک بہت معمولی حصے کا علم رکھتے ہیں. نیز میرے بارے میں سری لنکا میں گریفائٹ کے کان کنوں کا علم امریکی ریاست ارگون کے درخت کاٹنے والوں کے علم سے مختلف ہے. کچھ ایسا ہی معاملہ فیکٹری میں کام کرنے والے کیمیا دانوں اور تیل کے کنوؤں پر کام کرنے والے محنت کشوں کا ہے جو کہ تیل سے موم حاصل کرتے ہیں.

ایک حیران کن بات یہ ہے کہ تیل کے کنوؤں پر کام کرنے والے مزدور، فیکٹری کے کیمیا دان، کانوں سے گریفائٹ نکالنے والے کان کن، بحری جہازوں، ٹرینوں، اور ٹرکوں کو بنانے والے انجنئیر اور انہیں چلانے والے آپریٹر، جو مشینیں میرے سر پر دھات کی ٹوپی چڑھاتی ہیں ان پر کام کرنے والے کاریگر، اور پنسل کمپنی کے سربراہ اپنے اپنے حصے کا کام اس لئے نہیں کرتے کہ انھیں میری ضرورت یا طلب ہے. اگر ہو بھی تو ان کی حاجت پہلی جماعت کے طالب علم کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے. میری تخلیق میں حصہ ڈالنے والے لاتعداد افراد میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی میری شکل نہیں دیکھی اور انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ مجھے استعمال کیسے کیا جاتا ہے. ان کا جذبہ محرک میں نہیں، کچھ اور ہے. یہ لاکھوں افراد اپنا اپنا علم اور مہارت میری تخلیق میں اس لئے صرف کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی ضروریات زندگی حاصل کر سکیں. انھیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ میرا وجود ان کی ضروریات زندگی کا حصہ ہے یا نہیں.

ایک اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ میری پیدائش بیشمار عوامل و مراحل سے گزرنے کا نتیجہ ہے لیکن کسی مرحلے میں بھی آپ کو کسی منصوبہ ساز یا ہدایت کار کا نام و نشان نہیں ملے گا. ایسا لگتا ہے کہ کوئی غیر مرئی یا خفیہ ہاتھ میری تخلیق کا سبب بن رہا ہے. یہ وہ پہیلی ہے جس کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکی ہوں.

یہ حکایت مشہور ہے کہ صرف خدا ہی ایک درخت بنا سکتا ہے. لوگ اس حکایت پر فورا" ایمان لے آتے ہیں. کیوں؟ ایک درخت بنانا تو دور کی بات ہے شائد ہی کوئی انسان کسی درخت کی ماہیت کے بارے میں کچھ جانتا ہو یا اسے بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو. اس بارے

میں انسان کا علم بس سطحی ہے۔ مثلاً" وہ زیادہ سے زیادہ یہ جانتا ہے کہ سالماتی مادوں کی ایک مخصوص ترتیب و تشکیل کے نتیجے میں درخت وجود میں آتا ہے۔ لیکن کیا کسی انسان کے پاس ایسا دماغ ہے جو ایک درخت کی طویل زندگی کے دوران سالماتی مادوں میں مسلسل وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کی رہنمائی نہ سہی تو کم از کم انھیں ریکارڈ ہی کر سکے؟ ظاہر ہے اس کار عظیم کے لئے جو دماغ چاہیئے وہ کسی انسان کے پاس نہیں۔

ایک درخت کی مانند میرا یعنی پنسل کا وجود بھی پے در پے معجزات کا مرہون منت ہے۔ درخت، جست، تانبا، گریفائٹ، اور بہت سی دوسری اشیا، جن کا اپنا وجود کسی معجزے سے کم نہیں، میرے وجود کا حصہ ہیں۔ ان قدرتی معجزات میں ایک اور معجزے کا اضافہ کر لیں۔ وہ ہے انسانوں کی طلب یا مانگ کو پورا کرنے کے لئے لاکھوں انسانوں کی انفرادی تخلیقی توانائیوں، علوم و فنون، اور مہارتوں کا ایک منظم ترتیب سے بے ساختہ استعمال اور وہ بھی کسی منصوبہ ساز یا ہدایت کار کی رہنمائی کے بغیر۔ جیسے انسان تسلیم کرتا ہے کہ درخت صرف خدا بناتا ہے، ویسے ہی اسے تسلیم کرنا ہو گا کہ مجھے یعنی پنسل کو بھی خدا (آزاد فطری ہدایت) ہی بناتا ہے۔ جس طرح ایک انسان سالماتی مادوں کو ایک مخصوص ترتیب و تشکیل دے کر درخت پیدا نہیں کر سکتا، اسی طرح لاکھوں مختلف علوم و فنون کی ایک سلسلہ وار ترتیب سے رہنمائی کر کے مجھے وجود میں لانا بھی اس کے لئے ممکن نہیں۔

اوپر میں نے جو کچھ لکھا ہے اگر آپ اسے سمجھ گئے ہیں تو میرا درج ذیل بیان بھی آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔ "میرے معجزاتی وجود کی حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد آپ نوع انسان کی آزادی، جسے کوئی انسان اپنی مرضی یا خوشی سے نہیں کھوتا، کے تحفظ کے لئے کمر بستہ ہو جائیں گے۔" اگر آپ کو یہ ادراک حاصل ہو گیا ہے کہ انسانی طلب یا مانگ کے نتیجے میں انسانوں کے حاصل کردہ علوم و فنون خود بخود تخلیقی اورپیداوری سرگرمیوں میں لگ جاتے ہیں اور وہ حکومت یا کسی جابر مرکزی رہنما کے بغیر بھی ایسا کر سکتے ہیں، تو آپ نہ صرف آزادی کی اہمیت و افادیت کو سمجھ گئے بلکہ آزاد انسانوں کی صلاحیتوں پر آپ کا ایمان بھی پختہ ہو گیا۔ انسان کی صلاحیتوں پر یقین و ایمان کے بغیر آزادی ممکن نہیں۔

اگر صرف میں یعنی پنسل تنہا ہی شہادت دوں کہ اگر خواتین و حضرات اپنی تعمیری اور تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کرنے میں آزاد ہوں تو وہ کیا کیا کارنامے سر انجام نہیں دے سکتے تو شائد کمزور ایمان والے میری شہادت کو کافی نہ سمجھیں۔ خوش قسمتی سے میں تنہا نہیں ہوں۔ میری شہادت کی تائید کے لئے بے شمار ہاتھ کھڑے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آٹو موبائل، حساب کتاب کی مشین، فصل کاٹنے یا آٹا پیسنے کی مشین، اور دوسری بے شمار مشینوں کو بنانے کے مقابلے میں ڈاک کی ترسیل بہت آسان کام ہے۔ نیز جب انسان کوئی بھی کام کرنے میں آزاد ہوں تو وہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں انسانی آواز اور تصویر حتیٰ کہ کسی واقعے کی لائیو کوریج دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچا دیتے ہیں، ڈیڑھ سو مسافروں کو چار گھنٹے سے بھی کم وقت میں سیٹل سے بالٹی مور لے جاتے ہیں، ٹیکساس کے میدانوں سے گیس نکال کر ناقابل یقین حد تک کم نرخوں میں نیویارک کی بھٹیوں کو فراہم کر دیتے ہیں، اور چار پونڈ تیل خلیج فارس سے امریکہ

کے مشرقی ساحل تک لانے کی جو قیمت وہ وصول کرتے ہیں وہ اس رقم سے بہت کم ہے جو امریکی حکومت ایک اونس وزن کے خط کو بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچانے کے لئے چارج کرتی ہے.

میری کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں اور توانائیوں کے آگے غیر ضروری ضابطوں اور بندشوں کے بند باندھنا درست نہیں. اس سبق کی روشنی میں انسانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرے میں نظم و ضبط اور اتفاق و اتحاد کی فضا پیدا کریں اور انسان کی تخلیقی صلاحیتوں، توانائیوں، اور علوم و فنون کے آزادانہ بہاؤ کے راستے میں جو بھی رکاوٹیں ہوں انھیں قانونی ذرائع سے دور کریں. نیز یقین رکھیں کہ آزاد مرد و زن فطرت کے اس غیر مرئی یا خفیہ ہاتھ کے اشاروں کو سمجھنے اور ان پر چلنے کی اہلیت رکھتے ہیں جو کہ ہمارے آس پاس بیشمار معجزات اور عجائبات کے وجود میں آنے کا سبب ہے. میں بھی اس غیر مرئی ہاتھ کا ایک معجزہ ہوں. گو بہت سادہ اور معصوم ہوں لیکن میرا وجود اس بات کی دلیل اور شہادت کے لئے کافی ہے کہ آزاد انسانوں کی صلاحیتوں پر عملی ایمان اور بھروسے سے ویسے ہی نتائج نکلتے ہیں جن کے چند قدرتی نمونے سورج، بارش، صنوبر کے درخت، اور خوبصورت زمین کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں (113).
(بشکریہ فاؤنڈیشن آف اکنامک ایجوکیشن)

معیشت میں خود تنظیمی اور ارتقاء کی دلچسپ مثال : صنعتی انقلاب

اس سلسلے میں ایک دلچسپ ترین مثال صنعتی انقلاب کی ہے جو معیشت میں خود تنظیمی (spontaneous ordering) کی بدولت وجود میں آیا۔ یہ غیر منصوبہ بند (unplanned) تھا اسے آزاد انفرادی سرگرمیوں نے جنم دیا تھا جنہیں مارکیٹ باہم کوآرڈی نیٹ کر رہی تھی۔ اپنے عہد کی سٹیٹس کو قوتوں نے اس پر خوب واویلہ مچایا، نئے صنعتی یونٹ جلا دیے گئے اور سڑکوں پر طوفان بدتمیزی برپا کیاگیا۔ مگر یہ برپا ہو کر رہا کیونکہ اس وقت کے سیاسی اقتدار نے اس کی آزاد نمو میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی بلکہ اس کی ترقی میں ایک سہولت کنندہ کا کردار ادا کیا۔ تحریک احیاء العلوم کے زیر اثر دانشوروں اور فلسفیوں نے اسے خوب سے خوب خوش آمدید کہا۔ آج ہم چوتھے صنعتی انقلاب کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ صنعتی انقلاب سے متعلق وہ تمام خدشے غلط ثابت ہوئے ہیں جن کی آڑ میں صنعتی انقلاب کی مخالفت کی گئی تھی اور مارکیٹ میں حکومتی مداخلت کے عذر تراشے گئے۔

صنعتی انقلاب نے انسانی تہذیب و تمدن کو خوشحالی اور مسرتوں سے نوازا ہے۔ ذرا تصور کریں، جب صنعتی انقلاب برپا ہوا تھا اس وقت اگر مارکیٹ دشمن حکومتیں موجود ہوتیں اور اس انقلاب کو معاشی عدم مساوات کا سبب سمجھ کر یا عوامی دباؤ میں آکر نئی صنعتوں کی نشوونما کو روک دیا

جاتا تو کیا آج وہ معیار زندگی جس سے ہم سب لطف اندوز ہورہے ہیں ، ممکن ہوتا؟ وہی ترقی گریز قوتیں آج بھی چوتھے صنعتی انقلاب سے ہمیں ڈرا رہی ہیں کہ آگے نہیں بڑھنا چاہیے کیونکہ ان کے خیال میں اس سے سماج کا نظام بگڑ جائے گا اور معاشی عدم مساوات پیدا ہو گی۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومت یا کوئی اور سیاسی اتھارٹی سیاست سماج اور معیشت میں آمرانہ بنیادوں پر نظم قائم کرہی نہیں سکتی اگر ایسا کرنے کی کوشش کی گئی تو غربت و افلاس میں بے تحاشا اضافہ ہو گا ۔کیونکہ امکانات کی دنیا آزادی پسند ہے — بہتر مستقبل کے امکانات کو قید یا کنٹرول یا منصوبہ بند نہیں کیا جاسکتا - یہ امکانات شہریوں میں یعنی پاکستان کے کیس میں بیس کروڑ عوام میں آزادانہ نشودنما پاتے اور مفید نتائج دیتے ہیں۔

ویتنام نے معاشی ترقی کیسے کی ؟

ویتنام کا سرکاری نام سوشلسٹ ریپبلک آف ویتنام ہے - کل آبادی سو ملین کے لگ بھگ ہے - 1945 میں ہوچی منہ کی انقلابی قیادت کے نتیجے میں فرانس سے آزادی حاصل کی - آزادی کے بعد پورا ملک متحد نہ رہ سکا - 1954 میں ویتنام کا شمالی علاقہ ڈیموکریٹک ریپبلک آف ویتنام کی صورت میں مارکسسٹ ریاستی بندوبست کے زیرانتظام قائم ہوا جبکہ جنوب میں شہنشاہ باؤ ڈاؤ (Bao Dai) کی سلطنت قائم ہوئی - جب شمال اور جنوب کی ریاستیں قائم ہوئیں تو لوگوں کو تین سو دن دیئے گئے کہ وہ ملک کے جس حصے میں بھی رہنا چاہیں وہاں سکونت اختیار کر سکتے ہیں یوں ایک ملین سے زائد افراد نے سوشلسٹ نظام ریاست سے بادشاہت کی طرف ہجرت کی - دونوں ریاستیں اپنی عوام کے لئے بدقسمت ہی ثابت ہوئیں شمال میں ریاستی جبر اپنی انتہا پر تھا جبکہ جنوب میں سیاسی عدم استحکام نے لوگوں سے ان کا یہ حق چھین لیا کہ وہ اپنی زندگی کے مقاصد کی امن و استحکام سے جستجو کر سکیں -سرد جنگ زوروں پر تھی یوں سوشلسٹ انتظام کی حامل شمالی ریاست کو چین وسوویت یونین کا تعاون حاصل تھا جبکہ جنوب کی ریاست کو امریکہ کا - 1968 میں شمالی حصے نے جنوبی حصے پر حملہ کر دیا امریکہ نے اپنے اتحادی کا ساتھ دیا مگر امریکہ نے اپنی مقامی سیاست کے دباؤ کے تحت 29 مارچ 1973 کو اپنی فوج ویتنام سے نکال لی - 1975 میں ویتنام کے دونوں حصے سوشلسٹ نظام کے ماتحت متحد ہوئے اور وہاں کھیتوں اور فیکٹریز سے متعلق اشتراکیت کی پالیسی کو رائج کیا گیا جس کے نتیجہ میں ملک شدید قسم کے معاشی بحران میں مبتلا ہو گیا اور مہنگائی سہ ہندسی درجے میں چلی گئی - 1986 میں آزاد مارکیٹ اصلاحات متعارف کروائی گئیں تاکہ غربت بے روزگاری اور معاشی بحران کا مقابلہ کیا جا سکے - ان اصلاحات کو دوئی جا (Doi Moi) کی اصلاحات کہا جاتا ہے جس کے تحت کچھ انڈسٹریز پر حکومتی کنٹرول برقرار رکھتے ہوئے باقی تمام سیکٹرز کو پرائیویٹائز کر دیا گیا ، مارکیٹ کو زیادہ سے زیادہ آزاد کیا گیا اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی سرمایہ کاری کے لئے حوصلہ افزائی کی گئی - ان اصلاحات کے نتیجے میں تیز رفتار معاشی شرح نمو خاص طور پر زراعت ، صنعتی پیداوار تعمیرات ایکسپورٹ اور بیرونی سرمایہ کاری میں حاصل کی گئی- اس تیز رفتار شرح نمو نے حکومت کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ مزید اصلاحات متعارف کروائے -

اس وقت ویتنام کا شمار ایشیا کی تیزی سے ابھرتی ہوئی معیشتوں میں ہوتا ہے ، گولڈمین سیک کے مطابق اگر ویتنام اسی شرح نمو سے آگے بڑھتا رہا تو 2025میں دنیا کی اکیسویں بڑی معیشت بن جائے گا - 1986 کی مارکیٹ اصلاحات سے پہلے ویتنام میں غربت کی شرح ساٹھ سے زائد تھی ، دو ہزار دس میں یہ شرح 20.7 تھی جو تیزی سے کم ہو کر دو ہزار چودہ میں 13.5 فیصد ریکارڈ کی گئی جس میں مزید تیزی سے کمی آ رہی ہے - انیس سو نوے سے اب تک اوسط چھ سے ویتنام نے شرح نمو برقرار رکھی ہوئی ہے جو کہ چین کے بعد دوسری بہترین کارکردگی ہے - اس وقت ویتنام میں بے روزگاری کی شرح محض 4.46 ہے - انیس سو چھیاسی کے بعد کا دور ویتنام کے لئے صنعتی انقلاب کا دور ہے جب مارکیٹ کی قوتیں آزاد ہوئیں اور انہوں نے وسائل کی تخلیقی تفویض میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کیا - انیس سو چھیاسی سے پہلے ملک کی معیشت زراعت پر انحصار کرتی تھی مگر اب صنعتی پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے - اس وقت مینوفیکچرنگ ، آئی ٹی ،اور ہائی ٹیکنالوجی کی انڈسٹریز تیزرفتاری سے پھل پھول رہی ہیں

درج ذیل میں ان تمام اسباب کا ذکر ہے جن کی بدولت ویتنام نے ترقی و خوشحالی کا موجودہ مقام حاصل کیا

آزاد مارکیٹ اصلاحات:ان اصلاحات کے تحت ویتنام نے اپنی مارکیٹ کو ریاستی جبر سے آزاد کیا اور شہریوں کا یہ بنیادی حق تسلیم کیا گیا کہ وہ اپنی معاشی زندگی کے مقاصد کی جستجو میں آزاد ہیں - یہ نجی سیکٹر کی ہی کامیابی ہے جس کے بدولت آج ویتنام مڈل انکم سٹیٹس حاصل کر چکا ہے- بین الاقوامی تجارت اور انویسٹمنٹ کے فروغ کے لئے حکومت نے ہر وہ ممکن اقدامات کئے جن سے بیرونی سرمایہ کاروں کا اعتماد بحال ہو - اس وقت ویتنام کی تجارت کل پیداوار کے ایک سوپچاس فیصد سے بھی زائد ہے

سیاسی استحکام اور بہترین گورننس :ویتنام کے کل 63 صوبے ہیں اور ان صوبوں کے درمیان مقابلہ کی ثقافت کو فروغ دیا گیا ہے تاکہ وہ بہترین گورننس اور معاشی سہولیات سے زیادہ سے زیادہ بیرونی سرمایہ کاری کے لئے پرکشش بن سکیں

نوجوان آبادی : ویتنام کی اکثریت آبادی تیس سال کی عمر کے آس پاس ہے - جب مارکیٹ پھل پھول رہی ہو تو اس کا مطلب ہے کہ نوجوان اذہان کے لئے شاندار مواقع موجود ہیں کہ وہ اپنے معاشی مقاصد کی تخلیقی جستجو سے اپنا مقام کما سکیں - یوں زیادہ آبادی بوجھ نہیں طاقت بن جاتی ہے

تعلیم : ویتنام تعلیم پر اپنی جی ڈی پی کا تقریبا 6.3 فیصد خرچ کر رہا ہے

بہترین جغرافیہ : ویتنام چین کا پڑوسی ہے اور چینی مزدوروں کی نسبت ویتنامی مزدور اجرت کے معاملہ میں فی الحال سستے ہیں (جبکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی اجرت میں اضافہ ہو رہا ہے) یوں چین سے سرمایہ کاروں کی ایک بڑی تعداد ویتنام کی طرف ہجرت کر رہی ہے

ٹرانس پیسفک پارٹرشپ : یہ بارہ ممالک کا آزاد تجارتی معاہدہ ہے جس میں امریکہ و جاپان بھی شامل ہیں - نوٹ کیجئے کہ کل کے بدترین دشمن آج کے بہترین دوست ہیں جنھوں نے ایک دوسرے کی معاشی خوشحالی میں سہولت کنندہ کا کردار ادا کرنے کا عہد کر رکھا ہے - ایک ہم ہیں کہ ہمارا ایک طبقہ ہر وقت استعمار کی دہائی دیتا پھرتا ہے کہ دنیا نہیں چاہتی کہ ہم ترقی کریں جبکہ دوسری طرف ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کی مہم جو نفسیات اور اس کا ریاسی پالیسیز پر اثرورسوخ ہمیں اپنے پڑوس کی بہترین مارکیٹس سے قربت بڑھانے کا کوئی بھی موقع دینے پر تیار نہیں (114)

اس تحریر کا مقصد محض ویتنامی معیشت کے بارے میں بنیادی معلومات دینا نہیں بلکہ یہ بیان کرنا ہے کہ معاشی ترقی کے امکانات ہر ملک کو میسر ہیں - ویتنام کل تک غریب تھا تو اس کی وجہ اس کے داخلی مسائل اور مارکیٹ کی معیشت سے تعصب اور دشمنی تھی - نتیجہ یہ نکلا کہ بھوک غربت اور کسمپرسی نے مجبور کیا کہ معاشی پالیسیز بدلی جائیں اور گھر کے انتظام کو بہتر بنایا جائے - ویتنام کی معاشی ترقی میں دراصل بیرونی استعمار کے بجائے گھر کا استعمار رکاوٹ تھا - ہمارے ملک کی سٹیٹس کو نے بھی اپنی ناکامیوں کا سارا ملبہ باہر کے مفروضہ دشمنوں پر ڈال رکھا ہے کہ دراصل وہ ہمیں ترقی نہیں کرنے دے رہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری سیاست ثقافت اور معیشت کے جملہ امکانات ہمارے اندرونی دشمنوں یعنی اجارہ دار قوتوں نے اپنے قبضہ میں کر رکھے ہیں- وہ تمام مواقع جو ویتنام کو حاصل تھے وہ آج ہمیں بھی حاصل ہیں ہم بھی اپنی مارکیٹ کو تجارت اور انویسٹمنٹ کے لئے آزاد کر سکتے ہیں اور اس میں حائل تمام غیر منصفانہ اور غیر مساوی پالیسیز کی رکاوٹوں کو ہٹا سکتے ہیں - ہماری آبادی کا نصف سے زائد تیس سے کم عمر کے شہریوں پر مشتمل ہے، تعلیم پر ہم بھی جی ڈی پی کے 7 فیصد سے زائد خرچ کر سکتے ہیں . چین ہمارے پڑوس میں ہے اور اکنامک کوریڈور کی شکل میں ہم بھی چینی سرمایہ کاری سے معاشی طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں - جغرافیائی طور پر قدرت نے ہمیں ویتنام سے بڑھ کر نوازا ہے - ہمارے لئے سب سے بڑے چیلنجز سیاسی عدم استحکام اور سٹیٹس کو کا سیاست معیشت اور سماج پر قبضہ ہے- ان چیلنجز کے بہترین رسپانسز کے لئے لازم ہے کہ مہم جوئیانہ اقدامات سے مکمل طور پر پرہیز کیا جائے ،آئین کی بالادستی قائم کی جائے اور شخصی آزادیوں مساوات اور انصاف پر مبنی سیاسی و معاشی ثقافت کو پروان چڑھایا جائے - یقینا یہ کام مشکل ہیں مگر معاشی ترقی کے راستے کی بنیادی ضروریات یہی ہیں اس کے علاوہ کوئی بہتر متبادل اس وقت ہمیں حاصل نہیں

ہمارا فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے

آئی ایم ایف کی پیش گوئی ہے کہ مالی سال 2016-17ء میں بھارتی معیشت کی شرح نمو 7.4رہے گی- یوں بھارت دنیا کی تیزی سے ابھرتی ہوئی معیشت بن جائے گا - بھارت نے ہمارے ساتھ ہی برطانوی راج سے آزادی حاصل کی تھی- آزادی کے بعد بھارتی معیشت

کمیونزم سے متاثر رہی جس کی بڑی وجہ مہاتما گاندھی کا بھارتی دیہات کے لئے ایک خودکفیل کمیون سسٹم کا تصور تھا۔1990ء تک بھارتی معیشت پر ریاستی اثرو رسوخ کا غلبہ رہا، کھلی منڈی کی بین الاقوامی تجارت ناپسندیدہ رہی اور آزاد مارکیٹ کی معیشت کو گناہ سمجھا جاتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ قیام بھارت کے بعد تاجروں کی ایک میٹنگ تھی جس کی صدارت جواہر لعل نہرو کر رہے تھے۔ ایک تاجر نے شرح منافع کی بات کی تو جواہر لعل نہرو کو انتہائی ناگوار گزرا اور وہ گویا ہوئے۔ "مجھ سے نفع کی بات نہ کرو، یہ ایک گندا لفظ ہے"۔

جب تک بھارت کی معیشت روایتی اور ریاستی جبر کے ماتحت رہی، غربت کی شرح میں بھی اضافہ رہا اور شرح نمو بھی کم رہی۔ بھارت کی سست ترین شرح نمو کو پوری دنیا میں ہندو گروتھ ریٹ کہا جاتا تھا۔ 1991ء میں پوری بھارتی معیشت بحران کی لپیٹ میں تھی اور حکومت دیوالیہ ہونے کے قریب تھی۔ تب بھارت نے بین الاقوامی فنانشل مارکیٹ کی طرف رجوع کیا اور اپنی مارکیٹ کو اوپن کیا۔ پالیسی میں اس تبدیلی کا کریڈٹ من موہن سنگھ کو جاتا ہے جو اس وقت وزیر خزانہ تھے۔

انیس سو اکانوے بھارت کے لئے انویسٹمنٹ اور تجارت کے اعتبار سے نئے عہد کا آغاز ہے۔ 1991ء میں غربت کی شرح 45 فیصد تھی جو دو ہزار بارہ میں 22 فیصد اور دو ہزارپندرہ میں MMRP شماریاتی طریقہ کار کے مطابق 12.4 فیصد ریکارڈ کی گئی۔ غربت میں کمی کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے اور بھارت پرامید ہے کہ وہ جلد ہی کم سے کم غربت کی شرح پر ہو گا۔ 1991ء کے بعد کا عہد بھارت کے لئے صنعتی انقلاب کا عہد ہے جس نے اس کی معیشت سیاست اور ثقافت کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ بھارت کے لئے ناگزیر تھا ورنہ بڑھتی ہوئی آبادی بھارتی سماج کو مزید پسماندگی کی طرف دھکیل دیتی۔ اس سے مزید محرومیوں کو جنم ملتا اور ملکی اتحاد قائم نہ رہ پاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ 1991ء کے بعد بھارتی وفاق پہلے سے زیادہ مضبوط ہوا ہے اور بھارت کے اثرورسوخ میں اضافہ ہوا ہے۔

پاکستان کی طرف آیئے۔ ہماری اس وقت آبادی 195 ملین ہے (پاکستان ڈیموگرافک اینڈ ہیلتھ سروے)۔ بچوں کی شرح پیدائش حیران کن طور پر 3.8 فیصد ہے جو بہت ہی زیادہ ہے۔ اگر آبادی میں اسی شرح پیدائش سے اضافہ ہوتا رہا تو پاکستان آبادی کے اعتبار سے 2050ء تک دوسرا چین بن جائے گا۔ اس وقت بھی فکر کی جو بات ہے وہ یہ کہ ہماری کل آبادی کا نصف سے بھی زائدحصہ تیس سال سے کم عمر کے بچوں اور نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں نوجوان نسل کی معیشت یعنی روزگار کا ہم کیسے انتظام کر پائیں گے؟ یہ وہ سوال ہے جسے ہماری قومی پالیسی کی ترجیحات میں ہونا چاہیئے۔

اس سلسلے میں ایک بنیادی بات سمجھنا ضروری ہے وہ یہ کہ روزگار کے مواقع صرف اور صرف مارکیٹ میں پیدا ہوتے ہیں۔ پوری دنیا میں معیشت کا ایک بھی کامیاب ماڈل ایسا نہیں جہاں حکومت نے شہریوں کو روزگار مہیا کیا ہو۔ تمام ترقی یافتہ ممالک کی معیشت اور روزگار پرائیویٹ سیکٹر یعنی مارکیٹ پر انحصار کرتا ہے۔ یہی کہانی ہمارے پڑوسی ممالک چین اور بھارت کی ہے۔ جب مارکیٹ کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا ہے تو نہ صرف کل معیشت کے پھیلنے پھولنے سے حکومت کو ٹیکسز زیادہ اکٹھے ہوتے ہیں جس سے وہ عوامی بہبود کے کام کر

سکتی ہے تو دوسری طرف روزگار اور مزید کاروبار کے اسباب پیدا ہوتے ہیں ۔ پاکستان کی اس بہت زیادہ پھیلتی ہوئی آبادی کے روزگار کے لئے ہمیں مارکیٹ سرگرمیوں میں سات فیصد سالانہ سے زائد شرح نمو کی اشد ضرورت ہے جس کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک میں صنعتی انقلاب برپا کریں ۔ گزشتہ سال ہماری قومی پیداوار میں 4.7 فیصد کا اضافہ ہوا جو کہ دو ہزار آٹھ سے دو ہزار پندرہ تک کی بڑی شرح ہے مگر یہ ناکافی ہے ۔ بھارت اس سلسلے میں ہمارے لئے ایک بہترین کیس اسٹڈی ثابت ہو سکتا ہے جس کے زمینی حقائق ہم سے تاریخی اور ثقافتی اعتبار سے ملتے جلتے ہیں۔

ہمیں اپنی معیشت میں صنعتوں کے حجم میں اضافہ کرنا ہو گا۔ صنعت کاری کا ملکی معیشت میں سب سے اہم کردار ہے۔ غور کیجئے کہ پاکستان میں زرعی شعبہ سب سے زیادہ افرادی قوت (42.3 فیصد) کھینچے ہوئے ہے مگر ملک کی کل پیداوار میں اس کا حصہ سب سے کم یعنی 19.82 فیصد ہے ۔ صنعتوں میں سب سے کم افرادی قوت خرچ ہو رہی ہے مگر ملک کی کل پیداوار کو سب سے زیادہ ویلیو اسی شعبہ سے مل رہی ہے اور باقاعدہ ٹیکس کی بنیاد پر سب سے زیادہ ریونیو حکومت اسی شعبے سے حاصل کرتی ہے جب کہ اس کے مقابلے میں زرعی شعبہ نہ صرف ٹیکسز کی مد میں کوئی ریونیو نہیں دے رہا بلکہ الٹا سبسڈی پر پل رہا ہے ۔ جدید علم و ثقافت کی طلب صنعتی شعبے کو ہے جبکہ زرعی شعبہ ہنوز روایتی اور عہد حاضر کے تناظر میں غیر متمدن ہے۔

پاکستان میں صنعتی انقلاب کی واحد صورت یہ ہے کہ کاروبار میں کارجوئی یعنی Entrepreneurship کے لئے سازگار ماحول پیدا کیا جائے ۔ نئے کاروبار پیدا ہوں ، پھلے پھولیں ، ہماری کل پیداوار بڑھائیں اور روزگار کے مواقع پیدا کریں ۔ اس کے لئے آزاد اور اوپن مارکیٹ اشد ضروری ہے جس میں اجارہ داریاں، کارٹل اور ضرورت سے زائد حکومتی مداخلت نہ ہو۔ اس وقت پاکستانی مینوفیکچرنگ سیکٹر میں چھوٹے اور درمیانے بزنسز کا حصہ محض 6.7فیصد اور 13.12فیصد بالترتیب ہے۔ (پاکستان اکنامک سروے 2015-16ء اس کا مطلب ہے کہ نئے کاروبار پیدا ہی کم ہو رہے ہیں جو ترقی پا کر بڑے کاروبار بن سکیں ۔ اس کی وجہ نئے کاروبار میں بہت ساری غیر ضروری سرکاری رکاوٹیں ہیں ۔ آئی سی سی کے اوپن مارکیٹ انڈیکس میں پاکستان سے متعلق اشارے اسے ایک پسماندہ اور بند مارکیٹ کے طور پر ظاہر کرتے ہیں ۔

اس سب کچھ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ حکومت اپنی انتظامی ذمہ داریوں کی طرف مکمل توجہ دے اور معاشی سرگرمیاں مارکیٹ کے حوالے کر دے ۔ خبر ہے کہ گزشتہ ماہ حکومت نے 786 ارب کا قرض اسٹیٹ بنک سے حاصل کیا۔ سال 2015ء میں کل 1,364 ارب روپے کا قرض حکومت نے مقامی مارکیٹ سے لیا۔ دوسری طرف گورنمنٹ یہ دعویٰ بھی کر رہی ہے کہ وہ اب آئی ایم ایف سے کوئی قرض نہیں لے گی اور اسے ایک بڑی سیاسی کامیابی کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کا مقامی بنکوں سے لیا گیا قرض دراصل پرائیویٹ سیکٹر کو آسان قرض سے محروم رکھنے کے مترادف ہے اور یہ پالیسی ایک عرصے سے چلی آ رہی ہے کہ حکومت کو جب بھی پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور بین الاقوامی ادارے قرض دینے پر تیار نہیں ہوتے تو حکومت مقامی بنکوں سے یا اسٹیٹ بنک سے نوٹ چھاپ کر اپنی ضرورت پوری کرتی ہے جس کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر کے لئے قرض حاصل کرنا مشکل اور مہنگا ہو جاتا

ہے تو دوسری طرف مارکیٹ میں زیادہ پیسہ آ جانے سے مہنگائی کی شرح میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ حکومت کو یہ پالیسی فی الفور بدلنی ہو گی ، اپنے اخراجات انتہائی حد تک کم کرنے ہوں گے اور معاشی سرگرمیاں کھلی مارکیٹ کے حوالے کرنی ہوں گی ۔

دنیا میں کوئی بھی ایسا معاشرہ نہیں جو چیلنجز کا سامنا نہ کر رہا ہو۔ انسانوں کے معاشرہ میں چیلنجز اور امکانات یقینی ہیں ۔ معاشروں کا امتحان یہ ہوتا ہے کہ وہ ان مسائل کو کیسے رسپانس کرتے ہیں مثبت رسپانس مثبت نتائج پیدا کرتے ہیں اور منفی رد عمل کے نقصان دہ نتائج ہوتے ہیں ۔ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے مسائل کی شناخت اور تجزیہ کریں اور ان کے حل میں جامع منصوبہ بندی کی جائے ۔ ہمیں طے کرنا ہو گا کہ ہم اسی طرح پسماندہ رہنا چاہتے ہیں یا خوشحال و ترقی یافتہ بننا چاہتے ہیں ؟ اگر جواب خوشحالی ہے تو ہمیں غربت کے نوحے پڑھنے کے بجائے خوشحالی کی سائنس کو سمجھنا ہو گا ۔ ترقی یافتہ دنیا سے سیکھنا ہو گا ،اپنے رویوں پر نظرثانی کرنی ہو گی اور امن و سلامتی کی خوشبو میں شہرت کے اس سفر کو کامیاب کرنا ہو گا ۔ مشکل مرحلہ اپنا محاسبہ ہوتا ہے اس کے بعد غلطیوں کی ضد سے احتراز اور بہترین رد عمل سے کامیاب مستقبل کی طرف مستقل مزاجی سے گامزن رہنا ہے ۔ یقین ہے کہ ہم سب بھی دنیا میں باوقار ہوں گے کیونکہ نہ ہماری ثقافت بنجر ہے اور نہ امکانات سے یہ دھرتی محروم ہے۔ ہمارا فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔

قیمتوں کا نظام وسائل کی بہترین تفویض (allocation) کا ضامن ہے -

اگر سوشلسٹ حضرات اکنامکس جانتے ہوتے تو وہ کبھی بھی سوشلسٹ نہ ہوتے - (ہائیک)

قیمتیں وسائل کے بہترین استعمال کو ممکن بناتی ہیں کہ ایک چیز کی پیداوار پر جتنی ویلیو پیدا ہوتی ہے اس کے خرچ پر بھی اتنی ہی ویلیو خرچ (consume) ہونی چاہیئے ۔ قیمتوں کے نظام میں وسائل ضائع نہیں ہوتے۔ سوویت یونین کی مثال لیتے ہیں -ایک سیاح سوویت یونین جاتا ہے اور وہاں دیکھتا ہے کہ لوگوں کی ایک لمبی قطار ہے ۔جس میں لوگ گھنٹوں سے کھڑے ہیں۔ گلی کے ایک کونے پر کچھ لوگ ٹماٹر خریدنے کے لئے کھڑے ہیں تو ایک دوسری قطار میں جو تین دن چلتی رہی اس میں لوگ نئی بنیانوں کو حاصل کرنے کے لیے کھڑے ہیں جس کی نئی کھیپ فیکٹری سے ابھی ابھی آئی تھی۔ تین دن کے بعد جب ساری بنیانیں تقسیم کردی گئیں اور جو لوگ بچ گئے انہیں کہا گیا کہ وہ نئی کھیپ کاانتظارکریں۔یہی معاملہ ٹماٹروں کے ساتھ بھی ہوا، قطاریں چلتی رہیں جب تک کہ سارے ٹماٹر ختم نہیں ہو گئے –(115)
سوال یہ ہے کہ کیا ان تمام سوویت شہریوں کی ٹماٹروں اور بنیانوں سے متعلق ضروریات بھی سپلائی کے ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو گئیں ؟ اگر ضروریات کا معاملہ ویسا رہا تو آخر سپلائی سے محروم رہ جانے والے لوگوں نے اپنی ضروریات کی تکمیل کیسے کی ہو گی ؟

اسی طرح سوویت اکانومی کے بارے میں دو سوویت معیشت دان Nikolaï Petrovich Shmelev اور ولادی میر روپوو، سوویت معیشت پر اپنی کتاب The Turning Point : Revitalizing the Soviet Economy میں لکھتے ہیں کہ ''سوویت یونین میں بہت ساری ضروریات کی اشیاء عموماً گوداموں میں پڑی گل سڑ جاتی تھیں جبکہ لوگ کسی دوسری چیز کے منتظر گھنٹوں قطاروں میں لگے کھڑے رہتے تھے ، پھر بھی کچھ اشیاء ملتی تھیں اور کچھ نہیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈیمانڈ و سپلائی میں کوآرڈینیشن کا فقدان تھا۔قیمتوں کے بجائے بیوروکریٹس ڈیمانڈ اور سپلائی کا تعین کرتے تھے۔جب تک کہ ایک طویل دفتری طریقہ کار سے گزر کر ڈیمانڈ کی ایک رپورٹ افسران تک پہنچتی تھی اور وہ پیداوار و رسد کا حکم دیتے تھے اس وقت تک کافی دیر ہوچکی ہوتی تھی۔(116) یعنی شہریوں کی کسی مخصوص چیز میں طلب علم جب تک عمل میں لایا جاتا اس وقت تک وہ outdated ہو چکا ہوتا تھا - اسی طرح معیشت میں اس بات کو طے کرنے کا بھی نظام نہیں تھا کہ وسائل واقعی میں صحیح مختص (allocate) ہورہے ہیں یا نہیں۔یہ نظام کنزیومرز کی طلب کو براہ راست رسپانس نہیں کر رہا تھا بلکہ اس نظام میں بیوروکریٹس کے فیصلوں کو مرکزی اہمیت حاصل تھی ،مطلب یہ کہ فیصلہ کن کردار صارفین کا نہیں بلکہ بیوروکریٹس کا ہوتا تھا ۔

دیکھئے ہم محنت کرتے ہیں اور اس کے بدلے آمدن کماتے ہیں۔یہ ہمارا بنیادی حق ہے کہ ہم اپنی آمدن کے مطابق جو چیز چاہیں اسے خریدیں اور خرچ کریں۔جبکہ ایک ایسا نظام جس میں بادشاہ ،سیاست دان،بیورو کریسی ، جاگیر دار یا کوئی اور مراعات یافتہ طبقہ یہ طے کرے کہ ہمیں کتنی محنت کرنی چاہیے ، اس کے بدلے میں معاوضہ کتنا ہو گا اور ہمیں ضروریات و خواہشات کی کتنی اور کون کون سی اشیاء و خدمات میسر ہوں گی،حقیقتاً نہ صرف ہمارے بنیادی حق سے انکار ہے بلکہ اس سے پیچیدہ مسائل بھی جنم لیتے ہیں۔مثال کے طور پر مجھے معلوم ہے کہ کسی بھی مخصوص شے میں میری ضروریات اور خواہشات ڈیمانڈ کی صورت میں کتنی ہے،اور میں نے اپنی آمدن سے اس پر کتنا اور کن کن ترجیحات کے ساتھ خرچ کرنا ہے۔میری ضرورت وخواہش کا درست تعین سوائے میرے کوئی اور نہیں کرسکتا۔کیونکہ ہمیشہ لوگوں کی ضروریات و خواہشات میں انفرادیت ہوتی ہے–حقیقت یہ ہے کہ ایک ملک کی معیشت محض چند لوگوں پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ اس میں رہنے والے تمام شہری اس کا کم و بیش حصہ ہوتے ہیں ۔ اب ہوتا یہ ہے کہ بیوروکریٹس تمام تمام افراد کی طلب کو وقت اور مقام کے لحاظ سے خود ہی قیاس (suppose) کرتے ہیں اور اپنے حساب (calculation) سے ہی پیداواری سرگرمیوں کا تعین کیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ہم سب کو جوتوں کی ضرورت ہے۔پاکستان کی آبادی انیس کروڑ پچاس لاکھ ہے (117)۔ اب بیوروکریٹس کیسے طے کریں گے کہ ان تمام لوگوں کو کونسا اور کس ڈیزائن کا جوتا پسند ہے اور کس ساخت کے جوتے کی مختلف لوگوں کو ضرورت ہے؟ اسی طرح ہر فرد کے جوتوں کا سائزمختلف ہوتا ہے اور جوتوں میں پسند و ناپسند کے حوالے سے بھی لوگوں کی ترجیحات میں ایک بڑی وارائٹی پائی جاتی ہے ۔ لوگ قطاریں بنائیں گے اور ایک ایک جوڑا وصول کرتے جائیں۔اب ہوگا کیا؟ بیوروکریٹس خود قیاس کریں گے کہ فلاں ڈیزائن اور فلاں سائز کےاتنے اتنے جوتے پیدا کئے جائیں اور فلاں سائزو ڈیزائن کے اتنے۔ جب سپلائی لوگوں تک پہنچے گی تو اس میں بے ترتیب ڈیمانڈ کے مسائل (Random demand) کو کیسے حل کیا جائے گا یعنی انفرادی پسند و ناپسند اور پاؤں کے سائز سے ایڈجسٹمنٹ کا مسئلہ ہر ہر فرد کے لئے کیسے حل ہو گا؟ اس سے یہ ہوگا کہ کچھ لوگوں کو تو ان کی پسند کا جوتا مل جائے گا جبکہ کچھ لوگ محروم رہ جائیں گے اور وہ زبردستی ایک بے ڈھنگا اور بے جوڑ جوتا پہننے پر مجبور ہوں گے۔ یہی کچھ سوویت یونین میں ہوتا تھا۔بے ڈھنگے اور غیر مناسب (inapproriate) جوتے پہننے پر لوگ مجبور تھے کیونکہ بیوروکریٹس کی یہی مرضی (will) یا دوسرے لفظوں میں یہی شماریات (Calculation) تھی۔

قیمتوں کانظام ڈیمانڈ اور سپلائی کی حرکت کو فوری طور پر اور مستقل و مؤثر رسپانس کرتا ہے کیونکہ یہاں پروڈیوسر اور کنزیومر کا براہ راست رابطہ ہوتا ہے،پروڈیوسرکو نفع کی جستجو ہوتی ہے،جبکہ کنزیومر کے پاس ایک مقابلہ کی فضا میں ایک سے زیادہ متبادل ہوتے ہیں وہ جس سے مطمئن ہوتا ہے اسی طرف رجوع کرتا ہے اس لئے ہر پروڈیوسر کی خواہش ہوتی ہے کہ کنزیومر جب کوئی چیز ڈیمانڈ کرے تو وہ چیز اس کے پاس موجود ہونی چاہئے ورنہ کنزیومر کسی دوسرے پروڈیوسر سے رجوع کر لے گا– صرف وہ چیز موجود ہونا کافی نہیں بلکہ کوالٹی ڈیزائن اور خصوصیات بھی کنزیومر کی پسند کی ہوں ۔یوں بڑھتی ہوئی ڈیمانڈ کے ساتھ رسد بھی بڑھ جاتی ہے۔اور گرتی ہوئی ڈیمانڈ کے ساتھ پیداواری سرگرمی اور رسد بھی کم

ہوجاتی ہے کیونکہ پروڈیوسر کو خبر ہوتی ہے کہ کتنی رسد (inventory) اس کے ویئرہاؤس میں محفوظ ہے اور کتنی روزانہ کی بنیاد پر طلب یعنی ڈیمانڈ کی حالت میں ہے۔یہ خود کار انداز سے ہورہا ہوتا ہے اور معاشی عمل میں شامل تمام افراد اپنی اپنی ذمہ داریوں اور سیلف انٹرسٹ کی مدد سے اپنے اپنے متعلقہ امور سرانجام دے رہے ہوتے ہیں ۔ لاکھوں کی تعداد میں اشیاء و خدمات پیداوار اور خرچ میں اسی طرح سے ایک باقاعدہ کوآرڈینیشن میں استعمال ہو رہی ہوتی ہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ ہر ایک تقسیم محنت (ڈویژن آف لیبر) کے اصول کے تحت اپنی اپنی سرگرمی سرانجام دے رہا ہوتا ہے اور اپنے متعلقہ (Concerned) علم اور ڈیمانڈ و سپلائی کو رسپانس کر رہا ہوتا ہے ۔

دوسری طرف دیکھیں ایک سوشلسٹ معیشت جس میں کنزیومر اس خطرہ سے دوچار ہوتے ہیں کہ شاید آئندہ کوئی مخصوص چیز انہیں وقت پر ملے یا نہیں وہ ضرورت یاخواہش کی اشیاء کو لائنوں میں لگ کر زیادہ وصول کرنے اور محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ مستقبل میں قلت (shortage) کی صورت میں اسے کام میں لایا جائے گا۔یہ ڈر مزیدقلت کو جنم دیتا ہے اور معیشت باربار قلتوں کاسامنا کرتی رہتی ہے اور تقسیم محنت کے فقدان کے سبب کوآرڈینیشن کا عنصر بھی مفقود ہوتا ہے ۔جبکہ حقیقتاً ایک فری مارکیٹ میں یہ ڈر نہیں پایا جاتا۔لوگوں کے پاس مخصوص بجٹ ہوتا ہے وہ اپنی ضرورت اور خواہش کے مطابق خریداری اور خرچ کرتے ہیں اور انہیں اطمینان ہوتا ہے کہ مستقبل میں بھی جب وہ چاہیں گے اپنے پیسوں سے فلاں چیز خرید لیں گے اور اگر فلاں پروڈکٹ فلاں دکاندار سے دستیاب نہ ہوئی تو کسی دوسرے دکاندار یا پروڈیوسر سے مل ہی جائے گی ورنہ اس کا کوئی نہ کوئی متبادل تو ضرور میسر آئے گا۔

دونوں سوویت معیشت دانNikolouSchmelerاور ولادی میر Ropov اپنی کتاب میں مزید لکھتے ہیں:
''سوویت یونین میں پیداواری انٹرپرائزز ضرورت سے زیادہ راء میٹریل ، مشینری اور دوسرے ریسورسز طلب کرتی تھیں۔وہ ہر چیز وصول کرتی تھیں جو انہیں مل سکتی تھی(جیسا کہ بیوروکریٹک نظام میں ہوتاہے)اس کا تعین کئے بغیر کہ حقیقت میں انہیں کتنی ضرورت ہے اور کتنے ریسورسز ضائع ہورہے ہیں۔اسی طرح ان بیوروکریٹس کے افسران بالا دوسرے بیوروکریٹس بھی اصل پیداواری ضروریات سے بے خبرہوتے تھے۔ تقریباً 5 سے 15فیصد لیبر ان انٹرپرائزز میں ضرورت سے زائد ہوتی تھی جو بوقت ضرورت یعنی ایمرجنسی میں کام میں لائی جانی مقصود ہوتی تھی۔ پورے نظام میں اس چیز کی شماریات (Calculation) نہیں تھی کہ جتنی ویلیو کسی چیز کو پیدا کرنے میں خرچ آرہی ہے کیا واقعی میں اتنی ویلیو کنزیومر خرچ (Consume) بھی کر رہا ہے۔ریسورسز کا مؤثر استعمال (efficiency)جو کہ فری مارکیٹ معیشت میں نفع و نقصان سے معلوم ہوتی ہے ، ایک بیوروکریٹک حقیقت میں ایسا کوئی نظام یاcalculation نہیں تھی۔(118)

جب سوویت اکانومی میں وسائل کی تفویض یعنی اس کے مفید استعمال کا دوسری معیشتوں سے موازنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اشیاء کی پیداوار میں 1.5گنا زیادہ را میٹریل استعمال ہوتا تھا،بہ نسبت امریکی معیشت میں وسائل کے استعمال کے۔اسی طرح جو توانائی خرچ ہوتی تھی وہ امریکہ

کے موازنہ سے سوویت معیشت میں 2.1 گنا زائد خرچ ہوتی تھی۔ 2.4 گنا زیادہ metal استعمال ہوتا تھا اسی طرح ان پٹ میں 1.5 سے 2 فیصد زیادہ سیمنٹ استعمال ہوتی تھی ۔(119)

ایسا نہیں تھا کہ سوویت یونین کے پاس وسائل کی کمی تھی بلکہ سوویت یونین دنیا میں قدرتی وسائل کے اعتبار سے دنیا کی ایک خوش قسمت معیشت تھی، مسئلہ وسائل نہیں بلکہ اس کی تفویض (allocation) کا تھا - سوویت یونین کے پاس مارکیٹ نہیں بلکہ بیوروکریٹک معاشی انتظام تھی۔ایک فری مارکیٹ معیشت میں وسائل ضایع نہیں ہوسکتے کیونکہ اگر پروڈیوسر ایسا کرے گا تو اس کے نفع میں کمی آئے گی یا سرے سے کمپنی دیوالیہ ہوجائے گی۔نفع کی ترغیب اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اتنی ہی ویلیو پیدا کرے جتنی کنزیومر کو ضرورت ہے اور کنزیومر چونکہ اپنی ذاتی آمدن اور بجٹ سے اپنی خریداری اور خرچ کو پلان کرتا ہے اس لیے اس کا رجحان بھی یہی ہوتا ہے کہ اس کے وسائل ضائع نہ ہوں۔وہ اپنی ضروریات و خواہشات کے مطابق ہی چیزیں خریدتا ، خرچ کرتا اور جمع کرتا ہے۔ہر ایک (پروڈیوسر اور کنزیومر) کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی بنائی ہوئی یا خریدی ہوئی شے سے جتنی زیادہ سے زیادہ ویلیو پیدا (بطور پروڈیوسر) یا خرچ (بطور کنزیومر) کر سکتا ہے کرے۔وہ اپنے وسائل کا بہترین خیال رکھتے ہیں۔یوں پروڈیوسر اور کنزیومر اپنے اپنے سیلف انٹرسٹ کو pursue کرتے ہوئے وسائل کے بہتر استعمال کو ممکن بناتے ہیں۔

کیپٹلزم اور سوشلزم میں فرق کرنے والی بڑی چیز بھی یہی ہے کہ کیپٹلزم میں وسائل کی بہترین تفویض قیمتوں اور نفع و نقصان کی بنیاد پر ہوتی ہے جبکہ ایک سوشلسٹ اکانومی میں بیوروکریٹس فیصلہ کرتے ہیں کہ وسائل کو کیسے ، کہاں اور کتنا مختص (allocate) کرنا چاہئے ۔کیپٹلزم میں کنزیومر کو آزادی ہوتی ہے کہ جو چیز اور جس کوالٹی کی چاہے وہ خرید سکتا ہے جبکہ ایک سوشلسٹ معیشت میں بیوروکریٹ فیصلہ کرتے ہیں کہ اسے کیا کھانا چاہیے ، کیا پینا چاہئے ، کیا استعمال کرنا چاہیے اور کسی بھی شے یا خدمت کو وہ کتنا خرچ کرسکتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کیپٹلسٹ معیشت کی بنیاد پروڈیوسر اور کنزیومر کی آزادی ارادہ و عمل پر ہے جبکہ ایک سوشلسٹ معیشت کی بنیاد کنٹرول اور منصوبہ بندی پر ہے۔

گھانا اور آئیوری کوسٹ کے درمیان وسائل کے مفید استعمال کا مقابلہ

یہ سنہ 1960ء کی بات ہے کہ گھانا کے صدر اور ہمسایہ ملک آئیوری کوسٹ کے صدر کے درمیان اس بات پر شرط لگی کہ دیکھتے ہیں کہ کون زیادہ اور جلدی ترقی کرتا ہے۔ یاد رہے کہ دونوں ممالک نے 1960ء میں آزادی حاصل کی تھی۔گھانا نے سوشلسٹ نظام معیشت اختیار کیا جس میں گورنمنٹ معاشی نظام میں وسائل مختص (allocate) کرتی تھی جبکہ آئیوری کوسٹ نے فری مارکیٹ کا نظام قبول کیا جس میں قیمتیں اور نفع و نقصان کا نظام وسائل کو آزادانہ مختص کرتے تھے۔ قدرتی وسائل کا اگر موازنہ کیا جائے تو گھانا قدرتی وسائل سے مالامال تھا

جبکہ آئیوری کوسٹ اس کے موازنہ میں اس سے محروم تھا۔1982میں جب دونوں ممالک کے معاشی نتائج کا موازنہ کیا گیا تو یہ دیکھا گیا کہ آئیوری کوسٹ ،گھانا سے کافی آگے نکل گیا ہے ۔یہاں تک کہ آئیوری کوسٹ کا کم آمدن کا طبقہ گھانا کی مڈل کلاس سے بیس گنا زیادہ آمدن رکھتا تھا۔ اب ایک دلچسپ صورتحال پیدا ہوئی۔آئیوری کوسٹ کے سیاستدانوں میں معیشت پر کنٹرول کرنے کا رجحان بڑھا اور انہوں نے معیشت کو کنٹرول کرنا شروع کر دیا۔ جب کہ گھانا نے اپنے تجربات سے سیکھا اور معیشت پر آہستہ آہستہ حکومتی کنٹرول کم کرنا شروع کردیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آئیوری کوسٹ کی معیشت میں گراوٹ آتی گئی جبکہ گھانا کی معیشت میں شرح نمو تیز ہوگئی یوں گھانا آئیوری کوسٹ سے آگے نکل گیا ۔(120)

برما اور تھائی لینڈ کے درمیان وسائل کی بہترین تفویض کا مقابلہ :

اسی طرح کا ایک اورموازنہ برما اور تھائی لینڈ کے درمیان بھی ممکن ہے، برما سوشلزم کو قبول کرنے سے پہلے بہترین معیار زندگی کا حامل ملک تھا۔ جبکہ تھائی لینڈ جہاں سوشلزم رائج تھا ،اس کے شہری برما کے شہریوں سے کمتر معیار زندگی رکھتے تھے ۔ ہوا یہ کہ جب برما نے سوشلزم کو قبول لر لیا تو اس کا معیار زندگی کمزور تر ہوتا گیا۔ جبکہ تھائی لینڈ نے اس کے برعکس فری مارکیٹ معیشت کو قبول کر کے اپنے شہریوں کے لئے معیار زندگی میں اضافے کا بندوبست کر لیا ۔

یہ صرف آئیوری کوسٹ اور گھانا ، برما اور تھائی لینڈ کی کہانی نہیں بلکہ دوسرے ممالک جیسے انڈیا ، جرمنی ، چین ، نیوزی لینڈ ،ساؤتھ کوریا اور سری لنکا بھی اسی طرح کے تجربات سے گزرے ہیں۔ جب انہوں نے فری مارکیٹ میعشت کو قبول کیا تو معیار زندگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا ۔

بھارت اور جنوبی کوریا کا مارکیٹ سسٹم کی بنیاد پر مقابلہ

ایک اور مثال دیکھتے ہیں 1960ء میں انڈیا اور ساؤتھ کوریا کی معیشتیں ایک ہی حجم کی حامل تھیں۔ ساؤتھ کوریا نے فری مارکیٹ معیشت سے رجوع کیا اور قیمتوں پر کنٹرول ختم کر کے مارکیٹ کو ڈیمانڈ و سپلائی اور نفع و نقصان کی مدد سے وسائل کو مختص (allocate) کرنے کی آزادی دی جبکہ بھارت نے معیشت پر کنٹرول کی پالیسی قائم رکھی اور مارکیٹ کو بند رہنے دیا ،نتیجہ کیا ہوا؟ 1980ء میں جنوبی کوریا کی معیشت اپنے حجم میں محض 20سال کے عرصے میں بھارت سے دس گنا بڑھ گئی اور معیار زندگی میں بھی اسی شرح سے بھارت کی بنسبت بیس گنا اضافہ ہوا ۔(121)

بھارتی معیشت کی کہانی

بھارت کو دیکھیے 1947ء میں آزادی حاصل کی ، 1990 تک مارکیٹ پر سخت کنٹرول اور معیشت کو بیرونی دنیا سے تجارت کے لئے بند رکھا۔ معیار زندگی دنیا کی دوسری معیشتوں کی نسبت انتہائی کم تھا ۔ بیروزگاری 50 فیصد سے اوپر تھی۔ معیشت اتنی سست رفتار تھی کہ ''ہندو ریٹ آف گروتھ (Hindu rate of growth)'' کو طنزاً سست ترین گروتھ ریٹ کہا جاتا تھا۔ 1990ء میں بھارت نے اپنی معیشت کو آزاد کیا ، گورنمنٹ کا معیشت پر اثر رسوخ کم ہوا ، مارکیٹ ایکسپورٹ اور امپورٹ کے لیے کھلی اور 1990 سے آج تک بھارت ''دی اکانومسٹ '' کے مطابق دنیاء کی بہترین اور تیزی سے ابھرتی ہوئی معیشتوں میں اپنا شمار کروا چکا ہے ۔ اس وقت بھارت کا شمار دنیا کی بیس بڑی معیشتوں میں ہوتا ہے جو سیاسی و معاشی اثر و رسوخ کے اعتبار سے ایک طاقتور ملک بن چکا ہے۔ (122)

چین کی کہانی

اب چین کی طرف آتے ہیں۔ چین میں جب تک سوشلسٹ معیشت رائج تھی، قحط اور قلت (shortage) معمول کی بات تھی۔ چین نے ناکام سوشلسٹ تجربہ کے بعد 1980ء میں اکنامک ریفارمز کا آغاز کیا جس میں مارکیٹ کو زیادہ سے زیادہ آزاد کیا گیا ، تب جا کر تیز رفتار ترقی کا آغاز ہوا ۔ 1980ء کے بعد چین کی اتنی بڑی آبادی کی حامل معیشت میں خوراک و بنیادی ضروریات کی چیزوں کا نہ قحط پڑا اور نہ ہی قلت ہوئی۔ نوٹ کیجئے کہ جب معیشت کو بیورو کریٹ پلان کرتے تھے تو مارکیٹ میں قحط اور قلت معمول کی بات تھی۔ اور جب مارکیٹ کو ڈیمانڈ و سپلائی اور نفع و نقصان کی کوآرڈینیشن کے سپرد کیا گیا تو نہ صرف قحط اور قلت کا خاتمہ ہوا بلکہ شہریوں کے معیار زندگی میں بھی بے حد اضافہ ہوا۔ 1978ء سے 1995ء تک چین نے اوسط نو فیصد شرح نمو (گروتھ ریٹ) سے ترقی کی ہے جو انسانی تاریخ کا سب سے انوکھا واقعہ ہے (123)۔

یہ سارے کامیاب تجربات جن کا ذکر کیا گیا یہ صرف اس وقت ممکن ہوپائے جب وسائل سیاسی و بیوروکریٹک اثرات سے آزاد ہوئے ، معیشت آزاد ہوئی اور مارکیٹ نے ان وسائل کو بہتر طور پر مختص (allocate) کرنا شروع کیا۔

قیمتیں معلومات کا نظام ہیں

یاد رہے کہ جب بیوروکریٹ غلطی کرتا ہے تو یہ محض ایک غلطی نہیں ہوتی ، اس سے نہ صرف وسائل ضائع ہو رہے ہوتے ہیں بلکہ لوگوں کے معیار زندگی میں بھی انتہائی کمی آتی ہے۔ قیمتیں معلومات کا نظام ہیں کہ ایک کنزیومر کو کیا اور کتنی قیمت پر اور کن خصوصیات کی حامل ایک پروڈکٹ یا سروس چاہیے۔ ان معلومات کی بنیاد پر پروڈیوسر اپنی پیداوار کو پلان کرتا ہے ۔ اسکی کوشش ہوتی ہے کہ کنزیومر نے ایک پروڈکٹ یا سروس کے لیے جو ویلیو متعین کی ہے وہی ویلیو وہ پیدا کرے تاکہ اس کا کسٹمر نہ صرف اس سے مطمئن رہے بلکہ اگلی خریداری کے وقت

بھی اسے ترجیح دے۔کنزیومر اس پروڈکٹ اور سروس کے حصول کے بعد اسے اپنے تجربہ سے گزارتا ہے۔ اگر وہ اس سے مطمئن ہوتا ہے تو اسی پروڈیوسر سے رابطہ کرتا ہے۔ ورنہ وہ دوسرے پروڈیوسرز کی اشیاء و خدمات کو ٹیسٹ کرنا شروع کردیتا ہے ۔دونوں اپنے اپنے شخصی مفادات کو pursue کر رہے ہوتے ہیں۔پروڈیوسر اپنے نفع کو نقصان میں نہیں بدلنا چاہتا اس طرح کنزیومر اپنی آمدن اور بجٹ کو ضائع نہیں کرنا چاہتا ۔یوں دونوں مجبور ہیں کہ ایک دوسرے سے کوآرڈی نیٹ (Coordinate) کریں۔یاد رہے کہ اس عمل میں وسائل ضائع نہیں ہوتے ۔ اگر پروڈیوسر کنزیومرز کو صحیح رسپانس نہیں کرے گا تو مارکیٹ سے باہر ہو جائے گا - وہ براہ راست کنزیومرز کو جوابدہ ہے اور کنزیومرز ہی اسے انفارمیشن سگنل دے رہے ہوتے ہیں کہ ایک پروڈیوسر کو کس طرح ، کس قیمت پر ، کس وقت اور کن خصوصیات کی حامل ایک پروڈکٹ بنا کر اس کی ڈیمانڈ کو مطمئن کرنا ہے ۔

علم تمام وسائل میں سب سے قیمتی (scare) ہے۔

پروڈیوسر ہمہ وقت اس جستجو میں مصروف رہتا ہے کہ وہ اس راز کو جان جائے کہ اس کا کنزیومر زیادہ سے زیادہ کس طرح مطمئن ہو سکتا ہے تاکہ وہ زیادہ مارکیٹ شیئر حاصل کرے اور نفع کمائے۔جب کہ کنزیومر اس جستجومیں ہوتا ہے کہ آخر کار کون سا پروڈیوسر اس کی ضرورت و خواہش کو بنسبت دوسرے پروڈیوسرز کے بہترین طریقے سے پورا کر سکتا ہے تاکہ کم سے کم قیمت پر بہترین کوالٹی، جدت پسندی اور طویل عرصے کے لیے بہتر کارکردگی اور زیادہ سے زیادہ اطمینان بخش(Satisfaction, Utility) چیز اسے میسر آئے ۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مارکس اور فریڈرک اینگلز اس بنیادی فرق کو سمجھتے تھے جس میں ایک طرف وسائل کو قیمتیں اور نفع و نقصان جبکہ دوسری طرف سیاسی بیوروکریٹک آمریت مختص (allocate) کر رہی ہوتی ہے۔یاد رہے کہ سوویت یونین کا سیاسی معاشی اور سماجی نظام کارل مارکس اور اینگلز سے مکمل طور پر متاثر تھا۔ اینگلز لکھتا ہے کہ قیمتوں میں لچک بھر پور طور پر پروڈیوسرز کو خبردار کرتی ہے کہ انہیں کونسی چیز اور کس مقدار میں پیدا کرنی ہے، جو سماج کی ضرورت ہے۔اس میکانیزم کے بغیر ہم یہ نہیں جان سکتے کہ کونسی چیز، کتنی مقدار میں ، کن خصوصیات کی حامل ، اور کس وقت پیدا کی جائے۔(124)

قیمتوں کی بنیاد پر قائم ڈیمانڈ اور سپلائی کا نظام توازن پیدا کرتا ہے۔

مثال کے طور پر جب کسی چیز کی قیمت لوگوں کی نظر میں زیادہ ہوتی ہے تو لوگ اس چیز کو کم خریدتے ہیں۔یوں ڈیمانڈ کم ہوجاتی ہے۔جب اس شے یا کسی اور شے کی قیمت زیادہ ہوتی ہے تو پروڈیوسرز اپنے نفع کے حصول کے لیے اسے زیادہ اور جلد سے جلد پیدا کرنے کی کوشش

کرتے ہیں ، یوں سپلائی بڑھ جاتی ہے۔ڈیمانڈ کے کم ہونے اور سپلائی کے بڑھ جانے سے قیمتیں گر کر اپنی حالت توازن (equilibrium level)پر آجاتی ہیں جس پر وسائل کا سب سے بہتر استعمال ممکن ہوتا ہے۔

اگر قیمتوں کا نظام ہی نہ ہو بلکہ ہر چیز مفت ہو تو کیا ہو گا؟

اب تک کا انسانی سماجی تجربہ بتاتا ہے کہ اس سے وسائل ضائع ہوں گے – ایک مثال سے مدد لیتے ہیں اسرائیل میں Kibbutz کمیون ایسا کرتے تھے کہ اس کے تمام ممبران مل کر اشیاء و خدمات پیدا کرتے تھے۔اور انہیں خرچ بھی مشترکہ طور پر کرتے تھے۔محنت مشترکہ تھی اور خرچ بھی مشترکہ تھا ۔ محنت پر کوئی باقاعدہ آمدن نہیں ملتی تھی۔اسی طرح خرچ پر بھی کوئی پیسے وصول نہیں کیے جاتے تھے۔دیکھا یہ گیا کہ جب بجلی مفت تھی تو لوگ اس کے بارے میں بے فکر رہتے تھے۔وہ دن کے وقت بھی بلب آف نہیں کرتے تھے۔بجلی کے آلات چلتے رہتے تھے انہیں عموما بند نہیں کیاجاتا تھا۔اسی طرح چونکہ کھانا مشترکہ تھا اس لیے اس کمیون کے اراکین کمیون سے باہر کے لوگوں کو بطور مہمان دعوت پر بلاتے اور انہیں مفت میں کھانا کھلاتے۔اس تمام مفت خوری سے کمیون مالیاتی بحران میں آگیا اور اس نے تجربہ کے طور پر بجلی اور خوراک کی قیمتیں مقرر کردیں۔ اب ہوا یہ کہ بجلی اور خوراک کا کل صرف (consumption) ایک دم گر گیا اور لوگ ان کے استعمال میں ذمہ دار (responsible) بن گئے۔

فرق کیا تھا؟ فرق سیلف انٹرسٹ کا تھا۔جب چیزیں مفت تھیں اور مشترکہ تھیں تو ان کا خیال کم رکھا جاتا تھا اور جب ان پر اپنے پیسے خرچ ہونے لگے تو اب لوگوں نے اپنے سیلف انٹرسٹ کو pursue کیا اور پیسے بچانے کی کوشش کی۔کمیونل سسٹم میں وسائل ضائع ہورہے تھے۔جبکہ قیمتوں کے نظام میں کمیونٹی کے وسائل بہتر طور پر استعمال ہونا شروع ہوئے۔ (125)

کمیون سسٹم میں ایک نفسیاتی مسئلہ بھی ہوتا ہے۔مثال کے طور پر جب ایک کمیون کے ارکان مشترکہ طور پر مفت بجلی استعمال کر رہے ہوتے ہیں ۔ اگر ایک فرد بجلی کے استعمال میں احتیاط کرتا ہے اور صرف اتنی استعمال کرتا ہے جتنی اس کی ضرورت ہوتی ہے مگر وہ دیکھتا ہے کہ دوسرے افراد یا اس کے ہمسائے مفت کی بجلی کا فالتو استعمال کر رہے ہیں۔تو وہ سوچتا ہے کہ آخرصرف وہ ہی کیوں خیال رکھے جب باقی لوگوں کو اس کی فکر ہی نہیں۔ یوں لوگ سیلف انٹرسٹ اور نفع بخش ترغیب نہ ہونے کے باعث بھی بجلی کے استعمال میں بے فکر ہو جاتے ہیں ۔اسی لیے کہتے ہیں کہ مشترکہ چراگاہ چونکہ کسی کی نہیں ہوتی اس لیے ہر فرد کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے مویشی زیادہ سے زیادہ چر لیں۔ہم مشترکہ چیز کے فائدے کو حاصل کرنے میں بہت زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں۔اور جب اس چراگاہ کی دیکھ بھال ،اس کی زرخیزی اور محدود رقبہ کو سرسبز رکھنے کی ذمہ داری آتی ہے تو پہلو بچا جاتے ہیں ۔ اس محنت و مشقت سے ہر ایک جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بچ جائے یا کم سے کم شرکت کرے مگر فائدہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرتا رہے ۔

ہمارا سیلف انٹرسٹ سسٹم اور نفع کی خواہش ہمیں اپنی پراپرٹی سے زیادہ متعلق (Relevent) بنا دیتا ہے یوں ہم اپنی پراپرٹی کو زیادہ سے زیادہ نفع بخش بنانے کے لئے نہ صرف اس کی دیکھ بھال زیادہ کرتے ہیں بلکہ جب اپنی ضروریات و خواہشات کی اشیاء و خدمات کو بھی مخصوص قیمتوں پر خریدرہے ہوتے ہیں تو نہ صرف حسب ضرورت و خواہش خریدتے ہیں بلکہ اس کے خرچ میں بھی بہت محتاط اور ذمہ دار ہوتے ہیں۔

فری مارکیٹ میں قحط یا قلت کا خطرہ نہیں پایا جاتا

فرض کیا اگر لوگ مارکیٹ میں پیش گوئی کرتے ہیں کہ فلاں شے کی قلت ہوجائے گی یا وہ مہنگی ہوجائے گی۔اس خوف سے وہ چیزوں کو آج خریدتے ہیں اور محفوظ کرنا شروع کرد یتے ہیں تاکہ مستقبل میں سامنے آنے والی غیر یقینی کی کیفیت سے محفوظ رہ پائیں ۔جب وہ آج ہی خریدنا شروع کر دیتے ہیں تو فوراً اس شے کی قیمت میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ڈیمانڈ میں یہ اضافہ پروڈیوسرز کو انفارمیشن سگنل دیتا ہے کہ وہ زیادہ پیدا کرنا شروع کر دیں تاکہ مہنگے داموں بیچ کر نفع حاصل کریں ۔یوں جب وہ زیادہ پیدا کرتے ہیں اور متوقع وقت یا مقام جب آتا ہے (جس کے لئے قلت کی پیش گوئی کی گئی تھی) تو ڈیمانڈ کے مطابق سپلائی موجود ہوتی ہے اب فرض کیا کہ اس طرح زیادہ سپلائی مارکیٹ میں آ جاتی ہے،جس سے قیمتیں بھی گر جاتی ہیں اور کمپنی اپنے پیداواری اخراجات بھی ان قیمتوں پر پورا نہیں کرسکتی ،یوں وہ کم ڈیمانڈ ، کم قیمت اور نقصان کے رسپانس میں اپنی سپلائی کو بھی کم کر دیتے ہیں۔ اس طرح جلد ہی ڈیمانڈ اور سپلائی دوبارہ سے متوازن ہوجاتی ہے۔ڈیمانڈ ،سپلائی اور قیمتوں کا نظام کنزیومرز اور پروڈیوسرزکے درمیان ایک براہ راست کمیونیکیشن ہے۔ مارکیٹ میں ملینز کی تعداد میں کنزیومر ہوتے ہیں اور اسی طرح لاکھوں کی تعداد میں پروڈیوسرز۔ہر کنزیومر اپنے متعلقہ پروڈیوسر تک اپنی ڈیمانڈ کی صورت میں مطلوبہ سپلائی کے انفارمیشن سگنل بھیج رہا ہوتا ہے ۔

معاشی زندگی میں تعاون وتبادلہ محض اسی صورت میں ممکن ہے ۔

صرف ان اشیاء کی قیمت نہیں ہوتی جو کنزیومر خرچ کے لیے خریدتے ہیں بلکہ لیبر (محنت) بھی اپنے وقت اور مہارت کی قیمت وصول کر تی ہے ،جسے ہم تنخواہ یا اجرت کہتے ہیں۔ہم جو ادھار میں روپیہ پیسہ کسی دوسرے کو دیتے ہیں تو اس پر بھی قیمت وصول کر رہے ہوتے ہیں جسے انٹرسٹ یا سود کہتے ہیں۔جن خدمات سے مستفید ہوتے ہیں،جیسے بالوں کی تراش خراش، ڈاکٹر سے سرجری اور اساتذہ سے تعلیم وغیرہ ان کی بھی قیمت معاوضہ یا فیس ادا کرتے ہیں ۔حقیقت یہ ہے کہ ایک مارکیٹ اکانومی میں ان تمام وسائل کی جو نایاب (scare) ہیں کی تفویض محض قیمتوں کے نظام سے ہی ہوتی ہے۔ہر ایک اپنی اشیاء و خدمات کی ویلیو یا اہمیت (contribution) کا انعام (reward) لے رہا ہوتا ہےاور دوسروں کو دے رہا ہوتا ہے۔ہم جب اپنی محنت کی اجرت لے رہے ہوتے ہیں تو دوسروں کو بھی انکی محنت پر اجرت

دے رہے ہوتے ہیں اسے ہی معاشی زندگی میں تعاون و تبادلہ کہتے ہیں اور فری مارکیٹ کیپیٹلزم کی آرزو ہے کہ یہ عمل آزادانہ اور رضاکارانہ بنیادوں پر چلتا رہے –

قیمتوں کا نظام اور ڈیمانڈ و سپلائی وسائل کو کیسے بہتر مختص کرتے ہیں : کچھ مثالیں ۔

فرض کیا کہ ایک علاقے میں سیلاب آگیا ہے اور وہاں سے لوگ اٹھ کر محفوظ علاقے میں آگئے ہیں۔اب ہو گا یہ کہ محفوظ علاقے میں ڈیمانڈ کے بڑھنے سے وہاں مکانوں کے کرائے اور بقیہ قیمتیں بھی بڑھ جائیں گی۔اب بعض لوگوں کے لیے قیمتوں کا یہ بڑھنا محض لالچ کے سبب ہے۔(حیران کن طور پر جب کسی چیز یا خدمت کی قیمتیں بہت زیادہ گر جاتی ہیں تو لوگ اس وقت مارکیٹ کے احسان مند نہیں ہوتے)۔کرایوں کا یہ بڑھنااس سبب سے ہے کہ زیادہ لوگوں کو کمرے کی ضرورت ہے جبکہ اس علاقے میں مہیا کل کمرے تعداد میں کم ہیں۔اب اس صورت میں ہمارے پاس دو صورتیں بچتی ہیں۔

۱۔پہلی صورت میں گورنمنٹ مداخلت کرتی ہے اور کمروں کے کرائے کی ایک مخصوص حد مقرر کردیتی ہے۔اب فرض کیا کہ ایک فیملی میں چار افراد ہیں وہ دو کمرے اس کم سے کم کرائے کو دیکھتے ہوئے کرایہ پر لیتے ہیں۔ایک میں میاں بیوی رہتے ہیں اور دوسرے میں ان کے دو بچے قیام کرتے ہیں ۔

۲۔دوسری صورت یہ ہے کہ قیمتوں کو آزادانہ بڑھنے دیا جائے۔جب قیمتیں زیادہ ہوں گی تو وہی فیملی اسے زیادہ بہتر سمجھے گی کہ اس ناگہانی صورتحال میں وہ ایک ہی کمرہ کرایہ پر لے لیں اور چاروں اسی میں رہیں تاکہ پیسے بچائے جاسکیں۔

پہلی صورت میں کیا ہوا کہ دو کمرے اس ایمرجنسی کی صورتحال میں خرچ ہوئے جبکہ دوسری صورت میں صرف ایک ،یوں ایک اور فیملی کے لیے گنجائش پیدا ہوئی کہ وہ اس خالی کمرے کو کرایہ پر لے لے۔ڈیمانڈو سپلائی اور اس پر مبنی قیمتوں کا نظام ریسورسز کو بہتر سے بہتر استعمال میں لاتا ہے۔جب قیمتیں زیادہ ہوں گی تو آس پاس کے لوگ بھی یہ رجحان محسوس کریں گے کہ اگر ان کے گھر میں بھی گنجائش پیدا ہوتی ہے تو اس کا کوئی پورشن کرایہ پر دے کر کچھ کما لیں۔کچھ لوگوں میں یہ رضاکارانہ احساس بھی پیدا ہوجائے گا کہ وہ کسی فیملی کو مفت اپنے ساتھ رہائش دے دیں۔یوں کمیونٹی رضاکارانہ طور پر وسائل کو تعاون و تبادلہ کی بنیاد پرmanage کر رہی ہوتی ہے۔جبکہ بظاہر یہ لگتا ہے کہ چیزیں manage نہیں ہو رہیں کیونکہ ہمیں اس صورت میں فورس یعنی جبر کا استعمال ہوتا نظر نہیں آرہا ہوتا۔اور جب نارمل ٹائم آجاتا ہے ،لوگ اپنے اپنے گھروں یا حکومت کے ایمرجنسی میں قائم کردہ شیلٹرہاؤس میں شفٹ ہوجاتے ہیں تو قیمتیں گر کر ڈیمانڈ اور سپلائی کی نئی حالت پر آجاتی ہیں تاکہ پروڈیوسر اور کنزیومر کی متوقع (perceived) ویلیو برابر ہوجائے۔

ایک اور مثال دیکھتے ہیں۔ایک علاقہ میں بجلی کی کچھ دنوں کے لیے بندش ہوجاتی ہے۔یوں موم بتیوں کی ڈیمانڈ بڑھ جاتی ہے جس کے ساتھ ساتھ ان کی قیمتیں بھی بڑھ جاتی ہیں ۔اب اگر گورنمنٹ پابندی لگا دیتی ہے۔کہ قیمتیں بڑھانا ممنوع ہے اور قیمتیں اسی پرانے نمبرز پر رہیں تو کیا ہوگا؟ وہ لوگ جن کے پاس موم بتیاں موجود ہیں یا جو موجودہ قیمت پر جلد از جلد خرید سکتے ہیں وہ موم بتیوں کو ان کی نارمل تعداد میں خرچ کرتے جائیں گے یوں موم بتیوں کی قلت (shortage) کا مسئلہ حل نہیں ہو گا۔دوسری صورت قیمتوں کے بڑھنے کی ہے۔جب قیمتیں بڑھیں گی تو کنزیومر ان کو صرف اتنا استعمال کرے گا جتنا ضروری ہوگا۔یاد رہے کہ موم بتیوں کی اس علاقے میں سپلائی محدود ہے کیونکہ بجلی کی بندش غیر متوقع ہے۔

اب مستقل قریب میں دو امکانات ہیں ایک یہ کہ مارکیٹ میں جلد موم بتیاں ختم ہوجائیں گی اور اکثر گھروں میں اندھیرا ہوگا۔دوسری صورت میں زیادہ قیمتیں کنزیومرز کو حسب ضرورت خریداری پر مجبور کر دیں گی کہ وہ کم خریدیں گے،یوں مارکیٹ میں موم بتیاں زیادہ لوگ خرید سکیں گے اور قلت کا مسئلہ عارضی طور پر حل ہو جائے گا تاوقتیکہ سپلائی کی نئی کھیپ زیادہ ڈیمانڈ کو پورا کرنے کے لیے (نفع کی جستجو میں) اس علاقہ میں آجائے گی اور قیمتیں گرجائیں گی ...، یا بجلی بحال ہوجائے گی۔ قیمتوں کی مدد سے وسائل کی تفویض کا یہ نظام کسی بھی چیز کے نارمل اور ایمرجنسی دونوں حالات میں بہترین کام کرتا ہے۔

جب کسی علاقے میں کم خوراک پیدا ہوتی ہے اور اس کی قلت کے خطرے کے باعث ڈیمانڈ اور قیمتیں بھی بڑھ جاتی ہیں تو ان زیادہ قیمتوں کا فائدہ لینے کے لیے سپلائر اس طرف کا رخ کرتے ہیں یوں زیادہ سپلائی کے سبب قیمتیں بھی آخر کار گر جاتی ہیں اور قلت کا خطرہ بھی ٹل جاتا ہے۔یہ اس وقت ہوتا ہے جب مارکیٹ اوپن ہو اور تجارتی اشیاء کی آمدورفت پر حکومت کی پابندی نہ ہو۔حقیقت یہ ہے کہ فری مارکیٹ اکانومی میں قحط اس لیے ممکن نہیں کہ زیادہ ڈیمانڈ میں زیادہ سپلائی خودبخود اس طرف کا رخ کرتی ہے۔کیونکہ ہر سپلائر کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ قیمتوں سے زیادہ نفع کما سکے۔ جب گورنمنٹ خوراک کی آمدو رفت پر پابندی لگاتی ہے یا محدود کردیتی ہے تو دراصل وہ قحط یا قلت کے اسباب بھی خود پیدا کر رہی ہوتی ہے۔

یاد رہے کہ جب کسی چیز کی کمی واقع ہوتی ہے تو ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ لوگ اسے کم مقدار میں اوراحتیاط سے خرچ (کنزیوم) کریں۔ بغیر کسی ترغیب اور فائدہ کے اکثر لوگ ایسا نہیں کرتے مگر یہ قیمتیں ہوتی ہیں جو یہ کام ترغیب (Incentive) پیدا کر کے فطری انداز میں کرواتی ہیں۔

بیوروکریسی بمقابلہ قیمتوں کا نظام

آٹھ دسمبر2001ء کو دی اکانومسٹ میگزین نے رپورٹ کیا کہ ایک بڑی تعداد میں افغان مہاجرین قحط سے مرگئے باوجود اس کے کہ خوراک کی سپلائی بھی موجود تھی مگر افغان بیوروکریسی کی لازمی شرط یہ تھی کہ امدادی کارکن پہلے اپنا پیپر ورک مکمل کریں گے اور اجازت نامے حاصل کر کے ہی امداد کاروائیاں جاری رکھ سکیں گے۔ (126)

سوویت یونین میں بھی عموماً یہی ہوتا تھا کہ کہیں ایک مخصوص شے بہت زیادہ مقدار (یعنی Surplus) میں میسر ہے تو کہیں وہی مخصوص شے نایاب یعنی قلت میں ہے۔ بیوروکریسی کا پیپر ورک بہت طویل ہوتا تھا۔اور جب تک کسی ڈیمانڈ کو رسپانس کیا جاتا منظر بدل چکا ہوتا یعنی حالات بدتر ہو چکے ہوتے تھے ۔(127)

جب کہ فری مارکیٹ میں ایسا نہیں ہوتا جہاں قلت اگر پیدا بھی ہوئی تو وہاں زیادہ قیمت اور نفع کے رجحان کے سبب فوراً سپلائی پہنچ جاتی ہے،سوائے ان جگہوں کے جہاں امن و امان کی مخدوش صورتحال کے سبب لاجسٹک کے مسائل ہیں۔یاد رہے کہ سوویت یونین میں حکومت کو کل 20ملین قیمتوں کو بذریعہ بیوروکریسی مقرر و متعین کرنا پڑتا تھا اور ان کی کڑی نگرانی کرنا پڑتی تھی۔یہ کام سست رفتار بھی تھا اور ڈیمانڈ و رسد کی قوتیں مقید معیشت کے سبب بے اثر تھیں۔ہاں یہ ہے کہ بلیک اکانومی (پس پردہ معیشت) بھی خوب موجود تھی جس کا فائدہ بیوروکریسی ، مزدور رہنماؤں اور دوسری سٹیٹس کو قوتوں کو پہنچتا رہا — بیورو کریسی ٹینڈر پاس کرتی اور منظور نظر افراد نوازے جاتے —

حکومتیں لوگوں کو بے وقوف سمجھتی ہیں ۔

گورنمنٹ کی طرف سے قیمتوں کے کنٹرول کا نظام اس مفروضہ پر قائم ہوتا ہے کہ خریدار اور فروخت کنندہ دونوں فریقین کسی معاشی لین دین میں اپنے اپنے فائدے کو آزادانہ pursue نہیں کرسکتے اس لیے بیوروکریسی کی ضرورت ہے جو ان دونوں کو کسی ایک قیمت پر بذریعہ جبر لین دین پر مجبور کر دے۔ سوال یہ ہے کہ بیوروکریٹ یہ کام کس طرح اور کن بنیادوں پر کرتا ہے ، اس کے پاس ایسی کون سی جادو کی چھڑی ہوتی ہے جس سے وہ طے کر سکے کہ دونوں فریقین کا کس قیمت پرفاءدہ موجود ہے اور حقیقت میں کسی چیز کی منصفانہ قیمت کون سی اور کتنی ہے ؟، تو جواب ہے محض رپورٹنگ اور اندازے جن میں ایک سینئر بیوروکریٹ ایک مفروضہ قیمت کو خود سے قیاس کرتا ہے اور خریدار و سیلر کو مجبور کرتا ہے کہ صرف اس پر لین دین کریں۔

مارکیٹ میں واحد معیار صرف صارف ہے ۔

قیمتوں کا تعین محض اس طرح سے نہیں ہوتا۔کہ ایک پروڈیوسر نے کوئی شے بنانی شروع کی ۔وہ اس شے کی تیاری کے دوران جتنے اخراجات ہوئے لکھتا گیا اور آخر میں ان کل اخراجات کے ساتھ اپنے نفع کا مخصوص حصہ (Margin) طے کر کے اسے کل قیمت میں شامل کیا

اور مارکیٹ میں ایک لگی بندھی قیمت آفر کردی۔ جبکہ ہوتا یہ ہے کہ ایک ایسی مارکیٹ میں جہاں مقابلہ کی ثقافت پائی جاتی ہو ہر چیز یا تو اس قیمت پر یا اس سے نسبتا کم پر آفر کی جاتی ہے جو اس مارکیٹ میں اس پروڈکٹ یا سیکٹر کے دوسرے حریف (competitors) پیش کر رہے ہوتے ہیں یا جو اس شے کی متبادل اشیاء کی قیمت ہوتی ہے ۔اور کنزیومر کا راضی ہونا بھی لازم ہے کہ اس قیمت پر وہ چیز خریدے گا بھی کہ نہیں — اگر اس نے نہ خریدی تو آپ کی پیش کردہ شے فلاپ ہے چاہے آپ اس پر کتنی بھی محنت کر رہے ہیں — مارکیٹ میں واحد معیار صارف کی پسند ہے اسی لئے فری مارکیٹ کیپیٹلزم کو ہم کنزیومر ازم بھی شوق سے کہہ سکتے ہیں ۔فری مارکیٹ میں ٹرانزیکشن صرف اس وقت ہوتی ہے جب خریدار اور فروخت کنندہ دونوں کی ویلیو perception برابر ہوجاتی ہے اور وہ رضاکارانہ طور پر ایک مخصوص قیمت کو باہم طے کر لیتے ہیں — کسی بھی چیز کی قیمت دراصل اس چیز کی ویلیو میں ادراک (perception) ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ کسی بھی چیز کی ویلیو جب وہ مارکیٹ میں بکنے کے لئے موجود ہو گی تو وہی ہو گی جو اس کا صارف اس کے لئے ادراک (percieve) کرے گا اور یہ بھی یاد رہے کہ ہر فرد کا بطور صارف ویلیو میں ادراک مختلف ہوتا ہے جسے ہم تفصیل سے شخصی تصور اقدار میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں — معاشی معاہدہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب بیچنے والے کی ویلیو میں ادرا ک اور خریدار کی ویلیو میں ادرا ک کسی ایک نقطہ پر ایک دوسرے سے متفق ہو جاتے ہیں —

مارکیٹ میں تمام فریقین کے درمیان بہتر قیمت کے حصول کا مقابلہ جاری رہتا ہے ۔

مارکیٹ میں ہر فرد کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے سیلف انٹرسٹ کو Pursue کرے ۔لیبر کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سیلری یا اجرت وصول کریں ۔راء میٹیریل کے جتنے سپلائر ہوتے ہیں ان سب کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی سپلائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کریں۔ پروڈیوسرز کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کنزیومرز سے زیادہ قیمت وصول کرے (مگر ایک مقابلہ کی ثقافت میں ایسا ممکن نہیں کیونکہ اگر ایک پروڈیوسر اپنے پروڈکٹ کی قیمت میں اضافہ کرے گا تو کنزیومر دوسرے پروڈیوسر سے رجوع کرلے گا۔)اور کنزیومر کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کم سے کم خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ اشیاء و خدمات سے مستفید ہو سکے یوں ان سب کے درمیان بہتر قیمت کے حصول کے لئے باقاعدہ مقابلہ جاری رہتا ہے ۔ یہ صرف مارکیٹ ہے جہاں ایک خود کار عمل کے تحت معاشی فیصلہ ہوتا ہے کہ ان سب کے شخصی مفادات کہاں اور کس طرح پورے (fulfill) ہوتے ہیں ۔یہ ایک پرامن اور ترقی پسند معاشی بندوبست ہے جس کی بنیاد رضاکارانہ تعاون پر ہے ۔

بلیک اور"ان فارمل" مارکیٹ کیسے اور کیونکر قائم ہوتی ہے ۔

ایک چیز حتمی ہے وہ یہ کہ اگر لوگ اپنی ضروریات و خواہشات کو براہ راست ایک آزاد مارکیٹ سے پورا نہیں کرسکیں گے تو وہ دوسرے ذرائع (قانونی و غیر قانونی) استعمال کریں گے۔تاکہ اپنے نجی مقاصد کی تکمیل کر سکیں۔ مارکیٹ کو تو خریدار اور فروخت کنندہ چاہیئے ہوتا ہے۔دونوں

جہاں مل گئے اور انہیں لین دین میں فائدہ محسوس ہوا وہیں مارکیٹ قائم ہوگئی۔مارکیٹ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں حکومت و ریاست کے ادارے و نگران اس پر کڑا پہرا لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔مارکیٹ تو انٹارکٹکا میں بھی قائم ہوجائے گی۔اگر دو افراد ایک دوسرے کو کاروبار میں یا کسی دوسرے طریقے سے facilitate کر سکیں گے - مارکیٹ تو ہمالیہ کے جنگلوں میں بھی قائم ہوجائے گی جہاں چند افراد پر مشتمل ایک قبیلہ کے لوگ ایک دوسرے سے یا کسی دوسرے قبیلہ کے افراد سے اپنی ضروریات و خواہشات کا پر امن تبادلہ کریں گے ۔مارکیٹ کو صرف خریدار ، فروخت کنندہ اور ان کے درمیان کمیونیکشن و ٹرانزیکشن کی ضرورت ہوتی ہے۔اسے حکومت یا اداروں کی نہیں باقاعدہ طور پر قطعا ضرورت نہیں ہوتی ۔

جب تک حکومت و سرکاری ادارے لوگوں کے پر امن لین دین کے بیچ مداخلت نہیں کرتے لوگ اوپن مارکیٹ میں اپنے معاشی مقاصد کی آزادانہ جستجو کرتے رہتے ہیں اور جب انہیں محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کنٹرول ، منصوبہ سازی یا ریگولیشن کے نام پر انکے باہمی لین دین میں رکاوٹ ڈال رہی ہے تو وہ اوپن سے خفیہ جگہ کا انتخاب کرتے ہیں جسے بلیک مارکیٹ یا انفارمل مارکیٹ بھی کہتے ہیں ۔اوپن مارکیٹ کا ملک کی معیشت کو فائدہ ہوتا ہے۔نہ صرف ٹیکسز کی شکل میں حکومت کو ریوینو وصول ہوتا ہے بلکہ مارکیٹ میں اگرکسی فریق سے زیادتی ہوتی ہے یا کوئی دوسرا فریق کنٹریکٹ کی پابندی نہیں کرتا تو ریاست اپنے عدالتی نظام کے تحت انصاف کو یقینی بنا سکتی ہے۔ تیسرا یہ کہ اوپن مارکیٹ فنانشل سیکٹر سے براہ راست تعلق رکھتی ہے جب کہ بلیک مارکیٹ کو فنانشل سیکٹر کی خدمات حاصل نہیں ہوتیں یوں بغیر فنانشل سیکٹر کے یہ معاشی سرگرمیاں اپنے حقیقی پوٹینشل کے حصول میں ناکام رہتی ہیں - اس طرح ان میں گروتھ کے امکانات انتہائی محدود رہتے ہیں –

اس کی مثال ہم شراب سے سمجھ سکتے ہیں ۔ہم جانتے ہیں کہ پاکستان میں لوگوں کی کچھ تعداد ایسی بھی ہے جو شراب کو پسند کرتی ہے اور اسے پینا چاہتی ہے۔دوسری طرف حکومت نے شراب نوشی پر پابندی لگائی ہوئی ہے یوں شراب اوپن مارکیٹ میں دستیاب ہی نہیں۔اب خریدار تو موجود ہے اور شراب بنانے والے بھی۔یوں شراب کی تیاری اور خرید و فروخت اوپن مارکیٹ سے بلیک مارکیٹ یا ان فارمل مارکیٹ کی طرف شفٹ ہوگئی ہے۔ اس سے ہوا کیا ہے ؟ ایک یہ کہ شراب مارکیٹ کی کوالٹی بری طرح متاثر ہوئی ہے کیونکہ مارکیٹ منشیات فروشوں اور سٹیٹس کو کے زیر سایہ کام کرنے والے بدمعاش لوگوں کے قبضہ میں آ گئی ہے جو اپنی اجارہ داری سے لطف اندوز ہو رہے ہیں (شریف لوگوں کے لئے اس مارکیٹ میں کام کرنے کی حکومت نے گنجائش جو نہیں رکھی) ۔ہم آئے دن سنتے رہتے ہیں کہ فلاں خوشی کی تقریب میں لوگوں نے شراب پی جومکمل طور پر تیار یعنی پکی نہیں تھی یا اس میں زہر ملا ہوا تھا جس سے اتنے لوگوں کی ہلاکت ہوگئی۔یوں بلیک مارکیٹ میں حفظان صحت کا تصور ختم ہوجاتا ہے –اسی حوالے سے اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں جو چار بڑے امراض پائے جاتے ہیں جن سے لوگوں کی بڑے پیمانے پر ہلاکتیں ہوئی ہیں وہ درج ذیل ہیں

ایک : ہیپاٹائٹس B

دوم : بچوں میں موٹاپا

سوم: تشدد

چہارم : مضر صحت الکحل کی پاکستان میں کھپت (consumption)

جی ہاں .... پاکستان میں خراب کوالٹی کی شراب کے سبب ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد کل غیر طبعی ہلاکتوں کے اعتبار سے چوتھے نمبر ہے **(128)**

۔ دوسرا گورنمنٹ اپنے ٹیکس ریونیو سے محروم ہوگئی۔ تیسرا ایک بڑی مارکیٹ جو لاکھوں لوگوں کو روزگار فراہم کر سکتی تھی اسے بند کر دیا گیا۔چوتھا یہ کہ تمام افراد سے امتیاز برتا گیا۔وہ اس طرح سے کہ جس طرح لوکل مارکیٹ میں بلیک اکانومی ہوتی ہے اسی طرح ایکسپورٹ امپورٹ کی مارکیٹ میں بھی بلیک اکانومی پائی جاتی ہے۔یہاں ایک بات خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہے کہ وہ اشیاء وخدمات جو اوپن مارکیٹ میں کم داموں پردستیاب ہوسکتی ہیں،بلیک مارکیٹ میں انکی قیمت کئی گنا ہوتی ہے۔ اب ایک عام آدمی جو شراب پینا چاہتا ہے وہ مہنگی مگر ناقابل اعتبار کوالٹی کی شراب پینے پر مجبور ہے۔جبکہ طبقہ امراء کے لوگ امپورٹ کی بلیک اکانومی کے سبب غیر ملکی مشروبات کی سہولیات سے مستفید ہوتے ہیں ۔ مارکیٹ موجود رہتی ہے صرف خریدار اور سیلرز اپنی لوکیشن اور ٹرانزیکشن کے طریقہ کار کو بدل دیتے ہیں۔ پنجم یہ کہ بلیک مارکیٹ میں اچھی کوالٹی کا دستیاب ہونا بذات خود امتیازی رتبہ کی شناخت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔لوگ اپنی تقریبات میں اسے فخر سے پیش کرتے ہیں اور اس بات پر اتراتے ہیں کہ دیکھیں جی یہ پروڈکٹ فلاں ملک کا ہے یہ مارکیٹ میں بھلا کہاں سے ملتا ہے اسے ہم نے اپنے خاص ذرائع سے حاصل کیا ہے۔اسی طرح نوجوانوں میں اس ایڈونچر کا شوق پیدا ہوتا ہے کہ وہ کچھ انوکھا کام کریں جو دوسرے نہیں کر رہے اور چونکہ شراب نوجوانوں کے لیے مرغوب بھی ہوتی ہے اس لئے اس میں ایڈونچر کا شوق اور اس کی مرغوبیت شراب نوشی کے مزید رجحانات کو جنم دیتی ہے۔

جو اشیاء و خدمات یا تو ممنوع کر دی جاتی ہیں یا ان پر قیمتوں کے کنٹرول کا نظام نافذ کر دیا جاتا ہے مگر صارفین کو ان کی ضرورت ہنوز رہتی ہے تو وہ اشیاء و خدمات بلیک مارکیٹ میں ہی منتقل ہوجاتی ہیں۔بلیک مارکیٹ میں قیمتیں اوپن مارکیٹ سے بہت زیادہ ہوتی ہیں جس کی ایک بڑی وجہ قانونی خطرہ کا ہونا ہے جسے پورا (Compensate) کرنے کے لیے سیلرز زیادہ قیمتیں وصول کرتے ہیں۔قانونی خطرہ کے علاوہ مقابلہ کی ثقافت کی عدم موجودگی کے سبب بھی اجارہ داری کی لاگت (cost)، سیاستدانوں اور بیوروکریٹ انتظامیہ سےبچنے کے لیے کرپشن کی لاگت ، راء میٹریل ، سپلائی اور پیداواری سرگرمی کو خفیہ رکھنے کے سبب آنے والی زیادہ لاگت اور باقی دوسری لاگتیں مل کر بلیک مارکیٹ کی قیمتوں کو کئی گنا بڑھا دیتی ہیں یوں اس مارکیٹ سے مستفید ہونے والے زیادہ تر افراد کا تعلق طبقہ امراء سے ہی ہوتا ہے کیونکہ صرف وہ لوگ

ہی اتنی زیادہ قیمت افورڈ کر سکتے ہیں اور جو سستا مگر غیر معیاری مال بچتا ہے وہ عام شہریوں کے لئے ہوتا ہے جو عموما ان کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے – یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشیاء و خدمات پر یہ پابندی دراصل غرباء کی قوت خرید پر ہی پابندی ہے جبکہ امراء اس سہولت سے مستفید ہوتے ہی رہتے ہیں چاہے پہلے کی نسبت اب ان کے اخراجات زیادہ آ رہے ہوں ۔

جب قیمتیں کنٹرول کرلی جاتی ہیں تو کوالٹی کا مسئلہ بھی پیدا ہوجاتا ہے۔

مثال کے طور پر ہم سیب کی مثال لیتے ہیں ۔گورنمنٹ سیب کی باقاعدہ سمجھ بوجھ کے بعد ایک قیمت طے کردیتی ہے۔اور لوگوں سے کہتی ہے کہ سیب اگر ملے گا تو صرف اس قیمت پر ملے گا۔اس سے زیادہ پر ہرگز نہیں۔ اب ہوتا کیا ہے کہ مارکیٹ میں سیب کی کوئی ایک قیمت تو ہوتی نہیں بلکہ اسکی کم از کم تین قیمتیں ہوتی ہیں اچھی کوالٹی کا سیب اسکی قیمت بہت زیادہ ،درمیانی کوالٹی کا سیب اس کی قیمت درمیانی اور کمزور کوالٹی کا سیب اس کی قیمت کم ہوتی ہے۔ فرض کیا کہ اچھی کوالٹی کے سیب کی قیمت 10روپے ہے درمیانی کوالٹی کے سیب کی قیمت8روپے، اور کمزور کوالٹی کے سیب کی قیمت6روپے ہے۔حکومت مارکیٹ میں سیب کی قیمت فرض کیاآٹھ روپے مقرر کر دیتی ہے۔اب ہوگا یہ کہ سیب کے دکاندار ان تینوں کوالٹیوں کے سیب پر نہ اپنا وقت خرچ کریں گے اور نہ پیسہ کہ اچھے ،بہت اچھے اور کم اچھے سیبوں کو علیحدہ علیحدہ کریں اور ان کو خریدار کی ترجیحات کی بنیاد پر پیش کریں ۔کیونکہ ان دکاندار کو جو قیمت وصول ہونی ہے وہ تو ہے ہی مقررہ اور اس سے نہ ہی مارکیٹ میں مقابلہ کی ثقافت پیدا ہو گی کہ باقیوں سے بہتر کوالٹی اور قیمت دینے کا رجحان فروغ پائے ۔وہ ان سب کومکس (mix) کرکے کنزیومر کے سامنے رکھ دیتے ہیں ۔کنزیومر بھی مجبور ہے کہ سب سیب آٹھ روپے میں خریدے اور خود ہی ان کی چھانٹی کرتا پھرے۔

دوسرا یہ ہوگا کہ مارکیٹ کا رجحان کنزیومرز کی پسند ناپسند سے قیمتوں کو کنٹرول کرنے بیوروکریسی کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ سیب بیچنے والے اپنی تنظیم یا یونین بنائیں گے چندہ جمع کر کے خفیہ طریقے سے بیوروکریسی کو رشوت دینے کا رجحان فروغ پائے گا اور بدلے میں سرکاری قیمت کو بڑھا کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ایک بیوروکریٹک کنٹرول کی مارکیٹ میں پروڈیوسر کا رجحان کنزیومر سے ہٹ کر بیوروکریٹ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔اب وہ کنزیومر کو اپنی پروڈکٹ یا سروس کی کوالٹی اور بہتر قیمت کی ترغیبات پیش کرنے کے بجائے بیوروکریٹ کو ترغیبات مہیا کرے گا کہ وہ اس کے نفع کے حصول میں اپنی کرپشن قبول کرے۔

تیسرا یہ ہوگا کہ ایک پروڈیوسر اپنے سیبوں کی چھانٹی کرے گا اور جو اچھی کوالٹی کے سیب ہوں گے انہیں بلیک مارکیٹ میں بیچے گا یا ایکسپورٹ کردے گا۔جہاں اسے بہتر قیمت مل رہی ہوگی اور اپنے ملک میں مقررہ قیمت کافائدہ یوں اٹھائے گا کہ خراب کوالٹی کے سیب مقامی خریداروں کو بیچنے کی کوشش کرے گا کیونکہ قیمت تو مقررشدہ ہے ۔اب اگر حکومت ایکسپورٹ پر پابندی لگانے کی کوشش کرتی ہے تو ایکسپورٹ سیکٹر

بری طرح متاثر ہوگا اور حکومت کو فارن اکاؤنٹ میں خسارے کا سامنا کرنا پڑے گا۔کیونکہ ایکسپورٹ مارکیٹ سے حاصل ہونے والی فارن کرنسی سے ہی امپورٹ ممکن ہوپاتی ہے۔ اگر امپورٹ نہیں ہوگی تو لوکل مارکیٹ میں نہ ٹیکنالوجی کا نفوذ ہوسکے گا ، نہ نئی مشینیزی آ سکے گی اور نہ ہی ملک کی پیداواری سرگرمیوں میں اضافہ ممکن ہو پائے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری مارکیٹ و معیشت زوال کا شکار ہوجائے گی۔

جب مارکیٹ زوال کا شکار ہوتی ہے تو بیوروکریسی بجائے اس کے کہ معیشت کی سائنس کو سمجھے اور مارکیٹ سے متعلق اپنی منصوبہ بندیوں کی ناکامیوں کا ادراک کرے الٹا مارکیٹ کو مزید کنٹرول کرنے کی کوشش کرتی ہے۔پروڈیوسرز کے گوداموں پر چھاپے مارے جاتے ہیں -بلیک مارکیٹ کے خلاف کریک ڈاؤن ہوتا ہے ،خرید و فروخت کے مراکز کی خفیہ یا ظاہراً نگرانی کی جاتی ہے،پکڑ دھکڑ ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں زیادہ سے زیادہ آمریت اور جبر کی فضا پیدا ہوتی ہے۔جو طویل مدت میں ملک کی سیاست ،سماج اور معیشت کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔یوں پروڈیوسرز ایسے جبر میں مزید سرمایہ کاری اور منصوبہ بندیوں سے احتراز کرتے ہیں۔

چھٹی چیز جو ان بیوروکریٹک معیشتوں میں دیکھنے میں آئی ہے وہ یہ کہ پروڈیوسرز جب مارکیٹ میں قیمتوں کی کمی کے سبب نقصان اٹھاتے ہیں اور اشیاء کی تیاری پر آنے والی لاگت میں اضافہ ہوتا ہے تو حکومت کو ان سیکٹرز کو قائم رکھنے کے لئے سبسڈی دینا پڑتی ہے۔ تاکہ وہ اپنی لاگت میں اضافہ کو پورا کر سکیں اور ایک محدود منافع بھی کما سکیں کیونکہ ہر سیکٹر میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد کا روزگار ہوتا ہے — گورنمنٹ بے روزگاری کے ڈر سے ہر سیکٹر کو کسی بھی قیمت پر قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے -اب سبسڈی پر چلنے والے کمرشل ادارے کنزیومرازم کے بجائے بیوروکریسی کے سوشلزم پر منتقل ہوجاتے ہیں۔وہ کرپشن اور سیاسی اثر و رسوخ سے مزید سے مزید سبسڈی حاصل کرتے جاتے ہیں جس کا بوجھ ٹیکس کی صورت میں تمام کنزیومرز پر ہی پڑتا ہے اور وسائل کا نقصان بھی علیحدہ سے ہوتا ہے۔

ساتویں چیز یہ کہ جب آپ مارکیٹ کے ایک سیکٹر پر پرائس کنٹرول لگاتے ہیں تو در اصل آپ ایک رجحان کا آغاز کر رہے ہوتے ہیں کہ مزید سیکٹرز پر بھی عوامی یا سٹیٹس کو کے مطالبے پر پرائس کنٹرول لگایا جا سکتا ہے (ریاستیں بھی اپنے برے تجربات سے اس وقت تک نہیں سیکھتیں جب تک کہ ملک کی معیشت دیوالیہ نہ ہو جائے یا گہری کھائی کے کنارے پر نہ پہنچے) ۔ اسی طرح جب آپ ایک سیکٹر کو سبسڈی دیتے ہیں تو باقی سیکٹرز بھی اپنے ہاتھ پھیلاد یتے ہیں کہ ہمیں بھی سبسڈی دی جائے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مارکیٹ فری نہیں رہتی۔بلکہ اجارہ دار طبقات آپس میں وسائل اور خزانے کے حصے پر لڑتے ہیں۔کمرشل ادارے نفع کے حصول کے لیے کنزیومرز کو نہیں بلکہ بیوروکریسی سمیت ہر متعلقہ سٹیٹس کو کو ترغیبات دیتے ہیں۔مارکیٹ میں بہتر کوالٹی اور کم قیمت کا فائدہ (incentive) ختم ہوجاتا ہے۔مارکیٹ میں ہر نیا آنیوالا پروڈیوسر صرف اس وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب تک کہ بیوروکریسی اور بقیہ سٹیٹس قوتیں اس کی سرپرستی نہ کریں یوں حقیقتا ساری

معیشت بیوروکریٹک سوشلزم یا سٹیٹ ازم کو پیاری ہوجاتی ہے اور کنزیومر ازم کمزور اور شکستہ تر رہ جاتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ انوویشن اور نئی ٹیکنالوجی کی ضرورت اور ترغیب کم پڑ جاتی ہے

قیمتوں کے کنٹرول کا نظام اور کوالٹی کا مسئلہ : میڈیکل سیکٹر کی مثال ۔

فرض کیا کہ حکومت نے ادویات پر پرائس کنٹرول لگا دیا ہے اب ادویات ساز کمپنیاں کیا کریں گی؟ وہ کم بہتر کوالٹی کی ادویات مارکیٹ میں لائیں گی تاکہ اپنی لاگت کو پورا کر سکیں۔کم کوالٹی کی ادویات سے مریض کی صحت پر مزید اخراجات آئیں گے بجائے اس کے کہ وہ مقابلہ کی ثقافت میں جو بہتر کوالٹی کی دوا کی صحیح قیمت بنتی ہے وہ ایک ہی وقت میں ادا کرے اور اپنی صحت کو محفوظ کرلے۔حقیقت یہ ہے حکومت صرف ایک چیز کنٹرول کر سکتی ہے قیمتیں یا پھر کوالٹی – کم سے کم قیمت پر بہتر سے بہتر کوالٹی کی خواہش پورے میڈیکل سیکٹر کو تباہ کر دیتی ہے – میڈیکل سیکٹر پر تحقیقات کے مطابق جن ممالک میں ادویات پر قیمتوں کے کنٹرول کا نظام لاگو نہیں وہاں ادویات کی کوالٹی انتہائی شاندار ہے۔(129)

اکنامکس ایک سائنس ہے۔اسے اگر بطور سائنس کے ڈیل نہ کیا جائے تو بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے۔

ہم اس سلسلے میں ایک دلچسپ مثال لیتے ہیں یہ سولہویں صدی کے سپین کی بات ہے جب سپین کی افواج نےAntwerp کے قلعہ کو گھیر لیا۔جب حصار بندی ہوگئی تو خوراک چونکہ محدود تھی اور دن بدن کم ہوتی جارہی تھی تو قیمتیں بڑھنے لگیں۔زیادہ قیمتوں کا فائدہ لینے کے لیے باہر سے لوگ چوری چھپے اشیاء خوردونوش قلعہ کے اندر سمگل کرنے لگے۔یوں زیادہ قیمت پر سہی مگر خوراک کا مسئلہ حل ہوتا رہا۔مگر عوام کی فریاد پر کہ قیمتیں بہت زیادہ ہیں قلعہ کی سیاسی طاقتوں نے قیمتوں کی ایک حد مقرر کردی اور زیادہ قیمت پر اشیائے خوردونوش بیچنے پر پابندی لگا دی۔اب حیرت انگیز طور پر قلعہ کے باہر سے اندر کی طرف سمگلنگ رک گئی کیونکہ اسمگلرز کی ترغیب (Incentive) ہی ختم ہو گئی کہ وہ چوری چھپے خطرات کا سامنا کرکے اندر جائیں اور چیزیں بیچیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ قحط پڑگیا۔حکمرانوں کو سمجھ ہی نہ آئی کہ آخر ہو کیا رہا ہے۔قحط اتنا پھیلا کہ مجبوراً قلعہ بند قوتوں کو ہتھیارپھینکنا پڑے۔ (130)

اسی تناظر میں تحقیقات کے مطابق پرائس کنٹرول سسٹم اپنے نتائج میں الٹا اشیاء میں قحط یا قلت کا سبب بنتا ہے – (131)

قیمتیں انحصار کرتی ہیں : ڈیمانڈ، سپلائی اورپیداواری اخراجات پر۔ یہ تینوں باہم متعلق (Interrelated) ہیں۔ایک مارکیٹ میں تمام اشیاء و خدمات کی قیمتیں ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں۔مثال کے طور پر اگر کسی ایک پروڈکٹ کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے اورکنزیومر کے پاس

کوئی دوسرا متبادل نہیں ہوتا تو وہ اپنے زیادہ روپے اس پروڈکٹ پر لگائے گا اور باقی اشیاء و خدمات کی خرید و فروخت پر کم خرچ کرے گا۔یوں باقی اشیاء کی ڈیمانڈمیں بھی کمی آئے گی اور اس کی قیمتیں گرجائیں گی۔

اس طرح جب ایک پراڈکٹ کی قیمت بڑھتی ہے تو کنزیومر اس کے متبادل کی طرف شفٹ ہوجاتا ہے۔یوں اس متبادل کی قیمت بھی بڑھ جاتی ہے۔مثال کے طور پر اگر آٹے کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے جو کنزیومر کے بجٹ میں اضافہ کا سبب بنتا ہے تو کنزیومر اب اپنے کچھ خرچ (consumption) کو چاول کی طرف بھی منتقل کر دے گا۔اگر وہ ہفتے میں ایک دن چاول کھاتا تھا تو اب وہ اسے دو دن کھانا شروع کر دے گا۔یوں آٹے کی ڈیمانڈ میں نسبتا کمی آئے گی اور اس کی قیمت بھی کم ہو جائے گی جبکہ کھپت (consumption) کا چاول کی طرف منتقل ہونے کے سبب اب چاول کی ڈیمانڈ میں بھی نسبتا اضافہ ہوگا۔یوں اس کی قیمت بھی بڑھنے لگے گی یہ سب کچھ ایک خودکار نظام کے تحت ہو رہا ہوتا ہے مگر عام آدمی عموما یہی سمجھتا ہے کہ ایک چیز کی قیمت بڑھ گئی ہے مگر حکومت اس پر کچھ نہیں کر رہی ۔

اسی طرح جب کسی ایک شے یا خدمت کو کنٹرول کیا جاتا ہے تو اس کا اثر باقیوں پر بھی پڑتا ہے۔یوں کسی ایک کو کنٹرول کرنے کی کوشش پورے معاشی نظام کو کنٹرول کرنے کی طرف لے جاتی ہے (اس پر پہلے بھی ہم نے تفصیل سے بات کی)۔

قیمتیں ساکن نہیں ہوتیں

کیونکہ ضروریات وخواہشات میں رجحانات ،راء میٹریل کی سپلائی اور لاگت، کنزیومرز کی ڈیمانڈ، پروڈیوسرز کی سپلائی، اور محنت کی اجرت وغیرہ یہ سب چیزیں بدلتی رہتی ہیں۔جن کے نتیجے میں قیمتیں اور قیمتوں کے نتیجے میں دیگر متعلق (concerned) چیزیں بھی بار بار بدلتی رہتی ہیں،یہ سال ،مہینہ،ہفتہ ،دن ،گھنٹے ،منٹ اور یہاں تک کہ سیکنڈوں کے حساب سے بدلتی ہیں۔اگرکسی نے مشاہدہ کرنا ہو تو وہ سٹاک ایکسچینج میں بدلتی ہوئی قیمتوں کا مشاہدہ کرے یا فارن ایکسچینج کی ٹرانزیکشن میں بدلتے ہوئے ریٹس (rates) کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ قیمتوں کے نظام کو سرکاری سطح پر کنٹرول یا منصوبہ بند کرنے کی ہر کوشش درحقیقت معاشی تاریخ اور تجربات کی رو سے اب تک ناکام ٹھہری ہے اس سلسلے میں ذیل میں وینزویلا کی مثال لیتے ہیں ۔

وینزویلا : مارکیٹ کے اصولوں سے انحراف کا بھیانک انجام

ریکارڈو ہاسمین

معشیت میں نئے خیالات کی اپیل یقیناً پائی جاتی ہے اور یہ جائز بھی ہے. مگر سوال یہ بھی ہے کہ کیا ہر نئی چیز اچھی بھی ہو گی اور کیا ہر اچھی چیز نئی ہی ہو گی ؟

چین کے ثقافتی انقلاب (cultural revolution) کی پچاسویں برسی یہ یاد دہانی ہے کہ جب مسلمہ حقائق کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے. وینزویلا کا موجودہ تباہ کن بحران بھی ایک اور مثال ہے- ایک ملک جسے امیر ہونا چاہئے تھا، دنیا کے گہرے ترین بحران، بے انتہا مہنگائی، اور بد ترین زوال کے سماجی اشاروں سے گزر رہا ہے- اس کے شہری جو دنیا کے سب سے زیادہ تیل کے ذخائر کے مالک ہیں. خوراک اور ادویات کی کمی سے قحط زدہ ہیں اور مر رہے ہیں .

جب یہ سانحہ پک رہا تھا، وینزویلا اقوام متحدہ کی خوراک اور زراعت کی تنظیم، لاطینی امریکا کے اکنامک کمیشن، برطانوی لیبر پارٹی کے لیڈر Jeremy Corbyn سابق برازیلوی صدر لولا ڈی سلوا، اور امریکی سنٹر فار اکنامک پالیسی ریسرچ سمیت کچھ دیگر اداروں سے دادو تحسین حاصل چکا تھا.

اب اس ملک کی تباہی اور زوال سے دنیا کو کیا سیکھنا چاہئے ؟ مختصر یہ کہ وینزویلا معاشیات کے بنیادی اصولوں کو مسترد کرنے کے انجام کا عبرت ناک منظر ہے .

ان میں سے ایک اصول یہ ہے کہ سماجی فلاح حاصل کرنے کے لئے بہتر آئیڈیا یہ ہے کہ مارکیٹ کو کام میں لایا جائے نہ کہ اسے دبا دیا جائے- حقیقت یہ ہے کہ مارکیٹ خود تنظیمی (self-organization) کی ایک ضروری صورت ہے جس میں ہر فرد اپنے معیار زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے محنت کرتا ہے وہ (اشیاء یا خدمات) پیش کرکے، جو دوسرے افراد کے لئے ضروری و اہم ہوتی ہیں -

بہت سارے ممالک میں لوگ خوراک، صابن، اور ٹوائلٹ پیپر خریدتے ہیں. اس کے لئے انہیں کسی قومی پالیسی کے ڈراؤنے خواب سے نہیں سامنا کرنا پڑتا جیسا کہ وینزویلا میں ہوتا رہا (جہاں صابن اور ٹوائلٹ پیپر کے لئے بھی قومی منصوبہ بندی ہوتی تھی) مگر فرض کیا کہ آپ کو وہ نتائج پسند نہیں جو مارکیٹ پیدا کرتی ہے جیسا کہ گرین ہاؤس گیسوں کا اخراج، تو سٹینڈرڈ معاشی نظریہ کہتا ہے کہ آپ کچھ ٹرانزیکشنز پر ٹیکس لگائیں – اور یہ ٹیکس کے پیسے ان لوگوں کو دیں جو مارکیٹ میں مقابلہ سے پیچھے رہ گئے، اور مارکیٹ کو اپنا کام کرنے دیں.

ایک اور متبادل جو سینٹ تھامس آکیانوس نے پیش کیا تھا وہ یہ کہ قیمتوں کو انصاف پر مبنی ہونا چاہئے – معیشت کہتی ہے کہ یہ بہتر نظریہ نہیں – کیونکہ قیمتیں معلومات کا نظام ہیں جو سپلائرز اور کسٹمر کے لئے محرکات پیدا کرتا ہے کہ انہوں نے کیا اور کتنا پیدا کرنا یا خریدنا ہے- ریاست کی طرف سے قیمتوں کو طے کرنے کی کوشش اس نظام کو ناکام کر دیتی ہے جس سے معشیت میں دائمی انحطاط آجاتا ہے.

وینزویلا میں just cost and prices کا قانون ہی اس کی وجہ ہے کہ کسان وہاں کاشتکاری نہیں کرتا – اسی وجہ سے زراعت کی پروسیسنگ کا کام کرنے والی کمپنیاں اپنا کام بند کر کے جا چکی ہیں – سادہ الفاظ میں، قیمتوں کو کنٹرول کرنے سے بلیک مارکیٹ کے لئے ترغیب پیدا ہوتی ہے کہ اس میں جائیں جو چاہیں چیزیں خریدیں یا بیچیں . اس قانون کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ملک جس میں بہت وسیع و عریض قیمتوں کے کنٹرول کا نظام ہے وہ دنیا میں بلند ترین شرح مہنگائی رکھتا ہے- اسی طرح پولیس کی کوششوں میں بھی حد درجہ وسعت آگئی ہے کہ ان مینیجرز کو جیلوں میں ڈال دیا جائے جو اپنی اشیاء گوداموں میں رکھتے ہیں – اور سرحدیں بند کر دی گئی ہیں تاکہ سمگلنگ سے بچاؤ کیا جائے. قیمتوں کو سرکاری طور پر مقرر کرنا ایک ایسی تنگ گلی ہے جس کا انجام موت ہے- اس کے لئے آپ کو اشیاء پر سبسڈی دینا پڑتی ہے تاکہ چیزوں کی پیداوار پر کم خرچ آئے یوں اشیاء کی قیمتیں بھی کم رہیں.

یہ بلا وسطہ سبسڈی دینے کا نظام فورا پوری معشیت میں گندگی کا سبب بنتا ہے- وینزویلا میں بجلی اور گیسولین پر سبسڈی تعلیم اور صحت کے مجموعی بجٹ سے بھی زائد ہے.. وینزویلا میں روزانہ کی سرکاری طور پر مقررہ اجرت پر آپ مشکل سے 227 گرام گائے کا گوشت خرید سکیں گے، یا بارہ انڈے، مگر اس اجرت سے آپ 1000 لیٹر گیسولین یا 5100 KWH بجلی خرید سکتے ہیں جس سے پورے قصبہ کو بجلی دی جاسکتی ہے – (مگر دلچسپ یہ بھی ہے کہ وینزویلا میں بھی بجلی کی شدید ترین لوڈ شیڈنگ ہے)- ایکسچینج ریٹ پر سبسڈی اپنے آپ میں ایک نیا معمہ ہے اگر آپ ایک ڈالر کو بلیک مارکیٹ میں جا کر بیچیں، وصول شدہ رقم سے گورنمنٹ کے مقرر شدہ ایکسچینج ریٹ پر آپ 100ڈالر خرید سکتے ہیں-

ان حالات میں آپ کو گورنمنٹ کی مقرر کردہ قیمتوں پر نہ اشیاء مل سکتی ہیں اور نہ ڈالرز- مزید یہ کہ جب سے گورنمنٹ کے پاس یہ استطاعت ختم ہوئی ہے کہ وہ قیمتوں کو کم رکھنے کے لئے انڈسٹریز کو ضروری سبسڈیز مہیا کرے، پیداوار میں شدید ترین کمی آئی ہے. یہ وینزویلا کے بجلی اور صحت کے سیکٹرز سمیت اور بہت سارے سیکٹرز میں ہو رہا ہے-

بلا واسطہ (Indirect) سبسڈیز میں بھی تنزلی ہے. کیونکہ جو امیر ہے وہ غریب سے زیادہ خرچ کرتا ہے یوں اسے اس کا زیادہ فائدہ پہنچتا ہے – یہ اس کے لئے زیادہ موزوں ہے. یہ پرانی مروجہ دانائی کا ثبوت مہیا کرتا ہے کہ اگر آپ مارکیٹ کے نتائج میں تبدیلی چاہتے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ مارکیٹ یا سیکٹر کو نہیں بلکہ براہ راست لوگوں کو نقدی (cash) کی شکل میں سبسڈی فراہم کریں.

ایک اور روایتی مروجہ دانائی یہ ہے کہ ریاستی ملکیت میں چلنے والے اداروں میں ایمانداری کی ترغیبات کا سٹرکچر اور ان میں بہتر و ضروری علم پیدا کرنا کہ وہ ان اداروں کو بہتر صورت میں چلا سکیں ایک بہت ہی مشکل کام ہے. اسی لئے صرف ضروری یہ ہے کہ ریاست کے پاس محدود تعداد میں اسٹریٹجک اہمیت کی فرمز یا سرگرمیاں ہوں جو مارکیٹ کے خطرات سے ماورا ہوں.

وینزویلا نے ان اصولوں کو مسترد کر دیا اور نجی سیکٹرز کو سرکاری تحویل میں ضبط کرنا شروع کر دیا- خاص طور پر جب 2006 کے بعد آنجہانی صدر ہیوگوشاویز دوبارہ سے منتخب ہوئے تو انہوں نے زرعی فارمز، سپر مارکیٹس، بنکس، ٹیلی کامز، پاور کمپنیز، تیل پیدا کرنے اور سروس مہیا

کرنے والی فرمز، اور مینو فیکچرنگ کمپنیاں جو سٹیل سیمنٹ کافی، دہی، ڈیٹرجنٹ، اور یہاں تک کہ شیشے کی بوتلیں بناتی تھیں انہیں بحق ریاست ضبط کر لیا گیا – ان تمام اداروں میں پروڈ کٹوٹی (تخلیقی صلاحیت) تباہ کن حد تک گر گئی.

حکومتیں عموما اپنے کھاتوں کو متوازن کرنے کی جدوجہد کرتی ہیں. جس سے وہ حد سے زیادہ مقروض ہو جاتی ہیں اور فنانشل مصائب پیدا ہوتے ہیں. ابھی تک حکومت کے کھاتوں میں مالیاتی امور کو ہوشیاری سے سر انجام دینا مروجہ معاشیات کا ایسا اصول ہے کہ جس پر بہت زیادہ تنقید ہوتی ہے. مگر وینزویلا ایک مثال ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ جب ہوشیاری پر تیوری چڑھانے کی نفسیات غالب آجاتی ہے اور مالیاتی معلومات کو ریاستی خفیہ رازوں کی طرح سمجھا جاتا ہے تو اصل میں کیا ہونا ہوتا ہے-

افسوسناک امر یہ کہ وینزویلا نے دو ہزار چار سے تیرہ کے دوران تیل کی قیمتوں کے عروج سے یہ کام لیا کہ اپنے بیرونی قرضوں کو پانچ گنا تک بڑھایا دیا. سنہ 2013 میں جب وینزویلا کے بے اعتدال قرضوں نے اسے بین الاقوامی کیپیٹل مارکیٹ سے باہر نکال پھینکا تو اس کے بعد ریاست نے پیسے چھاپنے شروع کر دیئے . اس سے پچھلے تین سالوں میں کرنسی اپنی 98 فیصد ویلیو سے محروم ہو چکی ہے. جب 2014 میں تیل کی قیمتیں گر گئیں تو ملک اس قابل نہیں تھا کہ کسی سہارے پر کھڑا ہو سکے- ملکی پیداوار اور امپورٹ کرنے کی صلاحیت تباہ کن حد تک گر چکی تھی. جس نے موجودہ سنگین بحران کو جنم دیا.

اکنامکس جن مروجہ اصولوں پر قائم ہے اسے ہم نے تاریخ کے تکلیف دہ اسباق سے سیکھا ہے. جس کا خلاصہ ہم سمجھتے ہیں کہ درست ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ ہر چیز پرفیکٹ ہے. ترقی کا تقاضا ہے کہ غلطیوں کی نشاندہی کی جائے اس کے بعد ہمیں ان کے حل میں نئے خیالات کی ضرورت ہوتی ہے. مگر اس وقت سیکھنا بہت مشکل ہوتا ہے جب اعمال نتائج کے قریب ہوں - یہ ایسا ہی ہے جب آپ شاور لے رہے ہوں اور ساتھ میں پانی کے ٹمپریچر کو منظم کرنے کی بھی کوشش کریں (جو یقیناً پہلے کرنے کا کام ہے)، جب رد عمل کا وقت کم ہو – نئے خیالات کی تلاش ضروری ہے مگر انتہائی ہوشیاری کی متقاضی بھی ہے. جب آپ تمام مروجہ اصولوں کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیں گے تو آپ چین کے ثقافتی انقلاب کی طرح تباہی دیکھیں گے اور آج اس کی مثال وینزویلا ہے -(132)

مقابلہ کی ثقافت میں ارتقاء ہے -

ناکامی کاروبار کے فطری عمل کا حصہ ہے- کمپنیاں بنتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں یوں کیپٹلزم آگے بڑھتا ھے۔ (فارچون میگزین)

کاروبار مارکیٹ کے لئے اہم ہیں- صارف طلب کرتا ہے اور کاروبار اس طلب کو رسپانس کرتے ہوئے سپلائی مہیا کرتے ہیں -کاروبار اور صارفین کے درمیان تعلق رضاکارانہ ہے- صارف کو کسی چیز کی ضرورت ہے وہ مارکیٹ میں کسی بھی پروڈیوسر سے وہ چیز خرید سکتا ہے- اگر وہ پسند کرے تو اس مخصوص چیز کو خریدنے کی بجائے اس کے متبادل سے بھی رجوع کر سکتا ہے- مثال کے طور پر اگر وہ مارکیٹ میں گیا ہے اور چائے خریدنا چاہتا ہے – مارکیٹ میں چائے دستیاب نہیں یا اسے اس کی من پسند بہتر کوالٹی نہیں مل رہی یا وہ چائے بیچنے والے دکانداروں کی خدمات سے مطمئن نہیں تو وہ مارکیٹ میں کافی خرید کر اس سے اپنا دل بہلا سکتا ہے اور فوری توانائی حاصل کرسکتا ہے-اسی طرح پروڈیوسر بھی پابند نہیں کہ کچھ مخصوص علاقے کے لوگوں کو ہی اپنی پروڈکٹ یا سروس پہنچے، وہ جہاں مطمئن ہوتا ہے وہیں پروڈکٹس یا سروسز مارکیٹ میں آفر کر دیتا ہے-

وسائل کی بہترین تفویض کا معیار کاروبار میں نفع و نقصان ہے - نفع سے مراد ہے کہ پروڈیوسر مقابلہ کی ثقافت میں دستیاب وسائل کو بہتر استعمال کر رہا ہے اور اسے صارف کا اعتماد حاصل ہے- نقصان سے مراد یہ ہے کہ پروڈیوسر یا تو اپنے وسائل کو بہتر استعمال نہیں کر رہا یا صارف کو اب اس کی ضرورت یا خواہش نہیں رہی یا وہ ان کا اعتماد کھو چکا ہے ۔

یہ نفع و نقصان اور ضروریات و خواہشات جامد نہیں ہوتیں یہ ایک متحرک عمل ہے- اور یہی متحرک عمل کیپٹلزم یعنی فری مارکیٹ کو بھی متحرک رکھتا ہے- ہر دس سال کے بعد فارچون 500 کمپنیوں کی لسٹ بدل جاتی ہے - ہر عشرے نئی ٹیکنالوجی مارکیٹ کو نئی شکل دے رہی ہوتی ہے- ہر عشرے مارکیٹ کے نئے ہیروز ہوتے ہیں، ہر عشرے کارجوؤں (entrepreners) کا زیادہ رجحان نئے سیکٹرز اور نئی انڈسٹری میں ہوتا ہے- اب تک تین صنعتی انقلاب آچکے ہیں اور ہم چوتھے صنعتی انقلاب کے دہانے پر ہیں مگر یہ عمل جاری ہے - معلوم سے نامعلوم کی طرف یہ سفر کیپیٹلزم کو زندہ رکھتا ہے -

اپنے مستقبل کو خود کمپنیاں بھی حتمی طور پر منصوبہ بند نہیں کر سکتیں اور نہ ہی کنٹرول ......، مستقبل غیر معلوم ہی رہتا ہے.

۲۰۰۳ء میں دنیا کا سب سے بڑا بنک جاپان کا Mizuho تھا -۲۰۰۳ء میں اسے 20 بلین ڈالر کا نقصان ہوا اور اس کے سٹاک کی قیمت ۹۳ فیصد گر گئی- اس کے سٹاک کی کل ویلیو جتنی گری وہ ایک ملک نیوزی لینڈ کی کل جی ڈی پی سے بھی زائد تھی- سوال یہ ہے کہ

کیاMizuho مستقبل پر اپنی کمانڈ برقرار رکھ سکا ؟ اگر اسے مستقبل کا یقینی علم ہوتا تو کیا وہ یہ سب ہونے دیتا؟ اور یہ کہ آخر کیا وجہ تھی کہ مارکیٹ لیڈر خود ہی مارکیٹ میں لڑ ھکڑا کر گر پڑا؟ یہ سب مارکیٹ کی آزاد قوتوں کے سبب تھا جو ناقابل کنٹرول ہیں ، آزادانہ کام کرتی ہیں ، مارکیٹ کو متحرک رکھتی ہیں ، جو اسے رسپانس کرے اور اس کے ساتھ ساتھ متحرک رہے اسے صلہ دیتی ہیں ورنہ اسے ناکام کر کے مارکیٹ سے نکال پھینکتی ہیں- اسے مقابلہ کی متحرک ثقافت کہتے ہیں-

کمپنیوں کا عروج و زوال ان کے نفع کی شرح پر انحصار کرتا ہے- جب کوئی نئ ٹکنالوجی یا نیا آئیڈیا لے کر کوئی کمپنی مارکیٹ میں آتی ہے تو وہ روایتی ٹکنالوجی اور روایتی کمپنیوں کے مقابلے میں زیادہ ریونیو یعنی زیادہ نفع کماتی ہے- یہ چیز پرانی کمپنیوں کو بھی مجبور کرتی ہے کہ وہ اب اپنی ٹکنالوجی میں جدت لائیں ، یا نئے آئیڈیاز کو تلاش کریں اور انہیں اختیار کریں- اسی طرح منافع کی زیادہ شرح دوسرے بزنس مین اور کارجوؤں (Entrepreneur) کو بھی ترغیب دیتی ہے کہ وہ اس سیکٹر میں سرمایہ لگائیں- یوں مارکیٹ میں جب زیادہ پروڈیوسر آتے ہیں اور مقابلہ بڑھ جاتا ہے تو کنزیومرز کے لئے قیمتیں اور پروڈیوسر کے لئے شرح منافع کم ہو جاتا ہے تا وقتیکہ نئ ٹیکنالوجی یا نیا آئیڈیا متعارف کروا کر پروڈیوسرز اپنے حریفوں کے خلاف نئ برتری (یعنی Comparative Advantage)حاصل کر لیتے ہیں یا مقابلہ کی سکت نہ ہونے کے سبب بطور کمپنی دم توڑ دیتے ہیں -

منصوبہ بندی (Planning) کا لبرل طریقہ

منصوبہ بندی کی مقبولیت کا راز ہر خاص و عام کی اس خواہش میں مضمر ہے کہ ہم اپنے مشترکہ مسائل ہر ممکن دور اندیشی سے حل کر سکیں- جدید منصوبہ سازوں اور لبرلز کا اختلاف اس نکتے پر قطعاً نہیں کہ آیا ہمیں اپنے معاملات سے متعلق منصوبہ بندی میں منظم طرز فکر کا استعمال کرنا چاہیے یا نہیں بلکہ اصل اختلاف منصوبہ بندی کے بہترین طریقے پر ہے- سوال یہ ہے کہ آیا ہمیں ایسا ماحول پیدا کرنا چاہیے جس میں شہریوں کے علم اور آزادانہ اقدامات کو کھل کھیلنے کا پورا موقع دیا جائے جس سے وہ خود انفرادی طور پر کامیاب منصوبہ بندی کر پائیں یا ہم مجموعی اقتصادی سرگرمیوں کی تنظیم و ترتیب ایک ایسے بلیو پرنٹ کی مطابق کریں جس میں شعوری طور پر معاشرے کے تمام وسائل کو ہانک کر منصوبہ سازوں کی اس فکر کا مقلد محض بنا دیا جائے کہ کس شخص یا طبقے کو کیا ملنا چاہیے (یا اس سے کیا کام لیا جائے)- یہ بات اہم ہے کہ موخر الذکر طریقے کی مخالفت کو معاشی معاملات کے نظم میں عدم مداخلت کے رویے پر نظریاتی یقین سے جدا رکھا جائے-

لبرل فکر یہ نہیں کہ چیزوں کو جس طرح وہ ہیں ویسے ہی چھوڑ دیا جائے بلکہ لبرل فکر انسانی (اقتصادی) کوششوں کو مربوط کرنے میں مسابقت کی طاقتوں کے، بطور ایک وسیلہ، بہترین استعمال کی حامی ہے- یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ جہاں بہترین مسابقتی ماحول پیدا کرنا

ممکن ہو وہاں انفرادی جدوجہد کو راہ دکھانے سے بہتر کوئی تجویز نہیں۔ فائدہ مند مسابقت کو یقینی بنانے کے لیے بھرپور سوچ بچار سے بنائے گئے قانونی ڈھانچے کی ضرورت بہت اہم ہے اور اس ضمن میں ماضی و حال کے قوانین شدید نقائص سے قطعا خالی نہیں۔ لبرل ازم، بہرحال، مسابقت کی جگہ اقتصادی سرگرمی منظم کرنے کے ہلکے طریقے مروج نہیں کرنا چاہتا۔

لبرل ازم کا مسابقت کی برتری پر یقین کا سبب صرف یہ نہیں کہ اکثر وبیشتر، معلوم طریقوں میں بہترین طریقہ مسابقت ہی ہے بلکہ یہ وہ واحد طریقہ ہے جسے حکومت کی جبری اور صوابدیدی دست اندازی کی ضرورت نہیں ۔ یہ وہ طریقہ ہے جو شعوری سماجی جبر سے بے نیاز کر کے افراد کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ خود فیصلہ کر سکیں کہ آیا ان کے لیے کسی بھی پیشے کے امکانات اس پیشے کے غیر مفید پہلووں کا مداوا کر پائیں گے یا نہیں۔

مسابقت کا کامیاب استعمال حکومتی مداخلت کی چند صورتوں کو باقی رکھتا ہے۔ اوقات کار کی تحدید، صفائی ستھرائی کے انتظامات کی شرط اور سماجی خدمات کے ایک بھرپور نظام کی فراہمی وغیرہ مسابقت کے تحفظ کے نظریہ سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ تاہم ایسے میدان بھی موجود ہیں جہاں مسابقت کا نظام قابل عمل نہیں۔ مثال کے طور پر جنگل کٹائی اور فیکٹریز کے دھویں کے تباہ کن اثرات کا معاملہ جائیداد کے مالک کی منشا و مرضی پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ تاہم جہاں مسابقت کے لیے مناسب ماحول ممکن نہ ہو وہاں حکومتی براہ راست تنظیم کی ضرورت اس بات کو قطعا ثابت نہیں کرتی کہ جہاں مسابقت ممکن ہو وہاں بھی اس سے گریز کیا جائے۔ مسابقت کو ہر ممکن سطح تک موثر بنانے کے حالات پیدا کرنا، فراڈ اور دھوکہ دہی کو روکنا اور اجارہ داریوں کو توڑنا، یہ معاملات ریاستی تحرک کے لیے بلا شبہ ایک وسیع میدان فراہم کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسابقت اور (حکومتی) مرکزی تنظیم میں کسی درمیانی صورت کی تلاش ممکن ہے اگرچہ شروع میں اس سے بڑھ کر ممکن اور (معقول افراد کی) پسندیدہ صورت کوئی اور نظر نہیں آتی۔

تاہم اس معاملے میں کامن سینس ایک دھوکے باز راہنما ثابت ہوتی ہے۔ اگرچہ مسابقت کے لیے تھوڑی بہت تنظیم و ترتیب سہارنا ممکن ہے مگر مسابقت کو منصوبہ بندی کے ساتھ اپنی مرضی کی حد تک نتھی کرنا اسے پیداوار کے ایک موثر ذریعے کی حیثیت میں عمل کرنے سے روکے بغیر ممکن نہیں۔ مسابقت اور (حکومتی) مرکزی تنظیم دونوں ہی اگر نامکمل ہوں تو خراب اور غیر موثر ہو جاتے ہیں اور دونوں کا ملغوبہ تو چل ہی نہیں سکتا۔ منصوبہ بندی اور مسابقت کو جمع کرنے کی واحد صورت یہی ہے کہ مسابقت کو یقینی بنانے کے لیے منصوبہ بندی کی جائے ....، مگر مسابقت کے خلاف نہیں۔ ہماری تمامتر تنقید اس منصوبہ بندی کے متعلق ہے جو مسابقت کے خلاف کی جائے۔

(فریڈرک اے ہائیک) (133)

کسی بھی نئی پروڈکٹ یا سروس کی مقبولیت کی وجہ محض قیمت اور کوالٹی بھی نہیں ہوتی، دیگر چیزیں بھی اس میں اپنا کردار ادا کر رہی ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر سپر مارکیٹ اور شاپنگ مال کا تصور شہری آبادیوں میں اس وقت آیا ہے جب گاڑیاں عام ہوئی ہیں- اب لوگ لمبی ڈرائیو کر کے کسی الگ تھلگ سے شاپنگ مال یا سپر مارکیٹ میں جا کر خریداری کر سکتے تھے- وہ اپنی ضروریات و خواہشات کی تمام اشیاء ایک ساتھ خریدنے لگے. مال میں کارٹ سامان کو کھینچنے میں ان کے مدد گار بنے - انہوں نے bulk میں سامان خریدا، گاڑی کی ڈگی میں رکھا اور جا کر اپنے گھر میں بآسانی محفوظ کر لیا - وہ چیزیں جن کے خراب ہونے کا خدشہ تھا اس کے لئے ریفریجریٹر اور فریزر مدد گار بنے- گاڑیوں کے بغیر دور جا کر bulk میں سامان خریدنا آسان نہ تھا تو فریزر کے بغیر گھر میں محفوظ کرنا بھی آسان نہ تھا- دوسری طرف سپر سٹور اور مال کو بھی ریفریجیٹر، فریزر ، ائیرکنڈیشنر ، بجلی کی سیڑھیاں اور لفٹ ، تروتازہ ہوا کا نظام اور دیگر ڈھیر سارے عوامل نے مل کر اس قابل کیا کہ وہ کنزیومر کی ضروریات و خواہشات کی تمام اشیاء خدمات ایک ہی چھت کے نیچے رہ سکیں، جب کہ اس سے پہلے اس دوکان یا سٹور کو زیادہ ترجیح ملتی تھی جو گھر کے پاس ہوتا تھا.

ٹیکنالوجی کیسے مارکیٹ کی حالت کو بدل دیتی ہے : چند مثالیں -

گزشتہ صدی کے پہلے پانچ عشروں میں Graflex کارپوریشن کیمرا انڈسٹری میں لیڈر تھی -1930 اور 1940 کے عشروں کی فلمیں اور اخبارات کی تصاویر عموما اسی کارپوریشن کے کیمروں اور لینزز سے بنی تھیں- یہ ایک بڑا بھاری کیمرا تھا جس کی تصاویر بھی آج کی تصاویر کی نسبت غیر واضح ہوتی تھیں- ۱۹۵۰ کی ابتداء میں جاپانی کمپنی Nikon نے 35 mm Leica کیمرا مارکیٹ میں متعارف کروایا- یہ کیمرا سائز میں چھوٹا تھا اور اس کی تصاویر Graflex کی نسبت زیادہ عمدہ تھیں- اب فلم اور اخبارات کی فوٹوگرافک انڈسٹری Nikon کی طرف چلی گئی- نتیجہ کیا نکلا کہ صرف ایک عشرے میں ہی Graflex نقصانات اٹھا اٹھا کر مالی طور پر ڈوب گئی اور منظر سے ہی غائب ہو گئی. اب فوٹوگرافی کا شوق اکثر لوگ ڈیجیٹل کیمروں کی نسبت اپنے موبائل سے پورا کر رہے ہیں- یہی معاملہ ہم نے گھڑی کی انڈسٹری میں بھی دیکھا، بڑی گھڑی سے چھوٹی گھڑی اور اب لوگ وقت دیکھنے کے لئے موبائل سے اپنی ضروریات پوری کر رہے ہیں-

جب ٹیلی ویژن انڈسٹری کا آغاز ہوا تو نیوز پیپر انڈسٹری کو بہت نقصان پہنچا اور اس کے قارئین کی تعداد میں کمی آئی- خود امریکہ میں ٹیلیویژن انڈسٹری سے پہلے نیویارک شہر میں اخبارات کی چھ ملین کاپیاں بکتی تھیں اور ٹیلی ویژن انڈسٹری کے بعد یہ آدھی رہ گئیں- ویب سائٹ اور سوشل میڈیا کے آنے سے ان میں مزید کمی آئی ہے - سب سے زیادہ ٹیلیویژن اور ویب انڈسٹری سے نقصان سہ پہر کے اخبارات نے اٹھایا ہے - یہاں اہم بات یاد رہے کہ محض کنزیومرز اور پروڈیوسرز کی مارکیٹ متحرک نہیں ہوتی بلکہ را مٹریل، لیبر اور اس سے معتلق تمام مارکیٹس جیسے فنانشل مارکیٹ سب متحرک ہوتی ہیں - اس لئے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی انڈسٹری میں لوگوں کو کام سے نکالا جارہا ہے تو یہ نہیں دیکھتے کہ

کتنی نئی انڈسٹریوں میں زیادہ لوگ کام پر لگائے جا رہے ہیں۔ جس طرح کمپنیوں کا نفع و نقصان رسک پر ہوتا ہے ویسے ہی لیبر کا روزگار اور بے روزگاری بھی رسک پر ہوتی ہے ۔

جب کمپنیاں ، بدلتے وقت اور مقام کا ساتھ نہیں دے سکتیں تو چند ہی سالوں میں منظر سے غائب ہوجاتی ہیں

ڈسک ٹاپ کمپیوٹر کے آنے سے پہلے ٹائپ رائٹنگ انڈسٹری میں "Smith – Corona" مارکیٹ لیڈر تھا۔ جب ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر آئے اور ان میں ٹائپنگ آسان ہو گئی تو ٹائپ رائٹنگ انڈسٹری آہستہ آہستہ زوال کا شکار ہونے لگی. اسی کے عشرے میں 5 سال مسلسل "Smith – Corona" کمپنی نقصان میں رہی – اس نے بدلتی مارکیٹ کے ساتھ اپنی پروڈکشن کو بدلنے کی کوشش کی اور "ورڈ (word) پروسیسر" بنانے شروع کئے - ۱۹۸۹ء میں امریکہ میں بکنے والے آدھے ٹائپ رائٹرز اور ورلڈ پروسیسر اسی کمپنی کے تھے مگر کمپنی پھر بھی بدلتی ٹکنالوجی اور مارکیٹ میں کامیابی سے نہ چل سکی اور بالآخر چھ سال بعد دیوالیہ ہو گئی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ہم عموما ابھرتی ہوئی (Emerging) اور بڑی کمپنیوں کو دیکھتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ یہ اتنا بزنس آخر کیسے کر رہی ہیں مگر جب وہ کمپنیاں بدلتے وقت اور مقام کا ساتھ نہیں دے سکتیں تو چند ہی سالوں میں منظر سے یوں غائب ہوجاتی ہیں جیسے کہ تھیں ہی نہیں۔

مقابلہ کی ثقافت ....، نئی ٹیکنالوجی ،نئے آئیڈیاز ، نئے علوم، نئی مہارتوں، جدتوں اور تخلیقی صلاحیتوں کی مارکیٹ ہوتی ہے۔ اس میں کامیاب وہ ہوتا ہے جو وقت اور مقام کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرسکے، جو نہیں کر پاتا وہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ مارکیٹ میں وسائل کی تفویض محض قیمت (Price) اور نفع کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ مالی نقصانات (Losses) کا بھی اس میں اہم کردار ہے۔ مارکیٹ کی آزاد قوتیں وہاں سے وسائل لے لیتی ہیں جہاں انہیں صحیح استعمال نہ کیا جا رہا ہو (جس کا معیار صارفین کی ناپسندیدگی ہے جس کے سبب وہ اس کمپنی کے پروڈکٹ یا سروس سے مطمئن نہیں) اور وہاں منتقل کر دیتی ہیں جہاں صارفین کی طلب کو صحیح رسپانس کیا جا رہا ہو جس کے بدلے میں کمپنی وسائل کے درست استعمال کا نفع کماتی ہے - یہ نقصانات پروڈیوسرز کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ یا تو خود کو بدلتی مارکیٹ کے ساتھ بدلیں ورنہ مارکیٹ سے باہر نکل جائیں - فری مارکیٹ معشیت دراصل قیمتوں (prices) ، نفع اور نقصان کی بنیاد پر وسائل کی تفویض کا نام ہے -

مارکیٹ نقصان کے خطرے اور نفع کی جستجو پر چلتی ہے - مستقبل غیر معلوم ہے۔ سیاستدان اور بیوروکریٹس تو کیا کمپنی کے پالیسی میکرز بھی وقت اور مقام کے اعتبار سے مارکیٹ کے مواقع و خطرات اور اپنی حقیقی مضبوطی اور حقیقی کمزوریوں سے بہت حد تک لاعلم ہوتے ہیں۔ اگر انہیں مکمل اور حتمی علم ہوتا تو وہ کبھی دیوالیہ نہ ہوتے یا نقصان نہ اٹھاتے - اگر مارکیٹ کے تمام Participant انسان ، وقت اور مقام کا مکمل علم رکھتے ہوتے تو نہ مارکیٹ میں غیر متوقع حالات آتے اور نہ ہی نفع و نقصان کی ثقافت پائی جاتی -

مقابلہ کی ثقافت میں کمپنیاں اپنی آمریت نافذ نہیں کر سکتیں بلکہ خود مجبور ہوتی ہیں کہ مارکیٹ کی اتباع کریں ورنہ فیل ہو جائیں گی ۔

مثال کے طور پر ۱۹٦۰ء میں جب مارکیٹ میں کریڈٹ کارڈ آئے ، تو بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور جیسے نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر جب یہ عوام میں مقبول ہوئے تو خود یہ ڈیپارٹمنٹل سٹور مجبور ہوتے کہ انہیں قبول کریں کیونکہ ان سٹورز کے درمیان اس بات کا مقابلہ چل نکلا کہ پہلے کون قبول کرتا ہے۔ جو قبول کرتا ہے اسے گاہکوں سے زیادہ پذیرائی ملے گی کیونکہ وہ ان سٹورز میں بجائے نقدی کے ان کارڈ سے ادائیگی کر سکتے تھے.

فری مارکیٹ پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔

مارکیٹ میں داخل (ENTER) اور خارج (EXIT) ہونے کے لئے کوئی شرائط نہیں اگر آپ سمجھتے ہو کہ آپ پیداواری عمل میں کچھ بہتر اور کچھ نیا کر سکتے ہو. مارکیٹ نہ آپ سے آپ کا حسب نسب پوچھتی ہے، نہ تعلیم، نہ شناخت اور نہ ہی کچھ اور، اسے صرف آپ کی تعمیری contribution کی ضرورت ہے۔ مارکیٹ کا نظام مساوات پر قائم ہے ۔

فورڈ موٹر کمپنی امریکہ کا فخر ہے۔ اسے ۱۹۳۰ میں ہنری فورڈ نے قائم کیا تھا. ہنری فورڈ ایک کسان کا بیٹا تھا. جو آٹھ میل پیدل چل کر Detroit شہر میں کام کرنے جاتا تھا۔ اس کے پاس کوئی تعلیمی ڈگری نہیں تھی اور نہ ہی مالی وسائل. اس کے پاس صرف ایک آئیڈیا تھا. وہ کارجو (Entrepreneur) بنا اور اس نے امریکی معاشرے سمیت پوری دنیا کو بدل دیا۔ آزاد فنانشل مارکیٹ نے اس کے آئیڈیا کی مدد کی، اس لئے نہیں کہ انہیں فورڈ سے کوئی محبت تھی بلکہ اس لئے کہ انہیں اس کے آئیڈیا میں اپنا منافع نظر آیا تھا۔ ذرا تصور کریں کہ اگر امریکہ میں بیوروکریٹک معشیت ہوتی اور ایک کسان کا ان پڑھ بیٹا جس کے پاس نہ کوئی ڈگری تھی اور نہ ہی اپنی مہارتوں کے ثبوت میں کوئی باقاعدہ ثبوت ، اس کے ساتھ بیوروکریٹک رویہ کیسے ہوتا؟

زمانہ ماقبل صنعتی انقلاب میں صارف، پروڈیوسر جیسے لوہار سنار وغیرہ کے پاس جاتا تھا اور کہتا تھا کہ مجھے فلاں چیز اس ڈیزائن ، کوالٹی اور مقدار یا حجم کی چاہیئے، کاریگر وہ چیز بنا کر اسے پیش کر دیتا تھا اور اجرت وصول کر لیتا تھا - عہد حاضر کے صنعتی عہد میں پروڈیوسر کنزیومر کی ضرورت و خواہش کا پہلے سے ہی اندازہ لگاتا ہے، اس کا تجزیہ کرتا ہے اور اگر مطمئن ہو جائے تو متعلقہ چیز بنا کر مارکیٹ میں پیش کر دیتا ہے۔ مارکیٹ ایسی اشیاء سے بھری پڑی ہیں اور پروڈیوسر کو بھی حتمی طور پر یہ علم نہیں کہ اس کی شے حقیقت میں خریدی جائے گی یا کنزیومر اس کے مد مقابل کی کسی دوسری شے کو اس کی نسبت زیادہ اہمیت دے گا۔ اگر پروڈیوسر کا صارف سے متعلق تجربہ کامیاب ہے تو وہ نفع کماتا ھے

اس وقت تک جب تک وہ صارفین کی توقعات پر پورا اترتا رہتاہے- اور جب اس کا صارفین سے متعلق تجربہ یا علم ناکام ہو جاتا ہے یا بدلتے وقت اور ٹکنالوجی کے ساتھ وہ صارفین کی توقعات پر پورا انہیں اترتا تو وہ مالی نقصان اٹھا کر دیوالیہ ہو جاتا ہے-

بنیادی اہمیت علم کی ہے

چاہے وہ کیپیٹلزم ہو یا سوشلزم، بنیادی اہمیت نہ سرمایہ کی ہے اور نہ محنت کی ...، بلکہ بنیادی اہمیت علم کی ہے- اس علم کی کہ:

- آخر صارفین کی طلب (Demand) وقت اور مقام کے ساتھ ساتھ کیا رہے گی؟
- کوئی بہتر متبادل (Alternative) تو مارکیٹ میں نہیں آجائے گا
- مارکیٹ میں کوئی زیادہ ہوشیار و باصلاحیت مد قابل (Competitor) تو نہیں آجائے گا
- را مٹریل کی سپلائی ہنوز اچھی قیمتوں اور کوالٹی پر ملتی رہے گی؟
- Skilledلیبر کی کمی تو نہیں ہو جائے گی؟
- سیاسی و سماجی اور ماحولیاتی میکرو اکنامک تبدیلیاں تو نہیں آ جائیں گی وغیرہ وغیرہ .

ایک پروڈیوسر ان سب سوالات کے درمیان ہمہ وقت گھرا رہتاہے- اگر وہ ان سوالات کے صحیح جواب نہیں معلوم کر لیتا اور ان کو صحیح رسپانس نہیں کرتا تو اس کا کاروبار چند برسوں میں دیوالیہ ہو جاتا ہے—

مارکیٹ کے نظام کو خود پروڈیوسرز سے بھی خطرہ ہوتا ہے -

یہی فری مارکیٹ معشیت ہے جو کہ بذات خود پروڈیوسرز کے لئے ذہنی دباؤ اور غیر یقینیت کا سبب ہوتی ہے اور پروڈیوسرز بھی خواہش کر رہے ہوتے ہیں کہ کسی طرح مارکیٹ میں نئ مدمقابل کی کمپنیوں کے داخلہ کو روکا جائے-کس طرح سیاست و ریاست مارکیٹ میں مداخلت کر کے ہمیں تحفظ اور اجارہ داری میں مدد دیں - کس طرح وہ من پسند حکومتی معاشی پالیسیوں سے فائدہ اٹھائیں- حقیقت یہ ہے کہ فری مارکیٹ معشیت کو پروڈیوسرز سے بھی خطرہ رہتا ہے-اور ان پروڈیوسرز کے لئے کام اس وقت زیادہ آسان ہوجاتا ہے جب سیاست معیشت میں مداخلت کا حق رکھتی ہے اور وہ پروڈیوسرز رشوت و لابنگ وغیرہ کے استعمال سے بیورو کریسی اور سیاستدانوں سے اپنی پسندیدہ معاشی پالیسیاں بنوا لیتے ہیں
—

دنیا بھر میں فنانشل سیکٹر اس سے مستفید ہو رہا ہے- فنانشل سیکٹر میں لوگ خوب Risky ٹریڈنگ اور ٹرانزیکشن کرتے ہیں— بہت زیادہ رسک کے نتیجہ میں جب انہیں زیادہ نفع ملتا ہے تو اس سے خوب پھلتے پھولتے ہیں اور جب زیادہ رسک کے منفی نتائج نکلتے ہیں جیسے زیادہ نفع کی

بجائے زیادہ نقصان تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں گورنمنٹ Lender of last resort بن کر ان کی مدد کو آجائے گی اور انہیں تحفظ فراہم کرے گی-ریاست کے تحفظ میں چلنے والی مارکیٹ جس میں نفع کمپنیوں کا ہوتا ہے اور نقصان کا سامنا عوام کو ٹیکسوں کی رقم سے ادا کرنا پڑتا ہے، بذات خود کمپنیوں کے لئے انتہائی پر کشش ہے - یہ اسٹیٹ کیپٹلزم (State Capitalism) ہے ، فری مارکیٹ کیپٹلزم نہیں- فری مارکیٹ کیپٹلزم میں وسائل کے بہترین استعمال پر آپ نفع کمائیں گے اور ترقی کریں گے جبکہ وسائل کے ناقص استعمال پر آپ نقصان میں جائیں گے اور دیوالیہ ہو کر مزید وسائل کے ضیاع سے سوسائٹی کو محفوظ رکھیں گے ، حکومت کا نہ آپ کے نفع میں بطور پارٹنر کوئی کردار ہو گا اور نہ وہ نقصان کی صورت میں آپ کا تحفظ کرے گی -

مارکیٹ میں حال اور مستقبل کی کوآرڈینیشن

ہم جانتے ہے کہ ایک اکانومی میں سب سے بڑا مسلہ انفارمیشن کا ہے- ایک بیورو کریٹک معاشی انتظام میں بیوروکریٹ اپنے افسران سے ہدایات لیتے ہیں اور رسپانس کرتے ہیں ، جبکہ مارکیٹ اکانومی میں (جس میں پروڈیوسر کو بھی انفارمیشن کی کمی اور غیریقینیت کا مسئلہ ہوتا ہے) قیمتوں اور نفع و نقصان کا نظام پروڈیوسرز کو ہدایات دے رہا ہوتا ہے - کیا چیز پیدا کرنی ہے؟ کتنی پیدا کرنی ہے؟ کسے بیچنی ہے، کب سپلائی بھیجنی ہے، ڈسٹری بیوشن پر کتنا خرچ آئے گا، کل کتنی لاگت آئے گی اور کنزیومرز کی حقیقی ڈیمانڈ کیا ہے وغیرہ وغیرہ؟ ان سب معلومات کو پروڈیوسرز قیمتوں کے نظام سے اخذ کرتے ہیں اور اس کے رسپانس میں اپنی پیداواری سرگرمیوں کو منظم کرتے ہیں -

فری مارکیٹ میں قیمتوں کا نظام مستقبل سے متعلق حتمی ہدایات فراہم کرنے میں بعض اوقات ناکام ہو جاتا ہے ، جب ڈیمانڈ ، سپلائی اور قیمتیں مستقبل کے کیس میں حتمی طور پر غیر معلوم ہوتی ہیں ، مگر آپ مجبور ہوتے ہیں کہ آج فیصلہ کریں - یہ مسئلہ صنعتوں میں کم جبکہ زراعت میں زیادہ آتا ہے - زراعت میں معلومات کا مسئلہ موسمی تغیرات کے مسئلہ سے بھی زیادہ گھمبیر ہے - ایک کسان اپنی فصل کی بوائی کی اگر آج منصوبہ بندی کرتاہے -منصوبہ بندی کے دوران وہ فصل کی کٹائی کے وقت یعنی بوائی سے تقریبا چار سے چھ ماہ بعد کے وقت کے لئے قیمتوں کو قیاس کرتا ہے - وہ چار سے چھ ماہ اس پر خوب محنت کرتا ہے اور چھ ماہ بعد کا غیر معلوم مستقبل جب حال (Present) بن جاتا ہے تو قیمتیں کم ہی اس کی Predicted قیمتوں کے برابر ہوتی ہیں بلکہ اکثر اوقات اس درجے سے اوپر یا نیچے ہوتی ہیں کیونکہ فصل جب مارکیٹ میں آتی ہے تب ہی ڈیمانڈ اور سپلائی کی بنیاد پر قیمت طے ہوتی ہے- اسے چھ ماہ پہلے جاننا ناممکن ہے - یہی وہ رسک ہے جس کا سامنا کسان کرتے ہیں اور ہر وہ پروڈیوسر کرتا ہے جو مستقبل کے لئے کوئی چیز پیدا کر رہا ہے –

نفع کی جستجو کے بغیر معاشی زندگی جامد ہے -

_ سوشلسٹ اور نیم سوشلسٹ معشیت میں پرافٹ یعنی نفع کو برائی سمجھا جاتا تھا - کارل مارکس کے نزدیک یہ قدر زائد ہے جو لیبر کا حق ہے مگر سرمایہ دار اس سے چھین لیتا ہے – " فے بیان سوشلسٹ " جارج برنارڈشا اسے "overcharge" (یعنی جائز قیمت سے زیادہ قیمت وصول کرنا) کہتا ہے - یہاں تک کہ جواہرلعل نہرو ، بھارت کے پہلے وزیراعظم نے جب اپنے ملک کے صنعتکاروں سے ملاقات کی تو کہا "مجھ سے نفع کی بات نہ کرو، یہ ایک گندا لفظ ہے. (134)

حقیقت یہ ہے کہ نفع مقابلہ کی ثقافت میں کامیابی کا انعام ہے، یہ وسائل کے صحیح استعمال کی ترغیب دیتا ہے. جدت اور پروڈکٹوٹی کے لئے اکساتا ہے- جس طرح ایک کمرہ جماعت میں مقابلے کی ثقافت تمام طلباء کو پر جوش اور بہتر کارکردگی کے لئے آمادہ رکھتی ہے اسی طرح معشیت میں پرفارمنس کی جستجو کا مقصد بھی نفع کا حصول ہے- ہم سب اپنے اپنے نفع کی جستجو کرتے ہیں- ایک ایمپلائی اس کوشش میں ہوتا ہے کہ وہ بہتر سے بہتر جاب اور معاوضہ حاصل کر سکے- ایک صنعتکار اس کوشش میں ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام وسائل کو بہتر استعمال کر کے نفع حاصل کرے - ایک کسان اس کوشش میں دن رات محنت کرتا ہے کہ وہ بہتر فصل کاشت کرے اور بہتر آمدن کمائے -نفع کی جستجو کے بغیر معاشی زندگی جامد ہے اور محنت و کارکردگی کی ترغیب باقی نہیں رہتی.

سوشلسٹ نظام کا دعوی کہ نفع کی جستجو چونکہ ایک برا عمل ہے،اس لئے جب نفع کی ثقافت ختم کر دی جائے گی تو قیمتیں کم ہو جائیں گی اور لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو جائے گا. مگر سوشلسٹ معیشتوں میں اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟ کیا لوگوں کی اشیاء و خدمات تک رسائی بنسبت ان معشیتوں کے جن میں نفع و نقصان کی ثقافت پائی جاتی تھی ، بڑھی؟ کیا سوشلسٹ معشیتوں کے حامل ممالک میں لوگوں کے معیار زندگی میں بہتری آئی؟ جواب نہیں میں ہے- اس کی کیا وجہ ہے ؟ اس کی وجہ ترغیبات کے نظام کا نہ ہونا ہے.

جدت اور تخلیقی صلاحیتیں

دیکھئے ایک کمرشل انٹرپرائزز جو مقابلے کی ثقافت میں کام کرتی ہے اس کے لئے جدت اور پروڈکٹوٹی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے - اگر وہ جدت اور پروڈکٹوٹی میں بہتری نہیں لائے گی تو اس کا مدقابل بازی لے جائے گا - اگر اس کے مدقابل نے نئی ٹیکنالوجی اور جدت پیدا کی مگر اس نے نئے tools کو adopt نہ کیا تب بھی وہ ناکام ہو جائے گی، اور دیوالیہ ہو جائے گی. دیوالیہ پن کا ڈر اور نفع (یعنی کامیابی کی جستجو) ایک کمپنی کو رسک لینے، تحقیق ، ایجاد اور دریافت کرنے اور بہترین مہارتوں کو adopt کرنے کی ترغیب دیتے ہیں.

دوسری طرف سوشلسٹ معشیتوں میں جدت اور پروڈکٹوٹی کا عنصر موجود ہی نہیں تھا. اس کی ایک وجہ ترغیبات کے نظام کا نہ ہونا ہے - کوئی بھی بیوروکریٹ ایسی کوئی ترغیب نہ رکھتا تھا کہ وہ کوئی نیا آئیڈیا متعارف کروائے یا کوئی نیا پروڈکٹ مارکیٹ میں میں لانے کی کوشش کرے-

اگر وہ ایسا کرنا بھی چاہتا تو اسے اپنی اتھارٹیز سے ایک طویل طریقہ کار سے گزر کر اجازت لینا پڑتی اور ایک مضبوط بیوروکریٹک کلچر میں کچھ ایسا کرنے کی اجازت ملنا تقریبا ناممکن ھے کہ مثبت نتائج بھی برآمد ہو سکتے ہیں اور منفی بھی ..... دوسری وجہ شدید ترین کنٹرول ہے. اگر رسک لے لیا گیا ہے اور نتیجہ خراب نکلا ہے تو سٹالن کے ہاں اس کی بدترین سزا تھی– اس بندے کی جاب جا سکتی تھی جس کے نئے آئیڈیا نے منفی نتائج دیئے اور اس کی زندگی خطرہ میں پڑ سکتی تھی. سٹالن اسے وسائل کو ضائع کرنے کے مترادف سمجھتا تھا- اس کے اور باقی سوشلسٹ آمروں کے نزدیک بہترین عمل یہ تھا کہ تمام افسران اپنے افسران بالا اور قوانین و پروسیجر کی پابندی کریں.

اس سلسلے میں بھارت کی نیم سوشلسٹ معشیت کو بطور مثال دیکھتے ہیں - بھارت نے اپنی اکانومی کو 1991 میں آزاد کیا. اس سے پہلے ہندوستان کی مشہور ترین کار "ہندوستان ایمبیسڈر " تھی جو کہ برطانوی "مورس آکسفورڈ" کی کاپی تھی- 1954 میں اس کار کو مورس آکسفورڈ سے نقل کیا گیا اس وقت سے 1990 تک اس کا ڈیزائن اور ساخت ویسی رہی باوجود اس کے کہ ہندوستان ایمبیسڈر کے ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ میں کل 250 لوگ کام کرتے تھے - سوال یہ ہے کہ آخر وہ کیا کام کرتے تھے- 1990 میں لندن کے اخبار دی انڈیپنڈنٹ نے رپورٹ کیا کہ ہندوستان ایمبیسڈر کی مینو فیکچرنگ اب بھی ناقص ہے. اسے سنبھالنا بہت مشکل ہے اور خطرناک حادثات کا باعث ہے. اس کے باوجود لوگ اس گاڑی کے لئے مہینوں انتظار کرتے تھے. کیونکہ کسی دوسرے ملک سے گاڑی کی امپورٹ پر پابندی تھی- یاد رہے کہ ہندوستان ایمبیسڈر سرکاری کمرشل ادارہ تھا.

جبکہ کیپیٹلزم میں جدت ، زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے- مثال کے طور پر ۱۹۷۰ء میں IBM کمپیوٹرز کا سائز تقریبا "3000 کیوبک فٹ" ہوتا تھا مگر IBM کی ساری مارکیٹ ختم ہو گئی کیونکہ intel نے انگلی سے بھی چھوٹے سائز کی chip بنالی تھی جو وہی کام کرتی تھی جو IBM کا تھا. اس وقت سے اب تک intel اپنی اسی chip کی پر فارمنس بڑھا رہی ہے کیونکہ اسے اپنے مدِمقابل CYRIX ، AMD ، اور دوسری کمرشل کمپنیوں سے خطرہ ہے کہ وہ آگے نہ نکل جائیں. اپنی بقا کے لئے وہ ایک بڑی رقم انویسٹ کر چکا ہے. مگر ہنوز اس کی جدوجہد جاری ہے کہ وہ منافع بخش اور ناکام نہ ہو.

یہاں اس نکتہ کو اٹھانا ضروری ہے کہ آج ہمیں جو سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی اور جدت نظر آتی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ کمرشل اداروں کی تحقیقات ، ایجادات اور دریافتوں کے لئے فنڈنگ ، اور ان کے نتائج کو implement کرنے کی ترغیب ہے - کیپیٹلزم کو ٹکنالوجی اور ترقی کی بھوک ہے، اس کے بغیر اس کی بقا ممکن نہیں- علوم و فنون میں جس درجہ کی جدت ہم مغربی کیپیٹلسٹ ممالک میں دیکھتے ہیں اس کا عشرعشیر بھی ہمیں سوشلسٹ اور فاشسٹ ممالک میں نظر نہیں آتا. فری مارکیٹ کے کاروباری ادارے اور اس کی ثقافت ، سائنس و ٹکنالوجی کو کیوں pursue کرتے ہیں ؟ کیونکہ اس میں ان کا نفع اور ان کی بقا ھے - جبکہ سوشلسٹ ممالک میں کمرشل اداروں کے بیوروکریٹک

منتظمیں کواپنی بقا کے لئے نفع ، جدت ، پروڈ کٹوٹی ،سائنس و ٹیکنالوجی اور انتظامی (managerial) مہارتوں کی ضرورت نہ تھی بلکہ انہیں اپنے بیورو کریٹک طریقہ کار کو pursue کرنا تھا -

نقصان کمپنی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی پالیسی بدلے ورنہ دیوالیہ ہو جائے گی-

مقابلہ کی ثقافت میں جمود تنزلی اور تباہی ہے -اگر اسی ہندوستان موٹرز کی مثال کو آگے بڑھائیں تو پھر یہی ہندوستان موٹرز تھی کہ جب 1990 میں مارکیٹ آزاد ہوئی اور مقابلہ کی ثقافت مارکیٹ میں قائم ہوئی تو اس نے نئے ماڈلز کی کاریں اپنے صارفین کی پسند کے بہترین فیچرز اور کوالٹی کے ساتھ متعارف کروائیں کیونکہ اب اسے بقا کی جدوجہد میں کامیاب ہونا تھا -

مقابلہ کی مارکیٹ کیا ھے؟

- ✓ وہ مارکیٹ جس میں کسی ایک کمپنی یا کسی سرکاری ادارہ کی اجارہ داری نہ ہو-
- ✓ جو ڈیمانڈ اور سپلائی کی بنیاد پر آزادانہ کام کرے.
- ✓ مارکیٹ میں کسی بھی نئے پروڈیوسر کے داخلہ پر پابندی نہ ہو،
- ✓ قیمت اور کوالٹی ڈیمانڈ اور سپلائی سے متعین ہوں
- ✓ اس میں جمود نہ ہو اور کوئی بھی فرم یا سرکاری ادارہ قیمت و کوالٹی پر اثر انداز نہ ہو سکے-
- ✓ مقابلہ کی ثقافت میں کام کرنے والی مارکیٹ مناپلی یعنی اجارہ داری سے پاک ہوتی ہے –
- ✓ یہ دیکھنے کے لئے کہ مارکیٹ کتنی آزاد ہےتین اشارے بہت اہم ہیں-

1. قیمتوں میں جمود نہ ہو بلکہ قیمتیں لچکدار ہوں -
2. مارکیٹ میں کارجوئی (enterpreneouship) کا رجحان کتنا ہے- نئے پروڈیوسرز کیا نئے آئیڈیاز یا ٹیکنالوجی کے ساتھ مارکیٹ میں داخل ہو رہے ہیں اور جدت و پروڈکٹوٹی وقت کے ساتھ ساتھ مارکیٹ میں کتنی بڑھ رہی ہے ...؟ مارکیٹ کی معلومات اور وسائل پر کسی ایک فریق کا قبضہ تو نہیں –

اگر نئے آئیڈیاز اور نئی ٹیکنالوجی مارکیٹ میں نفوذ کر رہی ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مارکیٹ کے تمام عناصر مقابلہ کی ثقافت میں کام کر رہے ہیں- مارکیٹ میں نئے پروڈیوسرز کی انٹری میں سب سے بڑی روکاوٹ عموما گورنمنٹ قوانین ہوتے ہیں جو کمپنی کی رجسٹریشن اور لائسنگ کے لئے بہت زیادہ ڈاکومنٹیشن (Documentation) مانگتے اور شرائط

رکھتے ہیں اور اس عمل کو طویل بنا دیتے ہیں ۔ اسی طرح لائسنگ کے لئے مزید شرائط بھی ہوتی ہے یعنی سیکورٹی ڈیپازٹ، متعلقہ تعلمی سرٹیفیکیٹ وغیرہ

3. پروڈیوسرز کی تعداد: مارکیٹ میں جتنے زیادہ پروڈیوسرز ہوں گے اتنا زیادہ مقابلہ کی ثقافت بڑھے گی ، اتنا امکان کم ہو گا کہ پروڈیوسرز باہم کارٹل بنا کر ایک ہی قیمت کو جامد کر لیں یا اپنی مرضی سے اسے لچک دیں ۔

مارکیٹ میں گورنمنٹ کا ایک اہم کردار

حکومت یقینی بنائے کہ آیا واقعی مارکیٹ میں مقابلہ کی ثقافت پائی جاتی ہے یا نہیں ۔ اس پر اجارہ داری یا مناپلی تو نہیں. اس سلسلے میں حکومتیں انٹی ٹرسٹ لاء بناتی ہیں۔

انفرادیت (Uniqueness) اور مارکیٹ

یہاں ایک چیز کی وضاحت ضروری ہے کہ کسی نہ کسی حد تک ہم اپنی ذہانت، مہارت، اور صلاحیتوں میں لاثانیت یعنی انفرادیت (uniqueness) رکھتے ہیں اس اعتبار سے ہم منفرد اور لاثانی ہیں۔ ایک آرگنائزیشن میں ڈویژن آف لیبر بھی اسی اصول پر ہوتی ہے، اگر انفرادیت نہ ہوتی تو ہم لیبر کو ان کی مہارتوں، قابلیتوں اور تجربہ کی بنیاد پر تقسیم نہ کرتے تاکہ ان کا ایک منظم کام زیادہ سے زیادہ پروڈکٹوٹی مہیا کرے۔ اسی طرح ایک سیکٹر میں ہر پروڈیوسر اپنی کچھ خصوصیات میں منفرد ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم موبائل سیکٹر کو اگر دیکھیں کہ ان میں ہر پروڈیوسر (قیمت اور کوالٹی کی بنیاد پر اپنی کچھ منفرد خصوصیات رکھتا ہے۔ apple کے سافٹ وئیر ، ڈیزائن اور دیگر خصوصیات میں samsung سے مختلف ہیں اور samsung ، نوکیا ، سونی ریکسن اور بلیک بیری وغیرہ سے مختلف ہے. یوں قیمتوں کے تعین میں یہ اپنی منفرد خصوصیات کو بھی شامل کرتے ہیں. اور اس سے مارکیٹ میں مقابلہ کی فضا کو نئی ٹکنالوجی اور جدت و پروڈ کٹوٹی کے میدان میں انعام ملتا ہے۔ اگر یہ منفرد خصوصیات کمپنیوں کو حاصل نہ ہوتیں تو ٹیلی کمیونیکیشن کی مارکیٹ میں تمام موبائل پروڈیوسر ایک جیسے موبائل فون ہی بیچتے۔

فری مارکیٹ کے لئے ضروری شرط رضاکارانہ تعاون و اشتراک (Cooperation) ہے۔

کیا پیدا کرنا ہے، کتنا پیدا کرنا ہے، کس کے لئے پیدا کرنا ہے، کب پیدا کرنا ہے، کہاں سپلائی دینی ہے، کس قیمت پر خریدنا یا بیچنا ہے، اور کتنی اجرت لینی یا دینی ہے یہ سب معاملات تمام افراد کی باہم آزاد ایسوسی ایشن سے طے ہونے چاہئیں ۔ یہ نجی اور سماجی سرگرمیاں ہیں اور ریاست

کو ان فیصلوں پر اجارہ داری نہیں حاصل ہونی چاہئے – مقابلہ کی ثقافت صرف وہاں پائی جاتی ہے جہاں لوگوں کو آزادی حاصل ہو ، ان کی معاشی سرگرمیوں ، ان کے انتخاب، انکی ایسوسی ایشن ، کوآپریشن اور ان کے بطور پروڈیوسر، کنزیومر اور ایمپلائی کردار میں ۔

انصاف پر مبنی قیمت کون سی ہوتی ہے ؟

مارکیٹ میں ہر خریدار کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کم سے کم قیمت پر خریدے جب کہ ہر seller کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ قیمت پر بیچے- سوال یہ ہے کہ اس میں انصاف پر مبنی قیمت کون سی ہو گی؟ فری مارکیٹ کی رو سے وہ قیمت انصاف پر مبنی ہو گی جس پر دونوں پارٹیاں (خریدار اور فروخت کنندہ) راضی ہو جائیں- اس صورتحال میں تین چیزیں اہم ہیں.

1-مارکیٹ میں تمام افراد آزاد ہوں اور ان پر کوئی جبر نہ ہو.
2- خریدار کے پاس متبادل (Alternative) موجود ہوں جن سے وہ رجوع کر سکے ، اگر وہ کسی ایک کمپنی یا پروڈیوسر کی کوئی چیز نہیں خریدنا چاہتا تو.
3-مارکیٹ میں صرف ایک سیلر کی مناپلی نہ ہو بلکہ تمام زیادہ پروڈیوسرز کے درمیان قیمت اور کوالٹی پر مقابلہ کی ثقافت پائی جاتی ہو.

ایک مقابلہ کی ثقافت کی حامل مارکیٹ میں قیمتیں ہمیشہ ہی انصاف پر مبنی ہوتی ہیں- اس کے لئے ہم ایک مثال سے مدد لیتے ہیں. فرض کیا کہ ایک پروڈیوسر کوئی چیز فروخت کر رہا ہے. اس پر اس کی لاگت چھ روپے ہے اور وہ دس روپے میں بیچ رہا ہے. مارکیٹ میں 4 پروڈیوسر ہیں اور ہر ایک کے پاس برابر برابر مارکیٹ شئیر ہیں یعنی ہر پروڈیوسر کے پاس مارکیٹ کا 25 فیصد ہے- اب ہو گا یہ کہ ہر پروڈیوسر چونکہ مقابلہ کی ثقافت میں اپنے سیلف انٹرسٹ یعنی نفع کو Pursue کرتا ہے تو وہ مزید مارکیٹ گھیرنے کے لئے قیمتوں کو کم کرنے کی کوشش کرے گا اب وہ دوسروں کی نسبت سستی چیز بیچے گا تو بہت سارے صارف اس کی طرف آئیں گے اب وہ فرض کیا قیمت کو 9 روپے کر دیتا ہے- اب باقی تین پروڈیوسر جب دیکھیں گے کہ ان کی مارکیٹ ان کے ہاتھوں سے قیمتوں کی وجہ سے جا رہی ہے تو وہ بھی قیمت کم کرنے کی کوشش کریں گے یوں ایک پروڈیوسر سے قیمت میں کمی اور زیادہ سے زیادہ سے مارکیٹ شیئرز کے حصول کا مقابلہ قیمتوں کو اس درجے پر لے آئے گا کہ اگر وہ مزید کمی لاتے ہیں تو انہیں مالی نقصان ہو گا-اس موقع پر بھی مقابلہ تھمے گا نہیں بلکہ ہر پروڈیوسر مزید کوشش کرے گا کہ وہ کوئی ایسی نئ ٹیکنالوجی ایجاد کرے جو زیادہ کام کرے اور زیادہ پیداوار دے مگر کم خرچہ لے – مطلب یہ کہ جدت اور پروڈ کٹوٹی کے نئے طریقے سوچے جائیں گے- یوں قیمتیں بھی مزید کم ہوں گی اور مارکیٹ میں بھی جدت آئے گی.

اب ہم اس امکان پر غور کرتے ہیں کہ وہ چاروں پروڈیوسر جن کے پاس مارکیٹ کے برابر حصے ہیں وہ آپس میں اتحاد کر کے مارکیٹ پر اجارہ داری یعنی مناپلی یا cartel قائم کر لیتے ہیں – حقیقتا ایسا ہونا ناممکن ہے. دیکھیں جب لاگت چھ روپے آرہی ہے، قیمت وصول دس روپے کی جا رہی ہے اور نفع چار روپے ہے تو اس طرح اس مخصوص مارکیٹ سے باہر کے مزید انویسٹر اور کارجوؤں (enterpreneurs) کے لئے یہ صورتحال پر کشش ہو جائے گی کہ وہ بھی اس مارکیٹ میں داخل ہوں اور اتنے بڑے مارجن کا نفع کمائیں- وہ جب مارکیٹ میں داخل ہوں گے تو مارکیٹ میں صارفین کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے وہ کم قیمت پر اس پروڈکٹ کو پیش کریں گے یوں کارٹل عملی صورت میں ناکارہ ہو جائے گا – اس کی مثال ہم نے OPEC ممالک کے اتحاد یعنی کارٹل میں بھی دیکھی جو اب تیل کی عالمی قیمتوں کو جامد یا کنٹرول کرنے میں ناکام ہے – ایک ملک کے پرائیویٹ سیکٹر میں یہ کارٹل سوائے حکومتی مدد کے نہیں قائم ہو سکتا جس میں ان چار پروڈیوسرز کی رشوت یا لابنگ کے سبب حکومت ایسا قانون بناتی ہے یا ریگولیشن نافذ کرتی ہے جس کی وجہ سے نیا پروڈیوسر مارکیٹ میں قانونی پیچیدگیوں یا دیگر شرائط کی وجہ سے داخل نہ ہو سکے-

کیا کاروبار کرنا آسان ہے ؟

عموما یہ سمجھا گیا ہے کہ بزنس کوئی سادہ سی سرگرمی ہے جسے اگر کوئی بزنس مین سر انجام دے سکتا ہے تو بیوروکریٹ کیوں نہیں- یہی خیال لینن کا بھی تھا. - بالشویک انقلاب کی شام اس نے اعلان کیا کہ کاروباری ادارے چلانے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے.

1- اکاؤنٹنگ آتی ہو. یعنی حساب کتاب، لین دین ، لاگت اور وصولیوں کا حساب کتاب رکھا جا سکے.

2- کنٹرول کرنے کی صلاحیت

اس نے لکھا کہ کیپٹلزم نے ان طریقوں کو اتنا سادہ کر دیا ہے کہ کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی یہ دونوں کام بآسانی کر سکتا ہے- اس کے لئے ایک عام مزدور کافی ہے. (135)

چند سال اقتدار میں رہنے کے بعد وہ جان گیا کہ وہ غلط تھا. کاروبار محض اکاؤنٹنگ اور کنٹرولنگ کا نام نہیں. ایندھن کے بحران کے دنوں میں ، جب پورا سوویت معاشی نظام بحران کی لپیٹ میں تھا اور کسانوں کی بغاوتیں تھمنے پر نہیں آرہی تھیں، اس نے لکھا کہ معشیت آسان کام نہیں یہ انتہائی مشکل اور پیچیدہ کام ہے. (136)

۱۹۲۰ء میں کمیونسٹ پارٹی آف کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ہمیں ایڈمنسٹریشن کے فن سے واقف ٹیلنٹ چاہیئے، ویسے جیسے سرمایہ دار بزنس مین ہوتے ہیں.

Opinions on corporate management are all too frequently imbued with a spirit of sheer ignorance, an anti-expert bias.

کارپوریٹ مینجمنٹ کے بارے میں تمام آراء سراسر جہالت کی روح کے ساتھ متواتر ذہن میں ڈالی گئی ہیں یہ غیر ماہرانہ تعصبات پر مبنی ہیں. (137)

صرف تین سال کے عرصہ میں جو سبق سیکھ لیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ معاشی بندوبست قائم کرنا اور معاشی رویوں کو کنٹرول کرنا آسان کام نہیں . یوں اس خطاب کے بعد اس نے نئی معاشی پالیسی متعارف کروائی جس نے تھوڑی بہت مارکیٹ سرگرمیوں کو بحال کیا اور ایندھن کے بحران سے وقتی طور پر نجات پائی -.

علم اور معاشی فیصلے.

اگر ہم صرف زراعت میں ہی سنٹرل پلاننگ کی بات کریں کہ مقابلہ کی ثقافت کو ختم کر دیا جائے اور ملک کی ساری زراعت بیوروکریٹس کنٹرول کریں تو یہ زراعت کی پروڈ کٹوٹی اور توانائی کے لئے بھی انتہائی مضر ہے- فرض کیا کہ ہم ایک علاقہ کی پوری زمین پر زراعت کو پلان کرنا چاہتے ہیں جس کے لئے تمام ماہرین سرجوڑ کر بیٹھتے ہیں اور ایک منصوبہ بنایا جاتا ہے کہ اس علاقہ میں فلاں فصل کاشت کی جائے کیونکہ ہمیں اس کی ضرورت ہے.

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ زمیں کی نوعیت یعنی مٹی کی کوالٹی فی ایکٹر تقریبا مختلف ہوتی ہے. ایک پورے فارم میں یا پورے ملک کے تمام فارمز میں فی ایکٹر مٹی کی ساخت اور اس کے لئے مناسب فصل کا بہترین علم صرف اس کسان کے پاس ہوتا ہے جو اس پر کاشت کاری کرتا ہے ، نہ صرف اسے بوائی کے لئے بہترین بیج اور بہترین مٹی کا علم ہوتا ہے بلکہ وہ یہ بھی جانتا ہوتا ہے کہ اس زمین میں پانی کے انجذاب کی صلاحیت کتنی ہے-فصل کی کیسے نگہداشت کی جائے وغیرہ وغیرہ- بیوروکریٹس اس علم سے محروم ہوتے ہیں- اگر بیوروکریٹس ماہرین کی خدمات بھی لے لیں تب بھی ماہرین ایک مخصوص زمین سے متعلق اتنا علم نہیں رکھ سکتے جتنا اس پر برسوں سے محنت کرنے والے کسان کا ہوتا ہے-

دوسرا سیلف انٹرسٹ کا بھی فرق ہوتا ہے. ماہرین جائزہ لیتے ہیں، تجربہ کرتے ہیں، اور بیوروکریٹس کو تجاویز رپورٹ کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں جب کہ اس کسان کی روزی روٹی اسی زمیں سے جڑی ہوتی ہے وہ اس کے بارے میں حساس بھی ہوتا ہے، فکر مند بھی اور بہتر منصوبہ بندی کے لئے وہ اپنی تمام ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو استعمال میں لاتا ہے.

اب جب فصل تیار ہو گئ اس کے بعد اس کی مزید پلاننگ کی ضرورت ہوتی ہے ۔ کسان فصل کو دیکھتا ہے کہ کتنے عرصہ وہ اسے محفوظ رکھ سکتا ہے- اگر وہ فنا پذیر(Perishable) ہے تو وہ اسے فورا منڈی میں پہنچا دیتا ہے جہاں سے دوکاندار اسے فورا تازہ حالت میں صارفین تک پہنچا دیتے ہیں یہ سب سیلف انٹرسٹ کے تحت ہورہا ہوتا ہے. اب فرض کیا کہ فصل تیار ہو گئ ہے اور فنا پذیر ہے تو جب تک بیوروکریٹ اپنے ڈاکومنٹس مکمل نہیں کریں گے کہ اسے یہاں سے لے جا کر کہاں رکھا جائے، وہاں سے لوگوں تک کیسے پہنچایا جائے، اگر ایک سخت بیوروکریٹک ثقافت کا تصور کریں جس کے بغیر سوشلزم قائم نہیں ہو سکتا تو آپ فورا اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جب تک سبزیاں یا دیگر Perishable اشیاء کنزیومر تک پہنچیں گی آدھی سے زیادہ ضائع ہو چکی ہوں گی.

فصل کی کاشت کاری کے دوران بھی شخصی مفادات کا تصور فصل کی پروڈکٹوٹی پر اثر انداز ہوتاہے- جب کسان کو پتا ہو گا کہ فصل اچھی نکلے یا بری اسے اس کی متعین اجرت مل جائے گی تو وہ اس صورت میں کم محنت کرے گا بنسبت اس کے کہ اسے معلوم ہو کہ اس کا معاشی مستقبل فصل کی بہتر پلاننگ ، نگہداشت و محنت پر انحصار کرتا ہے ، اگر فصل بہتر نہ آئی تو اسے مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا -

یہی وجہ ہے کہ وہ ممالک جو خوراک کو ایکسپورٹ کرتے تھے انہوں نے اگر زراعت کو حکومتی پالیسی سے کنٹرول کرنے کی کوشش کی تو وہ خوراک کی قلت کا شکار ہو گئے- یہ صرف ایک دو ممالک کی کہانی نہیں بلکہ ان تمام ممالک میں یہی ہوا ہے جنھوں نے زراعت کو سنٹرل پلاننگ سے کنٹرول کیا ، چاہے یہ سوشلسٹ آمریت پسند ریاست نے کیا یا جمہوری حکومت نے ......- زراعت کا علم صرف اور صرف کسان اور منڈی پر انحصار کرتا ہے. (138)

مثال کے طور پر روس اور یوکرائن سوشلسٹ انقلاب سے پہلے ضرورت سے زائد خوراک ایکسپورٹ کرتے تھے 1913 میں زار روس کے عہد حکومت میں نو ملین ٹن خوراک دوسرے ممالک کو بیچی جاتی تھی - انقلاب کے بعد کیا ہوا کہ خوراک کی اتنی قلت ہوئی کہ اسے دوسرے ممالک سے امپورٹ کرنا پڑا؟ (139)

چین جہاں ماؤ کے دور میں تمام معاشی شعبوں کی طرح زراعت پر سنٹرل گورنمنٹ کی منصوبہ بند آمریت نافذ تھی، خوراک کی قلت اور قحط معمول کی بات تھی. جب چین نے ۱۹۷۸ میں اپنی زرعی شعبہ کو نجی تحویل میں دیا تو اس کی پروڈ کٹوٹی اتنی بڑھی کہ نہ صرف چین خوراک میں خود کفیل ہوگیا بلکہ اب وہ اپنی ضرورت سے زائد خوراک کو ایکسپورٹ کرتا ہے. (140)

برطانیہ جمہوریت کی ماں ہے. ورلڈ وار ٹو کے بعد برطانیہ نے اپنی ایک نوآبادیاتی Rhodesia میں مونگ پھلی کو کاشت کیا اور سنٹرل پلاننگ کا طریقہ استعمال کیا نتیجہ ناکامی کی صورت میں برآمد ہوا- یہاں تک کے لندن سے زرعی شعبے کے ماہرین نے اس نوآبادیاتی کا دورہ کیا، زمین

اور حشرات کا جائزہ لیا گیا، کھادیں اور سپرے تجویز کئے گئے مگر مگر ناکامی ہوئی. حقیت یہ ہے کہ Rhodesia نوآبادیاتی کے کسان لندن کے پروفیسرز سے زیادہ اپنی مخصوص زمین، اس کی ساخت، زرخیزی، اور دوسری خصوصیات کو جانتے تھے۔ (141)

روس، یوکرائن، چین اور برطانیہ کے پاس اچھی نیت کے باصلاحیت بیورکریٹس اور ماہرین کی کمی نہیں تھی. کمی علم کی تھی. علم وقت اور مقام کے اعتبار سے ایک دماغ یا ادارے میں اکٹھا نہیں کیا جاسکتا. علم dispersed ہے اور اپنی زمین کا علم اس میں کھیتی باڑی کرنے والے کسان سے بڑھ کر کسی کے پاس نہیں ۔

مناپلی

مناپلی اگر سوشلزم میں ہو یا کیپٹلزم میں دونوں نظام کے لئے زہر قاتل ہے۔ سوشلسٹ معشیت میں ریاست کی آمریت سوسائٹی کے تمام شعبوں پر نافذ ہوتی ہے ۔آپ کے پاس کوئی دوسرا متبادل نہیں ہوتا اگر آپ گورنمنٹ کی سروسز سے مطمئن نہیں۔ کیپٹلزم میں ڈیمانڈ اور سپلائی کی قوتیں اپنی اصل میں صارفین پر انحصار کرتی ہیں ۔ اگر سیاسی مداخلت نہ ہو تو مقابلہ کی ثقافت میں مناپلی ناممکن ہے۔

گورنمنٹ کی خدمات اور مارکیٹ کی پرفارمنس کا صحیح موازنہ ہم اس وقت بھی کر سکتے ہیں جب سیلاب یا کوئی دوسرا قدرتی حادثہ اگر ہو جاتاہے۔ لوگ اپنے ٹیکسز سے ریاست کو بھی اس کی خدمات کا معاوضہ دیتے ہیں اور انشورنس کمپنی کو بھی خدمات کے بدلے پریمیم (Premium) یعنی انشورنس مہیا کرنے کی فیس دی جاتی ہے۔ ذرا پرفارمنس کا موازنہ کریں کہ سیلاب کے فورا بعد شہریوں کے لئے بہتر سہولیات کون فراہم کرتا ہے؟ انشورنس کمپنیاں یا حکومتی بیورکریٹک امداد؟ دنیا میں جہاں بھی انشورنس مارکیٹ موجود ہے آپ دیکھیں گے کہ اپنے صارفین کے لئے انشورنس کمپنیاں ریاست سے زیادہ متحرک اور Efficient ہوتی ہیں.

اسی طرح سرکاری اداروں کے بیوروکریٹس کا رویہ اور مارکیٹ میں کمپنیوں کے رویوں کا باہم موازنہ کریں ۔ آپ ایک ہوٹل پر جاتے ہیں، آرڈر دیتے ہیں آپ کو بہترین کرسی اور میز پر بیٹھایا جاتا ہے اور فورا آرڈر سرو کرنے کی تگ ودو کی جاتی ہے ، چپاتی طلب کرتے ہیں فورا چپاتی حاضر کی جاتی ہے۔ کسی کپڑوں کی دوکان پر جاتے ہیں دوکاندار آپ سے مسکرا کر مخاطب ہوتا ہے، آپ کپڑوں کو دیکھتے ہیں وہ آپ کے لئے شیلفوں سے کپڑے نکال نکال کر آپ کے سامنے بکھیر دیتا ہے۔ آپ کو ان میں سے کوئی پسند نہیں آتا آپ چلے جاتے ہیں وہ ان کپڑوں کو دوبارہ ترتیب دے کر شیلفوں میں لگاتا ہے اور اگلے گاہک کا انتظار کرتا ہے۔ اب ذرا سرکاری اداروں کی پرفارمنس کا محاسبہ کریں ۔ واپڈا جائیں اور محسوس کریں کہ کیسی سروس آپ کو فراہم کی جارہی ہے۔ سوئی گیس کے کسی کنکشن کے لئے بھاگ دوڑ کر لیں. نجی مارکیٹ کی سروسز اور حکومتی سروسز میں آپ کو زمیں وآسمان کا فرق لگے گا۔ ذرا نیشنل بنک آف پاکستان اور دوسری پرائیویٹ بنکس کی سروسز اور پرفارمنس کا موازنہ

کریں. جب پاکستان کے ٹیلی کمیونیکشن سیکٹر میں PTCLکو مناپلی حاصل تھی اس وقت PTCL کی صارفین کے لئے خدمات کا موازنہ آج کے نجی اداروں جیسے jazz اور ٹیلی نار وغیرہ سے کریں آپ کو زمین و آسمان کا فرق محسوس ہو گا.

اس کی کیا وجہ ہے ؟ کیونکہ دوکاندار سمجھتا ہے کہ اس کی بقا صرف کسٹمرز پر منحصر ہے. اگر وہ مہذب ہوگا اور بہتر قیمت و کوالٹی فراہم کرے گا تو کسٹمر اس کے پاس بار بار آئیں گے اگر ایسا نہیں کرے گا تو اس کا کاروبار ختم ہوجائے گا. مگر ریلوے، ptcl، واپڈا اور نیشنل بنک کی کارکردگی اور بقا کسٹمرز پر نہیں ہے کیونکہ ریاستی مناپلی نے انہیں وجود بخشا ہے اور جب تک سنٹرل کمانڈ پسند کرے گی وہ قائم رہیں گی -

بزنسز صرف اپنے پروڈکٹس یا سروسز نہیں بیچتے بلکہ اپنی نیک نامی (Reputation) بھی بیچتے ہیں. ایک موٹرسائیکل سوار اگر کسی اجنبی علاقے سے سفر کر رہا ہو. اسے کسی سافٹ ڈرنک کی طلب ہو تو وہ راستہ کی کسی دوکان سے کوئی لوکل مشروب لینے کے بجائے پیپسی ، کوکاکولا، ڈیو، یا سیون اپ وغیرہ پسند کرے گا جس سے وہ نہ صرف واقف ہے بلکہ ان کی کوالٹی پر اعتبار بھی کرتا ہے.

یہ کارل مارکس تھا جس نے کیپیٹل کا لفظ سب سے پہلے استعمال کیا اور یہ کمیونسٹ تھے جنھوں نے اس نظام کو کیپیٹلزم کا نام دیا اور اپنے لئے سوشلزم کا نام پسند کیا جب کہ اس کے لئے زیادہ مناسب نام اسٹیٹ ازم (State-ism) بنتا ہے- اگر لبرل مارکیٹ کے مفکرین اپنے معاشی نظام کا خود کوئی نام رکھتے تو یہ "کنزیومر ازم" ہوتا-

قانون کیا ہے اور کتنا اہم ہے ؟

ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ سمجھ لیں کہ قانون کہتے کسے ہیں اور یہ کیوں ضروری ہے ؟ اس کا دائرہ کار اور طریقہ کار کیا ہے اور یہ کہ کیا قوانین بھی کچھ اصولوں کے پابند ہوتے ہیں ؟ اگر ہاں، تو وہ اصول کون کون سے ہیں؟

یاد رہے کہ قانون محض حکمرانوں یا سیاستدانوں کی مرضی کا نام نہیں کہ وہ پارلیمان میں بیٹھے ہیں یا بادشاہ اپنے دربار میں بیٹھا ہے اور انہوں نے جو طے کرلیا وہی 20 کروڑ آبادی کے معاشرے کے لیے قانون ہوگا قانون کوئی معمولی چیز نہیں. اس کی مخصوص بنیادیں ہوتی ہیں۔کچھ رہنما اصول ہیں جن پر ان قوانین کا پورا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے۔ اور جو قانون کو ایک مخصوص اثر و مزاج اور رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

ایک لبرل معاشرہ جن قوانین پر اتفاق کرتا ہے اس کی بنیادیں فرد کی آزادی ،مساوات اور انصاف میں قائم ہیں۔فرد کے بنیادی حقوق پر ہی سیاست معیشت اور سوسائٹی کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

ہم قانون بناتے نہیں بلکہ انہیں ایک طویل ارتقائی عمل سے گزر کر دریافت یا ایجاد کرتے ہیں – یہ حتمی بھی اسی سبب سے نہیں ہوتے کہ یہ ارتقائی سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ہمارے قوانین پر ہمارے اجتماعی شعور وقت،جغرافیہ اور سماجی رویوں جیسے عناصر کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ نالج کی طرح قوانین بھی وقت اور مقام کے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔

قانون اور ثقافت

ہم اپنے حال کی تعمیر میں فطری طور پر اپنی سابقہ نسلوں کے تجربات جیسے ثقافت، رسم و رواج،مذہب،زبان اور دوسرے مظاہر سے جڑے ہوئے ہیں۔ثقافت کی یہ علامتیں ہمارے بزرگوں کی سرگرمیوں اور تجربات کا نچوڑ ہیں جن میں وقت کے ساتھ ساتھ ارتقاء جاری ہے۔ ثقافتی اقدار ہمارے لیے نہایت محترم ہیں۔مگر ہمیں ان کی مطلق پابندی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا – ثقافت دراصل اس سماج میں رہنے والے تمام انسانوں کی مختلف سماجی امور میں باہمی رضامندی (Mutual Consent) کو ظاہر کرتی ہے جس کی لوگ رضاکارانہ بنیادوں پر پیروی کرتے ہیں – قانون پر اسی سبب سے ثقافت کو برتری حاصل ہے کہ ثقافت اپنے عمل میں زیادہ جمہوری اور عوامی ہوتی ہے – قانون کو چاہئے کہ بغیر کسی بنیادی سبب کے ثقافت کو چیلنج نہ کرے بشرطیکہ ثقافت کا کوئی پہلو انسانی حقوق سے متصادم نہ ہو –

یہ قوانین بناتے ہوئے ہم trial & error کے عمل سے بار بار گزرتے اور اسی سے عملی طور پر سیکھتے ہیں۔ اگر ان سرگرمیوں کے بہتر نتائج نکلیں تو ہم اس میں مزید ویلیو شامل کرتے ہیں اور اگر منفی نتائج برآمد ہوں تو اس سرگرمی کو یا تو قطعی طور پر ترک کردیتے ہیں یا پھر اس

کی خامیوں کوتاہیوں کو نکال کر اسے بہتر طور پر دوبارہ سرانجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ہماری یہ سیکھت (learning) ہماری آنے والی نسلوں میں منتقل ہوجاتی ہے جس طرح اسلاف کے تجربات کے نتائج (learning) ہم تک پہنچے ہیں - رسم و رواج، زبان ، علم ،شاعری ،تعمیرات سمیت ان گنت ایسے مظاہر میں جو ہم تک ہماری گزشتہ نسلوں کے نتائج کی صورت میں پہنچے ہیں۔ہم غیر شعوری طور پر ان کی پیروی کرتے ہیں ، ان سب خصوصیات کا بطور قانون ہماری زندگی میں ایک معتبر مقام ہے۔

زبان کی مثال

زبان (language) اس سلسلے میں سب سے بہترین مثال ہے - اس کا پہلے بھی ہم نے ذکر کیا کہ اسے کسی فرد واحد، ادارے ، گروپ یا طبقہ نے دریافت نہیں کیا ، نہ ہی یہ کسی ملکی قانون یا اتھارٹی سے وجود میں آئی ہے بلکہ یہ وہ سیکھت (learning) شعور اور سمجھ ہے جو ہمارے آباؤاجداد سے ہم تک پہنچی ہے۔ایک لفظ کے معانی جو ہم سمجھتے ہیں وہ لفظ کسی اجنبی کے لئے بالکل ہی انوکھا اور بے معنی ہوگا مگر ہمارے لئے ہرگز نہیں - لفظ کا جوہری طور پر کوئی مخصوص ، متعین اور حتمی مطلب نہیں ہوتا ، لفظ کے ساتھ جو معانی ہم تصور (Suppose) کرتے ہیں وہ ہمارے آباؤاجداد کا اس مخصوص لفظ کے مفروضہ معانی پر اتفاق ہے جو ان سے ہم تک پہنچا ہے –

مثال کے طور پر سیب ایک پھل ہے ،لفظ پھل میں معنی نہیں بلکہ معنی اس رضا مندی (consent) میں ہے جن پر پہلے ہمارے آباواجداد نے اتفاق کیا اور اب ہم ان سے سیکھ کر اس پر بلاشک و شبہ اتفاق کرتے ہیں کہ سیب سے مراد اس شکل و خوشبو اور ذائقہ کا پھل ہے - سیب کا نام سن کر جو خیال ہمارے ذہن میں آتا ہے جس میں ہم سیب کو دیکھتے اور اس کے ذائقہ کو محسوس کرتے ہیں وہی حقیقت ہے جس سے ہم سیب کو بطور ایک مخصوص پھل کے شناخت کرتے ہیں اور اسی پر ہماری سوسائٹی کا اتفاق قائم ہوتا ہے - فرض کیا ملتان میں میں کسی شخص کو سیب کھانے کو کہوں تو وہ اس سے مراد وہی پھل لے گا جس کا میں نے تصور کیا -

اب ہمارے پاس دو چیزیں ہیں۔ ایک ثقافت ہے جس کا بظاہر ہم پر کوئی باقاعدہ جبر نہیں مگر ہم اس کی اپنی رضامندی اور خوش دلی سے پابندی کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ سرکاری قانون ہے جس کی ہم سے زبردستی پابندی کرائی جاتی ہے۔ان دونوں کے درمیان آخر کیا تعلق ہے ؟ اس پر ہمیں اس کہاوت کو یاد کرنا چاہیے۔

جب کوئی قوم بہت زیادہ قوانین بنانا شروع کردے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس پر بڑھاپاآگیا ہے -

اس سے مراد یہ ہے کہ تہذیب و تمدن قوانین سے قائم نہیں ہوتے بلکہ ثقافت سے قائم ہوتے ہیں - ثقافت ایک سماج میں بنیادی چیز ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ ان متعلقہ امور میں سوسائٹی کے افراد کے درمیان رضاکارانہ اتفاق رائے (mutual consent) قائم ہے. ہم

قانون اس وقت بناتے ہیں جب ہم کلچر میں کوئی ایسی کمی یا خرابی دیکھتے ہیں جس سے ہمارا اجتماعی شعور بغاوت کر رہا ہوتا ہے یا اس سے ظلم کو جواز مل رہا ہوتا ہے اور مظلوم کی مدد کے لئے ثقافتی اقدار بے بس محسوس ہوتی ہیں یا بالادست طبقات قانون کی غلط تشریح کر رہے ہوتے ہیں۔ان نقائص کو دور کرنے کے لئے ہم قانون بناتے ہیں تاکہ بالادوست طبقات ان خرابیوں کی مدد سے سماج کے سیاسی و معاشی طور پر کمزور افراد کا استحصال نہ کرسکیں۔ قانون ان خامیوں کو ختم کرنے کے لئے بطور ایک ذریعہ استعمال ہوتا ہے کہ اگر شہریوں کی آزادی ،مساوات ، انصاف اور دیگر بنیادی حقوق پر ضرب پڑ رہی ہے تو انہیں دور کیا جائے۔

ہم ثقافت کو وقت اور مقام کے اعتبار سے مسلسل update کرتے جاتے ہیں ، یہی سرگرمی ہمارے آباو اجداد کی بھی تھی اور یہی سرگرمی ہماری آنے والی نسلیں سرانجام دیتی رہیں گی۔مگر یاد رہے کہ ثقافت قانون سے زیادہ طاقتور اور پر اثر ہے اور بہترین قانون وہ ہے جو اپنی بنیادی ذمہ داریوں (جان و مال ، شخصی آزادیوں ، حق ملکیت کے تحفظ ، اور مساوات و انصاف کا قیام) کی سرانجامی کے ساتھ ساتھ عمومی صورتحال میں ثقافت سے عداوت نہیں رکھتا ۔بہترین معاشرے وہ ہیں جن میں قوانین کا دائرہ اختیار کم مگر موثر ہوتا ہے جبکہ سماجی اقدار زیادہ طاقت ور اور انسان دوست ہوتی ہیں۔

قانون سے متعلق کچھ اہم نکات درج ذیل ہیں -

- دور جدید کی آزادیوں ،مساوات اور انصاف کو محض قوانین نے نہیں جنم دیا بلکہ ان میں ثقافت کا بھی قیمتی حصہ ہے۔ثقافت جو محض مادی تبدیلیوں سے وجود میں نہیں آتی۔ جس میں تنوع پسندی ہے اور جو فرد کے حق انتخاب اور آزادی ارادہ و عمل اور شخصی نظام اقدار پر ضرب نہیں لگاتی - مغربی تمدن قانون کی نہیں آزادہ رو ثقافت کی عملی تصویر ہے۔

- قانون اور ثقافت ایک شعوری و غیر شعوری ڈھانچہ (framework) قائم کرتے ہیں جن میں ہم اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ قانون اور ثقافت پر شخصی آزادی، مساوات اور انصاف کو برتری حاصل ہے۔

- کلچر اس وقت قائم ہوتا ہے جب اس کے اراکین شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کی پیروی کرتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں کلچر پر سوسائٹی کا اجماع ہوتا ہے۔

- کلچر عموما ہر عہد کی مادی و اخلاقی ضروریات وخواہشات اور ان کی تکمیل کے اسباب و ذرائع کی عملی تصویر ہوتا ہے۔کلچر دراصل معاشرہ کا آئینہ ہے ۔ کسی بھی معاشرے میں انسانی دوستی کی اقدار کو جاننا ہوتو اس معاشرے کے کلچر میں انسان دوست روایات اور لوگوں کے رجحان کو مشاہدہ کیا جاسکتا ہے ۔

- قانون جبر کا نام نہیں بلکہ تحفظ کا نام ہے۔ قانون شہریوں کی شخصی آزادی ،مساوات اور انصاف کا تحفظ کرتا ہے۔وہ ان سے ان کی آزادی چھینتا نہیں بلکہ ان کی آزادی کو سہولیات بہم پہنچاتا ہے۔

- قانون جنرل ہونا چاہیے یعنی اسے فرد کی ضروریات و خواہشات، امیدوں و امنگوں اور ثقافت سے ہم آہنگ ہونا چاہئے ۔ اسے کسی سنٹرلائزڈ اتھارٹی یعنی اپنے نفاذ میں کسی سٹیٹس کو یا بالادست طبقہ کی ضرورت نہ ہو۔قانون کی نظر میں سب برابر ہوں اور وہ مساوات و انصاف کو ہر حال میں غیر مشروط طور پر قائم کرے۔

قانون کی اپنے دائرۂ کار کے اعتبار سے مزید دو اقسام ہیں ۔

قانون کی ایک قسم وہ ہے جس میں قانون اپنے نفاذ میں تمام شہریوں کو مساوی رتبہ و درجہ فراہم کرتا ہے۔جبکہ دوسری قسم میں وہ قانون شامل ہے جو کسی خاص گروپ،علاقہ ،نسل ،زبان یا شناخت سے امتیازی سلوک کرتا ہے۔

مثال کے طور پر حکومتیں اپنے اخراجات کے لئے ٹیکس لگاتی ہیں ۔فرض کیا یہ ٹیکس آمدن پر 5فیصد ہے ۔اگر پورے ملک کی معیشت پر بغیر کسی امتیاز کے یہ ٹیکس نافذ ہوتا ہے تو یہ وہ قانون ہے جو سب سے مساوی برتاؤ کر رہا ہے۔اگر اس کے الٹ میں یہ قانون منظور ہوتا ہے کہ تمام انڈسٹریز 5 فیصد ٹیکس دیں گی مگر ٹیکسٹائل کے شعبہ پر ٹیکس معاف ہو گا اورآئل و گیس سیکٹر پر اوسط شرح سے دوگنا ٹیکس وصول کیا جائے گا تو یہ عدم مساوات ظلم اور نا انصافی ہے۔اسی طرح زراعت پر ٹیکس چھوٹ دینا اور صنعتوں پر بھاری ٹیکس لگانا کلاسیکل لبرل اصول قانون کی رو سے مساوات سے بغاوت ہے۔لبرل ازم معیشت میں ان قوانین کو تسلیم کرتا ہے جن کی بنیاد آزادی ،مساوات اور انصاف پر ہے۔اور وہ قوانین جن میں امتیازی برتاؤ کیا جاتا ہے وہ قابل مذمت ہیں ۔

پاکستان میں جغرافیائی بنیادوں پر امتیازی برتاؤ غیر قانونی ہے ۔

راقم الحروف سے ایک بار ایک دوست نے پوچھا کہ آپ کے خیال میں پاکستانی آئین کو اگر لبرل بنایا جائے تو کون کون سے اقدامات ضروری ہیں ؟ میرا جواب سادہ سا تھا وہ یہ کہ ہمیں پاکستانی قانون کے بنیادی اصولوں پر اعتماد ہے جو دراصل برطانوی کامن لاء سے اخذ کئے گئے ہیں جن میں شخصی آزادی ، شہریت کے حقوق میں مساوات اور غیر متعصبانہ انصاف کی ضمانت دی گئی ہے نیز 1973 میں عوامی نمائندگی کی اساس پر قائم منتخب پارلیمان کی بھرپور توثیق بھی اسے حاصل ہے ۔مگر قانون کی کچھ شقیں ایسی بھی ہیں جن پر ہمیں اختلاف ہے کیونکہ یہ اپنی بنیاد میں متعصبانہ ہیں ۔آئین کا یہ متعصبانہ رویہ ایک بنیادی اصول کے تحت ختم کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ پارلیمان کوئی ایسا قانون پاس نہیں کر سکتی اور انتظامیہ کوئی ایسا حکم نافذ نہیں کر سکتی جو تمام شہریوں پر بغیر کسی مذہبی لسانی جغرافیائی نسلی و صنفی امتیاز کے لاگو نہ ہو – ایسا ممکن ہی نہ ہو کہ ایک چیز جو پنجاب میں قانونی ہے وہ سندھ میں غیر قانونی ہو ، جو خیبر پختونخواہ میں تو جائز ہو مگر فاٹا میں جا کر ناجائز ہو جائے، جو پنجاب میں بنیادی انسانی حق مانا جائے مگر بلوچستان میں جا کر اسے غداری سے مشروط کر دیا جائے اور جو مرد کے لئے تو جائز ہو مگر عورت کے لئے نہیں۔

ایک جمہوری ریاست میں شہریت کی مساوات سے مراد یہی ہے کہ اس ملک میں تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہیں اور ان میں کسی ایک کو بھی دوسرے پر حقوق کے باب میں برتری یا کمتری حاصل نہیں۔ جو قانون ایک عام شہری کے لئے ہے چاہے وہ بلوچستان کے ویرانوں میں بھٹک رہا ہے یا جنوبی پنجاب میں تنگ حال ہے یا فاٹا میں خاک و خون کی جنگ میں بے آسرا و بے سہارا ہے اور یا پھر وہ تھر کے ریگستانوں میں پانی و خوراک کی صدائیں لگا رہا ہے ، وہی قانون ایوان وزیراعظم میں بیٹھے وزیراعظم ، پریزیڈنٹ ہاؤس میں تشریف فرما صدر مملکت ، جنرل ہیڈ کوارٹر میں چھڑی ہلاتے چیف آف آرمی سٹاف اور وزیر اعلیٰ ہاؤس کے خادم اعلیٰ کے لئے بھی ہے – ان میں کسی کو بھی اس قانون میں نہ کوئی استثنیٰ حاصل ہونا چاہئے اور نہ ہی کوئی چھوٹ – صرف ایک شاہی سلطنت میں ایسا ہوتا ہے کہ شاہی خاندان کو یا ان کے منظور نظر افراد کو استحقاق اور قانون و انصاف کے معاملے میں اجارہ داری حاصل ہوتی ہے – ایک قومی ریاست میں جو شہریت کی مساوات آزادی اور انصاف کو اپنے قانون و ثقافت کے لئے معیار بناتی ہے،شہریوں کے حقوق میں کسی بھی قسم کا امتیاز غیر قانونی و غیر اخلاقی ہے اور قابل مذمت ہے –

آج پاکستانی وفاق بہت سارے چیلنجز کا سامنا کر رہا ہے ۔ہمارے ملکی مسائل کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں مختلف شناختیں احساس محرومی کا شکار ہیں – وہ سمجھتی ہیں کہ ان سے امتیاز برتا جاتا ہے اور انہیں مرکزی دھارے سے باہر رکھا جاتا ہے جس کی وجہ مرکز

پر ایک مخصوص شناخت کی اجارہ داری ہے – اگر ریاست تمام شناختوں کا احترام و مقام مقدم رکھتی اور آزادی مساوات و انصاف کو معیار بناتی تو ایسا ممکن نہ ہوتا –

خبر ہے کہ وفاقی وزارت برائے ریاستی امور و سرحدی علاقہ جات نے فاٹا سول سیکٹریٹ کو احکامات جاری کئے ہیں کہ قبائلی رسم و رواج کو قانونی شکل دینے پر کام شروع کیا جائے – یاد رہے کہ چھ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی وزیراعظم کے مشیر سرتاج عزیز کی سربراہی میں جنگ زدہ قبائلی علاقے کو مرکزی دھارے میں لانے کے لئے اپنی تجاویز پیش کر چکی ہے اور ان پر بحث پارلیمان میں جاری ہے – یہ بھی یاد رہے کہ نوآبادیاتی دور سے ہی فاٹا پر فرنٹیئر کرائم ریگولیشن کی شکل میں استبدادی قوانین رائج رہے ہیں جویہاں پسماندگی کی ایک بڑی وجہ ہیں –ایک قانون کی رو سے اگر کوئی ایک فرد یا افراد کا ایک گروہ کوئی سنگین جرم کرتا ہے تو حکومتی نمائندہ یا پولیٹیکل ایجنٹ اس کی سزا اس کے پورے قبیلے کو دے سکتا ہے – بتایا گیا ہے کہ مذکورہ کمیٹی کی ان تجاویز میں ایک تجویز یہ بھی ہے کہ جرگہ سسٹم کو قائم رکھا جائے – اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اس تجویز کی توثیق پارلیمان سے ہو جاتی ہے یا حکومت اسے کوئی اور قانونی چھتری فراہم کرتی ہے تو پاکستان میں ایک متوازی عدالتی نظام لاگو ہو جائے گا– سوال یہ ہے کہ اگر فاٹا کو قبائلی رواج کے سپرد کیا جا رہا ہے جن کا تحفظ قبائلی جرگہ کرے گا تو یہ حق بلوچستان کے بلوچوں ، جنوبی پنجاب کے سرائیکیوں ، سندھ کے سندھیوں اور باقی شناختوں کو کیوں نہیں دیا جاتا ؟ یاد رہے کہ جب ایک قانون پارلیمان سے پاس ہو جاتا ہے تو وہ دراصل اپنے تصور و عمل میں حق و ناحق ، جائز و ناجائز اور درست و غلط کی تقسیم و تشریح کر رہا ہوتا ہے یوں جب جرگہ سسٹم فاٹا کے لئے جائز ہو سکتا ہے تو سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ پنچایت یا جرگہ قسم کی دوسری متوازی عدالتیں باقی علاقوں میں کیوں نہیں جائز ہو سکتیں ؟

بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا کسی خطے کے رسم و رواج قانون کے لئے بنیاد بن سکتے ہیں ؟ خاص طور پر اس صورتحال میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ رواج معاشرے کے کمزور طبقات خاص طور پر خواتین کے خلاف انتہائی متعصبانہ رویہ رکھتے ہیں– فاٹا کے کچھ علاقوں خاص طور پر خیبر ایجنسی میں خواتین کو ووٹ دینے کے حق سے محروم رکھا گیا (یاد رہے کہ باقی علاقوں میں بھی ٹرن اوور مایوس کن رہے) اور اس اقدام پر تمام سیاسی جماعتیں متفق تھیں ، نہیں معلوم کہ کیا ان جماعتوں کی مقامی اور قومی قیادت نے شہرت کی اپنی تعریف میں خواتین کو ووٹنگ کے حق سے نکال دیا ہے کیونکہ میڈیا میں اس خبر کی تشہیر کے بعد بھی انھوں نے چپ سادھ رکھی؟اسی طرح فاٹا میں لڑکیوں کی تعلیم کی شرح محض تین فیصد ہے جس میں سب بڑی رکاوٹ یہی رسم و رواج ہیں – اگر لوئر دیر میں خواتین کو ووٹنگ کے حق سے محروم کرنا وہاں کے رسم و رواج کی ضرورت ہے تو ملک کے دوسرے حصوں میں بھی خواتین کی قران سے شادی اور لڑکیوں کو تعلیم کے بنیادی حق سے

محروم رکھنا بھی وہاں کے رواج کا حصہ ہے تو کیا ریاست ان علاقوں کے شہریوں کو یہ حق دے گی کہ وہ بھی اپنے رسم و رواج کے مطابق اور اپنی پنچایتوں کے تحت فیصلے کر سکیں ؟ اگر نہیں تو محض فاٹا میں کیوں ؟

- پہلی بات تو یہ ہے کہ رسم و رواج ایک ساکن چیز نہیں یہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں –
- دوسری بات یہ کہ یہ قوانین بنیادی انسانی حقوق سے متصادم ہیں جنہیں رسم و رواج کا چولا پہنا کر بھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا اور ریاست کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ شہریوں کے بنیادی حقوق کا ہر صورت میں تحفظ کرے –
- سوم ایک جمہوری قومی ریاست کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ شہریوں کے مابین حقوق کی مساوات قائم ہو – فاٹا میں ایسے قوانین نہیں نافذ ہو سکتے جو بقیہ پاکستان میں رائج نہ ہوں –
- چہارم یہ کہ فاٹا کو مرکزی دھارے میں لانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اسے بقیہ پاکستان سے الگ تھک نہ کیا جائے نہ حقوق کی شکل میں، نہ وسائل کی تفویض کی شکل میں اور نہ ہی کسی اور حوالے سے – فاٹا پاکستان کا حصہ ہے اور اس سے کسی بھی طرح کا امتیاز برتنا ہی دراصل اسے مرکزی دھارے سے الگ کرنے کے مترادف ہے –
- پانچویں اور سب سے اہم بات یہ کہ ان قبائلی علاقوں میں سرداری نظام موجود ہے – یہ قدیم رسم و رواج سردار اور حکومتی اہلکاروں کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں –قبائلی جرگہ پر سرداروں کی اجارہ داری قائم ہوتی ہے – اگر ریاست قبائلی رسم و رواج کو قانونی شکل دیتی ہے تو اس سے سوائے اس کے اور کوئی مراد نہیں کہ ایک طرف شہریوں پر سرداری نظام کا تسلط جدید شکل میں نافذ کیا جائے گا تو دوسری طرف ریاست ، پسماندگی کو فروغ دینے اور ان علاقوں کو مرکزی دھارے سے باہر رکھنے میں پیش پیش ہو گی –
- چھٹی بات یہ ہے کہ ثقافت فرد کا ذاتی حق انتخاب ہے ، اس میں کوئی جبر نہیں – فرد آزاد ہے کہ وہ اپنے علاقے کے رسم و رواج کی مطلق پابندی کرے یا نہ کرے یا ان میں کچھ کی تو پابندی کرے اور کچھ کی نہیں – یہی معاملہ پاکستان کے ہر شہر میں ہے ، کراچی کو دیکھ لیں اس میں کوئی ایک متعین طرز کی ثقافت نہیں پائی جاتی جس کی شہری ہر صورت میں پابندی کرتے ہوں بلکہ اس میں شہریوں کی انفرادی پسند و ناپسند نے مجموعی طور ایک خوبصورت ثقافت کو جنم دیا ہے جس میں وقت کے ساتھ ساتھ ارتقاء ہے -ثقافت اور قانون میں فرق ہے ثقافت کسی رسم یا رواج کی رضاکارانہ اتباع یا اس سے انکار کا نام ہے جبکہ قانون تو ہے ہی سراسر اتباع کا نام – قانون میں مجرم کو حق انتخاب نہیں دیا جا سکتا کہ چاہے تو جیل چلا جائے یا اپنے گھر ،مگر ثقافت کے باب میں ریاست کسی فرد کو مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ کسی رسم و رواج کی ہر صورت میں پابندی کرے ، یہ تو ریاست کے

دائرۂ کار میں ہی نہیں آتا– قانون شہریوں کے حقوق کا تعین کرتا ہے فرائض کا نہیں سوائے ایک فرض کے کہ آپ باقی شہریوں کے حقوق کو نقصان نہیں پہنچائیں گے– اگر رواج کو قانون کا درجہ دے دیا جائے تو اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ثقافت کا جبر نافذ کر رہے ہیں جو آمریت کی ایک بدترین صورت ہے–

- ساتویں بات یہ کہ فاٹا میں ہمیں شدت پسندی کے عفریت کا بھی سامنا ہے – شدت پسندی کے مسائل کا حل معاشروں کو اوپن کرنے میں ہے تاکہ وہ دنیا سے سیکھیں ان سے مکالمہ کریں اور ارتقائے زمانہ سے ہم آہنگی اختیار کریں - بند معاشروں میں پسماندگی نفرت اور انتہا پسندی پروان چڑھتی ہے – فاٹا کو الگ تھلگ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نہیں چاہتے کہ وہ ارتقائے زمانہ سے کچھ سیکھیں اور اس میں اپنا زہین و مخلص حصہ ڈالیں –

نو آبادیاتی عہد آج سے 69سال قبل ہندوستان میں اپنے اختتام کو پہنچا تھا اسے فاٹا میں بھی اب ختم ہو جانا چاہیئے – اگر ہنوز فاٹا پر جابرانہ قوانین نافذ رہتے ہیں تو سوال بار بار اٹھایا جائے گا کہ کیا آپ نے فاٹا کو مقبوضہ علاقہ سمجھ رکھا ہے، کیا یہ آزاد و خودمختار پاکستان کا حصہ نہیں اور یہ کہ یہاں کے شہریوں سے امتیازی سلوک کیوں روا رکھا جا رہا ہے ؟

- اہم اور قابل غور چیز یہ ہے کہ قانون ہمیں یہ بتا سکتا ہے کہ آیا وہ کون سا کام ہے جو ہم نہیں کرسکتے ، جس سے کسی دوسرے فرد کی آزادی اور مساوی رتبے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مگر قانون کسی فرد کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ لازمی طور پر کیا کیا سرگرمیاں سرانجام دے یعنی ان کی شخصی آزادی میں مداخلت نہیں کر سکتا ۔مثال کے طور پر قانون یہ زبردستی نہیں کر سکتا کہ
  - لازمی طور پر تمام شہری فوجی تربیت حاصل کریں
  - تمام عورتیں لازمی طور پر سکارف پہنیں۔ وغیرہ وغیرہ

جیسا کہ پہلے نکتے میں یہ بیان کیا گیا کہ قانون تحفظ دیتا ہے جبر نہیں کر سکتا - جب ہم کسی سرگرمی سے کسی دوسرے کو روکنے کو کوشش کرتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے کو اگر نقصان پہنچارہا ہے تو ایسا ہر گز نہ ہونے دیا جائے۔ یہ تحفظ ہے۔اور جب ہم کسی کو کہتے ہیں کہ فلاں عمل (مثال کے طور پر صرف ایک بچہ کی پیدائش کی اجازت) وہ ہر صورت میں کرے تو یہ وہ جبر ہے جو ہم اس فرد پر نافذ کر رہے ہوتے ہیں اور یہ یقینا قابل مذمت ہے ۔

قانون

(Frederic Bastiat)

قانون کی کایا کیا پلٹنی ریاست میں پولیس کی طاقتیں بھی بے مہار ہو گئی ہیں ۔ میری دانست میں قانون، نہ صرف اپنے اصل مقصد سے منہ موڑ چکا ہے، بلکہ مکمل متضاد مقاصد کی راہ پہ چڑھا دیا گیا ہے۔ قانون ہر قسم کی حرص کا ہتھیار بن چکا ہے۔ جرائم پر قابو پانا تو درکنار، قانون خود انہی برائیوں کا مرتکب ہو رہا ہے جن برائیوں کی سزا دینا قانون کا منصب تھا۔

اگر یہ مفروضہ درست ہے تو یہ نہایت سنجیدہ حقیقت ہے اور میرا اخلاقی فرض ہے کہ میں اپنے شہری بھائیوں کی توجہ اس جانب مبذول کراؤں۔

زندگی ایک نعمت خداوندی ہے: ہمیں خدا کی جانب سے ایک ایسی نعمت ملی ہے جو دیگر تمام نعمتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ زندگی کی نعمت ہے.... جسمانی، ذہنی اور اخلاقی زندگی کی نعمت۔ تاہم زندگی محض اپنے ہی سہارے پر نہیں گزاری جا سکتی۔ خالق حیات نے ہمیں زندگی کی حفاظت، بہتری اور اسے کمال تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی دے رکھی ہے۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نہ صرف خالق نے ہمیں حیرت انگیز صلاحیتیں عطا کیں بلکہ ہمیں رنگا رنگ فطرت کے ذرائع کے بیچوں بیچ پیدا کیا۔ اپنی صلاحیتیں فطرت کے ان ذرائع پر لگا کر ہم اشیاء پیدا کرتے اور استعمال میں لاتے ہیں۔ زندگی کو اپنے مقررہ راستے پر رواں دواں رکھنے کے لیے یہ عمل ناگزیر ہے۔

زندگی ، اس کی صلاحیتیں، اور پیداوار .... بالفاظ دیگر انفرادیت،آزادی اور ملکیت ..... یہی انسان کی کل تعریف ہے۔ "جامع کمالات سیاستدانوں" کی ہوشیاروں کے باوجود اصل بات یہ ہے کہ خدا کی جانب سے عطا شدہ یہ تینوں تحفے ہر انسانی قانون سازی سے ماقبل اور ماورا و برتر ہیں۔ زندگی ، آزادی اور ملکیت کا وجود ، انسانی قوانین کے بل بوتے پر قائم نہیں بلکہ اس کے برعکس حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی ، آزادی اور ملکیت پہلے سے موجود تھے اور یہی انسانی قوانین کا باعث بنے۔

تو سوال یہ ہے کہ قانون کیا ہے؟

قانون انفرادی حق دفاع کی اجتماعی تنظیم کا نام ہے۔

ہم میں سے ہر شخص کو خدا کی طرف سے اپنی ذات، آزادی اور ملکیت کے دفاع کا فطری حق میسر ہے۔ یہ زندگی کی تین بنیادی ضروریات ہیں اور ان میں سے کسی ایک کی حفاظت مکمل طور پر باقی دو کی حفاظت پر منحصر ہے۔ کیونکہ ہماری صلاحیتیں ہماری انفرادیت ہی کی

ایک شاخ ہیں، اسی طرح ہماری ملکیت بھی ہماری صلاحیتوں کی ایک شاخ کے سوا کچھ نہیں۔ اگر فرد کو اپنی ذات، آزادی اور ملکیت کے دفاع کی اجازت، چاہے وہ (بوقت ضرورت) طاقت کے ذریعے ہی ہو، حاصل ہے تو پھر انسانوں کے ایک گروہ کو بھی یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ ان تینوں حقوق کی دائمی حفاظت کے لیے ایک مشترکہ طاقت کو منظم اور اس کے ساتھ تعاون کریں۔ یوں اجتماعی حق کا فلسفہ، جس کے جواز کی دلیل اس کا قانونی ہونا ہے، انفرادی حق کے تصور پر ہی استوار ہے۔ ایسے میں وہ مشترکہ طاقت جو اس اجتماعی حق کی حفاظت کرتی ہے کا منطقی طور پر کوئی جواز یا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے جس کے متبادل کے طور پر وہ کام کرتی ہے۔ **لہذا، جیسا کہ ایک فرد قانونا دوسرے فرد کی ذات، آزادی یا ملکیت کے خلاف طاقت کا استعمال نہیں کر سکتا بعینہ مشترکہ طاقت کا استعمال بھی اسی منطق کی بنا پر قانونا کسی فرد کی ذات، آزادی یا ملکیت کے انہدام کے لیے نہیں کیا جا سکتا۔**

طاقت کا ایسا غلط استعمال انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر، ہمارے مقدمے کے خلاف ہو گا۔ ہمیں طاقت اپنے انفرادی حقوق کے تحفظ کے لیے ملی ہے۔ کون ہے جو جرات سے کہہ سکے کہ یہ طاقت ہمیں اپنے ہی بھائیوں کے برابر حقوق تباہ کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ اگر ایک فرد خود سے دوسروں کے حقوق کو قانونا نقصان نہیں پہنچا سکتا تو کیا منطق کا تقاضا یہی نہیں کہ وہی اصول اجتماعی طاقت پر بھی لاگو کیا جائے کیونکہ اجتماعی طاقت انفرادی طاقتوں کے مجموعے کا ایک نظم ہی تو ہے۔

اگر یہ سچ ہے تو اس بات سے زیادہ واضح اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ قانون فی نفسہ جائز دفاع کے فطری حق کی اجتماعی تنظیم اور اجتماعی طاقت کو انفرادی طاقت کا متبادل بنانے کا نام ہے۔ نیز اس اجتماعی طاقت کو صرف وہی اختیار حاصل ہے جو انفرادی طاقت کو ایک فطری اور قانونی حق کے طور پر حاصل ہے یعنی قانون شخصیات، آزادیوں اور ملکیتوں کی حفاظت کرے، ہر شہری کا حق قائم و دائم رکھے، اور انصاف کی حکمرانی کا باعث بنے۔

ایک عادل اور پائیدار حکومت:

اگر ایک قوم کی تشکیل مذکورہ بالا بنیاد پر ہو تو مجھے یہ لگتا ہے کہ لوگوں کے اعمال اور خیالات میں توازن زیادہ آئے گا۔ میرا خیال ہے کہ ایسی قوم کی حکومت اپنے سیاسی خد و خال سے قطع نظر، جہاں تک تصور کیا جا سکتا ہے ،انتہائی سادہ، قبولیت کے لیے آسان، کم خرچ، محدود، غیر جابر، عادل اور پائیدار ہوگی۔

ایسے انتظام کے ماتحت، ہر شخص کو اپنی ذات سے متعلقہ حقوق اور ذمہ داریوں کا احساس ہو گا۔ کسی فرد کو بھی حکومت سے شکایت نہ ہو گی کیونکہ اس کی ذات کا احترام ہوگا، اس کی محنت آزاد ہو گی اور اس کی محنت کا صلہ ہر غیر عادلانہ حملے سے محفوظ رہے گا۔ ہمیں

اپنی کامیابی پر ریاست کا شکر گذار نہیں ہونا پڑے گا اور اپنی ناکامی پر ریاست سے ہمارا شکوہ ایسا ہی ہوگا جیسے کسان برفانی طوفان کا شکوہ حکومت سے کریں۔ ایسے تصور حکومت کی جانب سے دیئے گئے تحفظ کا قیمتی احساس ہی ریاست کا واحد تعارف بن جائے گا۔

مزید یہ کہ، نجی معاملات میں ریاستی عدم مداخلت کے باعث، ہماری ضروریات اور ان کی تسکین ایک منطقی انداز اختیار کر لیں گی۔ ہم غریب خاندانوں کو روٹی کے لیے باتیں سنتا نہیں دیکھیں گے۔ ہم شہری اور دیہی علاقوں کو ایک دوسرے کے خرچ پر آباد ہوتا نہیں دیکھیں گے۔ ہم سرمائے، محنت اور آبادی کو قانونی فیصلوں کی بنا پر بے گھر ہوتا نہیں دیکھیں گے۔ اس ریاستی طور پر مسلط کردہ غیر منصفانہ تقسیم سے ہمارے زندہ رہنے کے ذرائع شدید متاثر ہوتے ہیں اور حکومت پر اضافی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیتے ہیں۔

قانون کی مکمل تباہی:

بدقسمتی یہ ہے کہ آج کل قانون اپنے اصلی کردار پر قطعاً باقی نہیں رہا اور جب قانون نے اپنی حقیقی ذمہ داریوں سے تجاوز کیا تو ایسا صرف چند معمولی اور قابل بحث امور میں نہیں بلکہ اس سے کہیں آگے قانون کے اپنے حقیقی مقاصد کی مخالفت پر ختم ہوا۔ قانون خود اپنے ہی مقصود کو تباہ کرنے کے لیے استعمال ہوا۔ قانون جس انصاف کی بقا کا ضامن تھا اسے فنا کرنے کے لیے عمل میں لایا گیا یعنی قانون کے ذریعے حقوق کی حفاظت کی بجائے حقوق محدود اور ختم کرنے کا کام ہوا۔ قانون ایسے بددیانتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا جو بلا احتساب دوسروں کی زندگی، آزادی اور مال سے کھیلنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ قانون نے لوٹ مار کی حفاظت کے لیے لوٹ مار ہی کو حق اور قانونی حق دفاع کو سزا دینے کے لیے جرم بنا دیا۔

قانون کی یہ کایا پلٹ کیونکر ممکن ہوئی اور اس کے اثرات کیا ہیں؟

قانون کی یہ کایا پلٹ دو مکمل طور پر مختلف وجوہات کا نتیجہ ہے جو احمقانہ حرص اور جھوٹی انسانی ہمدردی ہے۔ پہلے سبب کو ذرا سمجھتے ہیں۔

انسان کا ایک مہلک رجحان:

ذاتی بقا اور ذاتی ترقی کی خواہش تمام انسانوں میں مشترک ہے ۔اگر کسی شخص کو اپنی صلاحیتوں کے بلا روک ٹوک استعمال اور اپنی محنت کے ثمرات کی آزاد رسائی حاصل ہو تو سماجی ترقی لگاتار، مسلسل اور کامیاب ہوتی ہے۔

تاہم انسانوں میں جب بھی ممکن ہو سکے دوسروں کے خرچ پر خوشحال ہونے کا رجحان بھی مشترک ہے۔ یہ کوئی غیر ذمہ دارانہ الزام نہیں ہے اور نہ ہی یہ بات کسی بے زار اور ظالم طبیعت کے فرد کی جانب سے کی گئی ہے۔ تاریخ شاہد ہے۔ نہ ختم ہونے والی جنگیں، وسیع پیمانے پر ہونے والی ہجرتیں، مذہبی قتل و غارتگری، عالمی مسئلہ غلامی، تجارت میں بددیانتی اور اجارہ داری، یہ سب گواہ ہیں کہ انسانی فطرت

میں یہ مہلک رجحان جنگلی، آفاقی اور ناقابل ضبط رویے کے طور پر موجود ہے جو اسے کم از کم تکلیف سے اپنی خواہشات کی تکمیل پر اکساتا ہے۔

مال اور لوٹ مار:

انسان کے ذندہ رہنے اور خواہشات کی تکمیل کا وسیلہ صرف مسلسل محنت اور اپنی صلاحیتوں کا فطری ذرائع پر استعمال ہی ہے۔ یہ عمل مال یعنی جائیداد پیدا کرتا ہے۔ تاہم یہ بھی درست ہے کہ انسان کا ذندہ رہنا اور خواہشات کی تکمیل دوسروں کی محنت کا پھل چھین کر استعمال کرنے سے بھی ممکن ہے۔ یہ عمل لوٹ مار کا باعث ہے۔

چونکہ انسان فطرتاً تکلیف سے بچنا چاہتا ہے اور محنت بذات خود ایک تکلیف ہے لہذا انسان کے لئے جب بھی لوٹ مار، محنت سے زیادہ آسان ہو، وہ لوٹ کھسوٹ پر ہی اتر آتا ہے۔ تاریخ اس امر پر واضح ہے اور ایسے حالات میں مذہب اور اخلاقیات بھی لوٹ کھسوٹ روک نہیں سکتے۔

تو اس لوٹ مار کو کیسے روکا جائے؟ یہ تب ہی ممکن ہے جب لوٹ مار محنت سے زیادہ تکلیف دہ اور خطرناک ہو جائے۔

یہ واضح ہے کہ قانون کا مقصد اولیں اپنی قوت اجتماعی بروئے کار لا کر محنت کی جگہ لوٹ مار کے اس رجحان کو روکنا ہے۔ قانون کا تمام زور مال (ملکیت) کی حفاظت اور لوٹ مار کی سزا دینے پر صرف ہونا چاہیے۔ تاہم عموماً قانون ایک شخص یا اشخاص کا ایک طبقہ ہی بناتا ہے اور چونکہ قانون غالب طاقت کے سہارے بنا کام نہیں کر سکتا لہذا یہ طاقت بھی قانون بنانے والوں کو ہی چلی جاتی ہے۔

یہ ارتکاز طاقت کی حقیقت اور کم از کم کوشش کے ساتھ خواہشات کی تکمیل کا مہلک انسانی رجحان دونوں باہم مل کر قانون کی اس بڑی وسیع کایاپلٹ کی وضاحت کرتے ہیں۔ یوں یہ سمجھنا آسان ہے کہ قانون کیسے ناانصافی کو روکنے کی بجائے ناانصافی کا ناقابل تسخیر ہتھیار بن جاتا ہے۔ کیوں قانون ساز قانون کو دوسرے لوگوں کو درجہ بدرجہ تباہ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ان کی ذاتی آزادی کو غلامی سے، اور ان کے مال کو لوٹ مار سے۔ ایسا قانون ساز کے مفاد کے لیے کیا جاتا ہے اور اس کا تناسب قانون ساز کی طاقت کے مطابق ہوتا ہے۔

قانونی لوٹ مار کے شکار:

لوگ عموماً اس ناانصافی کے خلاف بغاوت کرتے ہیں جس کا وہ شکار ہوتے ہیں۔ یوں جب قانون خود لوٹ مار کو ادارہ جاتی طور پر قانون ساز کے مفاد کے لیے اختیار کرتا ہے تو لوٹ مار کے شکار تمام طبقات، پرامن یا انقلابی راستوں سے، قانون سازی کی طاقت حاصل کرنے کے

لیے کوشش کرتے ہیں۔ یہ محروم طبقات سیاسی طاقت کے حصول کی اس جد و جہد کے دوران اپنی فکر کے مطابق دو یکسر مختلف مقاصد میں سے کوئی ایک تجویز کرتے ہیں۔ یا تو ان کی خواہش اس قانونی استحصال کو روکنے کی ہوتی ہے یا اس میں حصہ دار بننے کی۔

اس قوم پر حیف جس کے محروم طبقات میں طاقت کے حصول پر موخر الذکر خواہش زور پکڑ لیتی ہے۔ جہاں پہلے معدودے چند لوگ ہی عوام پر قانونی استحصال کی طاقت استعمال کرتے تھے کیونکہ قانون سازی کی طاقت چند لوگوں تک محدود تھی وہاں اب قانون سازی میں عوامی شرکت کی بنا پر لوگ اپنے باہم متضاد مفادات کے توازن کے لیے اپنے اپنے حصے کے استحصال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ سماج سے ناانصافی کے خاتمہ کی بجائے وہ ناانصافی ہی کو عام بنا دیتے ہیں۔ محروم طبقات سیاسی قوت حاصل کرتے ہی دیگر طبقات کے خلاف انتقامی نظام ترتیب دیتے ہیں۔ وہ قانونی استحصال کا خاتمہ نہیں کرتے کیونکہ اس مقصد کے لیے مطلوبہ فراست انہیں حاصل نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے بددیانت پیشروؤں ہی کی مانند قانونی استحصال میں مشغول ہوجاتے ہیں اگرچہ ایسا ان کے اپنے مفادات کے برعکس ہی ہوتا ہے۔

شاید مشیت ایزدی ہے کہ انصاف کا دور آنے سے قبل ہر ایک کو ظالمانہ عذاب سہنا ہی پڑتا ہے۔ کچھ کو اپنے شر کے باعث اور کچھ کو اپنی کم فہمی کی بنا پر۔

قانونی استحصال کے اثرات:

کسی بھی سماج میں قانون کے آلہ استحصال بن جانے سے بڑھکر تبدیلی اور برائی ناممکن ہے۔ ایسی کایاپلٹ کے نتائج بیان کرنے کے لیے کئی جلدیں چاہییں لہذا ہم صرف اہم ترین اثرات کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ کایا پلٹ معاشرے سے انصاف اور ناانصافی کا امتیاز ختم کر دیتی ہے۔

کوئی بھی معاشرہ ایک خاص حد تک قوانین کے احترام کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ قوانین کے لیے حصول احترام کا محفوظ ترین طریقہ انہیں قابل احترام بنانا ہے۔ جب قانون اور اخلاقیات میں باہم تضاد ہو تو شہریوں کو ظالمانہ طور پر اخلاقی حس سے محروم ہونے یا قانون کا احترام باقی نہ رکھنے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ ان دونوں برائیوں کے اثرات بد ایک سے ہیں اور کسی کے لیے بھی ان میں ایک کا انتخاب مشکل ہوتا ہے۔

قانون کی فطرت انصاف قائم رکھنا ہے۔ یہ بات اتنی بڑی حقیقت ہے کہ عوام کے اذہان میں قانون اور انصاف کو ایک ہی چیز خیال کیا جاتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کا یہ لازمی مفروضہ ہوتا ہے کہ ہر قانونی چیز جائز ہوتی ہے۔ یہ ایسا مقبول عام خیال ہے کہ بہت سے لوگوں نے غلط طور پر یہ طے کر رکھا ہے کہ چیزیں مبنی بر انصاف محض اسلیے ہوتی ہیں کیونکہ قانون ایسا کہتا ہے۔ لہذا استحصال کو مبنی بر انصاف

اور مقدس بنانے کے لیے یہ کافی ہے کہ قانون استحصال کو روا رکھتا اور اس کی حفاظت کرتا ہو۔ غلامی، پابندیوں اور اجارہ داری کے معذرت خواہ ، ان سے فائدہ اٹھانے والوں اور ان کے متاثرین دونوں ہی طبقات میں پائے جاتے ہیں۔

آزاد فکروں کی منزل:

اگر کوئی ان اداروں کی اخلاقیات پر شک کا اظہار کرے، تو بڑی آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ تم تو خطرناک تبدیلیاں چاہتے ہو، تم مثالی دنیا میں رہتے ہو، تم خیالی آدمی ہو، تم تخریب کار ہو، تم معاشرے کی بنیادیں ہی ہلا دینا چاہتے ہو۔ اگر کوئی اخلاقیات یا سیاسیات پر درس دے تو باقاعدہ ایسی تنظیمیں موجود ہیں جو حکومت سے کچھ اس طرح کی فریاد کرتی دکھائی دیں گی۔ ''اب سائنس صرف آزاد تجارت (آزادی، ملکیت اور انصاف) کے نقطہ نظر سے ہی نہیں پڑھائی جا سکتی بلکہ اب اور مستقبل میں سائنس فرانسیسی صنعت کا انتظام کرنے والے حقائق اور قوانین کے نقطہ نظر سے بھی بطور خاص پڑھائی جائے۔ (جی ہاں یہ وہی حقائق اور قوانین ہیں جو آزادی، ملکیت اور انصاف کے خلاف ہیں۔) اور یہ کہ سرکاری تعلیمی مناصب پر فائز پروفیسرز کو مروجہ قوانین کی حرمت سے متعلق ذرا سی بھی چوں چراں سے لازما باز رہنا ہوگا۔''

گویا اگر غلامی یا اجارہ داری، استحصال یا لوٹ مار کو جواز بخشنے والا کوئی قانون موجود ہے تو اس کا ذکر بھی نہ ہو کیونکہ ایسے قانون کے ذکر سے بھی اس کی حرمت متاثر ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ لازم ہے کہ اخلاقیات اور سیاسی معیشت اسی قانون کے نقطہ نظر سے ہی پڑھائے جائیں کیونکہ کسی چیز کا محض قانون ہونا ہی مبنی بر انصاف ہونے کی دلیل ہے۔

اس افسوسناک کایاپلٹ کا ایک اور اثر یہ بھی ہے کہ اس سے سیاسی جذبات ، سیاسی تنازعات اور خود سیاست کو مبالغہ آمیز اہمیت مل جاتی ہے۔

قانون کو محدود کرنا ہی حل ہے:

مجھے معلوم ہے کہ اس کے جواب میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے مگر یہاں اس موضوع پر تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ عوامی حق رائے دہی کا تنازعہ (اور دیگر تمام سیاسی تنازعات)، جو دنگا فساد اور احتجاج کا باعث بنتا ہے، مکمل طور پر غیر اہم ہو جائے اگر قانون اپنا حقیقی مقصد پورا کرے۔ درحقیقت اگر قانون صرف تمام افراد، ان کے جان و مال اور ان کی آزادیوں کی حفاظت تک محدود کر دیا جائے اور قانون انفرادی حق دفاع کی اجتماعی تنظیم سے زیادہ کچھ نہ ہو اور اگر قانون استحصال اور لوٹ مار کے لیے رکاوٹ، نگران اور سزا دینے والا ہو تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم حق انتخاب کی دائرۂ کار سے متعلق بحث میں پڑیں؟

ان حالات میں کیا ایسا ممکن ہے کہ حق انتخاب زیادہ یا کم لوگوں کو میسر ہونے سے بنیادی اچھائی یعنی امن عامہ پر کوئی فرق پڑے؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ ووٹ سے محروم طبقات پرامن طور پر اپنا حق رائے دہی ملنے کا انتظار نہ کریں؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ ووٹ کا حق رکھنے

والے اپنے اس امتیاز کو لازما باقی رکھنا چاہیں؟ اگر قانون اپنے مقصد حقیقی تک محدود کر دیا جائے تو ہر ایک کی قانون میں دلچسپی ایک جیسی ہوگی۔ کیا یہ واضح نہیں کہ ایسے حالات میں ووٹ ڈالنے والا ووٹ سے محروم طبقات کو تنگ نہ کر سکے گا۔(کیا اس صورت میں اکثریت کی آمریت کا خدشہ مستقل طور پر ٹل نہ جائے گا ؟ اور کیا جمہوری عمل سے مہم جو قسم کے آمروں کا راستہ بھی بند نہ ہو جائے گا ؟)

قانونی استحصال کا مہلک خیال:

اب ذرا دوسری جانب توجہ کیجیے۔ سوچیے کہ ایسا اصول متعارف کرایا جائے کہ نظم، ضابطے، حفاظت یا حوصلہ افزائی کے نام پر قانون ایک شخص سے مال لیکر دوسرے کو دیدے، تمام لوگوں کی دولت (جیسے ٹیکسز) لے کر چند ایک کو کو فراہم کردے، چاہے وہ کسان ہوں، مینوفیکچرر، بحری جہازوں کے مالکان، اداکار یا کامیڈینز یا کوئی بھی ہوں تو منطقی طور پر ہر طبقہ قانون پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کا نہ سوچے گا؟

بے مہار قانون تنازعات جنم دیتا ہے:

جیسا کہ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ قانون اپنے حقیقی مقاصد سے پھیرا جا سکتا ہے اور مال کی حفاظت کی بجائے اسے لوٹنے کے کام آ سکتا ہے، لہذا ہر ایک استحصال سے بچنے یا استحصال کا حصہ بننے کی خواہش لیے قانون سازی کے عمل میں شراکت داری کا دعوی رکھے گا۔ سیاسی سوالات ہمیشہ متعصبانہ، غالب اور توانائیوں کا مرکز ہونگے۔ مقننہ کے دروازوں پر بھی لڑائی جھگڑے ہونگے اور قانون سازوں کی باہمی چپقلش بھی ایسی ہی شدید ہوگی۔ یہ جاننے کے لیے برطانیہ اور فرانس کی مقننہ کے حالات سے آگہی ضروری نہیں بلکہ صرف اس معاملے کو سمجھ لینا ہی کافی ہے۔(142)

- صرف وہ قانون قابل تسلیم ہے جسے عوامی نمائندے عوامی رضامندی سے بنائیں نہ کہ وہ محض اپنی مہم جو نفسیات سے بناتے پھریں - آمریت یا بادشاہت عوام پر قانون نافذ کرنے کا کوئی قانونی جواز نہیں رکھتی کیونکہ اس کا اپنا وجود ہی غیر قانونی ہے۔

پاکستان میں قانون لبرل نہیں

سوال یہ ہے کہ پاکستانی قانون کی ساخت کیسی ہو کہ اسے لبرل قانون کہا جائے جو شخصی آزادیوں کو قائم کرے، ان کا تحفظ کرے، اور ان کی نشودنما و نئے امکانات کی تسخیر میں مددگار ہو ؟ یہ سوال بہت بنیادی ہے۔

- جب جنوبی وزیرستان سے لوگوں کو بے دخل کیا گیا تھا، صوبہ خیبر پختون خوا میں ان کی سرگرمیوں کو محدود کیا گیا اور ان کی پنجاب و سندھ کی طرف نقل مکانی کو روک دیا گیا تھا تو یہ لبرل ازم اور شہریت کی مساوات سے انحراف تھا۔ پاکستان کے شہری پورے پاکستان میں جہاں بھی جانا چاہیں انہیں روکا نہیں جا سکتا۔

- صوبوں کے درمیان گندم کی نقل و حرکت ایک مخصوص سیزن میں روک دی جاتی ہے۔ یہ لبرل اصولوں سے انحراف ہے۔

- بلوچستان میں شہری آزادیاں جس جبر کا سامنا کر رہی ہیں وہ آزادی و مساوات سے انحراف ہے۔ اسی طرح کراچی میں رینجرز کے اختیارات بقیہ پاکستان کی نسبت امتیازی ہیں اور غیر لبرل قانون ہیں۔ فاٹا کے قوانین پورے پاکستان کے قوانین سے شہری آزادیوں، مساوات، اور انصاف کی بنیاد پر بہت مختلف ہیں یہ بھی غیر لبرل قوانین ہیں۔ خواتین اور مردوں سے متعلق قوانین کو صنفی امتیاز کی بنیاد پر تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔

- ریاست شہریوں کو مذہبی بنیاد پر تقسیم نہیں کر سکتی۔ احمدیوں سے متعلق ریاست کی تعصبانہ قانون سازی احمدیوں سے امتیازی سلوک ہے
- لبرل ازم کو اس سے غرض نہیں کہ کون کافر ہے اور کون مسلم مگر ایسی قانون سازی نہیں ہو سکتی کہ کسی ایک فرقہ، مسلک، اور مکتب فکر کو کافر قرار دیا جائے جبکہ باقیوں کو مسلمان۔ یہ امتیازی سلوک ہے جو لبرل ازم کے اصولوں سے انحراف ہے۔ یہ قانون کے دائرۂ اختیار میں ہی نہیں آتا کہ وہ اصلی مسلمان اور نقلی مسلمان میں امتیاز کرے یا شہریوں کو مذہبی بنیاد پر غالب اکثریت اور محروم اقلیت میں تقسیم کرے۔ لبرل فلسفہ قانون کی رو سے تو کوئی اکثریت و اقلیت ہے ہی نہیں، سب برابر ہیں۔ اکثریت و اقلیت کی اصطلاح کسی سماجی مظہر کو سمجھنے کے لئے تو استعمال کی جا سکتی ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ دس افراد کے ایک گروپ میں پانچ بلوچ اور پانچ پنجابی ہیں یہ تقسیم اس متنوع گروپ کو سمجھنے میں تو ہماری مددگار ہو سکتی ہے مگر قانون بلوچ اور پنجابی میں امتیاز نہیں کر سکتا۔

- ایمرجنسی میں بننے والے قوانین، مخصوص مدت کے قوانین، آرڈیننس جنہیں پارلیمانی توثیق حاصل نہ ہو، اجارہ داری فراہم کرنے والے قوانین، کسی شعبہ سے متعلق قوانین جیسے سوشل میڈیا پر لوگوں کی رضاکارانہ ایسوسی ایشن کے اور قوانین ہوں جبکہ سماجی زندگی میں تعلقات کے اور قوانین ہوں ، یہ سب آزادی، آزادی اور مواقع میں مساوات، اور انصاف کے لبرل اصولوں سے انحراف ہے۔

- کوٹہ سسٹم ... یہ شہریوں کو ان کے جغرافیہ، اور صنفی خصوصیات کی بنیاد پر تقسیم کرتا ہے یہ غیر لبرل ہے۔ اس سے مواقع کی مساوات پیدا نہیں ہوتی۔

۔ ٹیکس : ٹیکسوں کی شرح تمام شہریوں اور تمام معاشی سرگرمیوں پر ایک ہی ہونی چاہیئے۔ پاکستان میں کچھ شعبے ٹیکس فری ہیں اور الٹا سبسڈی یا ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ کے نام پر فنڈ حاصل کر رہے ہیں۔ 'صنعتی ٹیکس فری زون' ریاست میں ایک علیحدہ انتظامی یونٹ ہیں اور لبرل اصولوں کے مطابق امتیازی سلوک کی مد میں آتے ہیں۔ پاکستان میں ٹیکسز کا سارا بوجھ صنعتوں، امپورٹ ایکسپورٹ تجارت ، صارفین (ان تینوں یعنی صنعتوں، امپورٹ ایکسپورٹ تجارت ، صارفین پر بھی ٹیکس کی شرح مختلف ہے جیسے تجارت میں کچھ تو ڈیوٹی فری ہیں اور کچھ پر 200 فیصد ٹیکس لاگو ہے) اور تنخواہ دار طبقہ پر ہے جبکہ زراعت و خدمات کے شعبوں کو ٹیکس فری درجہ اور سبسڈی دی جا رہی ہے۔

اسی طرح کی ڈھیروں مثالیں دی جا سکتی ہیں جو پاکستان میں قانون سازی کے میدان میں عرف عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ اگر پاکستان میں لبرل آئین کے بنیادی اصولوں کو معیار بنایا جاتا تو ہر مارشل لاء کی کوشش کے بعد فوجی حکمرانوں کو سپریم کورٹ کی آشیر باد سے آئین کو معطل کرنے یا سپریم کورٹ سے آئین کی ترمیم کی اجازت لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ آئین کو سپریم کورٹ تو دور کی بات پارلیمان بھی معطل نہیں کر سکتی۔ بنیادی انسانی حقوق، آزادیوں، مساوات اور انصاف سے متضاد قوانین نہ پارلیمان بنا سکتی ہیں اور نہ ہی سپریم کورٹ اور نہ ہی کوئی اور اتھارٹی۔ فوجی مارشل لاء تو سراسر غیر آئینی و غیر قانونی ہے۔

آئین کے لئے لازمی شرط ہے کہ وہ اپنے لب و لہجہ میں سادہ اور معنی میں واضح ہو جو تمام شہریوں کو (جنہوں نے اس کی پابندی کرنی ہے) آسانی سے سمجھ آئے نہ کہ صرف وکلاء کو۔ اس سے ابہام جنم نہ لیں۔ قانون نیت، عمل، اور نتیجہ سے بھی پہلے معلوم (Known in advance) ہو۔ اور وہ قانون تمام شہریوں پر بشمول سیاست دان، بیوروکریسی اور معزز جج صاحبان پر بھی برابر طور پر نافذ ہو نہ کہ بیوروکریسی اور جج صاحبان کو یہ اختیار ہو کہ چونکہ آپ قانون کے نگران ہیں اس لئے ہتھوڑا شہریوں کے سر پر ہی ماریں اور PTA (پاکستان ٹیلی کمیونیکشن اتھارٹی) کے نام سے سنسر بورڈ بنا کر سوشل میڈیا پر آمریت سے لطف اندوز ہوں۔ قانون کوئی کھلواڑ نہیں جسے محض سیاست دانوں، بیورو کریسی اور غیر منتخب عدلیہ کی مرضی کے سپرد کر دیا جائے۔ نہ ہی قانون سے یہ مراد ہے کہ جو چیز سندھ میں جائز ہے وہ پنجاب میں ناجائز ہو سکتی ہے، یا جو حق اہل پنجاب کو حاصل ہے وہ اہل بلوچستان کو نہیں، یا ایک چیز ایک سال کے لئے تو جائز ہے مگر اس کے بعد ناجائز ہو جائے گی۔ قانون کا موضوع امن و امان اور بنیادی انسانی حقوق ہیں بندش یا سزائیں نہیں۔ قانون سوشل کنٹریکٹ ہے اس کی اہمیت کو سمجھیں، اسے مذاق نہ بنائیں۔

سماجی انصاف (Social Justice) کا سراب

میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ فرد کے عدالتی تحفظ کو" مطلق سماجی انصاف" کے سراب سے بڑھ کسی چیز نے نقصان نہیں پہنچایا-(ہائیک)

سماجی انصاف آج کل بہت زیادہ مستعمل اصطلاحات میں سے ایک ہے۔ عموماً اسے معاشی امور میں زیادہ استعمال کیا جارہا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس کسی دوسرے فرد سے زیادہ آمدن یا دولت ہے تو اس زیادہ کو آپ سے چھین کر اسے دے دی جائے جس کے پاس کم ہے۔ جب دونوں کے درمیان آمدن یا دولت برابر ہوجائے گی تب سماجی انصاف قائم ہوجائے گا۔ سماجی انصاف کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قانون اور انقلاب کی دہائی دی جاتی ہے اور مساوات کی اصطلاح اپنے من پسند مفہوم میں دہرائی جاتی ہے ۔

حقیقت میں سماجی انصاف سے مراد سماج میں تمام انسانوں کے درمیان سماجی اور ریاستی سطح پر مساوات ہے، تمام افراد کو قانون کی نظر میں برابری ملے۔ تنوع پسندی اور شہریت کی مساوات قائم ہو۔ مواقع کی مساوات کی ثقافت قائم ہو ،کوئی فرد واحد ، طبقہ ، عقیدہ ، نظریہ ریاست و سماج پر قابض نہ ہو سکے اور نہ ہی ریاست فرد و سماج پر اپنی آمریت قائم کرسکے۔ تمام ادارے اپنی اپنی حدود میں رہ کر اپنی ذمہ داریاں نبھائیں اور فرد و سماج اپنی خود تنظیمی پر قائم ہو۔ شہریوں کے درمیان تنازعات کی صورت میں عدلیہ انصاف سے کام لے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آزادی و حقوق میں بھی مساوات قائم ہو - ایک ملک میں کوئی بھی شہری کسی دوسرے شہری کی نسبت حقوق کے باب میں نہ کمتر ہو اور نہ ہی بالاتر –

یاد رہے کہ جس طرح آزادی ایک شخصی تصور ہے اسی طرح انصاف بھی خالصتا شخصی معاملہ ہے – سماجی انصاف اپنی اصطلاح میں ایک مبہم تصور ہے جس کے کوئی متعین معانی نہیں – جب کہ اس تصور میں کہ تمام شہریوں کو ایک ریاستی بندوبست میں انصاف ملے ، ایک واضح اور قابل عمل تصور ہے - لبرل ازم کی رو سے سوسائٹی کے تمام افراد کو جب کسی تنازعہ یا امتیازی معاملہ میں انصاف مل رہا ہو گا تب ہی سماجی انصاف قائم ہو گا نہ کہ یہ کہ ایک شخص یا طبقہ جس طرز کی سوسائٹی اور سوسائٹی میں یکسانیت چاہتا ہے وہی سماجی انصاف ہے -

حقیقی انصاف غیر جانبدارانہ (Impartial) اور غیر شخصی (Impersonal) ہوتا ہے -قانون شہریوں کے درمیان امتیاز قائم نہیں کرسکتا ،قانون کسی سے کچھ چھین نہیں سکتا ، قانون کا مقصد تو تحفظ ہے۔ قانون کی نظر میں امیر و غریب ، مرد و عورت ،چھوٹا بڑا ،پنجابی سندھی بلوچ و پختون ، امیر و غریب، مرد و عورت، جوان بوڑھا، لمبا پست قد، گورا کالا، ان پڑھ تعلیم یافتہ، دیہاتی شہری، مسلم غیر مسلم، اردو بولنے والا یا

سرائیکی بولنے والا سمیت سب برابر ہیں۔ جب قانون سماجی انصاف یا سماجی بہبود کے کسی مفروضہ تصور کے نام پر شخصی آزادی سے انکار اور کسی مخصوص نظریہ یا عقیدہ کی آمریت نافذ کرتا ہے تو یہ سب سے بڑی ناانصافی اور ظلم ہے۔

اسی طرح یہ بھی انصاف کے خلاف ہے کہ میں کماؤں ، اس میں سے احتیاط سے خرچ کروں - جو بچ جائیں انہیں جمع (save) کروں یا invest کروں ، اپنی investment پر نفع لوں یا خود کاروبار کر کے اپنے معاشی مقام و مرتبہ میں بہتری لاؤں اور آپ چونکہ یہ سب نہیں کرسکے اس لیے آپ مجھ سے میری دولت قانون یا انصاف کے نام پر چھین کر معاشی مساوات کو جبراً نافذ کرنے کی کوشش کریں۔ میری آمدن ، میری دولت ، میری محنت و ذہانت اور صلاحیت و قابلیت ...دراصل ان تمام شخصی خوبیوں و لیاقت کے بہتر استعمال کا انعام ہے - جو میں نے کمایا ہے آپ کو بھی تو مواقع کی مساوات حاصل ہے تو آپ بھی یہ مقام حاصل (earn) کرلیں۔بدانصافی اس صورت میں ہو گی کہ مقابلہ کی ثقافت موجود نہیں یا آپ سے امتیازی برتاؤ کیا گیا یا آپ سے آپ کی کمائی چھین لی گئی -

کن معاشروں میں سماجی انصاف زیادہ رہا ہے لبرل معاشروں میں یا غیر لبرل میں ؟

اب ذرا ہم ان نتائج کا موازنہ کرتے ہیں جو لبرل معاشروں میں حاصل ہوئے اور ان دوسرے معاشروں میں نتائج جو غیر لبرل نظام یعنی سماجی انصاف کے غیر منصفانہ نظام کو رائج کرنے سے حاصل ہوئے۔ایک معاشرہ وہ ہے جس نے فرد کو بنیادی موضوع بنایا – شخصی آزادی کو سب سے بڑی قدر تسلیم کیا اور انصاف و مساوات کو تحفظ کا دیا ۔اسے ہم لبرل معاشرہ کہتے ہیں۔دوسرا معاشرہ وہ ہے جس نے سماج کو موضوع بنایا،سماجی انصاف کے مفروضہ تصور کو ریاستی جبر سے فرد پر نافذ کرنے کی کوشش کی اور انصاف کو دراصل دوسروں سے ان کے حقوق اور ملکیت چھیننے کا نام دیا۔ نتائج ہم سب کے سامنے ہیں - لبرل معاشرے دو صدیوں سے زائد ہو گئے مضبوطی سے قائم ہیں جبکہ غیر لبرل یعنی سوشلسٹ معاشرے جو جنگ عظیم دوم کے بعد تقریبا 46 ممالک میں آمریت کے زیر اثر قائم ہوئے ناکام و نامراد ہو چکے ہیں – سچ ہے کہ معاشرے انصاف سے قائم رہتے ہیں ، ظلم و جبر سے نہیں - نتائج معیار ہیں ، نیت معیار نہیں - جس طرح محض نیت پر قتل کی دفعات نہیں لگتیں اسی طرح محض اچھی نیتوں سے اچھے نتائج کی بھی گارنٹی نہیں دی جا سکتی ۔سوال یہ ہے کہ ان دونوں (لبرل اور غیر لبرل) معاشروں میں سے کس معاشرے میں مساوات اور سماجی انصاف زیادہ ہے۔

- کیا مساوات و سماجی انصاف اشتراکی روس یا سوویت یونین میں تھا جہاں ریاست کی آمریت فردو معاشرہ اور سیاست و معیشت پر نافذ تھی؟

- کیا سماجی مساوات و انصاف یوگوسلاویہ میں زیادہ تھا جو سوویت روس سے بھی زیادہ عملی طور پر سوشلسٹ تھا؟

- آپ یہ سوال Djilas سے پوچھیں جس نے محض ایک کتاب لکھنے کے جرم کی سزا پائی۔آپ Selgrade کی یونیورسٹی کے اساتذہ و طلباء سے پوچھیں جنہیں جیلوں میں ڈالا گیا۔ کیونکہ انہوں نے ریاستی آمریت کے مفروضہ سماج کو ماننے سے انکار کیا تھا۔ چین میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ سماجی انصاف کے مفروضہ تصور کے جبر میں مار دیئے گئے ۔ صنعتی انقلاب کے بعد لوگ جنگ اور قحط سے اتنے نہیں مرے جتنے ان سوشلسٹ ممالک میں مطلق العنانیت نے سماجی انصاف اور مساوات کے نام پر قتل کئے۔

- روس میں بیوروکریسی اور مزدوروں کی Politus کے لوگ پر لطف زندگی گزارتے تھے اور عام لوگ اس سے محروم رہے کیوں؟ کیوں کہ Politus سماجی انصاف کی تعریف و نفاذ پر اجارہ داری رکھتی تھی - وہ نظریہ کے استبداد کے سہارے حکمران تھی جبکہ عام شہری رعایا تھے جنہیں ڈیزائن یا منصوبہ بند کرنا مقصود تھا۔

میں بھی کمیونسٹ تھا

(مجاہد مرزا)

جی ہاں تھا، اس لیے کہ میں امام علی نازش اور بعد میں بہت ہی قلیل مدت کے لیے جام ساقی والی کمیونسٹ پارٹی کا رکن تھا، لیکن ایک عرصہ سے نہیں ہوں۔ کوئی شخص تب تک خود کو کمیونسٹ نہیں کہہ سکتا جب تک وہ کسی ایسی پارٹی کا رکن نہ ہو جو کمیونسٹ نظریے کو لاگو کیے جانے کی حامی ہو، کیونکہ اصطلاح کمیونسٹ لفظ کمیون سے ماخوذ ہے جو منظم اکٹھ کو کہتے ہیں ۔ البتہ انسان انفرادی طور پر یعنی کسی پارٹی میں شامل ہوئے بغیر کمیونسٹ نظریے کا حامی ضرور ہو سکتا ہے مگر کمیونسٹ نہیں۔

وجاہت مسعود نے مارکسزم سے منحرف ہونے کی بات کیا کی کہ لوگ اس بیچارے کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے جیسے کسی نظریے کو رد کرنے والے یعنی مرتد کی سزا اگر موت نہیں تو کم از کم اسے چین سے جینے کا حق نہیں دینا چاہیے۔

سوال اٹھایا گیا کہ کیا کوئی پرولتاری کمیونسٹ رہنما رہا، جی ہاں ایک "لمپن پرولتاری" تھا جس کا نام ایوسف واسیریوچ ستالن تھا یعنی سٹالن، سٹالن اس کی کنیت تھی یعنی سٹیل مطلب فولاد کی مانند (دلچسپ بات ہے کہ لینن بھی کنیت تھی جس کا مطلب ہے سست الوجود، کاہل) اس لمپن پرولتاری نے ڈھائی تین کروڑ آدمی یونہی مروا دیے تھے۔ ڈیڑھ دو کروڑ دوسری جنگ عظیم میں مارے گئے تھے اور دوسرا تھا خروشچوو جو زرعی مزدور تھا یعنی وہ بھی پوری طرح پرولتاری نہیں تھا۔ اس بیچارے کے ساتھ بریژنیو اور اس کے ساتھیوں نے کیا سلوک کیا تھا کوئی راز نہیں رہا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کا واحد جنرل سیکرٹری تھا جسے معزول کیا گیا تھا۔

مارکسزم کے بارے میں کہا گیا کہ یہ سائنس ہے۔ ٹھیک ہے اب تو جغرافیہ بھی سائنس ہے اور شہرت بھی، معیشت تو زیادہ سائنس ہے کیونکہ اس میں علوم کی ماں ریاضی کا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے مگر یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ سائنس تبدیل ہوتے ہوئے علم کو کہا جاتا ہے، منجمد یا مستند اصولوں پر استوار کسی ڈھانچے کو نہیں۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ سائنسی علوم میں پیش رفت ہوتی ہے اور بعض اوقات پہلے سے موجود مفروضے یکسر بدل جاتے ہیں۔

کارل مارکس کا اخذ کردہ معاشی سیاسی ماڈل بہت پہلے سے موجود سرمائے سے منسوب معاشی سیاسی ماڈل کے مقابلے میں ایک ماڈل تھا جس میں قدر زائد کو بنیاد بنایا گیا تھا اور استحصال کو اس نظام کی سب سے بڑی خامی۔ وقت کے ساتھ ساتھ نظام سرمایہ داری میں بہتریاں لائی جاتی رہیں، خاص طور پر اس نظام کی سماج سے وابستگی اور سماج میں بسنے والوں کو دی جانے والی سہولیات سے متعلق۔ مانا جا سکتا ہے کہ یہ تبدیلیاں جو بہتری پر منتج ہوئیں سرمایہ داروں کو اس لیے کرنی پڑیں کہ دنیا کے پہلے سوشلسٹ ماڈل سوویت یونین میں ویسی تبدیلیاں لائی جا رہی تھیں چنانچہ سرمایہ دار ملکوں کو سماجی بھلائی کے کام کرنے پڑے مگر تکلیف دہ امر یہ تھا کہ نہ تو سوویت یونین اور نہ ہی بعد میں سوشلسٹ بلاک میں شامل ہونے والے ملکوں میں سوشل ویلفیر کو وہ ہئیت بخشی گئی جو سرمایہ دار ملکوں نے اپنا لی تھی مستزاد یہ کہ آزادی نام کی شے مفقود تھی، ہر عمل " پرولتاریہ کی آمریت" کے تحت کرنا پڑتا تھا اور پرولتاریہ کی یہ "آمریت" برسر اقتدار انٹیلیجنشیا دوسرے الفاظ میں کمیونسٹ یا مارکسٹ اشرافیہ ترتیب دیتی تھی۔ ایک سے ڈربہ نما گھر، ایک سی الماریاں، ایک سے ریڈیو، ایک سے کپڑے، ایک سی گاڑیاں، ایک سی پبلک ٹرانسپورٹ، ایک سی یکسانیت، ایک سی اداسی، ایک سی نا امیدی اور ایک سا خوف۔ اس کے برعکس کمیونسٹ اشرافیہ کی ہر چیز مختلف اور متنوع ہوتی تھی۔ آج بھی ماسکو میں جو سنترالنایا کلینیچیسکی بالنتسا یعنی سنٹرل کلینیکل ہاسپٹل (یہ کمیونسٹ عہد میں صرف کمیونسٹ اشرافیہ کے لیے ہوتا تھا) ہے وہاں جا کر دیکھیں تو باقی ہسپتالوں کی نسبت آپ کو لگے گا کہ آپ ماسکو میں نہیں زیورچ میں ہیں، مگر اب اس سے سرکاری اشرافیہ کے علاوہ اشرافیہ طبقے کے دیگر افراد بھی اگر چاہیں تو ادائیگی کرکے مستفید ہو سکتے ہیں۔

جی ہاں درست، سوویت یونین میں کلاسیکل مارکسزم لاگو نہیں تھا وہ تبدیل شدہ شکل بالشویزم یا لیننزم تھی مگر کلاسیکل مارکسزم کیا لاگو ہو سکتا تھا یا ہو سکتا ہے؟ چونکہ آج تک ایسی مثال موجود نہیں ہے اس لیے یقین کی بجائے تشکیک کرنے کا زیادہ حق بنتا ہے۔

سوویت یونین میں لوگوں کا تعاقب کرکے مارے جانا ہو یا چین میں ثقافتی انقلاب کی آڑ میں قتل عام، ہر دو صورتوں میں بھیانک اور غیر انسانی تھا۔ ظاہر ہے مارکسزم نے ایسا کوئی درس نہیں دیا کہ لوگوں کو قتل کیا جائے یا روس کے آخری زار کی تین جوان اور کم عمر بیٹیوں اور ہیموفیلیا کے مریض واحد کم عمر بیٹے کو بھی گولیاں مار کر مار دیا جائے مگر یہ سب کچھ انہوں نے کیا جو خود کو مارکسزم کا نظریہ رکھنے والے کہتے تھے۔ پھر لینن اور سٹالن کون تھے، کیا وہ مارکسسٹ نہیں تھے؟ سٹالن کا نام تو اس لیے زیادہ لیا جاتا ہے کہ وہ روسی نہیں جارجیائی

تھا اور پھر اس نے سب سے زیادہ لوگ مروائے تھے لیکن لوگوں کو سرسری مقدمے کے بعد قتل کروانے کا کام تو لینن کے عہد سے شروع ہو چکا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ نظریہ ناکام نہیں ہوا بلکہ اس نظریے پر کاربند پارٹی اور اس کی حکومت ناکام ہوئی ہے۔ کیا کسی پارٹی اور اس سے وابستہ حکومت کو اس نظریے سے علیحدہ کرکے دیکھا جا سکتا ہے جس پر کاربند ہونے کی وہ دعویدار ہوتی ہے؟ ذرا مشکل ہے۔ ویسے ہی جیسے آج بہت سے لوگ القاعدہ، طالبان، داعش اور ایسے ہی دیگر اسلامی کہلانے والے گروہوں کی سرگرمیوں کو اسلام کے منافی خیال کرتے ہیں لیکن یہ گروہ بذات خود اور ان کے لاتعداد حامی ان اعمال کو اسلام کے مطابق مانتے ہیں۔

جو لوگ جس نظام کے تحت رہ رہے ہوں یا رہ چکے ہوں، ان کی اکثریت اس متعلقہ نظام سے متعلق جو رویہ رکھتی ہو وہی نقارہ خدا ہوتا ہے۔ سابق سوویت یونین کے باسیوں سے آپ کمیونزم کا زیادہ گلہ سنیں گے اس کے برعکس امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، ناروے، سویڈن اور ڈنمارک میں لوگوں سے اپنے ملکوں میں رائج نظام کی تعریف ہی سنیں گے۔ یونان، سپین، پرتگال جیسے ملکوں میں اگر بدتعریفی یا تنقید سنیں گے تو حکومت پر نہ کہ نظام پر۔ یہ زیب داستاں کے لیے ہوتا ہے کہ روس میں زیادہ لوگ سوویت یونین کو یاد کرنے لگے ہیں یا مغرب میں مارکسزم پھر سے مقبول ہو رہا ہے۔ ایسے سروے اور ایسے مضامین صرف اخبارات و دیگر ذرائع ابلاغ میں تنوع پیدا کرنے کے لیے کروائے اور لکھوائے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ڈاکٹر لال خان اور زبیر احمد جیسے مضمون نگار ہیں جن کے ہر مضمون میں انقلاب کی نوید ویسے ہی دی جاتی ہے جیسے ثواب کا کام کرنے والوں کو حصول جنت کی تو کیا ان کے کہے سے انقلاب آنے کو ہے؟

کسی نظریے سے عقیدہ جاتی تعلق رکھنا بھلا کیسے سائنسی رویہ کہلا سکتا ہے، اس سے تو بہتر ہے کہ انسان مذہبی عقیدے کو ہی راسخ کر لے تاکہ کم از کم اگلے جہان میں تو چین سکون سے رہنے کا تیقن ہو۔ اس جہان میں اچھے حالات پیدا کرنے کی خاطر بدلتے ہوئے معروضی حالات کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہوئے موجود سماجی، معاشی، سیاسی نظام کی خامیوں کو دور کیے جانے کے لیے سرگرم ہونا پڑے گا کیونکہ انقلابات کے زمانے لد چکے ہیں، اب جنہیں انقلابات کا نام دیا جاتا ہے وہ ماسوائے انتشار کے اور کچھ نہیں ہوتے مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ، یوکرین و دیگر ملکوں کے واقعات اور ان واقعات کے بعد کے حالات اس صداقت کے گواہ ہیں۔

(143)

(مجاہد مرزا ایک سابق کمیونسٹ ہیں ، پاکستان آرمی میں ملازمت کر رہے تھے کہ انقلاب کی مدد کے لئے روس جا پہنچے اور وہاں بیس سال گزار دیئے - اب بھی وہیں مقیم ہیں — جو انھوں نے مشاہدہ کیا وہ ''ہم سب'' میں اپنی ایک تحریر میں بیان کیا جسے یہاں انتظامیہ'' ہم سب'' کی اجازت سے نقل کیا گیا)

سوویت یونین کا معاشی و سماجی انصاف

انیس سو چوراسی کے آخر میں میخائل گورباچوف)آخری سوویت صدر) نے برطانیہ کا دورہ کیا۔ یہ دورہ حیران کن حد تک دونوں ممالک کو ایک دوسرے کے قریب لے آیا۔ اس دورہ کے دوران جب گورباچوف نے برطانوی شان و شوکت اور خوشحالی کا مشاہدہ کیا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس وقت مارگریٹ تھیچر برطانوی وزیراعظم تھیں۔ گورباچوف نے تھیچر سے سوال کیا :آخر آپ کو کیسے پتا چلتا ہے کہ تمام شہریوں کو بہتر غذا مہیا ہے؟ تھیچر نے بڑا ہی ٹیکنیکل اور معاشی سائنس کی حکمت سے بھرا جواب دیا

I don't know. Prices say it all.

(یہ کام میں نہیں کرتی، قیمتیں یعنی مارکیٹ کرتی ہے) (144)

یہ اس برطانوی وزیراعظم کا جواب تھا جس کا ملک عرصہ سے خوراک کی پیداوار میں خودکفیل نہیں تھا، مگر وہاں خوراک کی کمی نہیں تھی۔ جبکہ روس جہاں انقلاب سے پہلے زراعت کی اتنی پیداوار تھی کہ نہ صرف خودکفیل تھا بلکہ سالانہ نو ملین ٹن خوراک دوسرے ملکوں کو ایکسپورٹ کرتا تھا۔ (145) جب لوگوں سے بعد از انقلاب معاشی آزادی چھین لی گئ اور اس کی جگہ ریاستی آمریت نافذ کر دی گئ تو یکے بعد دیگرے خوراک کے بحرانوں نے روسیوں سے نہ صرف ان کا معیار زندگی چھین لیا بلکہ پے در پے قحط کے سبب جان کے لالے پڑ گئے۔ یوں اس تناظر میں تھیچر کا جواب انتہائی معنی خیز تھا۔

اسی طرح 1989 میں بورس یلسن نے امریکہ کا دورہ کیا۔ جانسن خلائی مرکز کا دورہ کرنے بعد مستقبل کا روسی صدر اچانک ایک سبزیوں کی دکان میں گھس گیا۔ وہاں اس نے لوگوں سے کافی سوالات کئے۔ امریکی لوگوں کے معیار زندگی نے اسے بہت متاثر کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایسا معیار زندگی تو Politburo (سوویت کمیونسٹ پارٹی کے پالیسی میکرز) کو بھی حاصل نہیں، یہاں تک کہ صدر گورباچوف بھی اپنی غذا میں اتنی چوائسز نہیں رکھتے جتنا یہاں کے ایک عام آدمی کو حاصل ہیں۔ بورس یلسن نے اپنے ساتھی روسیوں سے کہا "اگر ہمارے لوگ امریکیوں کا معیار زندگی اور یہاں کے سپر سٹور دیکھ لیں جو (روسی عوام) ضروریات زندگی کی بنیادی چیزوں کے حصول کے لئے ایک لمبی قطار سے گزرتے ہیں تو انقلاب آ جائے" (146)

انیس سو تراسی میں ایک سیاح روس جاتا ہے اور وہاں وہ دیکھتا ہے کہ ایک گلی میں ایک کافی طویل قطار ہے، معلوم کرنے پر پتا چلا کہ یہ ٹماٹر کے حصول کے لئے یہاں کھڑے ہیں جبکہ دوسری گلی میں ایک اور بڑی قطار مردوں کی بنیانوں اور زیر جاموں کے لئے تھی جو تین دن تک رہی یہاں تک کہ سب "انڈر گارمنٹس" ختم ہو گئیں۔(147)

فرق کیا تھا دونوں نظاموں کے بیچ ؟ امریکی نظام مارکیٹ پر انحصار کرتا ہے اور مارکیٹ طلب و رسد اور قیمتوں کی آزاد حرکت کا نام ہے۔ لوگ محنت کرتے ہیں، کماتے ہیں اور جو مرضی آئے خریدتے ہیں، اس میں ان کی معاشی آزادی ہے۔ سوویت نظام میں آپ ریاست کے ویسے ہی غلام ہیں جیسے دور زراعت میں آپ جاگیرداروں کے پابند تھے، آپ بغیر آمدن کے محنت کرتے ہیں بدلے میں ریاست آپ کی لباس رہائش اور خوراک کا انتظام کرتی ہے، اس میں معاشی آزادی صفر ہے، اشیاء و خدمات کے استعمال میں حق انتخاب سے آپ محروم ہیں۔ ریاست آپ کی لباس رہائش اور خوراک کا انتظام کیسے کرتی ہے آپ نے ٹماٹر اور بنیانوں کے قصے میں ملاحظہ فرمایا۔

یہاں ایک نقطہ زیر بحث لانا لازم ہے کہ طبقاتی تقسیم محض معاشی بنیادوں پر نہیں بلکہ سیاسی و سماجی بنیادوں پر بھی ہوتی ہے۔ ہر وہ چیز جو انسانوں میں مساوات کا خاتمہ کرے اور ان کی آزادیوں کو پابند سلاسل کرے وہ طبقاتی تقسیم کا سبب ہے۔ سوویت یونین میں جب مزدور قیادت (کمیونسٹ پارٹی) کی آمریت نافذ ہوئی تو خودبخود دو منفرد طبقات وجود میں آ گئے جن کی بنیاد طاقت، اختیار، اور اقتدار میں عدم مساوات تھی۔ اب سوویت پارٹی کے کرتا دھرتا کردار اور بیوروکریسی کے اعلیٰ افسران بالادست طبقہ بن گئے۔ دوسری طرف زیردست طبقہ عوام (رعایا) تھے جن کی پہلے معاشی و سیاسی آزادی سلب کی گئی اور پھر بالآخر آہستہ آہستہ باقی کی تمام آزادیوں سے بھی وہ محروم کر دیئے گئے۔ اسے ہمہ گیر آمریت (Totalitarianism) کہتے ہیں۔

ایک مذہبی (تھیوکریسی) ریاست میں بھی دو طبقات وجود میں آجاتے ہیں ایک طرف بالادست مذہبی پیشوائیت ہوتی ہے اوردوسری طرف وہ گناہ گار عوام جسے بقول تھیوکریسی حق انتخاب سے محروم رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ شیطان انہیں اچک لیتا ہے یوں علماء کی راہنمائی (جو حقیقتا بالادستی ہوتی ہے) اشد ضروری ہے۔ دونوں کے کردار بھی ملتے جلتے ہیں۔ایک سوشلسٹ نظام میں ریاست کے ولن اگر سرمایہ دار ہوتے ہیں تو مذہبی ریاست میں وہ ولن شیطان ہے۔ علماء کی مذہبی ریاست میں وہی حیثیت ہوتی ہے جو سوشلسٹ ریاست میں کمیونسٹ پارٹی کے سربراہان کی ہوتی ہے۔ اور عوام جن کی آزادی سے ملا بھی ڈرتے ہیں اور سوشلسٹ ریاست کے آمر بھی کیونکہ ملا کے نزدیک ایک آزاد فرد کے حق انتخاب کو شیطان اچک لیتا ہے تو سوشلسٹ ریاست میں وہ سرمایہ داروں کے بہکاوے میں آ جاتا ہے۔ آمریت کے ہتھکنڈوں میں دونوں کی نفسیات مشترک ہے۔ دونوں ہر حوالے سے ہمہ گیر آمریت (Totalitarianism) کی بدترین شکلیں ہیں۔

سوشلسٹ انقلاب محض دو چار ممالک میں نہیں آیا، کل 46 سے زائد ممالک تھے جنھوں نے یہ نظام نافذ کیا۔ انجام سب کے سامنے ہے۔ ان میں سے وہ ملک جو قدرتی وسائل کی قلت کا شکار تھے وہ فورا ہی دیوالیہ ہو کر اس نظام سے نکل آئے مگر ان کی وراثتیں (پاکستان میں ضیاآمریت کی طرح) ان معاشروں کی آزادی کے ہنوز درپے ہیں۔ وہ ممالک جو قدرتی وسائل کی دولت سے مالامال تھے ان میں آہستہ آہستہ یہ نظام کمزور ہوتا گیا جس کی وجہ اس سے جنم لینے والی معاشی ابتری، سیاسی آمریت، اور ثقافتی زبوں حالی ہے۔

وینزویلا بھی ان میں سے ایک ہے۔ روس کی طرح یہ ملک بھی تیل و گیس سے مالامال ہے جس کی معیشت کا کلی دارومدار تیل و گیس کی ایکسپورٹ پر ہے۔ انڈسٹری تباہ ہو چکی ہے، اس وقت وینزویلا میں شرح مہنگائی 700 فیصد سے بھی زائد ہے۔ لوگ بنیادی ضروریات تک

سے محروم ہیں۔ ادویات اتنی نایاب ہیں کہ جڑی بوٹیوں کی طب دوبارہ سے استعمال میں آ رہی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کا غلبہ ہے اور سیاسی آمریت کی بدترین شکل رائج ہے۔ معیشت کا ایسا برا حال ہے کہ قوی امکان ہے ملک جلد دیوالیہ ہو جائے گا۔

گزشتہ ماہ The Daily Beast کی رائٹر Saraí Suarez اپنے آبائی وطن وینزویلا اپنے خاندان سے ایک طویل عرصہ بعد ملنے جاتی ہیں وہ لکھتی ہیں

''ہم ہفتوں تیاری کرتے رہے۔ ہمیں روزانہ دوستوں کے وٹس ایپ پیغامات ملتے کہ بخار کی ادویات لیتے آئیے گا، یہ آپ کو یہاں نہیں ملے گی۔ اضافی ڈائپر لیتے آئیے گا یہاں آپ کو نہیں ملے گا۔ اب کیوں آ رہی ہو بعد میں آ جانا اس وقت حالات بہت برے ہیں۔ مچھر دانیاں لیتی آنا کیونکہ یہاں ذیکا، ڈینگی اور chikungunya وائرس ہر طرف ہے۔میں تمہیں نہیں ڈرانا چاہتی مگر یاد سے اپنی بچی کے لئے دودھ لیتی آنا، اپنے سفر کے دوران انتہائی احتیاط کرنا اور سوشل میڈیا پر کچھ بھی شائع نہ کرنا کیونکہ یہ یہاں خطرناک ہے''

اور جو انہوں نے مشاہدہ کیا اس کے بارے میں لکھتی ہیں ''یہاں کچھ بھی خریدنے کو دستیاب نہیں، اگر آپ کے پاس پیسے ہیں تب بھی نہیں۔ دکانوں میں فوجی سپاہی گھی چینی اوراور ٹوائلٹ پیپر کے خریداروں پر ایسے نظر رکھے ہوئے ہیں جیسے یہ سونے کے سکے ہوں۔ بجلی نہیں ہے، ریفریجریٹر خراب ہو رہے ہیں۔ بجلی کی تاریں بغیر مرمت کے بکھری پڑی ہیں ۔کاریں گرد سے اٹی ہوئی ہیں کیونکہ اسپیئر پارٹس دستیاب نہیں کہ مرمت کروائی جائے۔ ادویات دستیاب نہیں، ہسپتالوں کا انتظام انتہائی برا ہے، پرتشدد اموات کے اعتبار سے یہ ملک سرفہرست ہے۔ برین ڈرینج (قابل و تخلیقی ذہن کی ہجرت) عروج پر ہے۔ ایک بدحال ملک کے پیسوں سے جگہ جگہ ہوگوشاویز کی بڑی بڑی تصویریں لگی ہوئی ہیں جس میں اس کی گھورتی آنکھیں بتاتی ہیں کہ اس کا دور کتنی بدترین آمریت تھا۔ کیوبا کے بعد یہ وہ سوشلزم تھا جو میں نے اپنے شوہر کو دکھایا (کہ دیکھ لے اور سبق حاصل کرے)۔(148)

۔یہ سوال آپ پولینڈ کے Edward Lipiński سے پوچھیں کہ اس کا کیا قصور تھا کس جرم کی اسے سزا اسے ملی؟ محض آزادی کا نام لینے کی؟

Edward Lipin Ski سے جب ملٹن فریڈمین ملا تو ان کے درمیان بہت خوبصورت مکالمہ ہوا۔ اس نے کہا میں اب بھی سوشلسٹ ہوں مگر یہ سوشلزم آئیڈیل ہے۔یہ عملی طور پر نافذ نہیں ہوسکتا۔ہم اسے حقیقی زندگی میں نہیں دیکھ سکتے۔یہ صرف اس وقت قابل عمل ہوگا۔جب ہرفرد کے پاس یہاں پولینڈ میں اپنا گھراور دونوکر ہوں گے۔

ملٹن نے پوچھا ---دو نوکر بھی؟

اس نے جواب دیا ،جی ہاں-(149)

سماجی انصاف کے مفروضہ آئیڈیل نظام کو ہر فرد کے لئے دونوکروں کی ضرورت ہے تاکہ معاشی انصاف و مساوات قائم ہو - ہے ناں دلچسپ بات؟؟؟

تاریخ: دائیں بازو اور بائیں بازو سے کیا مراد ہے؟ .... نیز سماجی انصاف کے لئے لبرلز کی جدوجہد

یہ درست ہے کہ آپ کی سیاسی وابستگی آپ کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتی ہے - رائٹ اور لیفٹ یعنی دائیں اور بائیں بازو کی سیاسی اصلاحات آج تو دنیا میں تقریبا پرانی ہو چکی ہیں مگر ہنوز ہمارے مکالمہ میں ان کی گونج زور دار ہے –پہلے لیفٹ اور رائٹ کی بحث سے پہلے ایک دلچسپ تبصرہ Thucydides کا پڑھتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ "پرجوش انقلابی خمار کے دنوں میں اصطلاحات کے معانی بدل دیئے جاتے ہیں(150) – شاید یہی معاملہ ہمارے ساتھ بھی ہے- کوئی انقلاب کے چکر میں اصطلاحات پر اجارہ داری قائم رکھے ہوئے ہے تو کوئی "سٹیٹس کو" کو بچانے کی کوشش میں اپنے آپ کو اصطلاحات کا (انسان دوستی نہیں) محافظ سمجھنے لگا ہے-آیئے دیکھیں کہ لیفٹ میں آخر وہ کون لوگ تھے جنھوں نے سماجی انصاف کو فکری و عملی میدانوں میں قائم کرنے کے لئے مرکزی کردار ادا کیا -

دائیں اور بائیں بازو کی اصطلاحات کا جنم اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں یورپ خاص طور پر فرانس اور اٹلی میں ہوا – اس کا تعلق اپنی ابتدا میں ثقافت اور انسان دوستی کی اقدار سے تھا - دائیں طرف کا انسان جسے "man of right " کہا جاتا تھا سے مراد یہ تھا کہ ایک ایسا آدمی جو نسلی طور پر اعلی و برتر خاندان سے ہے اور اس کے اظہار میں وہ ایک خاص قسم کا لباس پہنتا ہے ، لباس پر امتیازی نشان (badges) لگاتا ہے ،اور نسلی امتیاز کو سماجی نظم و ضبط میں لازم تصور کرتا ہے-

جبکہ لیفٹ کا انسان "man of left" سے مراد ایسا آدمی تھا جو جمہوریت پر مکمل یقین رکھتا ہے- جو لوگوں کے ساتھ اور لوگ کے باہمی تعلقات سے وجود میں آنے والی سماجی بیٹھکوں اور گروپس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے- اور جو ریاست کو شخصی آزادیوں مساوات اور انصاف کی حمایت میں آنکھیں دکھاتا ہے اور بقول ول ڈیورانٹ وہ ثقافت سے محبت کرتا ہے مگر ریاست سے شخصی آزادیوں اور مساوات کے تحفظ میں مڈبھیڑ کے لئے ہر وقت آمادہ رہتا ہے اور جو نسلی امتیازات سمیت کسی بھی قسم کے امتیازات کی پرواہ نہیں کرتا ہے- (151)

لیفٹ اور رائٹ کی باقاعدہ تقسیم ۱۷۸۹ میں فرانس کی قومی اسمبلی میں دیکھنے میں آئی- اس وقت نسلی امتیازات اور فیوڈل ثقافت کے حامی طبقہ اشرافیہ کے لوگ سپیکر کی دائیں طرف بیٹھے- سٹیٹس کو کے مخالفین جو سیاسی سماجی اور معاشی آزادیوں کے حامی تھے بائیں طرف بیٹھے- جبکہ درمیان میں وہ لوگ بیٹھے جنہیں لیفٹ اور رائٹ کی جدوجہد سے کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ وہ آج کی معروف اصطلاح میں نیوٹرل

تھے۔ یاد رہے کہ نیوٹرل سے مراد بھی یہی ہے کہ جو ہو رہا ہے وہی صحیح ہے اور اس پر بحث و مباحثہ کی ضرورت ہی نہیں۔ سیاسی جدوجہد یا مکالمہ میں آپ یا تو تبدیلی پسند ہوتے ہیں یا تبدیلی کے مخالف اور جمود کے حمایتی ۔ نیوٹرل ہونے سے مراد یہ ہے کہ آپ کا کوئی سیاسی موقف ہے ہی نہیں ۔ اس کی ایک مثال ہم نے سرد جنگ کے دوران غیر جانبدار ممالک کے بلاک کی صورت میں دیکھی جنھوں نے کیپٹلسٹ اور سوشلسٹ میں سے کسی ایک کے ساتھ شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ ہم نیوٹرل یعنی غیر جانبدار ہیں ۔ تو کیا وہ ممالک واقعی میں غیر جانبدار رہے یا سمجھے گئے ؟ ہر گز نہیں ۔

فرانس کی اسمبلی میں لیفٹ اور رائٹ کی یہ تقسیم جلد ہی یورپ کی دیگر تمام پارلیمان تک بھی پہنچ گئی اور وہاں بھی یہ تقسیم وجود میں آ گئی ۔ لیفٹ اور رائٹ کے ان مباحثوں کا زیادہ زور یورپ میں رہا ہے۔ وہاں یہ دونوں ایک مخصوص طرز کی ثقافت کے بھی نمائندگی کرتے رہیں اور سیاسی و معاشی نظریات کے حوالے سے بھی ان کے رویے بہت دلچسپ رہے ہیں ۔

دائیں اور بائیں بازو کے لوگوں کی خصوصیات کیا تھیں اسے Max Eastman اس طرح Summarize کرتا ہے ۔

دائیں بازو کے لوگ :

- دائیں بازو کا آدمی ایک مخصوص طرز کا لباس پہنتا تھا ، badges لگاتا تھا اور اپنی خاندانی برتری یا نمایاں پن کے اظہار کے تمام ظاہری طریقوں پر عمل کرتا تھا۔
- یہ مختلف تقریبات میں نمایاں پن سے شرکت کرتا تھا اور اپنے لئے مختلف خطابات کو پسند کرتا تھا۔
- دائیں بازو کے لوگ جب باہم ملتے تھے تو ایک مخصوص فاصلہ لازمی رکھتے تھے۔
- دائیں بازو کا آدمی لوگوں کو ان کے خاندان اور اس میں پیدا ہونے والی ممتاز شخصیات کے حوالے سے شناخت کرتا تھا ، نہ کہ بطور انسان ایک مشترک شناخت کے ۔
- دائیں بازو کا آدمی روایتی ذہن کا مالک تھا ، روایتی جاگیردارانہ طرز زندگی جینا پسند کرتا تھا اور ان نظریات کو پسند کرتا تھا جو تسلیم شدہ چلے آ رہے تھے اس لئے تنقید و تجزیہ کو عموما نا پسند کرتا تھا.

بائیں بازو کا انسان

وہ اوپر درج کی گئی خصوصیات میں دائیں بازو کے الٹ تھا ۔

- وہ سادہ لباس پہنتا تھا۔ جتنا اس کا لیفٹ سے زیادہ تعلق تھا اتنا ہی اس کا لباس سادہ اور زیادہ Plain ہوتا تھا ، جس میں کسی قسم کا خاندانی یا نسلی امتیاز نہیں جھلکتا تھا۔

- ملتے ہوئے مصافحہ کرنا، ہر ایک کو ہیلو کہنا اس کا معمول تھا- وہ شہریت کی مساوات پر قائم قانون کی حکمرانی کا قائل تھا اس لئے وہ ہر قسم کے امتیازات کو غیر متعلق (Irrelevant) سمجھتا تھا -
- قانون سے متعلق اس کا تصور دائیں بازو سے مختلف تھا جو قانون کو استحقاق یافتہ ثقافت کے تحفظ کے لئے لازم خیال کرتے تھے جبکہ لیفٹ کے آدمی کا خیال تھا کہ قانون کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ وہ شہریوں کے حقوق اور ان کی شخصی آزادی کا تحفظ کرے-
- لیفٹ کا آدمی تنقید ، مکالمہ، تجزیہ اور آزاد خیال تعقل پسندی (Rationality) کا حامی تھا- تحریک احیائے علوم ،انقلاب فرانس ، Glorious انقلاب (انقلاب برطانیہ) اور اعلان آزادی (انقلاب امریکہ) کا ہر اول دستہ یہی لوگ تھے -

یاد رہے کہ اس ساری تقسیم کی بنیاد سیاست، سماج اور معشیت پر مبنی تھی ،مذہبی نظریات کا اس تقسیم میں کوئی کردار نہ تھا-

اس بات کا کیسے تعین ہو کہ میں لیفٹ سے ہوں یا رائٹ سے ؟ اس پر J. Pera اپنے خوبصورت مضمون میں اس طرح سے بات کرتے ہیں. "اپنے دل کی سنئے جب آپ دیکھیں کہ ایک شخص کٹہرے میں کھڑا ہے اور ریاست اسے سزا دینا چاہتی ہے - جب کاروائی شروع ہوتی ہے، تو دائیں بازو کے آدمی کا دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ اسے لازمی سزا ملنی چاہیئے جبکہ بائیں بازو کا آدمی ملزم کے ساتھ احساس ہمدردی کر رہا ہوتا ہے- وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح وہ شخص اس سزا سے بچ جائے- اس کے دل میں رحم و کرم موجزن ہوتا ہے- وہ اس معاملہ کو کم ہی دیکھ رہا ہوتا ہے کہ وہ جس شخص کے لئے جذبہ رحم رکھتا ہے وہ مجرم ہے بھی یا نہیں- وہ انصاف کے لئے آخری حد تک جاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ نا انصافی کا ذرہ برابر بھی شائبہ نہ ہو – پس دیکھ لیجئے کہ وہ شخص جو ریاست کی طرف ہے وہ دائیں بازو کا آدمی ہے اور جو فرد کی طرف ہے وہ بائیں بازو یعنی لیفٹ کا آدمی ہے" (152)

اس پورے پیرا گراف کو اگر اس سیاق و سباق میں پڑھیں کہ لیفٹ کے لوگ اپنی تحریک میں فرد و سوسائٹی کو اپنا دوست اور ریاستی جبر کو اپنا مخالف سمجھتے تھے تو پیراگراف کی سمجھ زیادہ آسان ہو جاتی ہے – اب ذرا تاریخ کے صفحات الٹا پلٹا کر دیکھئے کہ اس وقت کی لیفٹ کے یہ لوگ کون تھے؟ یہ اپنے عہد کے لبرل تھے جنھیں آج کلاسیکل لبرل کہا جاتا ہے اور راقم اپنے فہم میں اسی روایت سے جو آج کل Libertarian بھی کہلواتے ہیں سے ذہنی نسبت رکھتا ہے - اب اس طرف بھی آتے ہیں کہ آخر اس اصطلاح کا مفہوم کیسے بدلا ؟ اس بات کو سمجھنے کے لئے ذرا کلاسیکل لبرل ازم کا تصور آزادی و مساوات سمجھ لیں، پھر آگے بڑھتے ہیں –

جدید جمہوریت کے دو آئیڈیل ہیں: آزادی (لبرٹی) اور مساوات – ان ہی دو آئیڈیلز کی بنیاد پر امریکہ کا اعلان آزادی لکھا گیا تھا – انھی دو تصورات کی بنیاد پر انقلاب فرانس کی جنگ لڑی گئی تھی- لفظ "آزاد اور مساوی free and equel " اتنا ہی پرانا ہے جتنا لفظ جمہوریت –

یورپ و امریکہ کے اس دور میں جب لبرلز ہی لیفٹ سمجھے جاتے تھے ، ان دونوں اصطلاحات کے معانی میں یکسانیت پائی جاتی تھی: آزادی سے مراد یہ ہے کہ منتخب حکومت عوام کی اکثریت کے ووٹ سے قائم ہو اور مساوات سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک کو ایک ووٹ دینے کا حق حاصل ہو - آزادی سے مراد یہ ہے کہ محض قانون کی حکمرانی قائم ہو تو مساوات سے مراد یہ ہے کہ قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہوں - آزادی سے مراد یہ ہے کہ مواقع یا امکانات کی تسخیر میں آزادی ہو اور مساوات سے مراد بھی مواقع میں مساوات ہے – یوں آزادی اور مساوات میں کوئی فرق کیا ہی نہیں جاتا تھا- اس لئے سارے لیفٹ کے لوگ ایک ہی پلیٹ فارم پر تھے -اور پھر مارکس کی تعلیمات سامنے آئیں –

دلچسپ بات یہ ہے کہ مارکس کے حامی بھی ابتداء میں خود کو لبرلز ہی قرار دیتے تھے ، جبکہ بعد میں انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہمیں آزادی نہیں مساوات چاہیئے اور مساوات کا اپنا تصور یہ پیش کیا کہ معاشرہ کی ساری دولت تمام لوگوں میں برابر برابر تقسیم کر دی جائے اور ریاست فرد کی معاشی زندگی پر جبر کرنے کا حق رکھتی ہے – اب تک فطری تعلق فرد اور سوسائٹی کا مانا جاتا تھا جب کہ ریاست کی حیثیت محض ایک سماجی ادارے کی تھی جو انتظامی امور کی ذمہ داری ادا کرتا تھا مگر اب ریاست کو سماج کا نمائندہ کہا گیا – اس موقف میں شدت انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں آئی - یوں اب لیفٹ کا ایجنڈا بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا : ایک طرف وہی لبرل تھے جو اب خود کو لیفٹ اور رائٹ کی بجائے لبرل کہلوانا پسند کرتے تھے –

یاد رہے کہ سیاست و معیشت میں لبرل اصطلاح سب سے پہلے ایڈم سمتھ نے 1776میں اپنی کتاب ویلتھ آف نیشن میں استعمال کی تھی جو جلد ہی پورے یورپ میں پھیل گئ -(153) اس کتاب میں ایڈم سمتھ نے لکھا

"اگر تمام اقوام آزادی تجارت (free exportation and free importation) کے لبرل نظام کو قبول کر لیں تو وہ ایک بڑی آفاقی سلطنت (cosmopolitan Empire) کا حصہ بن جائیں گی اور اس طرح قحط سے مکمل نجات حاصل ہو جائے گی مگر بدقسمتی سے چند ہی ممالک نے اس نظام کو قبول کر رکھا ہے " (154)

سمتھ اس تصور سے اختلاف کرتا ہے کہ کسی بھی ملک کی تجارت معیشت اور انڈسٹری کو ویسے ہی ریگولیٹ (regulate) کیا جائے جیسے سرکاری دفاتر چلائے جاتے ہیں اور ان میں سرکاری بندوبست قائم کیا جاتا ہے – وہ کہتا ہے کہ اس طرح آپ جبر سے نظم و ضبط قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہوں گے جبکہ آزادی ،مساوات اور انصاف کا لبرل منصوبہ یہ ہے کہ ہرفرد کے اس حق کو تسلیم کیا جائے کہ وہ اپنے مفادات (سیلف انٹرسٹ) کی خود ہی جستجو کر سکے – (155)

دلچسپ بات یہ ہے کہ سمتھ کے ہاں لبرٹی یعنی آزادی کا تصور وہ آزادی نہیں جو ریاست یا سوسائٹی بزریعہ آئین و قانون یا سوشل کنٹریکٹ شہریوں کو دیتی ہے بلکہ وہ اس سے مراد نیچرل لبرٹی لیتا ہے یعنی وہ آزادیاں جو آپ کا بطور انسان پیدائشی حق ہیں اور انہیں قانون یا سماجی اتفاق رائے کی اصولی طور پر کوئی ضرورت نہیں ہوتی – مثال کے طور پر سائنس لینا ہمارا بطور انسان پیدائشی حق ہے ، ہمیں ریاست سے یا سماج سے اس حق کے لئے تصدیقی سرٹیفیکٹ لینے کی ضرورت نہیں – اسی طرح اپنے شخصی مفادات کی جستجو بھی ہمارا پیدائشی حق ہے کہ ہم اپنی مادی بقا کا سامان کر سکیں اور خوش و خرم زندگی جی سکیں – سمتھ کے مطابق انسان کے اس حق کو ریاست چیلنج نہیں کر سکتی اور نہ ہی سوسائٹی ، جمہوریت یا کسی اور تصور کی آڑ میں – سمتھ لکھتا ہے :

"ہر وہ شخص جب تک کہ وہ کسی دوسرے شخص کو نقصان نہیں پہنچاتا اپنے شخصی مفادات (سیلف انٹرسٹ) کی جستجو میں مطلق آزاد ہے – وہ اپنا راستہ خود منتخب کر سکتا ہے – مقابلہ کی ثقافت میں اپنے جس کردار (role) کو بھی پسند کرے ، شریک ہو سکتا ہے "
(156)

اس کتاب کی اشاعت کے فورا بعد Robertson نے سمتھ کو لکھا "آپ کی کتاب غیر لبرل انتظامات کے خلاف ایک تریاق (Antidote) کے طور پر سامنے آئی ہے "

پھر جیسے جیسے سمتھ اور اس کی فکر یورپ میں مقبول ہوتی گئی یہ اصطلاح بھی یورپ میں اتنی مقبول ہوتی گئی- یہ پارلیمان کے مباحثوں میں استعمال ہونا شروع ہوئی اور پھر 1782 میں کنگ جارج III نے اسے اپنی پارلیمانی خطبے میں دہرایا – سمتھ 1790 میں فوت ہو گیا ، اس کی وفات کے بعد اس کے ساتھیوں اور شگردوں نے اس اصطلاح اور اس کے کام کو پورے یورپ میں پوری سنجیدگی اور اخلاص سے پھیلا دیا اور یوں 1820 میں لبرل ازم کی اصطلاح (ازم کے اضافہ کے ساتھ) بطور آئیڈیالوجی معروف ہوئی جس میں لیفٹ کے تمام نظریات کو جمع کر دیا گیا اور بجائے خود کو بائیں بازو کا فرد کہنے کے لبرلز نے خود کو لبرل ازم سے ہی متعارف کروانا شروع کیا – اسی صدی کے تقریبا نصف میں برطانیہ میں لبرل پارٹی وجود میں آئی اور William Gladstone 1868 سے 1894 کے درمیان چار بار وزیرِاعظم منتخب ہوئے – لبرل پارٹی نے سمتھ کے ہی افکار کو عملی صورت دی : آزادی تجارت کو فروغ ملا اور حکومتی اخراجات و ٹیکسوں کی شرح میں کمی لائی گئی – بقول جوزف شیمپٹر "نیچورل لبرٹی ، آزاد مارکیٹ (Laisses Faire) اور آزادی تجارت کو فروغ ملا – (157)

نئے وجود میں آنے والے لیفٹ کے لوگ لبرلز سے سیاست اور معیشت کے باب میں متضاد ہو گئے – انہوں نے درج ذیل امور میں اپنے پیشروں سے انحراف کیا-

- نیو لیفٹ یا مارکسسٹ لیفٹ نے اب ریاست کو فرد پر فوقیت دینی شروع کر دی کہ وہ دولت میں مساوات قائم کرنے کے لئے اپنا جبر قائم کرے-

- اب دائیں بازو کے لوگوں کی طرح انہوں نے بھی نمایاں نشان جیسے ہتھوڑا وغیرہ کا استعمال شروع کیا، خطابات جیسے کامریڈ (اور پھر کامریڈ سے مارشل اور مارشل سے Generalissimo وغیرہ) ، اسی طرح سلیوٹ کلچر کا بھی آغاز ہوا- یہ سب امتیازی نشانات دراصل خود کو دوسرے لوگوں سے نمایاں و منفرد قرار دینے کے لئے تھے -
- اب قانون کا مقصد انسانی حقوق اور انسانی آزادیوں کا تحفظ نہیں بلکہ انہیں دبا کر رکھنا اور انتظامی امور کا فرد پر جبر قائم رکھنا قرار پایا - اتھارٹیز کے ارادہ کو فرد کے آزاد ارادہ یعنی Free Will پر فوقیت ملی، نظام اقدار شخصی نہ رہا تھا بلکہ اب لیڈر طے کرنے لگے یا ریاست کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ وہ غلط صحیح کی پہچان کرے – عملی مثالوں کے لئے سوویت یونین سمیت 46 ممالک جہاں سوشلسٹ اقتدار قائم ہوا دیکھ سکتے ہیں -
- تنوع کو نا پسند کیا گیا اور اتحاد و اتفاق کے نئے معانی پیدا کئے گئے-

یہاں تک کہ جس طرح Thucydides نے کہا کہ "پرجوش انقلابی خمار کے دنوں میں اصطلاحات کے معانی بدل دیئے جاتے ہیں" ، دو اصطلاحات پر بھی شب خون مارا گیا.

1- **liberation**: آزادی کی جدوجہد- جس کی بنیاد پر لبرلز خود کو لبرل کہتے ہیں اور جو بطور اصطلاح جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ ایڈم سمتھ سے پورے یورپ میں پھیلی اور انقلاب فرانس کے دنوں میں لبرلز نے شخصی آزادیوں مساوات اور مسرت کی جدوجہد کو ایک طرح سے "لبرلشن" کا نام دیا تھا - اب نیو لیفٹ یا مارکسٹ حضرات نے اپنی تحریک کو بھی لبرلشن قرار دیا کہ یہ بھی آزادی کی جدوجہد ہے-

2- **ورکنگ کلاس**: صنعتی انقلاب کے بعد یہ لبرلز ہی تھے جنھوں نے free man، free society اور Free Market کا نعرہ لگایا تھا. ان تینوں تصورات کے تحت انہوں نے غلامی کے خلاف جدوجہد کی اور امریکہ میں سب سے پہلے لبرلز کی ہی جدوجہد سے غلامی کا خاتمہ ہوا- اس عہد کا لبرل کسی ایک کلاس کی نمائندگی کا دعوی نہیں کرتا تھا بلکہ انسانوں کو ان کی دولت کی بنیاد پر تقسیم کرنے کا رواج پایا ہی نہیں جاتا تھا - مگر چونکہ وہ "سٹیس کو" کے مخالف تھے اور سٹیٹس کو میں زرعی عہد کی اشرافیہ کا غلبہ تھا اس لئے ان کا زیادہ جھکاؤ عام شہریوں کی طرف ہی تھا اور وہ بھی خود کو مزدوروں اور کسانوں کا نمائندہ سمجھتے تھے-
اسے ایک مثال سے سمجھیں.

غلامی کے خاتمہ سے پہلے امریکہ انسانی حقوق کے حوالے سے دو حصوں میں تقسیم تھا- جنوبی امریکہ میں سفید خام جاگیردار اور زمیندار بکثرت تھے اور یہاں کی معشیت زرعی اور تمدن جاگیردارانہ تھا. انہوں نے ہزاروں سیام فام اور ایشیائی غلام رکھے ہوئے تھے- جبکہ مغربی امریکہ میں تاجر، کاروباری افراد اور صنعتکار رہتے تھے - یہاں کی معشیت صنعتی اور تمدن بھی صنعتی اور شہری (Urban) تھا- جنوبی امریکہ میں رجعت پسندوں کی اکثریت تھی تو مغربی امریکہ میں لبرلز کی اکثریت تھی - ذرا تاریخ کے صفحات الٹ کر دیکھئے کہ انسانی حقوق کی جدوجہد کہاں سے

شروع ہوئی- دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ غلامی کے خاتمہ کے لئے کن علاقوں کے لبرلز آگے آگے تھے ؟ ورکنگ کلاس کی آواز کو کون اٹھا رہے تھے اور لفظ ورکنگ کلاس (مارکسسٹ معانی میں نہیں) کون بار بار ادا کرتے تھے؟ کن لوگوں نے کہا تھا کہ غلاموں کی آزادی کے بغیر Free man، Free Society، اور Free Market کا تصور قائم ہی نہیں ہو سکتا – جس طرح جنوب اور مغرب میں فرق تھا ویسے ہی رجعت پسندوں اور لبرلز میں مزدوروں اور غلاموں کے حقوق کی جدوجہد میں واضح فرق موجود تھا-

لبرلز کی اقوام مغرب میں سماجی انصاف کی اس جدوجہد کو ہائیک اس طرح بیان کرتا ہے –

" انفرادیت پسندی کا نظام ...،سوشلزم اور ہر قسم کی مطلق العنانیت کے نظام کے برعکس فرد کے حق انتخاب کے احترام پر قائم ہے - انفرادیت پسندی کے اس نظام کی خواہش یہی ہے کہ ہر فرد اپنی ذاتی صلاحیتوں اور شخصی جوہر کی خوب نشوونما کر سکے- یہ فلسفہ صحیح معنوں میں پہلی دفعہ زمانہ احیائے علوم میں پھلا پھولا اور یہی فلسفہ آگے چل کر مغربی تہذیب بنا- سماجی ترقی کی عمومی جہت یہی تھی کہ فرد کو جاگیردارانہ معاشرے کے شکنجوں سے آزاد کیا جائے-
انسانی امکانات کے افق کو بندشوں سے آزاد کرنے کا بہترین نتیجہ شاید سائنس کی عظیم الشان ترقی ہی ہے- پچھلے ایک سو پچاس سال میں سائنس نے جست لگا کر دنیا کو یکسر بدل دیا ہے- یہ تب ہی ممکن ہوا جب صنعتی آزادی نے نئے علوم کے آزادانہ استعمال کی راہ ہموار کی اور جب سے مردان کار کی دستیابی کی صورت میں ان کے اپنے جوکھم پر ہر نئی چیز کا تجربہ ممکن ہوا- اس بے مثال ترقی نے ہماری تمام توقعات کو پیچھے چھوڑ دیا- جب کبھی بھی انسانی استعداد کار کے آزادانہ استعمال سے پابندیاں اٹھائی گئیں، انسان اسی تیزی سے اپنی ہر لمحہ بڑھتی ہوئی خواہشات کی تکمیل کے قابل ہوا- بیسویں صدی کے آغاز پر مغربی دنیا میں ہر برسرروزگار آدمی مادی آسائش، تحفظ اور شخصی آزادی کے اس درجے کو پہنچ گیا تھا جس کا سو سال قبل تصور بھی ناممکن تھا- اس کامیابی کا اثر یہ ہوا کہ انسانوں میں اپنی تقدیر پر غلبے کے ایک نئے احساس اور اپنی بہتری کے نت نئے امکانات پر یقین نے جنم لیا-"(158)

اب اگر ذرا اس سوال پر غور کریں کہ فاشسٹ نظریے کے علمبردار اپنے آغاز میں کس آئیڈیالوجی سے تعلق رکھتے تھے اور یہ کہ فاشزم دراصل کس نظریہ کا انتہا پسندانہ ورژن ہے؟ کیا ہم نہیں جانتے کہ جرمنی میں فاشزم کی راہ سوشلسٹوں نے ہموار کی تھی جب انہوں نے لبرل ازم اور کیپٹل ازم کے خلاف پراپیگنڈے کے زہر سے جرمنوں میں (خاص طور پر یہودیوں سے نفرت جن کی اکثریت کاروباری افراد کی یعنی سرمایہ داروں کی تھی) نفرت پیدا کی (158) کیا ایسا نہیں کہ فاشزم کے سارے لیڈرز ، مسولینی سے لے کر Lavalاور Quislingتک سب کے سب نے اپنی ابتداء سوشلزم سے کی – وہ ابتداء میں سوشلسٹ تھے اور انتہا میں فاشسٹ ثابت ہوئے – اس پر ہائیک لکھتا ہے

"فاشزم اور مارکسزم سوشلسٹ رجحانات کا محض ری ایکشن نہیں تھا بلکہ ان رجحانات کا ناگزیر نتیجہ تھا" (159)

"یہ معنی خیز بات ہے کہ لبرلزم سے دستبرداری اور انحراف .....، چاہے وہ واضح طور پر سوشلزم کی انتہاپسندانہ شکل میں ہو یا جابرانہ منصوبہ بندی اور تنظیم کے پس منظر میں، جرمنی میں اپنے نقطہ کمال تک پہنچی۔ انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں جرمنی سوشلزم کی فکر و عمل میں بہت آگے نکل گیا حتیٰ کہ آج کی روسی مباحث بھی جرمنوں کی چھوڑی ہوئی جگہ کے قریب بھٹکتی پھرتی ہیں۔ جرمن ، نازیوں سے کہیں پہلے لبرلزم، سرمایہ داری، جمہوریت اور فرد کو اہمیت دینے والے نظام پر حملے کر رہے تھے۔ نازیوں سے بہت پہلے جرمن اور اطالوی سوشلسٹس ان تراکیب پر عمل کر رہے تھے جن کا بعد ازاں نازیوں اور فاشسٹس نے خوب استعمال کیا۔ سوشلسٹس ہی نے پہلی بار ایک ایسی سیاسی جماعت کے تصور کو حقیقت بنایا جو فرد کی مہد سے لے کر لحد تک تمام سرگرمیوں کا احاطہ کرے اور ہر معاملے پر اس کی فکری راہنمائی کا دعویٰ کرے۔ بچوں کی فکری ملمع کاری کے لیے انتہائی کم عمری میں ہی انہیں سیاسی جماعتوں کا حصہ بنانے کی رسم ہو یا کھیلوں، فٹ بال اور ہائیکنگ کا انتظام کلبوں میں کرنے کی روایت ہو تا کہ ممبران دوسروں کے افکار سے متاثر نہ ہو پائیں، دونوں کی ابتدا فاشٹس نے نہیں بلکہ سوشلسٹس نے کی۔ سوشلسٹس ہی نے سب سے پہلے اصرار کیا کہ (سیاسی) جماعت کے رکن کو سلام و آداب کے طریقوں اور طرز تخاطب سے خود کو دوسروں سے ممتاز کرنا چاہیے۔ ان سوشلسٹس ہی نے نجی زندگیوں کی نگرانی کے لیے خصوصی اداروں اور آلات کے زور پر مطلق العنان سیاسی جماعت کے لیے ایک کامل نمونہ قائم کیا۔ جب ہٹلر کی حکومت آئی تو جرمنی میں لبرل ازم کی موت سوشلزم کے ہاتھوں پہلے ہی ہو چکی تھی۔ جمہوری ممالک میں آج اکثریت کے خیال میں سوشلزم اور آزادی کا اجتماع ممکن ہے تاہم جس نسل کی اکثریت نے سوشلزم کا فاشزم تک سفر دیکھ رکھا ہے اسے ان دونوں نظام ہائے میں فرق خوب معلوم ہے۔ یہ بات لوگ سمجھتے ہی نہیں کہ ''جمہوری سوشلزم''، جو گزشتہ چند نسلوں کی پسندیدہ خیالی جنت ہے، نہ صرف ناقابل عمل ہے بلکہ ''جمہوری سوشلزم'' کی جد و جہد ، آزادی کو تباہ کرنے جیسے گل ہی کھلاتی ہے۔ کیا خوب بات ہے کہ ''ریاست زمین پر جہنم ہمیشہ تب ہی بنی ہے جب انسان نے اسے مطلق جنت (یوٹوپیائی) بنانے کی کوشش کی''۔(159)

اس رجحان سے یہی برآمد ہونا تھا کیونکہ آپ انقلاب کو نفرت اور تشدد پر پال رہے تھے - قصہ مختصر کہ تاریخ واضح ہے کہ کون تمام انسانوں کے ساتھ کھڑے رہے اور کس نے انہیں طبقات میں تقسیم کیا ہے ، کون ان کی آزادی، ان کے لئے مساوات اور انصاف کی جدوجہد میں پیش پیش رہے اور کن لوگوں نے ریاستی ظلم و جبر کی حمایت کی، غربت و افلاس کی مساوات قائم کی اور زندان خانوں میں انقلاب کے تحفظ کے لئے معصوم انسانوں کا خون بہایا۔ دور حاضر میں بھی ایسے چہرے پہچانے جا سکتے ہیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد لبرلز چار نکاتی ایجنڈے پر متفق رہے:

1- انٹرنیشنل مائیگریشن کے حق کی حمایت

2- آزادی تجارت (Free Trade) کے حق کی حمایت

3- عدم مداخلت (non interventionism) کی پالیسی کی حمایت

4- گلوبلائزیشن میں علم و ثقافت اور سرمایہ میں اشتراک کے حق کی حمایت

اپنے عہد میں اپنے اردگرد دیکھ کر پہچان لیجئے کہ ان چاروں نکات پر حملہ آور آج کون سی قوتیں ہیں- وہ ساری قوتیں جنہوں نے ہمیشہ دائیں بازو کے ایجنڈے کا ساتھ دیا- جنہیں کل بھی لبرل ازم سے عار تھی ،آج بھی ہے اور وہ اصطلاحات اور نعروں (Slogans) کو بدل کر اپنے نظریات کو طاقت و توانائی دنیا چاہتے ہیں-

فاشزم کیا ہے : سماجی انصاف کی ایک مطلق العنان (Authoritarian) شکل

ہمارے دانشورانہ مکالمہ میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم نے دور جدید کی سوشل سائنس کے تین بڑے رجحانات (لبرل ازم، سوشل ازم، اور فاشزم) کو تفصیل سے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی- جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پاکستان میں لبرل فاشزم کی اصطلاح یہاں کا صف اول کا کالم نویس استعمال کرتا ہے اور پھر اس کے دیکھا دیکھی یہ اصطلاح معروف بھی ہو جاتی ہے اس تحقیق و جستجو میں پڑے بغیر کہ اصل میں فاشزم ہے کیا؟ فاشسٹ ہونا کیونکر گالی ہے؟ گزشتہ صدی کے ابتدائی عشروں میں مغربی لبرل ازم نے جس فاشزم سے جنگ لڑی دونوں کے درمیان کس بات کا نظریاتی اختلاف تھا؟ اور یہ کہ مغرب میں جس فاشزم کی لہر دوبارہ سے اٹھ رہی ہے اس کا جنم کہاں سے ہے اور وہ مغربی لبرل ازم کے لئے کیونکر اور کن بنیادوں پر خطرہ بن رہی ہے- یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جن پر غوروفکر ہمارے اہل علم و فکر کے لئے ضروری ہے تب جا کر دانشورانہ مکالمہ سطحیت سے سنجیگی کی طرف رجوع کرے گا-

آیئے پہلے اس پر بات کرتے ہیں کہ لبرل ازم اور فاشزم سے کیا مراد ہے اور ان میں باہم اختلاف کیا ہے اس کے بعد بقیہ پہلوؤں کو زیر بحث لانا ممکن ہو جائے گا-

فاشزم ایک ایسا سیاسی فلسفہ، تحریک یا عہد (regime) ہے جس میں قوم یا نسل یا وطن یا ملک یا وفاق کو فرد یعنی شہری سے بالاتر سمجھا جاتا ہے اور جس میں مرکزی، وفاقی (centralized) اور جابرانہ (autocratic)سیاسی سماجی اور معاشی نظم پایا جاتا ہے-

لبرل ازم اس سے مختلف ہے- اس میں فرد ہر سماجی اکائی سے بالاتر ہے، قوم نسل وطن اور ملک فرد سے بالاتر نہیں- اس میں طاقت و اختیار عدم مرکزیت یا کم مرکزیت کی حامل (decentralized) ہوتے ہیں اور سیاسی سماجی و معاشی نظام فرد کی آزادی پر قائم ہوتا ہے- ریاست کے تمام ادارے شہریوں کے حضور جوابدہ ہیں- سماجی و معاشی زندگی میں ہر فرد آزاد ہے کہ اپنے پرامن مقاصد کی جستجو کرسکے-

مسولینی لبرل ازم کو فاشزم کا انٹی تھیسز سمجھتا تھا اس نے اپنی کتاب Fascism: Doctrine and Institutions میں ریاست کی اہمیت پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور فرد کی اہمیت کو صرف اتنا تسلیم کیا ہے کہ فرد ریاست کے مفادات کا تابع ہے۔

مسولینی کہتا ہے کہ یہ غیر فطری ہے کہ ریاست شہریوں کے حقوق کا تحفظ کرے۔ اس کے الفاظ ہیں۔

The maxim that society exist only for the well being and freedom of the people composing it does not seem to be in conformity with nature's plan. If classical liberalism spells individualism, Fascism spells Government

(یہ اصول کہ سوسائٹی جو لوگوں سے وجود آتی ہے، صرف ان لوگوں کی فلاح اور ان کی آزادی کے لئے ہی قائم کی جاتی ہے، فطرت کے منصوبہ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر کلاسیکل لبرل ازم سے مراد انفرادیت پسندی ہے تو فاشزم سے مراد صرف گورنمنٹ ہے) (160)

ہمارے قومی شاعر علامہ محمد اقبال جن کا شاہین آزاد پرواز پرندہ ہے جو پہاڑوں کی چٹانوں پہ اپنی انفرادیت پسندی کا تحفظ کرتا ہے، انہوں نے مسولینی کی جو تعریف کی سو کی۔ ذرا برطانوی سوشلسٹ شاعر و ادیب برنارڈ شا کی بھی سن لیجئے جنہوں نے 1927 میں لکھا۔

"سوشلسٹ یہ جان کر مسرور ہوں گے کہ آخر کار انہیں ایک سوشلسٹ (مسولینی) کو پا لیا ہے جو ویسے بولتا اور سوچتا ہے جیسے ایک ذمہ دار حکمران کو ہونا چاہئے(161)"

جرمن فاشزم کا بانی Paul Lensch ہے جو اپنی کتاب Three Years of world revolution میں لکھتا ہے:

Socialism must present a conscious and determined opposition to Individualism

(سوشلزم کے لئے ضروری ہے کہ وہ انفرادیت پسندی یعنی لبرل ازم کے خلاف ایک شعوری اور پرعزم اپوزیشن کا کردار ادا کرے(162) "

حقیقت یہ ہے کہ فاشزم سماج میں اخلاقی جبر کا قائل ہے۔ وہ فرد کو اپنی مفروضہ اخلاقیات کے حضور سرنگوں دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے جرمن فاشزم کا سلوگن بھی یہی تھا کہ (Gemeinmutz geht vor Eigennutz سماجی اخلاقیات انفرادی اخلاقیات سے بالاتر ہیں)

ہٹلر اپنی کتاب Mein Kampf میں لکھتا ہے:

"آرینز اپنی ذاتی صلاحیتوں سے عظیم نہیں تھے بلکہ ان کی آمادگی تھی جس کے باعث وہ اپنی ذات کو سماج سے کمتر سمجھتے تھے اور اگر اس کے لئے وقت ان سے تقاضا کرتا تو وہ قربانیوں سے نہیں گھبراتے تھے۔(163)

فاشزم فرد کا انکار کرتا ہے اس کے حقوق کا بھی، اس کی ذات کا بھی، اس کی آزادی مساوات اور انصاف کا بھی۔ وہ ایک مفروضہ تصور نظریہ یا عقیدہ کی آمریت کا نام ہے جو افراد سے اپنی پرستش اور خدمت گزاری کرواتا ہے۔ اسی بات کو ہٹلر اپنی کتاب میں ان الفاظ میں لکھتا ہے۔

"فرد کے حقوق ہوتے ہی نہیں، اس کے فقط فرائض ہوتے ہیں(164) "

فاشزم اپنی آمریت کا جواز سماجی بہبود کو قرار دیتا ہے اور سماجی بہبود کے نام پر شخصی آزادی کو نفرت سے دیکھتا ہے۔ شہری کے مفادات کو سماج دشمن قیاس کرتا ہے۔ اس کے نزدیک وہ تمام لوگ جو اپنے اور اپنے خاندان کے لئے محنت مشقت کرتے ہیں وہ سماج دشمن ہیں، وہ ریاست کے دشمن ہیں۔ ہٹلر لکھتا ہے۔

"ہماری قوم صرف ایک سادہ اصول سے صحت یاب ہو سکتی ہے۔ "سماجی مفادات کو انفرادی مفادات پر ترجیح دی جائے" (165
)

فاشسٹ فلسفہ و نظام حکومت یہ نہیں کہ ریاست آپ کے لئے کیا کر سکتی ہے بلکہ حقیقتاً یہ ہے کہ آپ ریاست کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔

فاشزم کا ذکر ہو اور اس میں کارلائل کا تذکرہ نہ ہو، ایسا ناممکن ہے۔ جس طرح کلاسیکل لبرل ازم کے فلسفہ میں لاک، مل، بینتھم، والٹیر اور ایڈم سمتھ کا کردار ہے، اور کمیونزم کے فلسفہ میں مارکس کا، بالکل اسی طرح جدید فاشزم کی تبلیغ و تشریح میں کارلائل کا کردار سب سے نمایاں ہے۔ یہ اتفاق نہیں کہ اپنے انجام کے آخری لمحات میں جب ہٹلر چہار سو شکست اور ناکامی دیکھ رہا تھا، وہ اپنے بنکر میں اپنے وفاداروں کے ساتھ محصور تھا اور دشمن کی فوجیں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ہٹلر نے اپنے قابل اعتماد اسسٹنٹ Goebbels کو کہا کہ وہ ان لمحات میں خود کو پرسکون رکھنا چاہتا ہے اس لئے اسے ایک کتاب پڑھنے کو دی جائے۔ اس کے اسسٹنٹ نے پوچھا کہ جناب کونسی کتاب پڑھنا چاہیں گے تو اس نے تھامس کارلائل کی کتاب "فریڈرک اعظم کی بائیو گرافی " طلب کی " اور اسی کتاب کو سینے سے لگائے دنیا سے کوچ کر گیا (166)

کارلائل گریٹ مین (ہیروز) تھیوری کا خالق تھا۔ اس نے ہیروز کی جو خصوصیات بتائی ہیں ان پر ماؤ سٹالن ہٹلر اور مسولینی خوب پورے اترتے ہیں۔ اس نے آزادی، مساوات، اور انصاف کے تصورات کا مذاق اڑایا اور سب سے بڑی قدر طاقت و اقتدار کو قرار دیا۔ اس نے آزادی کا حق صرف ہیروز کے لئے مخصوص کیا اور باقی افراد کے لئے اس کا کہنا تھا کہ وہ ہیروز کے حضور سرنگوں ہو جائیں۔ وہ کہتا تھا کہ ہیروز اور عام لوگ برابر نہیں ہو سکتے۔ جس طرح ہیرو دوسرے افراد پر حکومت کرتے ہیں اسی طرح ہیرو نسلیں بھی دوسری کمتر نسلوں پر حکومت کرتی ہیں۔ انصاف قانون کی نظر میں برابری نہیں بلکہ انصاف ہیروز (عظیم افراد) کا ارادہ و حکم ہے۔ اس نے سینکڑوں صفحوں پر محیط تحریریں لکھیں جن میں اس نے اس حکومت کی تعریف کی، جس سے لوگ ڈریں۔ اس نے لکھا کہ جنگیں انقلاب حملے تغیرات اور اکثریت پر جبر زندگی کا حصہ ہے۔ فاشزم کو سمجھنے کے لئے آیئے ذرا تفصیل سے کارلائل کے خیالات کو سمجھتے ہیں تاکہ ہم اپنے عہد میں بھی فاشسٹ نظریات کی شناخت کر سکیں اور خود کو بھی کھنگال لیں کہ کہیں ہم اپنے رویوں اور نظریات و عقائد میں فاشسٹ تو نہیں۔

-اس نے سب سے زیادہ لبرلز پر تنقید کی خاص طور پر جان سٹارٹ مل اور ایڈم سمتھ اس کی بدزبانی کا نشانہ بنے۔ اس نے ایڈم سمتھ کی Pinفیکٹری (مارکیٹ کے عمل کو سمجھانے کے لئے ایک کلاسیکل مثال (کا مذاق اڑایا اور کہا کہ "سب سے گھٹیا کام پیداواری محنت ہے اور سب سے اعلیٰ کام جنگیں لڑنا اور انقلاب برپا کرنا ہے۔ آخر معاشرہ کی تخلیقی صلاحیت کو جنگ میں کیوں نہ استعمال کیا جائے بجائے اس کے کہ اس سے سوئیاں بنائی جائیں، آخر بجائے جنگ کے سوئیاں بنانے میں کیا جمالیات ہے؟"- اس نے خود کو مطلق العنانی کا پیغمبر کہا اور کہا کہ میں ہر اس چیز کی مخالفت کرتا ہوں جسے لبرل مانتے ہیں۔ یاد رہے کہ وہ سوشلسٹ بھی نہیں تھا اور مارکس نے اپنے عہد میں اسے ذرہ برابر بھی اہمیت نہیں دی تھی۔

–اسے سب سے زیادہ غصہ فری مارکیٹ معیشت پر تھا۔ اسی نے سب سے پہلے لکھا کہ اکنامکس ایکdismal (ہولناک، مایوس کن) سائنس ہے۔ اسی سبب وہ مارکیٹ کی پیداواری سرگرمیوں کو نفرت سے دیکھتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ ذہانت اور محنت جنگوں میں اور حکومت کرنے پر کیوں نہیں صرف کی جاتی۔

فری مارکیٹ کیپیٹلزم سے اس کی نفرت کی دوسری وجہ غلامی کا خاتمہ ہے۔ چونکہ وہ بادشاہت اور جاگیرداری کا حامی تھا اس لئے وہ فرد کی معاشی آزادی کو نفرت سے دیکھتا تھا۔ اس کے عہد میں بادشاہت کا خاتمہ ہو رہا تھا، سیاسی سماجی اور معاشی آزادی حاصل ہو رہی تھی، اس کے نزدیک اس سب خرابی کی وجہ Laises Faire معیشت ہے جو تمام آزادیوں کو جنم دے رہی ہے۔ اس نے کہا کہ مساوات نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ حکمران طبقہ کو دوبارہ اختیارات اور طاقت دی جائے اور جو مضبوط اور طاقت ور ہے وہ سیاسی سماجی اور معاشی زندگی کو کنٹرول کرے۔

اسے پورا کیپیٹلزم مضحکہ خیز لگتا تھا جس کا اظہار اس نے بار بار کیا۔ اس نے کیپیٹلزم کے اصولوں جیسے آزادی، عالمگیر بنیادی حقوق، اور ترقی کا مذاق اڑایا۔ وہ کہتا تھا یہ کیسا معاشرہ چاہتے ہیں ”جو مساوی آزادی دیتا ہو۔ جس میں کوئی آقا اور غلام نہیں۔ سب کے برابر حقوق ہیں۔ سوسائٹی کی معیشت پر کسی کا کنٹرول نہیں بس ڈیمانڈ اور سپلائی معیشت کو منظم کرتی ہے۔ لوگ کسی حکم کی پیروی نہیں بلکہ اپنے اپنے سیلف انٹرسٹ (شخصی آرزؤں) کی جستجو کرتے ہوں۔ جس طرح سیاسی آزادی کے قائل ہیں ویسے ہی معیشت اور سماج کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں “۔ وہ لکھتا ہے ”میں پوچھتا ہوں کیا یہ احمقانہ بات نہیں۔ سوائے ہیروز کے کوئی اور بھی درست ہو سکتا ہے ؟“

–جو گورے نہیں وہ انسان ہی نہیں۔ اگر وہ غلام نہیں تو انہیں مار دیا جائے۔ اس نے کالوں کو دو پاؤں والا جانور قرار دیا۔ اس نے لکھا کہ انکی بس اتنی وقعت ہے کہ انہیں غلام بنا دیا جائے۔

–بہترین سوسائٹی وہ ہے جس میں اشرفیہ کی بالادستی ہو۔ عام لوگ تو رعایا بننے کے لئے پیدا ہوتے ہیں ان میں self determinationاور self responsibility کہاں ؟

–اپنے عہد میں اس کا ہیرو نپولین تھا اس نے کہا کہ ہیرو جیسا کہ نپولین پیدا ہی اس لئے ہوتے ہیں کہ حکومت کریں۔

–لبرل ازم فرد پر سوسائٹی اور ریاست کے جبر کا قائل نہیں۔ وہ سوسائٹی کو آزاد دیکھنا چاہتا ہے جس میں خود تنظیمی کی صلاحیت ہو اور حکومت و ریاست بطور ایک سماجی ادارہ کے اپنی حدود میں رہ کر کام کریں۔ یوں لبرل ازم میں سوسائٹی کو ڈیزائن یا کنٹرول کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔ وہ لبرل ازم کے اس موقف پر چڑتا تھا۔ کہتا تھا ”فرد کیا ہے؟ فرد کچھ بھی نہیں۔ فرد کے حقوق نہیں ہوتے اس کے فقط فرائض ہوتے ہیں (یہی بات بار بار ہٹلر اور مسولینی دہراتے تھے)۔ اس کا آزاد ارادہ نہیں ہوتا بس اس نے محض اتباع کرنی ہوتی ہے۔ سوسائٹی پر ریاست کو برتری حاصل ہے کیونکہ ریاست کی کمان ہیرو کے پاس ہوتی ہے۔ سوسائٹی پر اشرافیہ کا غلبہ ہوتا ہے جو ہیرو کی کمانڈ پر رعایا سے کام لیتے ہیں “۔

فاشزم اور لبرل ازم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک ریاستی آمریت اور ہیروازم پر قائم ہے تو دوسرا شخصی آزادیوں، آزادی میں مساوات، اور بنیادی انسانی حقوق کی اساس پر قائم قانون کی حکمرانی کا قائل ہے۔ دونوں کو ملانا ناممکن ہے۔ ایک لبرل ، فاشسٹ نہیں ہو سکتا اور ایک فاشسٹ ، لبرل نہیں ہو سکتا۔

ریاستوں کا عمومی رجحان فاشسٹ ہوتا ہے جیسے پاکستان کا ریاستی جبر بلوچستان اور فاٹا پر، بھارت کا کشمیر اور تامل ناڈو پر، چین کا سنکیانگ پر، امریکہ کی خارجہ پالیسیاں، ایران کا سنی آبادی، دیگر اقلیتوں اور شہریوں پر نظریاتی جبر، سعودیہ کا شیعہ آبادی اور شہریوں پر نظریاتی جبر، اسرائیل

کا فلسطین پر، اور ترکی، شام، عراق، اور ایران کا کردوں پر ایسی بہت ساری مثالیں ہیں۔ جبکہ فرد اور سوسائٹی پر امن ہوتے ہیں، لوگ تعاون و تبادلہ کی اساس پر پرامن زندگی پسند کرتے ہیں۔ نیشن اسٹیٹ کے تصور نے جہاں ایک طرف جمہوریت اور داخلی آزادیوں کی راہ ہموار کی ہے وہیں ان ریاستوں کی خارجہ پالیسیاں، کمزور شناختوں کے لئے داخلہ پالیسیاں، اور ریاست کی فرد و سوسائٹی پر کنٹرول کی کوشش نے جدید فاشزم کو جنم دیا ہے۔

حیران کن بات یہ ہے کہ کارلائل باوجود اپنے متعصب اور ظالمانہ نظریات کے برطانیہ میں بہت مقبول رہا۔ اسی طرح ہٹلر اور مسولینی جمہوری عمل سے باقاعدہ الیکشن جیت کر اقتدار میں آئے۔ جس مقبولیت پسند سیاست سے وہ اقتدار میں آئے اسی طرز کی سیاست امریکہ میں ٹرمپ، ترکی میں اردوان، برطانیہ میں بورس جانسن اورJeremy Corbyn ، بھارت میں بی جے پی اور مودی، روس میں پوتن، اسرائیل میں نیتن یاہو، فلپائن میںDuterte ، نیدر لینڈ میںGeert Wilders ، ہنگری میںViktor Orbán ، پولینڈ میں Jarosław Kaczyński، اور یورپ میں پھلتی پھولتی انٹی امیگرنٹ تحریکیں کر رہی ہیں۔ یہ غیر لبرل (Illiberal) ہیں اور مقبولیت پسند جمہوریت سے اپنے فاشسٹ نظریات کو نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا بیانیہ بھی ہٹلر مسولینی اور کارلائل سے ملتا ہے کہ سیاسی سماجی اور معاشی آمریت نافذ کر کے قوم کو عظیم سے عظیم تر بنایا جائے۔ لبرل ازم سیاست معیشت اور سماج کو ایک دوسرے سے جدا رکھتا ہے۔ لبرل جمہوریت ایک سیاسی بندوبست ہے معاشی یا سماجی نہیں اور اس پر انسانی حقوق اور شخصی آزادیوں کی کڑی شرط عائد ہے۔ دور جدید میں لبرل ازم کو پھر فاشسٹ نظریات سے خطرہ ہے، ایک بار پھر میدان سجنے کو ہے، مگر ہمارا دانشور لبرل فاشسٹ کی اصطلاح متعارف کروا کر نہ صرف اپنے خول میں قید ہے بلکہ اپنی لاعلمی اور بے خبری کی باقاعدہ علمی تصویر بنا کر اپنے قارئین کو گمراہ کر رہا ہے۔

شادباد منزل مراد پاکستان کا راستہ ...، جس میں نہ غربت ہو اور نہ غلامی۔

پاکستان کو ترقی یافتہ بنانے کے لئے ہمارے اندر اول تو یہ عزم و ہمت ہونی چاہئے کہ ہم نیا آغاز کر سکیں۔ ہمیں پہلے ان تمام غلطیوں سے سیکھنا ہو گا جو ہماری حماقتوں کے سبب ہیں یا اس ملک پر قابض اجارہ دار اور مراعات یافتہ طبقات کی وجہ سے ہیں ۔ علمی طور پر بھی ہمیں ترقی پسند فکر کی تعمیر سے پہلے موجودہ علمی ذخیرہ میں تطہیر فکر کا مشکل مگر بے حد ضروری کام کرنا ہو گا تاکہ ہم ان ذہنی و عملی شکنجوں و گمراہیوں سے آزاد ہوں جنھوں نے ہمیں صدیوں سے جکڑ رکھا ہے اور ہماری ترقی کے سفر میں ناقابل برداشت بھاری بوجھ ہیں ۔

پاکستان غربت سے اس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک ہم وسائل کی بہترین تفویض (Allocation) کا ایسا بندوبست نہیں قائم کر لیتے جس میں تمام شہریوں کی تخلیقی توانائیاں آزاد نہ ہوں ۔ انسانوں کی دوسرے انسانوں سے یا شہریوں کی ریاست سے غلامی اس وقت تک ختم

نہیں ہو سکتی جب تک تمام انسانوں کی سیاسی سماجی اور معاشی آزادی کے حق کو تسلیم نہیں کیا جاتا ، اور بالادست طبقات کی اجارہ داری کو توڑ نہیں دیا جاتا.....۔ ہمیں خوشگوار ترقی کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنا ہو گا ....، نہ کہ " ریاستی جبر سے ترقی کی منصوبہ بندی" سے ترقی ممکن ہے -

اگر ہم آزادی مساوات اور انصاف کی دنیا تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو رہنما اصول محض یہی ہیں : تمام انسانوں کی آزادی ، آزادیوں میں مساوات اور آزادیوں کا تحفظ کرنے والا نظام انصاف ..... ، پس یہی خالص ترقی پسندی ہے -

حوالہ جات

1. Natural Selection and Adaptation, Evolution, Douglas J. Futuyma, second edition.
2. The Biology of Behavior by roger j. Williams, Saturday Review, 30 January 1971.
3. Mammal Species of the World: A Taxonomic and Geographic By Don E. Wilson, DeeAnn M. Reeder. JHU Press, 2005
4. *Ibid.*
5. Human nature, cultural diversity and evolutionary theory by Henry Plotkin, Philos Trans R Soc Lond B Biol Sci. 2011.
6. Economics, an Introductory Analysis by Paul Anthony Samuelson, McGraw-Hill Book Company, 1948.
7. The Economist: Economics 4th edition: Making sense of the Modern Economy by Richard Davies, Profile Books, 2015.
8. "Life during growth", by William Easterly, Journal of Economic Growth, September 1999.
9. World Happiness Repost, http://worldhappiness.report/ 2016.
10. Creating Capabilities. By Martha C. Nussbaum, Harvard University Press, 2011.
11. Ibid
12. Development as freedom By Amartya Sen, Anchor Books, 2000.
13. Ibid
14. Ibid
15. Ibid
16. Ibid
17. Ibid
18. منہاج القران از ڈاکٹر برہان احمد فاروقی
19. Water: The dry facts, by The Economist, www.economist.com Nov 5th 2016.
20. The Free Market and Its Enemy by Leonard E. Read , Skyler J. Collins, 2015
21. Henry David Thoreau, The Thoreau Reader, http://thoreau.eserver.org/default.html
22. Free to Choose: A Personal Statement by Milton Friedman, Rose Friedman, Houghton Mifflin Harcourt, 1990.
23. Macroeconomics by Paul Samuelson and William Nordhaus, McGraw-Hill Companies,Incorporated, Aug 25, 2004
24. Mao's Great Famine: The History of China's Most Devastating Catastrophe, 1958-1962 by Frank Dikötter, Bloomsbury Publishing, Oct 1, 2010
25. The Chinese Economy: Transitions and Growth By Barry Naughton, MIT Press, Cambridge, London.
26. science and the Economic Crisis: Impact on Science, Lessons from Science by Francesco Sylos Labini, Springer International publishing, Mar 30, 2016
27. The First Industrial Revolution By P. M. Deane, Cambridge University press, 1965
28. Understanding the Industrial Revolution By Dr Charles More, Charles More, Routledge, 2000.
29. Ibid
30. The Fourth Industrial Revolution: what it means, how to respond by Klaus Schwab, World Economic Forum. 14 January 2016. https://www.weforum.org.
31. Ancient Economic thought by B.B.Price, Routledge, London, 1997.
32. Markets Are Breaking Down India's Caste System, Turning Untouchables into Millionaires by Malavika Nair & G. P. Manish. Foundation for economic education. https://fee.org. August 31, 2016.
33. The Wealth of Nations by Adam Smith, Bantam Classic, 2003
34. Mein Kampf By Adolf Hitler, Bottom of the Hill Publishing, 2010
35. The Speeches of Adolf Hitler, April 1922-August 1939, By Adolf Hitler, Edited by Norman H. Baynes, Oxford University Press, 1994.
36. Fascism: Doctrine and Institutions By Benito Mussolini, Howard Fertig, 1968.
37. Capitalism and freedom by Milton Friedman, University of Chicago Press, 2002.
38. Ibid

39. Letter to Archbishop Mandell Creighton by Lord Acton, Apr. 5, 1887. http://history.hanover.edu/courses/excerpts/165acton.html
40. Entangling Alliances by David Fromkin, Foreign Affairs. www.foreignaffairs.com. July 1970.
41. Benjamin Franklin: An American Life by Walter Isaacson, Simon & Schuster. 2003

یاد رہے کہ جو پہلا امریکی سکہ جاری کیا گیا تھے اسے بینجمن فرینکلن نے ڈیزائن کیا تھا اور اس پر یہی الفاظ درج تھے تاکہ دنیا کو یہ پیغام پہچایا جائے کہ ہم عدم مداخلت کی پالیسی پر چلنے والے ہیں -

42. Diplomacy by Henry Kissinger, Simon and Schuster, 1994.
43. Just and Unjust Wars: A Moral Argument with Historical Illustrations by Michael Walzer, Basic Books, 2015
44. A Few words on Non-Interventionism by John Stuart Mill. *www.libertarian.co.uk*
45. The Wealth of Nations by Adam Smith, Bantam Classic, 2003
46. British Foreign and Imperial Policy 1865–1919 by Graham Goodlad Routledge, 2005.
47. Liberalism and Colonialism by Bhikhu *Parekh, 1995.*
48. The Wealth of Nations by Adam Smith, Bantam Classic, 2003
49. Ibid
50. Ibid
51. Liberalism: In the Classical Tradition by Ludwig Von Mises. 1985. https://mises.org
52. The German Colonial Experience: Select Documents on German Rule in Africa, China, and the Pacific by Arthur J. Knoll, Hermann J. Hiery. University Press of America, 2010.
53. Liberty and American Anti-Imperialism, 1898–1909. by Michael P. Cullinane, Palgrave Macmillan, 2012.
54. The Forgotten Man and Other Essays by William Graham Sumner, Cosimo, Inc., 2007.
55. Ibid
56. Ibid
57. Ibid
58. The Spirit of Mediaeval Philosophy by Etienne Gilson, Charles Scribner's Sons New York, 1940.
59. منہاج القران از ڈاکٹر برہان احمد فاروق
60. The Rise and Fall of Society by Frank Chodorov, https://mises.org/library/rise-and-fall-society
61. Hayek: The Knowledge Problem by Jeffrey Tucker. 2014 www.liberty.me
62. The Road to Serfdom by Friedrich August Hayek, Psychology Press, 2001.
63. Ibid
64. Principles of Economics, By: Carl Menger, Free Press, 1950.
65. *The Mind and the Market: Capitalism in Western Thought* by Muller, Jerry Z. Anchor Books. (2002)
66. *The Collected Works of F. A. Hayek by Bruce Caldwell, The University of Chicago press.*
67. *Nazi Economics: Ideology, Theory, and Policy by* Avraham Barkai.Trans. Ruth Hadass-Vashitz. Oxford: Berg Publishers Ltd., 1990.
68. The Birth of War by R.B. Ferguson, Natural History, (2003, July)
69. Edison's Electric Light: The Art of Invention by Robert Friedel, Paul B. Israel, JHU Press, 2010
70. The Economics of Thomas Robert Malthus by Samuel Hollander, University of Toronto Press, 1997.
71. Twenty-six Centuries of Agrarian Reform: A Comparative Analysis by Elias H. Tuma. University of California Press, 1965.
72. The Constitution of Liberty: The Definitive Edition by F. A. Hayek, Ronald Hamowy. University of Chicago Press, 2011
73. Our world in data by Max Roser. https://ourworldindata.org/
74. Why Doesn't Capitalism Flow to Poor Countries? By RAFAEL DI TELLA&ROBERT MACCULLOCH, Brooking Institution 2009. https://www.brookings.edu/wp-content/uploads/2009/03/2009a_bpea_ditella.pdf
75. Planning for Freedom; and Twelve other Essays and Addresses by Ludwig Von Mises. Mises Institute. 1962. https://mises.org/library/planning-freedom-and-twelve-other-essays-and-addresses
76. The Chinese Economy: Transitions and Growth By Barry Naughton, The MIT Press Cambridge, London, England. 2006
77. The Pleasures of Philosophy: A Survey of Human Life and Destiny, By Will Durant, Simon and Schuster, 1964
78. An Essay on the Principle of Population By T. R. Malthus, Courier Corporation, Mar 13, 2012.
79. The Pleasures of Philosophy: A Survey of Human Life and Destiny, By Will Durant, Simon and Schuster, 1964
80. First Farmers: The Origins of Agricultural Societies by Peter Bellwood, Wiley, Nov 30, 2004

81. India: The Ancient Past: A History of the Indian Sub-Continent from C. 7000 BC to AD 1200 by BurjorAvari, Routledge Taylor & Francis Group, 2007.
82. Ibid
83. Ibid
84. European Economic History: From Mercantilism to Maastricht and BeyondBy E. Damsgård Hansen, Copenhagen Business School Press, 2001.
85. Ibid
86. The Industrial Revolution in the Eighteenth Century: An outline of the beginnings of the modern factory system in England By Paul Mantoux, Routledge, 2013.
87. Why can’t we see that we’re living in a golden age? By Johan Norberg, TheSpectator, 20 August 2016.
88. Classical Liberalism by Charles Siegel, Preservation Institute. 2011
89. Ibid
90. Ibid
91. The Invisible Hand of Peace: Capitalism, the War Machine, and International Relations Theory by Patrick J. McDonald, Cambridge University Press, Mar 2, 2009
92. The Road to Serfdom by Friedrich August Hayek, Psychology Press, 2001.
93. The Pleasures of Philosophy: A Survey of Human Life and Destiny, By Will Durant, Simon and Schuster, 1964
94. Ibid
95. Ibid
96. Ibid
97. Ibid
98. Organization for Economic Co-operation and Development (OECD), http://www.oecd.org/ , 2014.
99. Development as freedom By Amartya Sen, Anchor Books, 2000.
100. سیکولر ازم اور ریاست: ایک متبادل بیانیہ از ذیشان ہاشم ، روزنامہ جہاں پاکستان ، 31 جنوری دو ہزار پندرہ –
101. Capitalism and freedom by Milton Friedman, University of Chicago Press, 2002.
102. The Rise of the Western World: A New Economic History By Douglass C. North, Robert Paul Thomas, Cambridge University Press, 1976.
103. The Pleasures of Philosophy: A Survey of Human Life and Destiny, By Will Durant, Simon and Schuster, 1964
104. An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations By Adam Smith University Paperbacks, 1950.
105. The Man versus the State By Herbert Spencer. Mises Institute, https://mises.org. 1961
106. The Pleasures of Philosophy: A Survey of Human Life and Destiny, By Will Durant, Simon and Schuster, 1964.
107. Full text: Invoking Hitler, Raghuram Rajan warns: A strong govt may not move in the right direction By RaghuramRajan, Scroll in.http://scroll.in . 2015.
108. The Road to Serfdom by Friedrich August Hayek, Psychology Press, 2001.
109. Ibid
110. An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations By Adam Smith University Paperbacks, 1950.
111. The Division of Labor in Society by Emile Durkheim, Simon and Schuster, 2014.
112. Liberalism: In the Classical Tradition by Ludwig Von Mises. 1985. https://mises.org
113. I, Pencil: My Family Tree as told to Leonard E. Read By Leonard E. Read. Library of Economics and Liberty. http://www.econlib.org . 1958
114. Vietnam’s economy: The other Asian tiger by The Economist. Aug 6th 2016. http://www.economist.com
115. Basic Economics: A Citizen's Guide to the Economy by Thomas Sowell, Basic Books, NY, USA
116. The Turning Point: Revitalizing the Soviet Economy by Nikolai Shmelev and Vladimir Popov, I.B.Tauris & Co. Ltd. Publishers London.
117. Pakistan demographic and health survey, National Institute of Population Studies, Pakistan. http://www.nips.org.pk
118. The Turning Point: Revitalizing the Soviet Economy by Nikolai Shmelev and Vladimir Popov, I.B.Tauris & Co. Ltd. Publishers London.
119. International Trade and Central Planning: An Analysis of Economic Interactions By Alan A. Brown, Egon Neuberger, Research Institute on Communist Strategy and Propaganda, University of Southern California.
120. Agriculture, liberalisation and economic growth in Ghana and Côte d'Ivoire, 1960-1990 by Robin W. L. Alpine, James Pickett, Development Centre, Organisation for Economic Co-operation and Development, 1993

121. The Commanding Heights: The Battle for the World Economy Daniel Yergin, Joseph Stanislaw, Simon and Schuster, Jun 15, 2002
122. The economist, 02 june, 2011. http://www.economist.com
123. The Chinese Economy: Transitions and Growth By Barry Naughton, The MIT Press Cambridge, London, England. 2006
124. The Poverty of Philosophy by Karl Marx, Adegi Graphics LLC, 2001
125. Heaven on Earth: The Rise and Fall of Socialism by Joshua Muravchik, Encounter books San Francisco, 2003.
126. Afghan refugees: Death by bureaucracy, The economist, Dec 6th 2001. http://www.economist.com
127. The Turning Point: Revitalizing the Soviet Economy by Nikolai Shmelev and Vladimir Popov, I.B.Tauris & Co. Ltd. Publishers London.
128. Pakistan ranks 149/188 on SDG index, The Express Tribune, September 24, 2016, http://tribune.com.pk
129. Applied Economics: Thinking Beyond Stage One by Thomas Sowell, Basic Books, 2004
130. Antwerp: Twelve centuries of history and culture, by Karel van Isacker and Raymond V. Uytven, Fonds Mercator, 1992
131. Forty Centuries of Wage and Price Controls: How Not to Fight inflation. By SchuettingerRobert L. and ButlerEamonn F.. Washington D. C.: The Heritage Foundation, 1979.
132. Overdosing on Heterodoxy Can Kill You by Ricardo Hausmann, Project syndicate, MAY 30, 2016. https://www.project-syndicate.org
133. The Road to Serfdom by Friedrich August Hayek, Psychology Press, 2001.
134. Basic Economics: A Citizen's Guide to the Economy by Thomas Sowell, Basic Books, NY, USA
135. The State and Revolution by Vladimir Il'ich Lenin Penguin Books Limited, 1992.
136. Selected Works by Vladimir Il'ich Lenin, Foreign language publishing house, Moscow, 1951.
137. Ibid
138. Basic Economics: A Citizen's Guide to the Economy by Thomas Sowell, Basic Books, NY, USA
139. Ibid
140. The Chinese Economy: Transitions and Growth By Barry Naughton, The MIT Press Cambridge, London, England. 2006
141. Basic Economics: A Citizen's Guide to the Economy by Thomas Sowell, Basic Books, NY, USA
142. The Law by Frédéric Bastiat, http://bastiat.org
143. میں بھی کمیونسٹ تھا از مجاہد مرزا ، ہم سب ،. http://www.humsub.com.pk, 16-05-2016.
144. Basic Economics: A Citizen's Guide to the Economy by Thomas Sowell, Basic Books, NY, USA
145. Ibid
146. When Boris Yeltsin went grocery shopping in Clear Lake, Chrone, September 16, 2014. http://www.chron.com/neighborhood/bayarea/news/article/When-Boris-Yeltsin-went-grocery-shopping-in-Clear-5759129.php
147. The Turning Point: Revitalizing the Soviet Economy by Nikolai Shmelev and Vladimir Popov, I.B.Tauris & Co. Ltd. Publishers London.
148. Of Diapers and Dictators in Venezuela, The Daily Beast, 04-12-2016. http://www.thedailybeast.com/articles/2016/04/12/of-diapers-and-dictators-in-venezuela.html
149. Basic Economics by Milton Friedman. www.youtube.com 2010.
150. On Justice, Power, and Human Nature: Selections from The History of the Peloponnesian War By Thucydides, Paul Woodruff, Hackett Publishing, 1993.
151. The Age of Voltaire: A History of Civilization in Western Europe from 1715 to 1756, With Special Emphasis on the Conflict Between Religion and Philosophy by Will Durant, Ariel Durant, MJF Books, 1993
152. Etudes matérialistes sur la morale Broché By Yvon Quiniou, Editions KIME, 1988
153. An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations by Adam Smith, Hayes Barton Press, 1930.
154. Ibid
155. Ibid
156. Ibid
157. History of Economic Analysis, By Joseph Alois Schumpeter, Oxford University Press, 1986.
158. The Road to Serfdom By Friedrich August Hayek, Psychology Press, 2001
159. Ibid

160. Fascism: Doctrine and Institutions By Benito Mussolini, Ardita, 1935
161. Fellow Travellers of the Right: British Enthusiasts for Nazi Germany, Cited in Richard Griffiths, London: Trinity Press, 1980.
162. Three Years of World-revolution By Paul Lensch, Constable Limited, 1918
163. Mein Kampf by Adolf Hitler,Adolf Hitler, Jan 25, 2016
164. Ibid
165. The Speeches of Adolf Hitler: April 1922 - August 1939, By Adolf Hitler, Fertig, 1969
166. Adolf Hitler: The Definitive Biography John Toland, Knopf Doubleday Publishing Group, 2014